

فوری شکایتیں کا ادارہ

سینٹرل ڈائجسٹ

مارچ 2018

پیشہ ورانہ
میریٹ کریڈٹ



مدیر اعلیٰ
عذر ارسول

مدیرہ
نائب مدیر
بینی احمد
اظہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

جسٹس
ناہید سلطان اختر

معصوم بچوں کا بچپن چھین لینے والے
سنگدل اور ظالم انہوں کا ماحیرا

انشائیہ
جون ایلینا

جب الفاظ بے معنی ٹھہریں تو ایسی
ہی لازوال تحسیر رستم ہوتی ہے

موراں
علی اختر

ماہی کا آئینہ باغیچہ اور بے اختیار
فرانک کے ہنس آموز اور عبرت آمیز واقعات

التجا
محمد شوکی

بعد از سرگ... بیشتی
روحوں کی درد انگیز التجاؤں کا قصہ

مہلت
ثمر عباس

مخفوف ہاتھوں میں اپنا اہم رشتہ
کراکے مجھ پر اپنے اطمینان کا قصہ

آپ کے خط
مدیر اعلیٰ

سپنس کی مجلس مشاورت و ستارین کی ترغیب
شیریں باہیں گئے گلوے اور مخصوص مشورے

نفع نقصان
تنویر ریاض

بہشت کی چاشنی میں
لہن و حمو کا ہی کی تخیلوں کا قصہ

رنگ آسمان
سہیل آرہا جیوت

شرق مغرب کے عجیب استراحت اور تاریخی تفریق
امیرت اثرات میں لہلہا لپچہ پاکستان

آواز حق
مرزا امجد بیگ

بیرون ملک جا کر روزگار کے خواہش مند
لوگوں کے لیے ایک عبرت اثر واقعہ

خلش
نعمان اسحاق

زندگی کے بجائے درد کو جینے
والی ایک حسرت کی دلدرد کھٹا

حبس زدہ
مظہر سلیم ہاشمی

ایک پتھر دل باپ کی شقی القلمی
ایک لرزہ خیز وادوات

انتقام
انجم فاروق ساحلی

جوش میں ہوش کھو دینے والے
مصر کی سرزمین پر فرعون
محبسوں کا عبرت کا انتخاب
سازشیں اور پیغمبر کے معجزات کا احوال

تنہائی
نادیہ نور

خون جھاڑنے والے برقیے موسم
کی لہو گر مادیے والی وادوات کا احوال

امانت
شاہ زین رضوان

محبت کے رشتوں میں
گندمی مٹا کی تڑپ اور گرن کی روداد

وقت
حسانیت

ایک عزم بازی مگر کی بازی گری... سنسنی
خیز واقعات پر شعل ایک لہر باطلیل مستان

حضرت موسیٰ
رضوانہ سلجہ

جوش میں ہوش کھو دینے والے
مصر کی سرزمین پر فرعون
محبسوں کا عبرت کا انتخاب
سازشیں اور پیغمبر کے معجزات کا احوال

حریف
نشون ہادی

خاکت کی چار میں چھے نکلیے خجروں کی اذیت
اور... بے اعتبار رشتوں کی دلخراش داستان

مخفوف شعروں
قارین

آپ کے ہاتھوں ہی ایک گمن گئے بگ
آپ کی پستہ آپ کے ذوق تہم آہنگ

دیدہ دلیری
شاکی لطیف

دوسروں کو نصیحت کرنے والے
منصفوں کے بے ایمانی اور بے اصولی کا اجرا

ناکا
نظیر اسلام

ناکامی سے منہ چھپانے اور ڈر جانے
والوں کے لیے ایک حساس تحسیر

کترین
انار

دنیا بھر سے اوہر اوہر سے لطیف چٹکے
اقتباسات، سرگرمیاں اور تہذیب کا بکھڑا کپے

مشرق

ایک انگریزی فلم کے دوران میں پاکستان کی ایک آراستہ و بھراستہ بیٹی یہ جاننے کے لیے بے تاب تھی کہ پاکستان اور انگلستان کے درمیان کھیل کا جو مقابلہ ہو رہا ہے، اس کا انجام کیا ہوا؟ اسی نزدیکی میں ایک شخص نے جو ٹرانسمر سے کان لگائے کھیل کی روداد سن رہا تھا، بتایا کہ پاکستان ہار گیا اور پھر ان برونڈ اور جندہ ستیوں کے دلوں میں 1857ء کا دکھ تازہ ہو گیا۔ مغرب کے مقابلے میں مشرق کی بے حرشتی کا داغ پھر مل اٹھا۔

ہم جس بوسودو نامہ میں قائم ہیں، اس میں انگلستان سے ہارنا تو ہارنا، جیتنا بھی ہارنا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک یوز نے ایک انسان سے یہ شرط بندی کہ جو فلاں انسان کی ہو بھولتلا اتار دے، وہ اس چیز کے سارے پھلوں کا حقدار ہوگا۔ یوز نہ اس نقل میں جیت گیا اور خوش خوش اپنے باپ کے پاس گیا۔ باپ نے کہا: ”ارے میرے بیٹے! یوز نے انسان کی نقل اتارنے میں، انسان سے جیت جانا کیا حیرتہ خیال میں جیتا ہے؟“

تمہارا ہر کام اور ہر کھیل مغربی ہے، پس تم ہارے تو کیا اور جیتے تو کیا؟ بلکہ دکھ تو یہ ہے کہ تم ان کی نقل اتارنے میں کبھی کبھی جیت بھی جاتے ہو۔ اے قوم! تیری سحرگئی دیکھنے کے قابل ہے۔ تیرا قومی احساس اب صرف کھیلوں کے میدان میں بیدار ہوتا ہے۔

ہم دانشوروں کے اس فطانت نصاب اور حکمت آماب کردہ سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے جراثیم کے ”قومی شعور“ پر خطبات دینے کی اہم ذمہ داری قبول کر رکھی ہے۔ جو حشرات کے ”تہذیبی شخصیات“ کے باب میں داد و تحسین دیا کرتے ہیں۔ جراثیم کا قومی شعور، حشرات الارض کے تہذیبی شخصیات۔ ایک کیڑا میز پر جوکا ہوا مشرق کے عظیم ادبی ورثے پر انگریزی میں مضمون لکھ رہا ہے۔ ایک کوڑا، دیوان غالب ہاتھ میں لیے ہوئے، چاچا کی دھن میں بحر ہزج کی سر پرستی کر رہا ہے۔

تم کیا اور تمہارے احساس کیا۔ تمہاری حیثیت کیا ہے؟ جب تمہیں ہوتو کیوں کان کھائے جاتے ہو۔ ذرا اپنے آپ کو چھو کر تو دیکھو۔ دیکھا تم نے۔ یہ کچھ اور ہے۔ اپنے سراپا پر نظر ڈالو۔ یہ کسی اور کی شکل ہے۔ تم جو کچھتے ہو، اس کی شیرینی اور ترشی پر تمہارا کوئی حق نہیں۔ تمہارے کان دوسروں کے لیے سنتے ہیں۔ تمہارا شامہ دوسروں کے لیے سونگتا ہے۔ تمہارا لمس غلام، تمہاری بھارت غلام، تمہارا مذاق غلام، تمہاری ساعت غلام، تمہارا شامہ غلام۔ تمہیں وقت نے دہار ماری ہے کہ تمہارا حلیہ بگڑ گیا ہے۔ تمہارا داغ ماؤف ہو گیا ہے۔ تمہارے ہونے کی اب محض ایک ہی دلیل رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ تم جگہ گھیرتے ہو۔ مشرق قائم و دائم ہے کہ چشم بدردور۔ مشرق میں طول، عرض اور عمق پایا جاتا ہے۔ خدا اس چشم کو قائم و دائم رکھے۔

☆☆☆

ماہوری 2018ء کے دل کش شمارے کی حسین جھلکیاں



پاکستان

پاکستان

ماہنامہ

رافعت سراج اور شیریں حیدر کے مسلسل ناول کی نئی چونکا دیئے والی اقساط

صبا بخاری کے سلسلے وار ناول..... محبت لفظ ہے لیکن..... میں دیکھیے کردار نگاری کے حسین جوہر

ناہید سلطانہ اختر کے مشاق قلم کا شاہکار انسانہ..... چاک چاک قبائے دل

فرحین اظفر..... عورت کہانی میں ایک نہایت حساس موضوع لیے حاضر ہیں

روشانے عبد القیوم کا نسل ناول..... میرا عشق صوفیانہ

کردار سازی اور روح کی بالیدگی کا اہتمام لیے
ذکیہ بلگرامی اور اختر شجاعت
کے ایمان افروز کالم

شائستہ زریں نے مہمان بنایا شہزادہ شیخ اور ان کی وکیل ہم سفر کو

لکھیے جلد

ماہ نامہ قلم کاروں کی دل کو چھو جانے والی بہترین تحریریں جن میں عقیلہ حق، طیبہ عنصر مغل، بشیر سیال، ہما بیگ، ماہ وش طالب، نزہت حبیب ضیا، حرا قریشی، صدف آصف و دیگر مصنفات شامل ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ مستقل سلسلے، رنگ رنگ تراشے، دل موہ لینے والی شاعری، آزمودہ ترکیبیں اور بہت کچھ.....



عزیزانِ من!
السلام علیکم!

مارچ 2018ء کا شمارہ اپنے باذوق قارئین کی خدمت میں حاضر ہے۔ مہینہ مارچ کا ہوا درقرارداد پاکستان کا ذکر نہ ہوتا بات کچھ بھی نہیں ہے مگر۔۔۔۔۔ مشکل تو یہ ہے کہ 23 مارچ کے اغراض و مقاصد کا ذکر کر کے بھی بات بنتی نظر نہیں آتی کیونکہ۔۔۔۔۔ جب انسان کو اپنے ہی گھر کی چار دیواری میں بھی محفوظ کا احساس نہ ملے تو یہ کیفیت اسے ذہنی اذیت و انتہائی کا شکار کر دیتی ہے۔ مگر ہاں آج کل پاکستان کے مختلف شہروں میں بھی کچھ ایسی ہی بے اعتباری کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ ایک بار پھر سے معصوم بچوں کے اغواء، قلم اور زیا دتی کی وبا پھیل رہی ہے۔ نامعلوم افراد معلوم ہو جانے کے باوجود قانون کے شکنجے سے آزاد نظر آتے ہیں۔ والدین غموں سے پھوڑا اور پولیس مجربان سے دور جب کہ پاکستانی معاشرہ بے کس و مجبور۔۔۔۔۔ کیسی منظر کشی اور تاریخ رقم ہو رہی ہے اور دوسری جانب قانون کی وردیوں میں ملیوں اہل کاروں کے ہاتھوں بے قصور شہریوں کو کوئی بھی جھوٹا الزام دھر کر بے رحمانہ قتل کیا جا رہا ہے۔۔۔۔۔ اب کوئی یہ جھلے کہ ایسے میں بات کیسے بن سکتی ہے۔ اگرچہ انکسٹن وعمال کے جال میں الجھا کر تمام سیاستدان اپنے اپنے مفاد کی بات بناتے کی کوشش تو کرتے نظر آ رہے ہیں اور حسب دستور پاکستان کے دستور کی آڑ لے کر عوامی مسائل سے نظر ہٹ جانے کی روایت پر بھی دل و جان سے عمل پیرا ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ایک ماہ میں دو بار بیٹروں کی تیتوں میں اضافہ کر کے گیس، بجلی، پانی اور روزگار کو ترسے ہوئے لوگوں پر مہنگائی کا ہم نہ گرایا جاتا۔ بے یار و مددگار یہ قوم جس کے بظاہر اسنے سارے ”فاکیرین“ چلتے پھرتے اور تقاریر کرتے نظر آتے ہیں، اپنی بے بسی پر جھجھلاہٹ اور ڈپریشن کا شکار نہ ہو تو کیا کرے، اولاد چھوٹی ہو یا بڑی۔۔۔۔۔ اس وقت والدین کے لیے یہ درد بہت بڑی آزمائش بن چکا ہے۔ جنگل کے قانون کے بھی کچھ اصول ہوں گے۔ کچھ نہیں تو جنگلی جانوروں میں بھی کچھ دیر لٹا کی رقت ہوتی ہوگی، لیکن۔۔۔۔۔ یہاں انسانی فعل۔۔۔۔۔ انسانی معاشرہ اور قانون۔۔۔۔۔ کس پر اعتبار کیا جائے۔ کیا ہم پھر سے پتھر کے زمانے کی طرف دھکیلے جا رہے ہیں۔ تعلیم، ترقی، جدت، ایجادات نے ہمیں اس شعور سے کیوں دور کر دیا ہے کہ یہ سب تو انسان کے لیے ہیں تو پھر یہ انسان کے ہی دشمن کیوں ہو گئے ہیں۔ بہر حال سوال تو بے شمار ہیں مگر جواب کسی ایک کا بھی ملنا دشوار ہے لہذا آخر میں ہم صرف یہ دعا ہی کر سکتے ہیں کہ یا الہی ہمارے رہنماؤں اور بااختیار طبقے کو وہ شعور دے جو انسان کے لیے صرف انصاف کی بنیاد پر بہترین معاشرہ تخلیق کر سکے، (آمین) اور اب اس سوالیہ نشان کو سوچ کی منہ میں دبائے کچھ اپنی مٹھل کی بھی خیر نیتیں ہیں جہاں قارئین اپنے سندیوں کے ساتھ ہمارے منتظر ہیں۔

محمد رفاقت، واہ کینٹ سے تشریف لائے ہیں ”فروری 2018ء کا شمارہ آب و تاب سے ہمارے ہاتھوں میں آ گیا ہے۔ خوبصورت اور شاندار رسالہ شائع کرنے پر میں ہی نہیں سب ہی آپ کو مبارکباد دیتے ہیں۔ دقت پر ملنے سے اسے پڑھ بھی لیتے ہیں اور پھر خط بھی لکھ دیتے ہیں۔ اس دفعہ بھی کہانیوں کا معیار پہلے سے بھی بہتر تھا۔ بجلی ہی کہانی ہٹ دھرم تاریخی ماحول اور علی اختر صاحب نے اس کہانی کو بہت ہی اچھے انداز میں تحریر کیا جس میں پیچیدگی اور تاریخی قوم کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ علی اختر صاحب نے حق ادا کر دیا اور خوبصورتی سے سب کو اردوں کو ایک کہانی میں سودیا۔ بے شک وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ (بجلی بالکل درست کہا۔ تاریخی کہانی بڑی عرق ریزی کا تقاضا کرتی ہے) دوسری کہانیوں میں نور ریاض کی جوشی انتقام مذوا کا نازی کی میراث، محمد ناصر اعوان کی شراکت دار، ناہیدہ سلطانہ کی بے خبر، ملک صفدر حیات کی جرم زادہ، محمد الیاس کی جمہوریت، اعتراض ذہیم و ملی کی مجرم کون، شاکر لطیف کی نفسیاتی جنگ، شاہ زین رضوان کی نادیہ دھم، ایم زیڈ شیخ کی حقیقت، انجم فاروق ساحلی کی خطرناک، شریعہ اس کی راز داں، اسامہ قادری کی دادر، سب ہی اچھی کہانیاں تھیں۔ (بہت خوب) محفل شعر و سخن نے بھی دل لوت لیا، بہت اچھے شعر پڑھنے کو ملے۔ خط بھی

خوب اچھے لکھے گئے ہیں۔ خاص کر فشی محمد عزیز صاحب عرصے سے پڑھ رہے ہیں مگر لکھتے سال کے سال ہیں۔ میں بھی آپ کی اس بزم میں ایک کہانی ارسال کرنا چاہتا ہوں، کیا آپ اسے اپنے پرچے میں جکدیں گے۔“ (ذی ضرور جو پتا فہرست کے صفحے پر درج ہے اسی پر آپ میں ارسال کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کی کہانی قابل اشاعت ہوئی تو ضرور پرچے میں جکد پالے گی۔ سپینس ہند کرنے کا بے حد شکر ہے)

ریاض ہٹ، حسن ابدال سے محفل میں شریک ہیں ”حیدر کی بھی مسکراہٹ اور اداس چوڑیاں یہ کہانی سناری تھی کہ انتھار کی ٹھنڈیاں طویل ہو گئیں۔ خیر، آگے بڑھے تو جون ایلیا صاحب نے اسے قلم کی چھتھی ہوئی تحریر سے ردشاس کرایا۔ غریب عوام کو ہر دفعہ بے وقوف بنانے والے سب اچھا ہے دکھائیں گے اور دوت لے کر چلنے نہیں گے۔ پھر یا مقدر یا نصیب۔ اس کے بعد اپنی پیاری محفل میں قدم رکھا۔ فشی محمد عزیز نے دھاڑی سے رقم طراز ہیں کہ یہ خط وہ تیس سال بعد لکھ رہے ہیں۔ بھی بہت دیر کی کہانیاں آتے آتے۔ چند مہرمان جب بھی آئیں مہرمان ہی ہوتے ہیں۔ آپ کا خط بہترین ہے۔ میرا شعر پسند کرنے کا شکر ہے۔ محمد صفدر معادی آپ نے یہ بات بالکل ٹھیک لکھی ہے کہ مال اچھا ہو تو قیامت کبھی جاتی۔ آپ کو میرا تبصرہ پسند آیا مہرمانی۔ آپ کا تبصرہ بھی قابل قدر ہے۔ ہر بات کا تفصیل سے ذکر ہے۔ ایمانے زارا اشارہ آپ تبصرہ خوب لکھتی ہیں۔ بار عباس اور ماہین بار بار لوگوں کا کافی عرصے سے سپینس کے ساتھ تعلق ہے۔ بار عباس بھائی کافی اچھے اور گپ والے خط لکھتے رہے ہیں۔ ان کی ڈیز ہد دے قیامت والی بات سن کر مجھے بھی یاد آ گیا کہ میرا تعلق بھی سپینس سے اختا پرانا ہے۔ (بہت خوب) عبدالجبار رومی کیسے ہو بھی۔ محفل میں آپ کا خط دیکھ کر خوشی ہوئی ہے۔ ویسے شاہناہ سلطان، ناہیدہ یوسف اور کرن عمران کے تبصرے شاندار ہیں۔ تاریخ کے اوراق سے کثیر کردہ کہانی ہٹ دھرم نے بھی خوب معلومات میں اضافہ کیا۔ عورتوں کی ضد نے تاریخیوں کو آسمان سے زمین پر پٹخ دیا۔ ضد تو کسی کی بھی ہوتی تھا پتھانی ہے۔ اس کے بعد پڑھی ملک صفدر حیات صاحب کی جرم زادہ، مطلب ہے، جرم کی کوکھ سے جنم لینے والا بندہ۔ لکھ بھر رنگ بدلی کہانی نے ہمارے ذہن کو بھی کئی قلابازیاں لگوا لیں۔ آخر جب مجرم سامنے آیا تو حیرانی ہوئی۔ یہاں بھی آشنائے اسے قتل کروا دیا اور بعد میں کرکئی۔ بہر حال کہانی اچھی رہی۔ آج کل کی بلکہ میری ناقص رائے کے مطابق ہمیشہ کی سیاست سے پردہ اٹھائی کہانی محمد الیاس کی جمہوریت عوام کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ امتزاز سلیم و ملی کی تحریر مجرم کون ایک چوکا دینے والی تحریر ہے۔ نعمان نے جو کچھ لکھا بظاہر اچھا نہیں کیا۔ لیکن اس نے معاشرے کو دسی لوٹا جو معاشرے نے اسے دیا۔ انجم فاروق ساحلی کی کہانی خطرناک میں ایک بیوی نے اپنے خاندان کے قتل کا بدلہ بڑی ہوشیاری سے لیا۔ انجم فاروق ساحلی دلی و ن، نفسیاتی جنگ، شراکت دار اور حقیقت بھی پسند آئیں۔ یہ بات میں بر ملا کہوں گا کہ آپ لوگوں کا انتخاب لاجواب ہوتا ہے۔ جس نے ہمیں سپینس کا گرویدہ بنایا ہوا ہے۔ (آپ کی پسندیدگی کے چند جملے ہمارے حوصلے مہیز کر دیتے ہیں) اس بار میرا شعر شاید راتے میں رہ گیا تھا۔“ (لگتا تو یہی ہے)

امام رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ”انشائیہ حسب معمول فکر انگیز تھا۔ خطوط کی محفل میں پہلے نمبر پر آنے والے فشی محمد عزیز صاحب کو مبارکباد، موصوف واقعی بہت پرانے تبصرہ نگار ہیں، یہ عاجز بھی اس زمانے سے وابستہ رہا ہے اور آج بھی وابستہ ہوں۔ (بہت شکر یہ جناب) 1984ء سے لے کر اب تک کے میرے تبصرے میں نے محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ اشعار کا ذخیرہ بھی محفوظ ہے۔ (بہت خوب جناب) مدیر اعلیٰ صاحب میں آپ سے شکایت نہیں کروں گا کہ فردری کے پرچے میں میرا خط نہیں شائع ہوا، ڈاک خانے والوں کی غفلت کا شائبہ لگتا ہے مجھے۔ (بالکل درست کہا آپ نے۔ آپ کا پہلا خط بھی آپ کے دوسرے خط کے ساتھ میں ملا ہے) جوش انتقام کہانی معقول تھی، تعجب ہے سراغ رساؤں میں بھی ایسا پھڑے بازیاں ہوتی ہیں۔ میراث نے بہت متاثر کیا، ایک فکر انگیز کہانی تھی۔ کافی عرصہ یاد رہے گی۔ رنگ آسمان نے اس بار بہت گہرے رنگ بکھرے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کہانی میں جس اور سپینس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، بہت مزہ آ گیا۔ شراکت دار نہ صرف پراثر تھی بلکہ سبق آموز بھی تھی۔ بے خبر، مسد اللہ کے بچے والدین سے کیوں نفرت کرتے تھے۔ اس کا سبب جان کر حیرت ہوئی۔ جرم زادہ اس دفعہ ملک صاحب کی کہانی بہت ہی پھر کی ہوئی تھی، کہانی میں خوب لطف آیا۔ جمہوریت بائیں، تو کوئی کہانی ہی نہیں ہے۔ یہ تو اپنے وطن عزیز کے حالات، بیان کیے ہیں سو بہت خوب کیے ہیں۔ ”مجرم کون؟“ کافی دلچسپ کہانی تھی، لطف آ گیا۔ وقت پر تبصرہ کرنے کا دقت نہیں آیا۔ نفسیاتی جنگ بھی خوب کہانی تھی۔ نادیہ دھم، پسند نہیں آئی۔ حقیقت نے بھی خوب مزہ بہم پہنچایا۔



(گنا ہے آپ چٹارے لے کر پڑھتے ہیں..... یہ تو ہماری حوصلہ افزائی ہے کہ آپ کو مزہ آجاتا ہے) خطرناک بھی اچھی کہانی تھی، اس میں سسٹن بھی تھا۔ رازداران کہانی چٹ پٹی تھی۔ کہانی دارٹ سے تو ہلکا جانا رکھ دیا، کہانی کار بھی کون! اسامہ قادری، موصوف کا شیش کل ابھی تک ذہن میں گوج رہا ہے۔ اشعار کی محفل میں کراچی کے عاصم خان اور جنگ سٹی کے عظیم احمد، عرفان احمد اور کونیر کے عادل خان کے اشعار قابلِ داد تھے۔ جن دوستوں نے اپنے اپنے بھروسوں میں مجھ ناچیز کا ذکر خیر کیا، ان سب کا میں بدول سے شکر گزار و ممنون ہوں۔“

اسامہ قادری، مضمی، سندھ سے خراماں خراماں چلی آ رہی ہیں۔ جنوری 2018ء کا شمار ہاتھ میں آتے ہی دل خوشیوں سے بھر گیا، عاصیہ اوپر والا پورا سال خوشیاں، سکون اور امن سے نوازے۔ آئین۔ ڈاکرا نگل کے ذوق میں بھی اضافہ ہو رہا ہے اور فاضل کی خوبصورتی میں چار چاند لگ رہے ہیں۔ ڈائجسٹ کی قیمت میں جتنا بھی اضافہ کریں ہم چھوڑنے والے نہیں۔ بے فکر رہیں۔ (فکرتو ہوتی ہے لیکن آپ کی محبت مطمئن کر دیتی ہے) ایلپاچی نے قانون کے بارے میں لفظ لفظ بیچ بولا، ویلڈن۔ ایمانے داراشاد صدارت پر نظر آگئی۔ تیرہ بھی پرہٹ تھا، مبارک ہو۔ ذہن میں خاں ہمیشہ سے باریک بین ہیں اور دور کی کوڑی لاتی ہیں۔ بہترین پوائنٹ آؤٹ کرتی ہیں۔ شاعری بھی کمال غضب ہوتی ہے۔ اس بار تو محفل سے بھی ممبران کو اچھے برے، چھوڑنے بڑے بھروسوں کے ساتھ خوش کر دیا، محفل میں جگہ دے کر۔ بار بھاس بھائی ابھی تک پرانے زمانے والے ڈائلاگ یعنی تاکہ کھینچنے والی بات کر رہے ہیں۔ ہم پاکستانی بڑے دل والے ہیں۔ در ماندہ، ناہید سلطانہ اختر کی میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ سوسب سے پہلے ان کی کہانی پڑھی۔ بہت ہی زبردست اور لا جواب داستان رہی۔ جس جس نے مہرن کی ذمہ داری خراب کی کرے انجام سے نہ بچ سکے۔ ایسی کہانیاں پڑھ کر دل اداں ہو جاتا ہے۔ مگر امام صاحب بھی کچھ عرصے سے نظر نہیں آ رہے وہ دن ان کی اسٹوری میں ہنسانے کا مواد ہوتا ہے۔ (کبھی کبھی دقت بھی آ جاتا ہے) اک دور تھا، ڈاکٹر ساجد احمد جی نے کافی دلچسپ ماضی کا آئینہ دکھایا۔ مرزا احمد بیگ جی کی گریبان بھی بہت اچھا نام دے گئی۔ فرید احمد کو پیش مسائل اور ذاتی زندگی پر جتنی دھمے سامنے آئے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سیدی کی جگہ کا آدی پڑھ کر دل دھکی ہو گیا۔ پاکستانیوں نے کیا کیا دکھائیں سے مگر رفیق جیسے لوگ پھر بھی نہیں سوجھتے۔ امید تو مظہر سلیم ہاشمی جی کی بہت پسند آئی۔ دعا چوہری کافی مضبوط اعصاب رکھنے والی لڑکی تھی، اتنی مشکلات کا سامنا کیا، لیکن کامیاب رہی۔ آخری فیصلہ اپنے کزن کلیم کے حق میں دیا۔ شاکر لطیف جی کی سبکی بھی خوب رہی۔ ڈیوڈ کوٹلی کی جیسا سبکی ملا، پھر وہ بھی اس کی مجبور کا باپ، ایڈی کی پھر بھی اپنے مقدمہ میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آج کل میری پسندیدہ داستان حسام بنت جی کی وقت ہے۔ اس میں حقیقت پر جتنی اسٹوری ہے اور آج کے دور پر ہے، لکھا ہے جیسے ہماری آنکھوں کے سامنے فلم چل رہی ہو۔ رنگب آساں، اسے آدر اچوت جی بھی کسی سے کم نہیں، اس داستان کا پلاٹ پیملاؤ کی طرف جا رہا ہے اور دلچسپی بڑھا رہا ہے۔ زبردست جناب اسے آدر اچوت جی۔ کترینیں سدا کی طرح اسے دن نہیں۔ محفل شعر و سخن بھی جلتا رہی تھی۔“

چلیلی ہیر، جنگ صمد، پنجاب سے تشریف لائی ہیں۔ میرے بابا جان عرصہ دراز سے یہ رسالہ پڑھ رہے ہیں مگر کبھی لکھا نہیں۔ اب یہ ناچیز چلیلی ہیر پڑھنے اور ساتھ لکھنے کے قابل ہوئی تو سب میریں اور انگل ناچیرہ نگاروں میں رونق مٹا کر نے حاضر ہے۔ (ماشا اللہ..... انگل نما..... تیرہ نگارو!..... اب ویس جواب) فاضل پر خاندان بدش نسل کی حسد سالو لا رنگ اور چھوٹی آنکھوں کے ساتھ ہونٹوں میں دوپٹا ڈالنے کی خوش گمانی میں مسکرا رہی ہے۔ انشائیہ میں جن ایلپا نگل مبارک ترین پیش کر رہے ہیں۔ آئین۔ ادارہ میں رسالے کی قیمت 70 روپے کرنے کے بعد میں کھن اور کریم گنا نہیں جھولے۔ (بھلا کھن کے دور میں کریم نہ لکھیں تو کب لکھیں..... یہی بتا دیں) سسٹن ڈائجسٹ کا چسکا کھن سے زیادہ مزہ دار ہے۔ (یہ ہوئی نابات) تیرے سب کے اچھے رہے۔ نئے بھر زخمی اچھا تیرہ کرنے میں کامیاب رہے۔ ساتھ ہماری پیاری مدیرہ یعنی احمد کے تراش خراش کا بھی کمال ہوتا ہے جو یہ محفل جتن ہے (بہت شکر یہ) سلسلہ وار داستانیں میری فیورٹ ہیں۔ رنگب آساں مومٹ فیورٹ ی، اے اے آر راجپوت کئی پہلوؤں سے اس داستان کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ پروفیسر ہنری کی اچانک موت سے کہانی کا رخ تبدیل ہو گیا۔ اب سفر بنا اور شکی پورا کریں گے۔ دوسری طرف شاہ زمان، اریہ اور علی کا نوکہ بھی اپنے مشن کے قریب پہنچ چکا ہے۔ حسام بٹ صاحب نے بھی علی کی والدہ ملکی بیگم کو بھی داستان میں ختم کر دیا۔ اب علی کا امریکا کا جہاں جاسکے نہیں، دارشاد بھی شکوک لوگوں میں شامل ہے۔ علی اختر صاحب کی ہٹ دھرم بھی پرہٹ رہی۔ تاناریوں کی تہذیب و تمدن، رہن مہن دم واد اور ان کی تین مشہور



اور خدی نور تیں..... کی بالکل صحیح عکاسی کی۔ واللہ مزہ آگیا، کیسے کیسے شہزاد اور بٹ دھرم لوگوں کو موت چٹ کر جاتی ہے تو راکینہ کو بھی زوال آئی گیا۔ (کیسی عبرت کا مقام ہے) رضوانہ ساجد اور داستان حضرت موسیٰ، بہت زبردست ویلڈن۔ اسامہ قادری جی ہمیشہ بے مثال لکھتی ہیں۔ وارٹ بھی ان کی بہت زبردست اور شاعرانہ تحریر ہے، بہت ہی شمس اور سسٹن سے بھرپور داستان، دل موہ لیا۔ ڈاکٹر رفعت، عروسہ اور سوہرا مظلوم اور اچھے کردار ہے۔ شاہ جہاں بڑا کردار اور بڑا انجام۔ محفل شعر و سخن اور مراسلے بھی زبردست تھے۔“

ذہن خان آفریدی، حیدر آباد، سندھ سے شریک محفل ہیں۔ ماہنامہ سسٹن ڈائجسٹ فروری 2018ء 15 جنوری کو مل گیا۔ مردوق حسین سمرخی آنکھوں والی ویلڈن کس نے کی مناسبت سے زرد اور سرخ ڈریس میں اوم لگ رہی تھی۔ باتیں سب چھوڑ چھاڑ کر اپنی محفل پر نظر ڈالی تو نہ لک گیا۔ پیچھے دو ماہ سے میرا تیرہ غائب ہے حتیٰ کہ بلیک لسٹ میں بھی نظر نہیں آیا۔ ساتھ پوسٹ آفس والوں کی بھی کلاس لی۔ ڈائجسٹ کے آفس بھی فون کیا کہ یہ کیا جا رہا ہے۔ (ماجرایہ ہے کہ "لی بی" یہ پاکستان ہے" آپ کے دونوں خطوط ایک ساتھ ملے) انشائیہ میں ایلپا صاحب اس کو مبارک ترین قرار دے رہے ہیں۔ انشا اللہ تم شوق ہیں۔ ادارہ اس بار بھی خوب سیر حاصل تھا جس میں پاکستان کے مسائل نمایاں کیے گئے۔ محفل میں مٹی محمد عزیز نے، اپنے اولاد کو گولڈ کی خوشی منارہے تھے۔ مبارک باد، محمد صمد معادیہ صاحب بھی مستقل مزاج تیرہ نگار ہیں۔ بار بھاس صاحب بھی کافی سے زیادہ اولاد کو گولڈ ہیں۔ ڈیوڈ روپے کا سسٹن خریدنے والے خوش قسمت انسان، ایمانے داراشاد بھی اپنی صدارت پر خوش ہوئی نظر آئیں۔ ریاض بٹ صاحب، ادیس اسامہ خان صاحب، عبدالباری رومی صاحب محمد بھروسوں کے ساتھ روٹی محفل تھے۔ نئے ناموں میں شاہانہ سلطان اور طلعت مسعود صاحب اچھے بھروسوں کے ساتھ موجود تھے۔ ناہید یوسف صاحب کا تیرہ بھی میٹ رہا۔ جنوری 2018ء اور فروری 2018ء کے سسٹن ڈائجسٹ بہت ہی زبردست اور شاعرانہ رہے۔ محمد الیاس صاحب کی نکس، شرعاس صاحب کی مداد اور چاندی کا چمچن ڈاکٹر بھی صاحب کی اسے دن رہی، جنوری کے شمارے میں اب فردری کی طرف آتے ہیں۔ ہسٹری اور تاری میرا پسندیدہ ٹاپک رہا ہے۔ ہٹ دھرم میں علی اختر صاحب نے تاری حورقوں اور ان کے رہن کہن پر بہترین روشنی ڈالی۔ داستان میں تو راکینہ نے بڑی ہوشیاری اور چالاک کی دکھائی مگر پھر بھی ہار گئی۔ ویلڈن علی اختر صاحب، رنگب آساں میں اسے آدر اچوت نے پروفیسر ہنری کو مبارک داستان کا رخ بدل دیا۔ حسام بٹ صاحب نے وقت میں علی کی والدہ ملکی کو براہِ عمل دکھائی، اس طرح علی کا پاکستان میں رہ کر اپنی والدہ کا بدلہ لینا ضروری ہو گیا۔ یہ دونوں سلسلہ وار داستانیں سسٹن ڈائجسٹ کی جان ہیں۔ ویلڈن۔ بے خبر میں ناہید سلطانہ نے کافی سارے جابل والدین کو خبردار کر دیا۔ نئیاتی جنگ میں شاکر لطیف صاحب نے بہت عمدہ اور سسٹن سے بھرپور اسٹوری پیش کی۔ مارٹن نے تو کمال کر دیا۔ شرکات دار محمد یاسر اعوان نے دھوکا اور جرم پر اسٹوری پیش کی۔ گریم حسن نے دھوکا فراڈ کو ہلکا کر لیا تھا، ویس لسن کے ٹکڑے بھی چھپا چکا مگر جرم تو بولتا ہے۔ حضرت موسیٰ، ایمان تیری قدرت..... کہ جس سے خطرہ تھا وہی ان کی آنکھوں کے سامنے پنا، بڑھا۔ رضوانہ ساجد صاحب، جزاک اللہ، تیرے جیسے کا افتخار ہے۔ اسامہ قادری صاحبہ کی وارٹ نے آخری صفحات کا حق ادا کر دیا۔ بہت ہی اثر انگیز اور عبرت ناک داستان رہی۔ شاکر طرک دولت کے ٹکڑے پر لوگوں کی زندگیوں سے کیلتے ہیں لیکن قدرت اپنا کام کرتی ہے۔ شاہ جہاں جیسی عورت بھی لاپتہ ہو گئی۔ محفل شعر و سخن بھی کلاسک رہی۔ مراسلے بھی اے دن تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ سسٹن کلاسک نئے سال سے شروع کریں گے۔ (ادو..... بھی اداں نہ ہوں..... بس جلد ہی شروع کرتے ہیں)

محمد زبیر ساگر، گوجرہ سے چلے آ رہے ہیں۔ سسٹن ڈائجسٹ کا پرانہ قاری ہوں۔ بہت دیر سے سسٹن کے ساتھ میرا سہرا بند ہے۔ باقاعدہ سسٹن ہر ماہ خریدتا ہوں اور شوق سے پڑھتا ہوں لیکن خط کبھی کبھی لکھتا ہوں (بس یہی غلطی ہے آپ کی..... کبھی کبھی نہیں خط براہِ باقاعدگی سے لکھا کریں) جنوری کا سسٹن میرے ہاتھوں میں ہے بہت خوش قسمت ہوں کہ سسٹن کے فاضل کی خوبصورت حسینہ مجھے دیکھنے کو ملی، دلکش اور خوبصورت فاضل دیکھ کر دل میں کچھ کچھ ہوتا ہے۔ (ادو خدایا..... یہ کچھ کچھ کیا ہوتا ہے) کچھ ہمیں بھی تو بتائیں) سسٹن سے دلجیت ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتی اس لیے کہ اس کی ہر کہانی دل کو چھو لینے والی ہوتی ہے جس کی کہانیاں اور تیرے ابھی زیرِ مطالعہ ہیں لیکن میں یقین ہے کہ ہر ماہ کی طرح ہمارے سسٹن کی ہر کہانی ہماری جان نے جلد ہی ایک کہانی سمیٹوں گا۔ (جی ضرور.....)

محمد خواجہ، کورنگی وکراچی سے جنوری کے شمارے پر تیرہ لے کر حاضر ہیں۔ "نیا سال ہم تمام اہل وطن کو مبارک۔ جنوری نے



﴿ایمانے زارا شاہ، اسلام آباد سے تبرہ کر رہی ہیں﴾ "مائل والی خاتون ٹھنڈی وجہ سے بنامند دھوئے لپ اسٹک لگا کر بے پیار سے سسٹنس پر براہ جان ہو گئیں۔ اودانت میں دوپٹا اپنے آپ کا بالکل 1980ء کی ہیر دمن کیجیو کر دیا ہوا ہے ان نے.....! "انشائیہ دادار" پڑھ کر صرف ایک بات چلے پڑی ہم جہاں سے چلے تھے آج بھی وہیں کھڑے ہیں...! بھائی ہم نہیں بڑھو تو کیا ہوا۔ زمین تو اپنے مدار میں چکر پورا کرتی ہے (بھائی) محمد عزیز بے صدارت کی کرسی مبارک ہو۔ میں آپ سے ہی کیوں ہیں؟ جون جولائی کیوں نہیں اٹھیں نے بھی نوٹ کیا ہے خواتین بہت کم شامل ہوتی ہیں..... براہ عباس

﴿خلق ربانی انجم، رجز، چارسدہ سے محفل کی زینت بنے ہیں ”فروری 2018ء سسٹمز کلاسٹا سرسری دیکھنے کے بعد اندرونی صفات کی طرف قدم بڑھاوے تو بڑے قدم سسٹمز کے معنائین کی فہرست کے لیے رکھنے پڑے۔ سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد جون ایلیا کے انشائیہ سے ہوتے ہوئے آپ کے خطبات ہوتے ہوئے..... جس میں چند اہم مسائل پر تشریح فرمائی گئی تھی..... سے قارئین کے خطوط میں پہنچے۔ تبصرے کیے تھے اور سب کے تبصرے بہت اچھے بھی لگے۔ جن میں شیخ محمد عرز، محمد صفدر معاویہ، ایمانہ طاہر الدین بیگ، بابر عباس، ماہین بابر، فضل عباس، اور یس احمد خان، ریاض رب، عبدالجبار انصاری، شاکر گلشن اقبال، طاعات، مسعود کے تبصرے پسند آئے۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل کہانیاں بہت پسند آئیں۔ جن بے خبر، ناہید سلطانہ اختر، جرم زادہ، ملک صفدر حیات، جمہوریت، محمد الیاس، مجرم کون؟ اختر اسلم و صلی جنگ، شاکر لطیف، حقیقت، ایم ریڈ شیخ، حضرت موسیٰ، رضوانہ ساجد، خطرات، انجم فاروق ساحلی، را قادری کی وارث پسند آئیں۔ محترم بابر عباس، ماہین بابر، فضل عباس آف کھاریاں نے قارئین کے خطوط کہ سسٹمز کلاسٹا کی کہانیاں آپ کب سے شروع کر رہے ہیں؟..... اس سلسلے میں گزارش ہے کہ اگر کہانیاں جاتے تو کیا بات ہوگی۔“ (میں اندازہ نہیں تھا کہ آپ لوگ سسٹمز کلاسٹا کے لیے اتنے جہنم ہو۔

محمد صفدر معاویہ، ضلع غازیوال سے محفل میں حاضر ہوئے ہیں۔ سرورق پر دلربا سا ماڈل آویزاں ہے۔ محترم جون لیا کا انشائیہ پڑھا۔ آج اس وفد کے انشائیہ کے لفظوں میں دو کاٹ ہے جو بائیس آدمی کو تھوڑے رکھوے۔ آپ کا ادارہ یہ پڑھا۔ آپ نے جو کچھ لکھا وہ حکومت و ملت کے منہ پر ملنا چاہیے۔ اگر وہ سمجھے تو گمراہیوں کی ضرورت ہے سوچنے سمجھنے کی۔ وہ تو مزے ہی مزے میں ہیں۔ ملک میں بے ملک نقل و غارت ہو، زنا بانی ہو، چوری ڈاکا عام ہو، زنا شراب کے اڈے چلیں، ہم کس کس کو روکیں گے؟ بے کس کو؟ اس کو؟ اس کو؟ انتھاکو؟ نائب اللہ جس کے مرکزی مرام ابھی تک نہیں پکڑے گئے۔ پچھلی وفد آخری صفحات پر ناہید سلطانہ اختر کی ورنہ ایسے ہی ورنہ وصف لوگوں کو بے نقاب کرتی ہوئی تحریر تھی۔ ساتھیوں کی محفل میں میرے پڑوسی شہر نشینی محمد عزیز نے کرسی صدارت پر قبضہ کیا ہوا ہے، مبارک۔ باقی تمام دوستوں کے تھمرے ابھی پڑھنے ہیں جو کہ بہت بہترین ہوں گے۔ کہا نیوں میں رنگ آسان پڑھی جو کہ چنگ نہ خیز یوں سے بھر پور رہی۔ رینا باب کا مقدمہ ہار گئی۔ رابرٹ کی غداری کی وجہ سے۔ اور محمد بابرین کا نوکر بھی مشکل میں ہے خدا خیر کرے۔ پھر وقت پڑھی جہاں علی کی تو دنیا ہی لٹ گئی اس کی ماں اس سے روٹھ کر خالق حقیقی کے پاس جا پہنچی۔ بہت بڑا مقدمہ ہے مجھے تو شادی پر شک ہو رہا ہے کہ یہ سب دولت کی خاطر اس کا کیا چہرہ ہے۔ محمد یاسر اعوان کی شراکت دار پڑھی۔ اچھی تحریر تھی، واقعی خون کر کے بندہ بیچ نہیں پاتا۔ ناہید سلطانہ اختر کی بے خبری بھی اچھی تھی۔ جہاں انسانی تقاضے کے ہم مسئلہ کو اجاگر کیا گیا۔ اختر اذہم و علی کی جرم کو بھی محمد وہی۔ نوی نے بدلہ لینے کے لیے قتل عام اٹھایا جو خود اس کی زندگی کو بھی برباد کر گیا۔

راجہ تاج محمد وجوہ، پنڈاوان خان سے تشریف لائے ہیں۔ نئے سال کے پہلے سسٹن کے شمارے کے پاسل پر مسکراہٹ نکھیرتی جینہ مسرتوں اور کامرا نیوں کی نوید سنا رہی تھی۔ جون الیٹا اپنے انشا میں قاتلوں کی حرمت برقرار رکھنے کی تلقین کر رہے تھے۔ خطوط کی محفل جاندا تہجدوں سے بھر پور تھی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی تاریخی کہانی اک دور تھا، پڑھی جو جس سے بھر پور اور بہت ہی سبق آموز تھی۔ دیگر کہانیوں میں گر بیان، اسید نو اور ورنہ دل کو چھو لینے والی تھیں۔ رنگ آسان اور وقت بہت ہی دلچسپ و داستانی ہیں۔ رضوانہ ساجد نے اس مرتبہ حضرت موسیٰ کی عظمت کو اجاگر کیا۔ محفل شعر و سخن کے تمام اشعار اپنی نظیر آپ سے۔ (انتخابر اظہار خیال..... غم کی کی گئی ہے)

بابر عباس، ماہین بابر، فضل عباس، گھمانہ رو دکھار یاں سے تشریف لائے ہیں۔ سری بڑی خواری کے بعد اپنا پیارا اور جان دلارا آنکھوں کا تاسا سسٹن جو کہ فردوسی کی شکل میں تھا کسی پچھڑے دوست کی طرح ملا۔ سرورق پر بھلا کیا تہمرہ کروں۔ ڈاکر صاحب جب بھی کرتے ہیں کمال کرتے ہیں۔ شاید بیوی کے ذرا اثر ہیں۔ اس ماہ بہت سے ایسے واقعات ہوئے ہیں جو دل خراش ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور لکھا جاتا رہے گا مگر ہوگا کچھ بھی نہیں۔ ان واقعات میں سے ایک واقعہ قصور شہر کا زینب کا واقعہ جو سات جنوری کو ہوا آج 19 جنوری ہے قاتل گرفتار نہیں ہوا اور نہ ہی ہوگا۔ اس واقعے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میرا عزیز دوست میرا عزیز ساتھی میرا عزیز بھائی جو میرے لیے بہت کچھ تھا۔ انصاف ناور 17 جنوری کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ (اللہ تعالیٰ آپ کو کھیر دے اور آپ کے بھائی کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے) آپ سیاست پر بات کر کے اپنی جان کیوں ہلکان کرتے ہیں۔ اس سے شدید قسم کی بدمذہبی ہو جاتی ہے (شاید اسی طرح اس مرض کی کوئی دوا مل جائے) اس بار بینک کے آغاز کے لیے آپ نے فکری محرمز مئے صاحب کو بھیجا ہے جو اپنی بینک کے جوہر دکھلاتے ہوئے پٹری کی طرف گامزن تھے مگر 99 کے پچھیرے میں آکر ڈوٹ ہو گئے۔ اوپر کے طور پر محمد صفدر صاحب آئے اور کیا خوب آئے زبردست کیا زور و دارشات لگے ہیں۔ ریاض صاحب آپ کے کہیں کا کیا بنا دیا کیس جو کرکٹ میں اکثر چلتا رہتا ہے۔ خیر بڑی زبردست بینک کی آپ نے۔ سری ایک بات تو بتائیں ہم میں گیارہ کھلاڑی کھیلنے ہیں۔ بارہواں کھلاڑی غالباً پانی پانے کے لیے ہوتا ہے آپ نے تیرہ کھلاڑی کیسے کھلا دیے ہیں۔ اچھا اچھا یہ پاکستان ہے یہاں سب چلتا ہے۔ سری پہلے بتا دیتے اپنے طعنت مسودہ پانی پانے والے کھلاڑی ہیں۔ کہا نیوں کی شروعات دی گریٹ اور ایک خوبصورت رائٹر جناب عزت آپ جو اپنی کہانی کو نیتے نیتے پاؤں چلاتے ہوئے دل کو گرماتے ہوئے ہمیں رنگ آسان کی سیر کروا رہے ہیں، اے آرا راجوت صاحب رنگ آسان واہ وا کہہ سکتے۔ دوسرے نمبر پر حسام بٹ صاحب کو وقت کے ذریعے پکڑا۔ حسام بٹ صاحب تعین کریں پور کر رہے ہیں۔ آخری صفحات پر سسٹن نے ہمیشہ کلاسک اور

شاندار کہانیاں دی ہیں جو پرانے قاری حضرات کو ابھی تک یاد ہیں۔ محی الدین نواب مرحوم کی پتھر اور کزن، اس کے علاوہ دوسرے مصنفین کی جگہ اکبر، شوق کائین اور بہت سی دوسری، طاہر جاوید مغل کی کرب آشتی اور حالی ہی میں نکست کی فتح کا شرف زبیر مرحوم کی بہت سی یادگار تحریریں اور بہت سے خوبصورت رائٹروں نے بہت سی خوبصورت تحریریں پڑھنے کو دی ہیں، مگر اساقہ قادی صاحب کی وارث۔ مزہ نکل آیا، سوری اساقہ قادی صاحب۔ ناہید سلطانہ اختر صاحبہ ایک عجیبی ہوئی رائٹر ہیں ان کو پتا ہے میں نے قادی کو کیا دینا ہے، اس بار وہ بے خبر نہ کر آئیں۔ بے خبر ایک اچھی تحریر تھی اور گھر آگیز بھی۔ اختر اذہم و علی کی تحریر کردہ جرم کون نے اس طرح متاثر کیا جس طرح ایڈ زڈ و مریش کا خون متاثر کرتا ہے بہت خوب۔ ویل ڈن محمد الیاس صاحب جہوہریت پسند آئی گوکہ ہمارے ملک میں نہیں۔ علی اختر صاحب نے اس بار ہٹ دھرم کے ذریعے توجہ جمع چکیجہ خان کے خاندان کی سیر کرائی۔ بہت اچھے علی اختر صاحب، ہم کو آپ کی سیر پسند آئی ہم خوش ہوئے کچھ مانگ نہ لیں۔ حضرت موسیٰ کی حالات زندگی پر مبنی رضوانہ ساجد کی زبردست پیشکش دلوں کو منور کرتی ہوئی روشن تحریر کا دوسرا حصہ پڑھا۔ ول باغ باغ ہو گیا۔ شعر عباس صاحب جب بھی مغرب سے کچھ وادہ کرتے ہیں وہ بہت خاصے کی چیز ہوتی ہے۔ فردوسی کے شمارے میں آپ نے میرے خط کا وہ حال کیا ہے جو امریکا بھارو نے دیت نام کا کیا تھا۔ (خطوط کے آٹھ صفحات میں سے چار آپ کے نام کیسے کر سکتے ہیں..... اگلی بار یہ فارمولہ ضرور بتا دینے گا)

شاہانہ سلطان، جامع کلاچ، کراچی سے خوش خوش تشریف لاری ہیں۔ "ارے واہدہ یہ صاحبہ آپ کے جواب نے تو ہمیں لا جواب کر دیا اور کچھ کچھ شرمندہ بھی..... ہر بار آپ کو یہ کہوں گی کہ ہم نے پہلی بار انٹری ماری ہے (ظاہر ہے جب سالوں بعد تشریف آوری ہوگی تو کون سمجھے گا آپ اسی مکان کے مکین ہیں) اسی ڈر کی وجہ سے ہم نے سوچا کہ اب جلدی جلدی اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہنا چاہیے اور ہم نے سسٹن پڑھتے ہی قلم اٹھا لیا۔ اس بار تاریخی کہانی تو قویٰ نہیں لکھی۔ علی اختر صاحب ہلیڈ ذرا آسان زبان میں تاریخی منظر نامہ دکھائیں۔ ایسے تو ہم بھی ان موٹی موٹی کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں مگر انہیں ہم کون کرے گا۔ ویسے کہانی اچھی تھی۔ اس بار سب سے اچھی کہانی زینا کا میراث لگی۔ سمجھنے والوں نے اسے جو بھی سمجھا ہو مگر ہماری سمجھ میں تو یہی آیا کہ دکھوں کی ایک زنجیر ہے جس نے اس دھرتی پر رہنے والوں کو جکڑ رکھا ہے۔ جانے کب اس زنجیر میں رنگ لگے گا اور وہ کڑی کڑی کر کے ٹوٹی چلی جائے گی۔ حقیقت بھی اچھی لگی۔ لگتا ہے نئے مصنف کی کاوش ہے۔ بہر حال کوشش کامیاب رہی۔ جرم کو بھی دلچسپ لگی۔ شاکر لطیف کی نفسیاتی جنگ نے واقعی کمال کر دیا۔ آخری لمحوں تک انجام کا اندازہ نہ ہو سکا، ویلڈن۔ رضوانہ ساجد نے حضرت موسیٰ کا اگلا حصہ بھی بہت خوب لکھا۔ یہ سوانح محض واقعات نہیں بلکہ ان سے اللہ پر بھرپور وسار و توکل و یقین میں پہنچی پیدا ہوئی ہے، جزاک اللہ..... انجم فاروق کی خطرناک نے بھی مخطوط کیا۔ شعر عباس کی راز دواں نے لطف دیا مگر وقت دکھوں کی طرح دھیرے دھیرے چل رہا ہے۔ تیزی لائیں حسام بٹ صاحب۔ بہت ست رفتار کی کاٹھا ہے۔ محمد الیاس کی جہوہریت نے تو پاکستان کا نقشہ کھینچ ڈالا ہے۔ رنگ آسان بھی اسے آرا راجوت کے قلم سے بہت شاندار اور جاندار ہوتی جا رہی ہے۔ کیا یہ کوئی طویل سلسلہ ہے یا بس چند حصوں پر مشتمل اسٹوری ہے (یہ تو کہانی کے حالات و واقعات پر منحصر ہے کہ طوالت کتنی ہو سکتی ہے) محفل شعر و سخن کا انتخاب بہت لا جواب ہوتا ہے۔ تمام اشعار اساتذہ کے کلام کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بہت خوب۔ ہمارے قارئین کی حسن نظر کی واو دا پڑے گی۔ شاد زین رضوان اس بار واہدہ زخم لے کر آئے اور چھانگئے۔ شاہ زین رضوان نے بھی بہت کم عرصے میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ آپ کے قلم میں بھی جان ہے اور محمد یاسر اعوان نے تو شراکت دار لکھ کر کمال ہی کر دیا ہے۔ جرم بھی آج کل جرم۔ ہاں مکتا ہے اور اگر ہمارے بس ہیں ہوتا کی کو انعام دینا تو ہم بے خبر پر ناہید سلطانہ اختر کو ضرور نوازتے۔ بھی بہت خوب..... بات اگرچہ بہت معمولی ہے جسے والدین نظر انداز کر دیتے ہیں مگر فقط ایک جھلک بچے کے شعور میں ایسی محفوظ ہو جاتی ہے جو کالے نہیں لٹکتی..... ناہید ہر بار کسی نہ کسی اچھوتے موضوع پر قلم اٹھاتی ہیں۔ ویلڈن۔ اور جناب اس کے ساتھ ہی ویجیہ اجازت..... مدد یروکاب امید ہے کہ ہماری آمدنی بھی نہیں لگے گی۔" (یہ ہوئی تاہات.....)

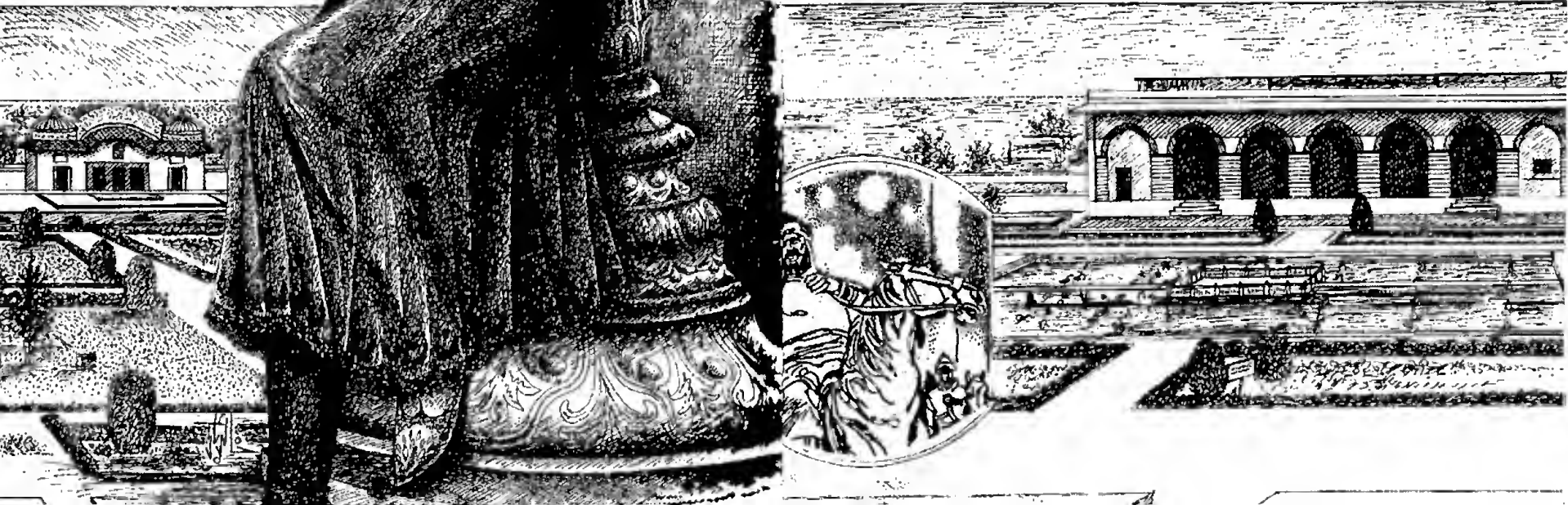
اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔
ناہید یوسف، اسلام آباد۔ مہتاب احمد، حیدر آباد۔ مہرین ناز، کراچی۔ اعجاز احمد شیخ، مٹان۔ انجم کمال، حیدر آباد۔ محمد جاوید، جہانیاں۔ عامر خان، کراچی۔ سعید واہدہ، لاڑکانہ۔ نور شاہ نواز اعوان، ڈی آئی خان۔

موراں

علی اختر

بادشاہت ہو یا فقر و فاقہ... انسان تو ہر حال میں انسان ہوتا ہے اور انسانی فطرت کے تمام تر تقاضے بھی پورے کرتا ہے۔ انہی میں ایک احساس محبت کا بھی ہے۔ جہاں کار دنیا میں مشغول رہ کر دیگر ذمہ داریاں نبھانے کی کوشش کی جاتی ہے... وہیں دل کے جذبات اور احساسات سے بھی چھٹکارا ممکن نہیں... رنجیت سنگھ... تاریخ کا ایک اہم دور اور شخصیت... اس دور کے معاشی، عسکری اور مذہبی معاملات اپنی جگہ مگر اس کے دل کی دنیا کے بھی کچھ اہم معاملات نے اسے خود میں الجھا رکھا... موراں... رنجیت سنگھ کی سب سے چہیتی محبوبہ اور بیوی۔ جس کے عشق نے اسے دیوانہ بنا رکھا تھا اور یہ دیوانگی دنیا کو حیران کر رہی تھی۔ اقتدار کی مسند سے اتر کر وہ محبوبہ کے قدموں میں بیٹھ کر سکون محسوس کرتا تھا۔ یہ محبت بھی انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ ماضی کے اوراق سے ایک دلگداز داستان

ماضی کا آئینہ بے اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات



اک کبرام بجا ہوا تھا۔ اک قیامت اتری ہوئی تھی۔ داخلی گزروں اور بیرونی جیلے سے بچنے کے لیے جنگی اقدامات کر لیے گئے تھے۔ فوج میں بیماری اسلحہ بارود تقسیم کر دیا گیا تھا۔ پنج دریا کے داخلی اور خارجی راستوں پر مسافروں کو لے جانے اور لانے والی تمام کشتیوں پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ صرف ایک کشتی تھی جسے مسافروں کو پالنے جانے کی اجازت تھی۔ یہ 27 جون 1839ء کا دن تھا، لاہور اخبار نے اس کی یوں منظر کشی کی ہے۔

مہاراجا وفات پا گیا۔ رانیاں، کنور کھڑک سنگھ، راجا دھیان سنگھ، جمدار خوش سنگھ سنگھ اور دوسرے لوگ بلند آواز میں رونے لگے۔ وہ اپنے سروں پر مٹی ڈال رہے تھے۔ زمین پر لوٹ رہے تھے اور پتھروں سے سر ٹکرا رہے تھے۔ لاش کے قریب بے عمل ساری رات جا رہی تھی۔ لاش میں ایک کبرام بجا تھا۔ ایک قیامت اتری ہوئی تھی۔ جو کوئی لاش کو دیکھتا، بری طرح رونے چلائے لگتا۔۔۔۔۔

مہاراجا کی لاش ساری رات زمین پر پڑی رہی۔ اس کے ارد گرد دیے جلنے رہے اور ساری رات گریہ و ماتم جاری رہا۔ راجا دھیان سنگھ سب سے زیادہ رورہا تھا اور ادبھی آواز میں بچہ رہا تھا کہ وہ مہاراجا کے ساتھ جل مرے گا۔ کھڑک سنگھ اور دوسرے سرداروں نے اسے اپنا فیصلہ بدلنے پر راضی کرنے کے لیے اس کے بیروں میں اپنی پگڑیاں رکھ دیں۔ تاہم چار رانیاں اور اس کی سات ملازمائیں اس کی چتا کے ساتھ جلنے کا عزم کیے ہوئے تھیں۔ اگلے دن مہاراجا کی لاش کو گنگا جل سے نہلا گیا۔ بحری جہاز سے مشابہ شکل کی صندلی لکڑی سے بنی چتا پر اسے لٹایا گیا۔ اس جہاز کے بادلان ریٹم اور ٹنل کے بنائے گئے تھے۔ وزیروں اور درباریوں نے چتا پر اپنی اپنی شاخیں ڈال کر عقیدت کا اظہار کیا۔ کئی ہونے والی چار رانیاں اور سات ملازماؤں نے شادی کے لباس اور زیورات پہنے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ ابھی انہیں ڈیلیوں میں بٹھا کر ان کے دلہاؤں کے ساتھ بھیج دیا جائے گا۔

چتا اٹھائی گئی تو وہ چاروں سات ملازماؤں کے ساتھ ننگے پاؤں چتا کے پیچھے بڑی خاموشی سے چلنے لگیں۔ وہ وقفے وقفے سے اپنی گوتی چوڑی، کڑا یا زور توڑ کر فقیروں کے جہوم میں اچھال دیتی تھیں یا مقدس گیت گانے والے برہمنوں میں سے کسی کو دے دیتی تھیں۔ جنازہ شہر کی تنگ گلیوں سے گزرا جو روتے ہوئے لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ مکانوں کی چھتوں اور کھلی کھڑکیوں سے بھی لوگوں کی

بڑی تعداد دھڑاڑیں مار کر جنازے کو دیکھ رہی تھی۔ پھولوں کی چٹائیں اس پر پھجھواری جاری تھیں۔

شیشاں گھاٹ پہنچ کر چتا رکھ دی گئی۔ ہندو مسلمان اور سکھوں نے آخری بار مرنے والے کے لیے دعا مانگیں۔ پھر برہمنوں کے مقرر کردہ وقت پر کھڑک سنگھ نے چتا کو آگ دکھادی۔ یہ پنجاب کے حکمران راجا رنجیت سنگھ کی لاش تھی۔ اس کی چاروں رانیاں اور سات ملازمائیں وقفے وقفے سے چلتی ہوئی لاش پر گود کر سٹی بن چکی تھیں۔ راجا دھیان سنگھ نے چتا پر گود کرنے کی کوشش کی لیکن لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ دوسری بیوہ ہونے والی رانیاں اور وہاں موجود ہر عمر، مذہب اور جنس کا فرد دھڑاڑیں مار مار کر رورہا تھا۔

رنجیت سنگھ کی چتا وودن تک سلگتی رہی۔ تیسرے دن راکھ اور ہڈیاں جمع کر کے مرتبانوں میں رکھ دی گئیں۔ یہ راکھ ہر دروازے کے مقام پر گڑگڑاؤ میں بھادی گئی۔ راجاؤں نے تین سو میل تک توپوں کی سلامی دی اور بستی ہوئی راکھ پر اپنی قیمتی شاخیں نذر کیں۔ لوگ اظہار محبت کے لیے پھولوں اور آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر رہے تھے۔

یوں تو پچیسے دو سالوں سے راجا رنجیت سنگھ کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ اپنی آخری عمر میں وہ شراب میں انیون گھول کر پینے لگا تھا اور وہ بھی زیادہ مقدار میں۔ ہولی اور دیوائی جیسے تہواروں میں اور بارش کے دوران وہ بے تحاشا شراب پینے لگا تھا۔ وہ پہلی بار 1826ء میں شدید بیمار ہوا۔ اس وقت اس پر ملیہ یا کا حملہ ہوا تھا۔ حکیم عزیز الدین کی ہدایت پر اس نے لدھیانہ سے ڈاکٹر مرے کو بلوایا۔ جو سات ماہ تک لاہور میں رہا۔ آہستہ آہستہ راجا رنجیت سنگھ کی صحت بحال ہوتی رہی۔ پھر مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا۔ 7 اگست 1835ء کو اس پر فالج کا ہلکا حملہ ہوا جس نے اس کے چہرے اور دائیں پہلو کو مفلوج کر دیا۔ اس کی وجہ سے وہ کئی گھنٹے بولنے سے قاصر رہا۔ وہ مجھے دیکھنے والے عطا بیوں کی باتوں کو مان لیتا تھا۔ اسے انگریز ڈاکٹروں کی تجویز کردہ کڑوی دوائیاں تو خصوصاً ناپسند تھیں۔ اس کے ڈاکٹر میک رگیو کو اس سے ہمیشہ بے شکایت رہی کہ۔۔۔۔۔

”مہاراجا دوا کھانے سے گریز کرتا ہے اور مجھے اس کا علاج کرنے میں بہت مشکل ہو رہی ہے۔ اس نے اپنا روزمرہ کاموں بدلنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔“ راجا رنجیت سنگھ نے ڈاکٹر میک رگیو کی نصیحتوں کو پس پشت ڈال کر اپنا روزمرہ کاموں بدلنے سے انکار

کر دیا تھا۔ وہ رات بھر بخار میں جلتے کے بعد بھی صبح کے وقت پانکی میں سوار ہو کر دریا پر یا کسی باغ میں چلا جاتا اور واپس آ کر دربار لگاتا۔ جس میں درخواشاں اور خبروں کی بھیجی ہوئی رپورٹیں سننا اور احکامات جاری کرتا۔ جب وہ بہت تنگ ہوتا یا بخار اسے بے بس کر دیتا، تب ہی کام سے رکھتا تھا۔ تاہم ڈاکٹر میک رگیو نے اسے کسی حد تک نظم و ضبط کا پابند کر لیا اور وہ ایک ماہ کے اندر اندر صحت یاب ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر کو لدھیانہ واپس جانے کی اجازت دے دی گئی۔

”گلتا ہے اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میں اب بہت جلد تنگ جاتا ہوں!“ یہ بات راجا رنجیت سنگھ نے 1836ء میں اپنے نئے معالج پیرون ہیوگن کو کہی تھی۔

1837ء میں رنجیت سنگھ پر دوبارہ فالج ہو گیا۔ اس مرتبہ اس کا پورا دائیں پہلو متاثر ہوا تھا اور وہ تقریباً چھ ماہ مفلوج رہا پھر دوبارہ پہلے کی طرح صحت مند نہ ہو سکا۔ وہ گھوڑے پر خود سوار نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے اٹھا کر گھوڑے پر بٹھانا پڑتا تھا۔ 24 جولائی 1838ء کو ہونے والے ایک حادثے سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ وہ کس قدر کمزور ہو چکا ہے۔ وہ صبح کی سیر کو باہر گیا ہوا تھا کہ ایک ہاتھی نے اس کی پانکی پر حملہ کر دیا۔ رنجیت سنگھ خود پانکی سے نہیں نکل سکا اور بائیں ہاتھ نے پانکی کے شیشے توڑ دیے۔ عطر سنگھ سنگھ حادلیہ نے اسے ہاتھی کے پاؤں سے کچلے جانے سے بچایا۔ اس نے ہاتھی پر نکلوا کر اس کی توجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے ہٹائی تھی۔

رنجیت سنگھ پر تیسرا حملہ آگ لینڈ کے دورے کے دوران ہوا۔ وہ اس وقت بے شمار تقریبات میں شمولیت کر رہا تھا۔ جب کرسمس کی شام وہ سخت بیمار ہو گیا اور اگلے پانچ دن موت اور زندگی کے درمیان جھولتا رہا۔ اس حملے نے مہاراجا کی بولنے کی قوت پوری طرح ختم کر دی اور اسے اشاروں سے بولنا پڑتا تھا۔ اس کے اشاروں کی زبان صرف دو اشخاص سمجھتا تھا رام سنگھ اور فقیر عزیز الدین بنی بھٹے تھے۔ فقیر عزیز الدین تو اس کی بات سننے کے لیے اس کے منہ سے اپنا کان لگا دیتا تھا۔

سردیوں کی بارش اور جنوری کی کاٹ دار سردی نے مہاراجا پر اچھا اثر نہیں ڈالا تھا۔ اس کا نزلہ بکڑ گیا اور اسے شدید کھانسی ہوئی۔ فروری میں موسم قدرے بہتر ہوا اور مہاراجا دھوپ میں کمرے سے باہر آنے لگا۔ اس کی صحت بہتر ہو گئی تو اس نے درباریوں کو اپنے بستر کے قریب بلانا

شروع کر دیا پھر مہاراجا مکمل صحت یابی کے لیے امرتسر چلا گیا جہاں پنج گراس نے بڑی رقم، سونا منڈھے سینگوں والی گائیں، سونے اور چاندی کے ہودے والے ہاتھی، سونے اور چاندی کی شیشیں خیرات کیں۔ زیادہ خیرات برہمنوں کو دی گئی۔ تاہم باقی سب مذہب کی عبادت گاہوں کو بھی حصہ دیا گیا۔ اب لوگوں کو یہ یقین دلایا جانے لگا کہ مہاراجا کی صحت بہتر ہو گئی ہے لیکن درحقیقت اس کی صحت خراب ہی تھی۔ تب انہوں نے لدھیانہ میں موجود ایجنٹ سے انگریز ڈاکٹر بھیجنے کی درخواست کی۔ لدھیانہ سے ڈاکٹر مرے اور ڈاکٹر سیٹل لاہور آئے۔

ڈاکٹر سیٹل نے ایک ہفتہ لگا کر مہاراجا کا پوری طرح معائنہ کیا اور گورنر جنرل کے لیے ایک خفیہ رپورٹ بھیجی۔ اس نے اپنی رپورٹ میں واضح طور پر لکھا کہ مہاراجا زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہے گا۔ اس کی حالت ایسی ہے کہ اتفاقی بیماری اسے موت کے گھاٹ اتار سکتی ہے۔ ممکن ہے وہ اپنی غیر معمولی قوت کی وجہ سے ایک سال تک زندہ رہ جائے۔ اس سے زیادہ عرصہ اس کے زندہ رہنے کا امکان نہیں ہے۔ جون 1839ء تک مہاراجا کے علاج کے لیے چھ یورپی ڈاکٹر اکٹھے ہو چکے تھے۔ ہمزبھیڈ ڈاکٹر ہوکر مرنے اسے قلعہ منگل ہونے کا مشورہ دیا۔ 10 جون کی شام بہت گرمی اور جس زندہ تھی۔ رات کو شدید اندھی پٹی۔ لاہور شہر کے دو دروازے اکٹھے گئے۔ قلعے کا بھی ایک دروازہ اکٹھا گیا۔ بے شمار درخت بھی گر گئے۔ شور اور کھلس کھانسی کی وجہ سے رنجیت سنگھ کورات نیند نہ آئی۔ مہاراجا کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ مہاراجا نے غم و یاکہ درج ذیل اشیا کی خیرات کی جائے۔

”سونا منڈھے سینگوں والی گیارہ گائیں، سانس کے پچیس بلوسات، سونے چاندی کی دی بنیں۔۔۔۔۔ سونے کے پانچ اور چاندی کے بہت سے ہرن، دو گھوڑے، ایک ہاتھی دو ہیرے کی انگوٹھیاں، مرجان کی گیارہ مالاکیں اور دو ہزار روپے نقد برہمنوں کو دیے جائیں!“

اس کے علاوہ اس نے جواہرات اور لاقعدا دوسری قیمتی اشیا پورے ہندوستان کے مندروں میں بانٹنے کا حکم دیا۔ اسی روز کوہ نور ہیرا سنگو کر جگن ناتھ کے مندر کو دے دیا۔ اپنی نگاریں، خنجر، پستول اور توڑے دار بند قوتوں کو فوجوں میں بانٹ دیا۔ اس کے بعد 27 جون کو اس کی بھرپور گزاری زندگی کا سورج غروب ہو گیا۔

☆☆☆

سدا کور اپنے شوہر گر بخش سکھ کے بعد بٹالہ کی سردار بنی۔ وہ بڑی معاملہ نم، ذہین اور ریاست کے انتظامات کو بڑی خوش اسلوبی سے چلانے کی اہلیت رکھتی تھی۔ وہ ایک بہادر، طاقتور اور تیز مزاج کی عورت تھی اور اپنے آپ کو ایک غیر معمولی عورت سمجھتی تھی۔

دوسری طرف چاہیت سکھ کا بایس سالہ بیٹا مہان سکھ جو اپنے باپ کی طرح جوجھو تھا، اس نے اپنے آباؤ اجداد کے متبوعہ علاقوں پر دوبارہ تسلط قائم کر لیا۔ وہ فتوحات کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھا۔ مہان سکھ نے جنوں کو فتح کر کے سکر چاکرہ مسل کو گمانی سے نکال کر نمایاں ترین مقام پر پہنچا دیا۔ انہی لڑائیوں میں سدا کور کا شوہر ہلاک ہو گیا تھا۔

رنجیت سکھ اسی مہان سکھ کا بیٹا تھا۔ رنجیت سکھ کی والدہ راج کور چند کے راجا گجیت سکھ کی بیٹی تھی۔ جو مہان سکھ سے بیاہ کر آئی تو اسے اپنے شوہر کے گھر والوں نے مائی ملواؤں کہنا شروع کر دیا یعنی نانہ کی خاتون۔ رنجیت سکھ اپنے بچپن سے ہی غصیلیا تھا۔ شاید اس کے غصیلیا ہونے کی ایک وجہ اس کی والدہ بھی تھی۔ اس نے جب اپنے والد کی وفات کے بعد سلطنت کا انتظام سنبھالا تو اس نے باپ کے مندر منتظم لکھ پتی رائے کو سوئپ دیا۔ رنجیت سکھ کی والدہ کو لکھ پتی رائے پر اعتراض تو تھا اور اس کی وفاداری بھی کہیں مشکوک نہ تھی لیکن اس کے بھائی دل سکھ اور سدا کور کو اس پر بھروسہ نہ تھا۔ کچھ اس کے رشتے داروں اور قریب ترین لوگوں نے ان دونوں سے متعلق کئی ایسی باتیں رنجیت سکھ کے گوش گزار کر دی تھیں جن کی بنا پر رنجیت سکھ بچپن سے ہی اپنی والدہ اور اس کے آشنائے نفرت کرنے لگا تھا اور وہ اپنا زیادہ وقت گوجرانوالہ کے نواح میں واقع جنگلوں میں گھروں اور جنگلی جانوروں کے شکار میں گزارنے لگا تھا۔ شکار نے اسے گھڑ سواری اور نشانے بازی میں باہر بنا دیا۔ چونکہ شکار کے بعد شراب نوشی کی عیقل ہو کر آتی تھی اس لیے وہ اپنی عمر کے ابتدائی سالوں میں ہی الکھول سے متعارف ہو چکا تھا۔

رنجیت سکھ مہان سکھ کی وفات کے اگلے دو سالوں تک ریاست کے انتظامی معاملات سے دور رہا۔ اس کی مصروفیات اور مشاغل نے اس کی والدہ راج کور کو پریشان کر دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر رنجیت سکھ کی شادی کر دی جائے تو ممکن ہے وہ زندگی کی ذمے داریوں میں دلچسپی لے سکے۔ اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار سدا کور سے کیا۔

سدا کور تو پہلے سے ہی ایک ایسے رشتے کی خواہش مند تھی جس سے اس کی نقل کی اہمیت دوبارہ سے قائم ہو جائے۔ یہ اس کے لیے بہترین موقع تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً اپنی بیٹی مہتاب کور سے رنجیت سکھ کی شادی قبول کر لی۔ جب رنجیت سکھ برات لے کر گوجرانوالہ سے بٹالہ روانہ ہوا، اس وقت اس کی عمر پندرہ سال سے کچھ ہی اوپر ہوئی۔ دواہم سکھ خاندانوں میں قائم ہونے والا یہ رشتہ پنجاب کی تاریخ کا ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔ رنجیت سکھ کی شادی میں پنجاب کے تمام ممتاز سکھ سردار شریک ہوئے تھے۔

مگر یہ شادی کوئی خوشگوار تاثر نہ چھوڑ سکی۔ اس لیے کہ مہتاب کور کے ذہن سے یہ بات نکالے نہیں نکل پائی تھی کہ رنجیت سکھ اس کے باپ کے قاتل کا بیٹا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی پوری زندگی رنجیت سکھ سے گریزاں رہنے لگی۔ رنجیت سکھ جو پہلے ہی رشتوں کی بے وفائی کا شکار تھا، وہ بھی اپنی ذات میں بخوبی گویا۔ سدا کور کو اس بات کی کوئی پروا نہ تھی کہ مہتاب کور اور رنجیت سکھ کی گھریلو زندگی کسی کج پر جاری ہے۔ وہ بھی اندر سے رنجیت سکھ کو پسند نہ کرتی تھی۔ اس کی تو بس ایک ہی خواہش تھی کہ مہتاب کور کو لڑکوں کو جنم دے جو سکر چاکرہ کی ریاست کے حکمران بن جائیں۔

دوسرا فائدہ سدا کور کو اس شادی سے یہ نظر آتا تھا کہ مہتاب کور، رنجیت سکھ کی بیوی بن کر کنبہاؤں کے مفادات کا تحفظ کر سکتی تھی۔ شاید اس چالاک کی رنجیت سکھ کو بھی علم ہو۔ یہی وجہ تھی کہ رنجیت سکھ نے وفاداریاں جیتنے کے بجائے تھکمانہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔ وہ تو خود کو ایک طاقتور سردار کی حیثیت سے منوانا چاہتا تھا اور اس کے لیے کنبہاؤں خاندان ایک وسیلہ بن چکے تھے۔ سدا کور اور رنجیت سکھ میں ایک انوکھا محبت اور نفرت کا رشتہ وجود میں آ گیا۔ وہ دونوں برتری کے خواہش مند تھے اور ایک دوسرے کی اس خواہش کو جاننے بوجھتے ہوئے اس کا احترام کرتے تھے جب معاملات اس سردمہری کا شکار ہو کر رہ جائیں تو ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب دونوں کو ایک دوسرے کی خامیوں اور خوبیوں کو قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔ لہذا ان دونوں کے درمیان بھی کامل ہم آہنگی اور مفاہمت پیدا ہو گئی۔

سدا کور نے اپنے داماد کو اپنے زیادہ قریب کرنے کے لیے یہ پہل کی کہ 1797ء میں جب اس کی ریاست بٹالہ کو رام گڑھیوں کی طرف سے خطرہ پیدا ہوا تو اس نے رنجیت سکھ سے مدد مانگی۔ رنجیت سکھ نے رام گڑھیوں کا بٹالہ پر دباؤ کم کرنے کے لیے اس کے ایک قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

رام گڑھیوں نے مفاہمت کے لیے ہاتھ بڑھایا جسے رنجیت سکھ نے فوراً قبول کر لیا اور اس طرح سدا کور کی ریاست پر سے خطرہ ہٹ گیا۔

رنجیت سکھ پر اب اقتدار کا نشہ پوری طرح چڑھ چکا تھا۔ سدا کور کے اس طرح مدد مانگنے سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ اب کنبہاؤں سے طاقتور نہیں رہے جتنا وہ انہیں سمجھ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ ایک اور مثل کو اپنے ساتھ لانا چاہیے۔ اس نے علیکوں کے سردار سے روابط بڑھانا شروع کر دیے اور 1798ء میں علیک سردار کی بہن کے ساتھ دوسری شادی کر لی۔ اس کی یہ شادی پہلی شادی سے زیادہ کامیاب رہی۔ اس کی دوسری بیوی اس کی والدہ راج کور کی ہم نام تھی۔ راج کور، رنجیت سکھ کی بیٹی کو بھی تھی۔ اسے پتا تھا کہ رنجیت اپنی ماں کے اصل پیار سے ہمیشہ محروم رہا ہے۔ لہذا وہ بڑا پیار بھرا سلوک اختیار کرنے لگی۔ بالکل مادرانہ انداز کا پیار لہذا رنجیت سکھ بھی اس کا احترام دل و جان سے کرنے لگا۔ اس نے راج کور کو پیار سے داتر کور کا نام دے رکھا تھا یا پھر مائی لکھن کہنے لگا تھا۔

دوسری شادی نے مہتاب کور کے دل میں رنجیت سکھ کی نفرت میں مزید اضافہ کر ڈالا تھا۔ اب مہتاب کور کو بٹالہ جانے کا ایک اور بہانہ مل گیا تھا۔ دراصل اس کے ذہن میں اور بھی بہت سی باتیں تھیں جن پر وہ رنجیت سکھ سے عمل کروانا چاہتی تھی۔

جن دنوں رنجیت سکھ اپنے ازدواجی معاملات طے کرنے میں مصروف تھا، اس عرصے میں سکر چاکرہ ریاست کے انتظامی معاملات لکھ پتی رائے اور رنجیت سکھ کے ماموں دل سکھ کی باہمی چپقلش کی وجہ سے سنگین مرحلے میں داخل ہو گئے تھے۔ لکھ پتی رائے کو حاصل کی وصولی کے دوران قتل کر دیا گیا۔ اگرچہ قاتل تو گرفتار نہ ہو سکے لیکن یہ افواہیں ضرور پھیل گئیں کہ اس قتل کے پیچھے دل سکھ کا ہاتھ ہے۔ دوسری طرف مہتاب کور کی بیٹی کی ماں نے بہن کی لیکن بعد میں بیاہ کر آنے والی راج کور (لکھن رانی) کے بہن سے رنجیت سکھ کا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام کھڑک سکھ رکھا۔ بیٹا پیدا ہوا تو اسے اپنی سلطنت کا جانشین بنانے کی خواہش بھی پیدا ہوئی۔ سدا کور اس بات سے ناخوش ہوئی تھی کہ اس کی بیٹی مہتاب کور رنجیت سکھ کے پہلے بیٹے کو جنم کیوں نہ دے سکی۔ تاہم وہ ایک دور اندیش عورت تھی۔ اس لیے اس نے مہتاب کور کو اس معاملے میں دوسرا درجہ بھی قبول کر لیا اور..... رنجیت سکھ کو مہاراجا کا خطاب اپنانے

کے لیے حوصلہ افزائی دی۔

☆ ☆ ☆

پنجاب رنجیت سکھ کے تحت پر بیٹھنے سے پہلے ایک ایسے خطے کا نام تھا جس کی حدود اور سرحدوں کا پوری طرح تعین نہیں ہوا تھا۔ رنجیت سکھ کے مہاراجا بننے سے پہلے بانوے سال کا عرصہ پنجاب میں افغان تفری اور انتشار کا زمانہ تھا۔ افغاناویں صدی پنجاب کے لیے مشکلات اور نقصانات کی صدی بنی رہی، جس میں نادر شاہ کا حملہ، احمد شاہ ابدالی کے فوجی حملے، مہلوں کی یلغار اور سکھ گردی کی لوٹ مار نے پنجاب کے عوام کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ رہی سہی کسر اس صدی کی دو خطہ سالیوں نے پوری کر دی۔ کھیتی باڑی برباد ہو گئی اور لوگوں کے کاروبار چوہا پٹ ہو گئے۔ وہ کا شکار اور تجارت پیشہ افراد جو قتل مکانی کر سکتے تھے، وہ پنجاب کا علاقہ چھوڑ کر ملک کے دوسرے حصوں میں چلے گئے۔

پنجاب کو قدرتی آفات نے اجازت کر رکھی تھی، اوپر سے وہ اور اس کے عوام بے دردی حملہ آوروں کے ہاتھوں بھی لٹتے رہے۔ اگر ایک دن احمد شاہ ابدالی مالیہ وصول کرنے کے لیے آجھمکا تو دوسرے دن لیرے سکھوں کی کسی مثل کا سردار راگھی کے نام پر پیداوار کا پانچواں حصہ مانگنے آ جاتا۔ لاہور کے کئی منقل اور ترک حاکم بھی لوٹ مار کی وجہ سے بدنام تھے۔

افغاناویں صدی کے نصف آخر تک پنجاب میں مسلسل لوٹ مار کا بازار گرم رہا۔ سکھوں کی بارہ مثلوں نے مختلف علاقے آپس میں بانٹ لیے جن میں پانچ لکھیں زیادہ اہم گردانی جاتی تھیں۔ پٹیکوں کی مثل لاہور کے علاوہ امرتسر اور مغربی پنجاب کے بیشتر علاقوں پر قابض ہو گئی۔ کنبہاؤں کی مثل کے پاس جمالیہ کی ترائیوں کا علاقہ تھا۔ پٹیکوں کی مثل کے پاس پٹیلہ اور سرہند کے قریب وجوار کا علاقہ۔ اہلوالیہ کی مثل راوی اور بیاس کے درمیانی علاقے پر قابض تھی۔ جبکہ سکر چاکرہ کی مثل جو کہ اہم مثل تھی، گوجرانوالہ اور اس کے ارد گرد کی بستیوں پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے تھی۔ ان تمام مثلوں کے سردار الگ الگ تھے اور جب بھی کوئی اہم مسئلہ یا دفاعی معاملات ہوتے تو تمام مثلوں کے سردار سال میں دو مرتبہ اکٹھے ہو کر اسے سلجھاتے۔ ابتدا میں یہ سیرت خالصہ (کل خالصہ اسمبلی) منظم انداز میں کام کرتی رہی مگر کچھ ہی سالوں میں ایسا ہونے لگا کہ مثلوں کے سردار دل کر کسی غیر ضروری معاملات پر بحث کرتے ہوئے آپس میں جھگڑ پڑتے اور معاملہ ہاتھ

پائی تک جا پہنچا جسے دیکھتے ہوئے سربت خالصہ کے اجلاس ہوتا بند ہو گئے۔ غرض پنجاب میں ہر طرف افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم تھا جس مقصد کے لیے سکھوں نے منٹیس قائم کی تھیں، وہ پورا نہ ہوسکا بلکہ اس کی جگہ نا اتفاقی نے سکھوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ جب جیسا سنگھ ابوالہ احمد شاہ ابدالی کی فوجوں سے لڑ رہا تھا تو چنگلیوں نے احمد شاہ ابدالی کی اطاعت قبول کر لی اور پٹیا لہ کے صاحب سنگھ کے رابطے ابدالی کے پوتے شاہ زمان کے ساتھ تھے جو کہ پٹیا لہ ہندوستان پر دوبارہ تسلط قائم کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ 1645ء سے 1661ء تک گوجرانوالہ کے ایک سکھ بدھ سنگھ نے اپنے گاؤں کے نام پر ایک مشکل سکر چاکریہ بنائی اور نادر شاہ کے خلاف جنگ لڑی۔ اس کے بعد اس کے لڑکے کو بدھ سنگھ نے مشکل کی سرداری سنبھالی۔ نو بدھ سنگھ کے چار بیٹے تھے جن میں چڑھت سنگھ سب سے بڑا تھا۔ نو بدھ سنگھ کے مرنے کے بعد اس مشکل کی کمان اس کے ہاتھ میں آئی جو کہ راجا رنجیت سنگھ کا دادا تھا جو 1771ء میں بندوق صاف کرتے ہوئے اچانک گولی چلیے سے زخمی ہو کر مر گیا۔ اس کے بعد رنجیت سنگھ کا باپ مہان سنگھ برسرِ اقتدار آیا۔ مہان سنگھ بڑا دلیر جوان تھا۔ اس نے اس افراتفری کے دور میں اپنے ارد گرد کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس نے کوئی لوہاراں نامی قصبے پر قبضہ کر کے تمام لوہاروں کو سننے طرزی بندوقیں بنانے کی دے داری سونپی۔ ایک طرف اس نے روپاس کے قلعے پر قبضہ کیا تو دوسری طرف جموں پھر پٹیا لہ پر اپنا تسلط قائم کیا۔

رنجیت سنگھ 1780ء میں پیدا ہوا۔ ابھی اس کی عمر دس برس تھی جب اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کی والدہ مائی ملوان بڑی دانا اور بد پر عورت تھی۔ اس نے سکر چاکریہ مشکل کو مضبوط کرنے کے لیے اس کی شادی اس وقت کی طاقتور مشکل چنگلیوں کے سردار جس کا انتقال ہو چکا تھا، اس کی والدہ سدا کو جو بڑی دانا اور بد پر عورت تھی، کی بیٹی مہتاب کور سے کر دی۔ جس برس رنجیت سنگھ کے والد مہان سنگھ کا انتقال ہوا، وہ گجرات میں اپنے والد کے ساتھ صاحب سنگھ بھنگی کے خلاف جنگ میں مصروف تھا کیونکہ صاحب سنگھ نے خراج دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مہان سنگھ محاصرے کے دوران بیمار ہو کر زندگی سے نا پس ہوا تو اس نے اپنے بیٹے رنجیت سنگھ کی پیشانی پر زعفران لگا کر اسے سکر چاکریہ بنا دیا۔ سکر چاکریہ مشکل کا سردار بننے ہی اس نے چنگلیوں کے خلاف جنگ کر کے انہیں اپنا مطیع بنانے

کا فیصلہ کیا۔ بھنگی اس وقت لاہور، امرتسر، گجرات اور پٹیا لہ پنجاب کے ایک بڑے حصے پر قابض تھے۔ رنجیت سنگھ نے انہیں عبرتناک شکست سے دو چار کر کے ان کے زیرِ نگیں علاقوں کو اپنی ملکیت میں شامل کر لیا۔

رنجیت سنگھ بہت بہادر اور نڈر انسان تھا۔ وہ ایک بار جس بات کا تہیہ کر لیتا جب تک وہ پوری نہ ہوجاتی، جین سے نہیں بیٹھتا تھا۔ وہ تیرہ برس کا تھا جب وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر شکار کے لیے جنگل میں گیا۔ ایک مقام پر آ کر وہ اپنے ساتھیوں سے چھڑ گیا۔ اسی اثنا میں اس پر اس کے پرانے دشمن حشمت خاں نامی سردار نے حملہ کر دیا۔ حشمت خاں اپنی سرداری بچانے کے لیے کئی بار شکست کھا چکا تھا۔ اب وہ اسے اکیلا دیکھ کر اس پر حملہ آور ہوا تا کہ اپنی برہمیت کا بدلہ لے سکے۔ اس نے جب حملہ کیا تو رنجیت سنگھ کا گھوڑا خوف کے مارے اپنی بچھلی ٹانگوں پر گھڑا ہو گیا جس سے حشمت خاں کا وار خالی چلا گیا۔ رنجیت سنگھ نے فوراً تلوار لگائی اور ایک ہی وار میں حشمت خاں کا سر کاٹ ڈالا اور اسے اپنے تیرے کی نوک پر اٹھا کر واپس اپنے ساتھیوں میں آ گیا۔

رنجیت سنگھ کے بچپن سے متعلق بہت زیادہ معلومات نہیں ملتیں لیکن سوہن لال سوری کے مطابق.....

”رنجیت سنگھ بچپن میں چچک کی بیماری کا شکار ہو گیا تھا۔ شہزادے کی طبیعت خراب تھی۔ برسلند خاں کی قیادت میں دو سو گھڑ سواروں کے ساتھ طیب لال حاکم رائے کو شہزادے کے علاج کے لیے بھیجا گیا۔ چچک کی بیماری سنگین ہو گئی تھی۔ اس کے سارے بدن پر چھالے نمودار ہو گئے تھے جن سے مواد بچنے لگا تھا۔ خصوصاً بائیں آنکھ والے چھالے سے اور پھر اس سب اس کی بائیں آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔“

اور پھر چچک کے یہ داغ ہمیشہ اس کے چہرے پر قائم رہے۔ رنجیت سنگھ کا باپ مہان سنگھ اپنی معرکہ آرائیوں کی وجہ سے اس کی پرورش پر زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ رنجیت سنگھ گرو درارے میں مہادت کے لیے جاتا۔ اس نے سکھ مذہب کے اصولوں کی ابتدائی تعلیم بھی برہمن پنڈتوں سے لی مگر اس نے اپنا زیادہ تر وقت کھیلوں اور شکار میں صرف کیا۔ اسے انہی دنوں گھوڑوں سے بھی لگاؤ پیدا ہو گیا۔ یہ لگاؤ آئندہ زندگی میں جنوں کی حد تک بڑھ گیا۔ رنجیت سنگھ بہت چھوٹا تھا جب اس نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی۔ وہ اپنی عمر کے ابتدائی برسوں ہی میں الکوحل سے معارف ہو گیا تھا۔

موریاں

اس کی شخصیت بھی عجیب و غریب تھی۔ پہلی ایڈن اس کی شخصیت کا یوں احاطہ کرتی ہے۔

”رنجیت سنگھ کا رنگ سیاہ تھا۔ چہرے پر چچک کے داغ تھے اور وہ کاٹا تھا (بالکل ایک بوڑھے جیسے) کی طرح خاستری ڈانسی اور ایک آنکھ والا۔“

انگریز مورخ اسے عموماً ”عیار مشرقی“ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ جب وہ برسرِ اقتدار آیا تو اس کی شخصی زندگی اس کے سیاسی کیریئر کی طرح رنگین بن کے رہ گئی تھی۔ اگرچہ وہ ایک بد صورت انسان تھا تاہم وہ اپنے ارد گرد خوب صورت مردوں اور عورتوں کو دیکھنا پسند کرتا تھا۔ اس کا قد اور قامت معمولی تھی لیکن وہ نہایت دلیر انسان تھا۔ متعدد معرکوں میں اس نے اپنی فوج کی قیادت خود کی اور تلوار اپنے ہاتھ سے چلا کر دشمن کے ساتھ مقابلہ کیا۔ وہ انسانوں سے زیادہ گھوڑوں سے محبت کرتا تھا لیکن ہزاروں برسوں میں وہ واحد ہندوستانی حکمران تھا جس نے ملک کی شمال مغربی سرحدوں کے پار سے آنے والے حملہ آوروں کی سرکوبی کی۔ اس نے اپنی سلطنت کے استحکام کے لیے سیکڑوں جاگیرداروں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنایا۔ تاریخ میں کوئی ایسا دوسرا بادشاہ مشکل سے ہی ملے گا جس نے خون بہائے بغیر اتنی بڑی سلطنت قائم کی ہو۔ اس نے پنجاب کے مشکل پیدا کرنے والے سکھوں اور مسلمانوں کو قاتل کر کے اپنے ساتھ ملایا بلکہ کشمیر کے پٹھانوں کو اپنی رعایا بنانے میں کامیاب ہوا۔ یوں اس کی سلطنت شمال میں چین اور افغانستان کی سرحدوں تک جبکہ جنوب میں سندھ کے صحرائوں تک پھیل گئی۔

☆☆☆

امر تسر پنجاب کا دوسرا بڑا شہر کا رو باری لحاظ سے لاہور سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ یہ شمالی پنجاب کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا۔ وسطی ایشیا سے تجارتی قافلے یہاں آتے اور اپنی اشیاء کے بدلے ہندوستانی اشیاء لے جاتے تھے۔ اس کی تنگ اور پیچ دار گلیوں میں واقع دکانوں میں ہر شے کا کاروبار ہوتا تھا۔ یہاں پر ریشم، مٹل، مسالا جات، چائے، چڑا، توڑے دار ہندو قیں اور دیگر اعلیٰ جات کے علاوہ سونے اور چاندی کے زیورات بنانے والے بھی بڑی تعداد میں کام کرتے تھے۔ امر تسر امیر شہر ہونے کی وجہ سے جہاں بیرونی حملہ آوروں کی نظر دوں تھا، وہیں سکھوں کے لیے بھی مقدس شہر تھا کیونکہ اس کی بنیاد ان کے چوتھے گرو رام داس نے رکھی تھی اور اسی شہر میں پانچویں گرو ارجن

نے سکھوں کے صحیفے کو ترتیب دیا تھا اور مقدس تالاب کے وسط میں گرو درارہ تعمیر کیا تھا۔ جن سکھوں کے لیے ممکن ہوتا وہ کم از کم سال میں دو مرتبہ اس تالاب میں نہانے، گرو درارے میں چڑھا دے چڑھانے ضرور یہاں آتے تھے۔ سکھوں کے لیے امر تسر دنیا کا سب سے اہم شہر تھا۔ جو شخص سکھوں کا راہنما اور پنجاب کا مہاراجا بننے کا خواہش مند ہوتا، اسے امر تسر پر لازمی قبضہ کرنا پڑتا۔ امر تسر تقریباً ایک درجن خاندانوں میں بٹا ہوا تھا جو اس کے مختلف حصوں پر حکمران تھے۔ ان خاندانوں نے اپنے اپنے علاقوں میں چھوٹے چھوٹے قلعے بنا رکھے تھے اور ان کے مسلح کارندے علاقے کے تاجروں اور دکانداروں سے ٹیکس وصول کیا کرتے تھے۔

مختلف سرداروں کے ٹیکس کلکٹروں میں ہمیشہ ٹیکس اکٹھا کرنے پران بن ہوجاتی اور شہر..... کے گلی کوچوں میں خون ریز لڑائیاں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ شہری اس صورت حال سے اکتائے ہوئے تھے۔ انہوں نے رازداری کے ساتھ رنجیت سنگھ سے رابطہ کر کے اسے شہر پر قبضہ کرنے کی دعوت دی۔ رنجیت سنگھ کے ایجنٹوں نے پہلے ہی اطلاع دے رکھی تھی کہ امر تسر کے سرداروں میں اتحاد نام کی کوئی شے وجود نہیں رکھتی۔ جو واحد خاندان کوئی حقیقت رکھتا تھا، وہ بھنگی سرداری کی وہ اور اس کے بیٹے گرو دیت سنگھ کا تھا۔ بھنگی سردار چار سال پہلے شراب نوشی کی کثرت سے مر گیا تھا۔ اب اس کی بیوہ مائی سکھاں گودند گڑھ کے قلعے پر قابض تھی اور اسے رام گڑھ محل کی حمایت حاصل تھی۔

1802ء کے موسم خزاں میں سکھاں کے کارندوں کی زیادتیوں سے تنگ آ کر شہر کا امیر ترین ساہوکار اردول اپنا کاروبار سمیٹ کر شہر کے دوسرے علاقوں میں چلا گیا اور اس کا اردول کو بے حد صدمہ بھی تھا۔ چنانچہ اس نے بھی رنجیت سنگھ سے درخواست کی کہ وہ شہر کا نظم و نسق سنبھال لے۔

رنجیت سنگھ نے اس سلسلے میں سدا کو اور فاتح سنگھ ابوالہ سے مشورہ کیا جنہوں نے اس کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ اس سے بہترین کوئی دوسرا موقع نہیں مل سکتا چنانچہ ان تینوں کی تحفہ فوج نے امر تسر کا محاصرہ کر لیا۔ سرداروں کو رنجیت سنگھ کی اچانک کارروائی پر بڑی حیرانی ہوئی۔ انہوں نے آپس میں صلاح مشورے کیے.... بالآخر سرداروں نے شہر کی تفصیل پر توپیں نصب کر دیں اور مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بھنگی کی بیوہ نے بھی مزاحمت کرنے کی

تیاری کر لی تھی۔ اسے توقع تھی کہ رام گڑھے اس کی مدد کو آئیں گے مگر وہ بین موضع پر آ کر دغا دے گئے۔ رنجیت سنگھ نے تمام سرداروں کو یکے بعد دیگرے شکست دیتے ہوئے شہر کو بہ آسانی فتح کر لیا۔ باقی سکھانے ہتھیار ڈال دیے۔ رنجیت سنگھ نے اس کی اور اس کے بیٹے کی ایک پنشن مقرر کر دی۔

گوند گڑھ قلعے کی فتح ایک اہم کارنامہ تھا۔ یہاں سے رنجیت سنگھ کو پانچ توپیں مالِ قیمت کے طور پر ملیں۔ ان میں احمد شاہ ابدالی کے تانبے اور تھیل سے ڈھائی مئی بہت بڑی توپ بھی شامل تھی۔ یہ وہی توپ تھی جس نے پانی پت میں مرہٹوں کو نیست و نابود کیا تھا۔ اس توپ کو بعد ازاں پنجگیوں نے افغانوں سے چھین لیا تھا اور اب وہ ان کے قبضے میں تھی۔ اسے ”پنجگیوں کی توپ“ کہا جانے لگا تھا۔

رنجیت سنگھ نے اس توپ کو کئی مہمات میں استعمال کیا اور اس کی موت کے بعد انگریزوں اور سکھوں کی جنگ میں اسے استعمال کیا گیا۔ بعد ازاں اسے متروک قرار دے کر لاہور کی ایک مرکزی سڑک پر نصب کر دیا گیا۔

امرتسر کے شہریوں نے رنجیت سنگھ کا گر بجوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ وہ امرتسر فتح کرنے کے بعد ہاتھی پر سوار ہو کر شہر کی تنگ گلیوں سے گزرتا ہوا گروہ دار سے پہنچا۔ وہاں اس نے مقدس تالاب میں غسل کیا۔ اس نے سبک مرمر اور سونے کے پتروں سے گروہ دار سے کی تعمیر نو کے لیے خطیر رقم دی۔ امرتسر فتح کرنے سے رنجیت سنگھ کی شان و شوکت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا اور جملہ جتنے برطانوی کمپنی کے زیرِ نگیں تھے، وہاں کے لوگ بھی جوق در جوق اس کی سلطنت میں آنے لگے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کے سپاہی خصوصاً ہندوستانی اور کچھ یوریشیائی رنجیت سنگھ کی فوج میں شامل ہونے کے لیے آنے لگے۔ مہاراجا پہلے ہی انگریزی فوج کی کارکردگی سے متاثر تھا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ انگریزی فوج نے اپنے محدود وسائل میں کن حربوں سے ہندوستانی نوایوں کی فوج پر برتری حاصل کی اور انہیں شکست سے دوچار کیا۔ انگریزوں کی فوج چھوڑ کر آنے والی ایک پائون نے اس کے سامنے پریڈ کی اور اس نے پہلی مرتبہ فوجیوں کو سادہ سے اٹکا بائی الفاظ پر جتنی اقدام کرتے دیکھا تو راجا رنجیت سنگھ نے انہیں ”ڈرل سارجنٹ“ کی نوکریوں پر اپنی فوج میں بھرتی کر لیا۔ اس نے اپنے نوجوان فوجیوں کو سرحد پار ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں بھرتی ہو کر انگریزوں سے

ترتیب لینے کے لیے پہلی بار بھجوا یا۔

سکھ فوجی ہندوستانی سپاہیوں سے تربیت لینے کو اپنی توہین جانتے تھے۔ وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر لانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ پیدل لانے والے دراصل امتیاز کا ناچ کرتے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ ایک سکھ ”سوالکھ“ اور پوری پوری فوج پر بھاری ہے۔ اگر کوئی انہیں ہندوستانی سپاہ سے تربیت لینے کا مشورہ دیتا تو وہ آگے سے طنز کرتے کہ ہندوستانی حقیر اور بیچارے ”خالصہ“ کو کیا سکھا سکتے ہیں۔ رنجیت سنگھ کے یہ بات پسند نہیں تھی کیونکہ اس کے من میں سکھوں کو بہترین سپاہ بنانے کا خطہ سایا ہوا تھا۔ لہذا اس نے ایک ترکیب اختیار کی۔ اس نے اپنی فوج میں یہ اعلان کر دیا کہ جو سکھ ہندوستانی اور یوریشیائی فوجوں میں موجود استادوں سے تربیت لینے پر رضامند ہوگا، ان پنجابی نوجوانوں کو دوسروں سے بہتر معاوضے اور مراعات دی جائیں گی۔

اس کے اس اعلان پر بہت سے فوجیوں نے ان اساتذہ سے تربیت لینے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اس طرح سکھوں کی ایک نئی انٹرفری بنائیں تربیت پائی جس کی وہ ہر روز صبح و شام پریڈ دیکھتا اور ان فوجیوں کے ساتھ استادوں کو بھی پر کشش انعامات سے نوازتا تھا۔ اس طرح دو ماہ کی بھرپور تربیت کے بعد رنجیت سنگھ کی ایک نئی فوج تشکیل پائی جس نے پریڈوں اور 1803ء کے موسمِ خزاں میں دسمبر کی تقریبات کے دوران جتنی مشقوں میں نمایاں حصہ لیا۔ اسی سال اس نے ملتان اور جھنگ کو دوبارہ اپنی سلطنت کا حصہ بنانے کے لیے ان پر چڑھائی کا سوچا۔ سارے سرداروں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر اس نے اپنا فیصلہ نہ بدلا۔ احمد خاں سیال نے اپنے ارد گرد کے لوگوں کو اکٹھا کر کے میدانِ جنگ میں اترنے کا فیصلہ کیا۔ رنجیت سنگھ کی فوج نے جوانی جملے میں ان کے دانت کھٹے کر دیے۔ اس کے ہاتھیوں نے قلعے کے دروازے توڑ ڈالے تو احمد خاں سیال موضع پاکر ملتان فرار ہو گیا۔ رنجیت سنگھ کا اٹکا نشانہ ملتان تھا۔ نواب مظفر خاں نے اپنے ارد گرد کے بہادر اور خوفناک قبائل کو اپنے ساتھ بلا لیا۔ اس نے مسلم کاشتکاروں کو اپنی مدد کے لیے بلا لیا مگر رنجیت سنگھ کی تربیت یافتہ فوج کے سامنے ان کے پاؤں نہ جم سکے اور انہیں بری طرح شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ رنجیت سنگھ کے لیے یہ دونوں ہمیں بہت مختصر اور حوصلہ افزا تھیں۔ برطانوی تربیت اور جنگ کے طریقے اپنانے کا فیصلہ اس کے لیے بہت سودمند رہا تھا۔

تربت

ٹالکم پاؤڈر



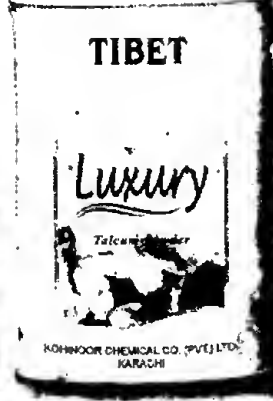
اب 3 نئی خوشبوؤں میں دستیاب



کلاسیک



سلیکٹ



لکڑی

ٹالکم پاؤڈر - صبح سے شام جھپکے مہربان

اس لیے اس نے اپنی فوج کی تحفیم و تربیت پر زور دینے کا فیصلہ کیا۔

رجنیت سنگھ نے امرتسر میں ہونے والی اس تحفیم فوج کے بعد اپنی فوج کو ہر حوالے سے بہتر بنانے کی طرف توجہ مرکوز کر دی۔ اسے کوئی جوان تربیت میں کمزور دکھائی دیتا یا اس کی یونیفارم درست نہ ہوتی تو وہ ڈسے دار افسروں کو سزا دیتا۔ وہ ایسے افسروں کی تنزیل کر دیتا اور ان پر بھاری جرمانے لگا تا لیکن وہ عام طور پر اپنے جوانوں کی حوصلہ افزائی کرتا اور انہیں ڈرانے کے بجائے انعامات سے نوازا تھا۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ میدان جنگ میں جاتا اور اپنے جوانوں کی بہادری کا خوب مشاہدہ کرتا تھا۔

اور اسی امرتسر کی سرزمین سے موران کا بھی تعلق تھا۔

☆☆☆

موران امرتسر کے مردم شناس شہر جہاں زندگی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ شوخیوں کرتے گزر رہی تھی، اسی کے بازار حسن کی ایک گلی تھی جو اپنی خوب صورتی، حسن اور جوانی میں بے نظیر ہونے کے ساتھ حاضر جوانی اور شوخیوں کی وجہ سے بھی مشہور تھی جب سے تہذیب و ثقافت نے اپنی کروٹ بدل لی تھی، تاریخ کے ساتھ ساتھ الفاظ نے بھی اپنے چولے بدلنے شروع کر دیے تھے۔ اب جداوب، جان کی امان پاؤں، ٹل، الٹی، جل جلالہ، عالم پناہ، جنت مکانی جیسے الفاظ دم توڑ چکے تھے اور ان کی جگہ ہزار کیسی لیسٹی، عزت مآب، عز و لا شان جیسے الفاظ نے جگہ لیٹی شروع کر دی تھی۔ طوائف جو بھی تربیت و تہذیب سمجھنے میں یکتا اور باہر سمجھی جاتی تھیں، اب کساد بازاری کا شکار ہو کر وہ گلی تھیں۔ ناچنے گانے والیوں کی شہرت کے چاند کو گرہن لگ چکے تھے۔ درباروں اور گلوں کی راہداریاں ادا سبیل کی نذر ہو چکی تھیں۔ شہنشاہیت کا جبروت دم توڑ چکا تھا۔ تہذیب و ثقافت نے بھی کروٹ بدل لی تھی۔ وہ گلیاں جو درباروں میں قدم دھرتی ہی رانیوں اور مہارانیوں کے عہدوں پر پہنچ چکی تھیں، اپنی حرمی طبیعت پر ماتم کر رہی تھیں۔ جوان عہدوں تک نہیں پہنچ پائی تھیں، دوبارہ سے اپنی گولیاں اور حویلیاں آباد کرنے لگی تھیں یا پھر سرداروں اور سرمایہ داروں کی چادر دیوار یوں میں فٹنشن کرنے لگی تھیں۔ ایسی گلیاں جو بھی دوبارہ سرکاری تک چڑھیاں تھیں، اب وقت کی گرد سے اپنا ماضی ڈھونڈنے پر مجبور ہو چکی تھیں۔ اب اگر کسی چھوٹی موٹی ریاست کا سردار بھی انہیں بلالیتا تو وہ اسے اپنا اعزاز جانتی تھیں۔ امرتسر کا مردم

خیز شہر جو کبھی شہر گراں بھی سمجھا جاتا تھا، اب بے بسی کی تصویر بن کر رہ گیا تھا۔ فارسی زبان کی مانگ اب گلی تھی۔ اب اس کی جگہ گلی جلی شکل میں زبان نے جنم لینا شروع کر دیا تھا جس میں کہیں کہیں فارسی زبان کے الفاظ بھی اپنی جھلک دکھانے لگے تھے۔

بازار حسن میں لگنے والے اور بچنے والے درباروں کا حسن بھی ماند پڑ چکا تھا۔ چلیے اور ساری نواز بھوک سے تنگ آ کر دوسرے کام ڈھونڈنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ایسے میں اگر کوئی حویلی آباد رہے تو وہ بڑی قیمت پر بھی جاتی تھی۔

موران جوان اور خوب صورت تھی۔ اوپر سے جب وہ چلتی تھی تو یوں لگتا جیسے مورلی چل رہی ہو۔ اس کے گلے میں سرسبکیت تو خدا نے کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جب وہ ناچتی تو لگتا جیسے جنگل میں کوئی مور اپنی مستی میں ناچ رہا ہو۔ چھنی فارسی زبان سے لیا ہوا لفظ جس کا مطلب تھا۔

سو نے میں ڈھلی ہوئی پوری طرح کھلی ہوئی۔ کسی گلاب کے مانند۔ یہ سچ ہے کہ موران پر یہ لفظ پوری طرح راج رہا تھا اس کی سماجی دوسری گلیاں اس سے اس بات پر حسد کرتی تھیں۔ ایک روز جب وہ سب اکٹھی بیٹھی تھیں اور خانم ان سے دور پاندان میں سے پورے پان کی کتر میں لگا کر انہیں تیر کر کے اس میں پڑے نمندے کے تلے رکھ رہی تھی، نہ جانے اسے کیا سوچی۔ اس نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”بھیلے دن ہوتے تھے وہ بھی جب مظلوم کے دوبارہ بچتے تھے۔ بھانت بھانت کے لوگوں کی روٹی روزگار ان سے وابستہ تھا۔ ہم جیسے معاشرے کے دھکارے لوگوں کی بیٹیاں شہنشاہوں کے من کو بھاجا جاتیں تو وہ گلوں میں جا کر راج کرنے لگتیں اور پشت پابست پورے خاندان کے پیش ہو جاتے مگر جب یہ یہ موئے انگریزوں نے حکومتوں پر قبضہ کیا ہے، ہماری خوشحالی تو ہم ہی توڑ گئی۔ گلوں میں اجاز پیدا ہو گئی۔ اب تو وہ پیش کش کرتی ہیں جو اپنے جسموں کی سرعام نمائش کرتی اور پہنچتی ہیں۔ اللہ زندگی دے میری موران کو۔ بچتے چاند ایسا حسن ہے اور اوپر سے نازخڑے ایسے کہ پرانا دور ہوتا تو اس کے قدموں سے کئی لاشے اٹھانے پڑتے۔“

انہی وہ بات کر رہی تھی کہ موران بڑے انداز سے سچ بچ کر قدم رکھتے اندر آئی اور ٹھٹھکی ہوئی آواز میں بولی۔

”کس کی بات ہو رہی ہے۔“

”لوہ بھی آگئی۔“ ان میں سے ایک بولی۔

”بیٹہ جاؤ اور سن لو روز روز کی رانچی۔ جب بھی ذرا

موران

فرمت ملتی ہے دم لینے کو اور اکٹھے بیٹھنے کا موقع مل جائے تو خانم کی زبان پر تمہارے سوا اور کسی کی تعریف ہی نہیں ہوتی۔ مجال ہے کسی اور کے لیے کوئی لفظ ان کی زبان سے اترے۔“ دوسری نے تنگ کر جواب دیا۔

”اور کیا۔۔۔۔۔ اللہ نے اسے حسن اور دوسری خوبیاں بھی تو اتنی دے رکھی ہیں۔ تمہیں بھلا پائیوں ہو رہا ہے۔“ کسی اور نے پہلی کی بات کاٹتے ہوئے اس پر چوٹ کی۔

”اری کم بختو ابو بی بی باتوں کے کنگوے (چنگے) اڑاتی رہو گی یا کام کے بارے میں بھی کچھ سوچو گی۔ یہ وہ حویلی ہے جہاں بھی تماش بینوں میں خوشبودار تواموں سے بچے پان بانٹے جاتے تھے۔ پھر یہ گزروں میں باغنا شروع ہوئے اور اب ان گزروں کو بھی وقت نے کتروں میں تبدیل کر دیا ہے۔ سوچو جب یہ بھی نہ رہے تو کیا ہوگا؟“

”خانم! اب ہم اپنے جسموں کے ماس تو چوٹکوں اور کھڑکیوں میں لٹکانے سے رہے۔ یہ تمہاری جیتی جیتی موران بھی تو ہے۔ سارے بازار میں اس کی خوب صورتی کی دھوم مچتی ہے۔ ناچتی ہے تو بقول لوگوں کے لگتا ہے کہ مورنا چٹا ہے۔ اس کو بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ ہم تو پھر اس سے ہر لحاظ میں کتر ہیں۔“ وہ بھی شاید کتنے دنوں سے ہماری بیٹی تھیں۔

ایک بار ہی پھٹ پڑیں۔

ابھی ان کی گفتگو جاری تھی کہ دروازے پر دنگ ہوئی۔

”بیاری جان! ذرا اٹھ کر دیکھنا کون آیا ہے۔ یہ موئے ملازم بھی بھوک کر کچھ کر ہوئے ہوئے کھٹکے لگے ہیں۔“

سچ کہا ہے۔ دھن کا اونچا نام! خانم نے اٹکائے ہوئے لہجے میں کہا۔

بیاری جان بھی کسماتے ہوئے انہی اور ڈھیلے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی۔ چھنی اتار کے ابھی اس نے دروازے کا چٹ کھولا ہی تھا کہ وہ دم سے اندر آ گیا۔ بیاری جان کی پانہیں دروازے پر اٹکی رہ گئیں اور اس کی آنکھیں جیرانی سے آنے والے کو تک رہی تھیں۔

اس کے سر پر بگڑی بندھی تھی۔ کربند کے ساتھ ایک طرف طعنے اڑا رہا ہوا تھا۔ دوسری طرف اپنے منہ میں تلوار لٹکی ہوئی تھی۔ قیاس کے اوپر سپاہیوں کے مخصوص نشان اور سچ لگے تھے۔ فوجی یونوں کو اس نے اتارنا بھی پسند نہیں کیا تھا۔ یونہی دندا تاوا وہ خانم کے قریب آ کر اوجھنی آواز میں بولا۔

”موران کون ہے؟“

”کھٹکی پر لٹکانے کے آرزو آئے ہیں اس کے؟“

موران نے ہنستے ہوئے اسی انداز میں جواب دیا۔ باقی

سب ان کی طرف جیرانی سے دیکھ رہی تھیں۔

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔ میں نے موران کا پوچھا ہے۔“ وہ اسی لہجے میں دوبارہ دہاڑا۔

”میں ہوں موران۔“ موران نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”میں دوبارے آیا ہوں۔ مہاراجا رجنیت سنگھ کے دوبارے۔“

”خیریت ہے، کوئی بھول ہوگئی، اس کرموں ماری سے۔ یقین جانو دروغ نہ تھی۔ سیاست سے ہمارا کوئی لین دین نہیں ہے۔“ ایک گھٹانے مسکین سامنے بناتے ہوئے کہا۔

”بات تو پوری ہونے دو۔“ سپاہی نے رعب سے کہا تو وہ ایک بار پھر ہم گئی۔

”برا کا ہے کو مانتے ہو دروغ نہ تھی۔ طوائفوں کے پاس دو ہی تو ہنر ہوتے ہیں۔ ایک چٹون کاری اور دوسرا حاضر جوابی۔“ موران نے پھر شوخی سے جواب دیا۔

”مہاراجا رجنیت سنگھ نے موران کو اپنے دربار میں بلا بھیجا ہے۔“ سپاہی نے بتایا۔

”زے نصیب۔ خوش آئید یہ کسی نے سچ کہا ہے۔ خوشبو جب بھٹکتی ہے تو ہر جگہ اپنا جادو پھیلا دیتی ہے۔ بڑی خوش بخت ہے میری بیٹی۔ موران! اچھے مبارک ہو۔“ خانم نے سب چھوڑ چھاڑ کر موران کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

تھوڑے وقف کے بعد وہ پھر گویا ہوئی۔

”کب حاضری ہوگی میری بیٹی کی۔ لاہور کے دوبارہ میں ہی بلایا ہے یا امرتسر میں کہیں حاضری ہوگی؟“ خانم نے اسی چاہو سامنے لہجے میں دریافت کیا۔

”لاہور جانا ہوگا۔ آپ تیاری رکھیں۔ جب بھی حکم ہو اسرکاری پیادے آکے اسے لے جائیں گے۔“ سپاہی نے دوبارہ جواب دیا اور پھر واپسی کے لیے مڑا۔

”اے دروغ نہ تھی۔ کچھ کھائی تو لیتے۔ اگر جواب ہم گزریوں کے پاس آپ کے شایان شان تو کچھ نہیں مگر پھر بھی۔۔۔۔۔ تھوڑا ٹھہرو۔“ خانم اسی انداز میں بولی۔

”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ آپ بس اسے تیار رکھیں۔ ہو سکتا ہے کل ہی اسے جانا پڑ جائے۔“ سپاہی نے پھر سے بتایا اور واپس چلا گیا۔

☆☆☆

موسم خزاں اور 1796ء کا سال تھا۔ جب شاہ زمان اپنے ملک سے فرار ہوا اور اس نے پنجاب کا رخ کیا۔ یہ اس کا پنجاب پر تیسرا حملہ تھا۔ اگرچہ وہ اپنے پہلے دو حملوں میں

بری طرح سے ناکام ہوا تھا۔ تاہم اس بار افغانوں نے گرم تھیں کہ وہ آج بڑی فوج کے ساتھ حملہ آور ہو رہے ہیں کہ ہندوستان کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس نے اپنی بیس ہزار مسلح افغانوں پر مشتمل فوج کے گردنی کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے دریائے سندھ کو پار کیا۔ اس نے اپنی کثیر فوج کے علاوہ ہندوستان میں تصور کے نظام الدین کو اپنی مدد کرنے کے انعام میں لاہور کی صوبیداری دینے کا وعدہ کیا۔ منج کے بار پٹالہ کا صاحب سنگھ تھا جو ہر قلعہ کی اطاعت کرنے کی اپنی خاندانی روایت پر پوری طرح سے کاربند تھا۔ پنجاب کی دوسری طرف روہیلہ افغان تھے۔ اووہ کا وزیر اور جنوب میں میسور کا ٹیپ سلطان تھا۔ ان سب نے اصرار کر کے افغانوں کو ہندوستان بلایا تھا۔

شاہ زمان کے ہندوستان پر حملہ کرنے کی خبر جوبھی پھیلی، لوگ جانیں بچانے کے لیے پہاڑوں کی طرف بھاگنے لگے۔ منسل دار جو لوگوں کو تحفظ دینے کے وعدے پر حاضری نہیں وصول کیا کرتے تھے اور ٹیکس، مالیہ وصول کرتے وقت لوگوں سے انتہائی ظالمانہ سلوک کرتے تھے، وہ بھاگنے والوں میں سب سے آگے تھے۔ دمبر تک افغانوں نے پنجاب میں جہلم تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ لاہور تک اب افغانوں کا راستہ روکنے والے دوسرا حصہ تھا۔ ایک گجرات کا صاحب سنگھ اور دوسرا لاہور کا رنجیت سنگھ۔ صاحب سنگھ نے پہلے پہل افغانوں کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن بعد میں حوصلہ کھو بیٹھا اور مشرق کی طرف فرار ہو گیا۔

افغانوں کی توپوں اور ہندوؤں سے مسلح افواج کے مقابلے میں رنجیت سنگھ صرف پانچ ہزار گھڑسوار اکٹھے کر سکا جن کے پاس تفنگیں (لوہے کی بیس نالیاں جن میں آگے تیر رکھ کر انہیں دشمن پر سانس کے زور پر پھینکا جاتا تھا) اور نیزے تھے۔ افغانوں کو روکنے کے لیے ضروری تھا کہ سنگھ متحہ ہو جائیں اور ان کو جمع کرنے کا واحد مرکز امرتسر تھا۔ رنجیت سنگھ اپنی فوج اور خاندان کو لے کر اس مقدس شہر کی طرف چل پڑا۔ سربت خالصہ کے بلاوے پر بہت سے سنگھ سرداروں نے لیکھ کہا اور امرتسر آگئے۔ ان کا اکثریتی فیصلہ تھا کہ وہ میدان چھوڑ کر پہاڑوں میں چھپ جائیں۔ جب افغان ان خالی شہروں کو لوٹ لیں گے، تب وہ چھپ کر ان پر حملے کریں گے۔

لیکن رنجیت سنگھ کی ساس سدا کو رنے رنجیت سنگھ کو مشورہ دیا۔

”تم کو کتنا ہندو ذات سے تعلق رکھتے ہو جو دشمن پر پیچھے سے چھپ کر وار کر دو گے۔ سنگھ ہو کر کچھ قوم کی تھیک نہ کر آؤ اور دشمن کی چھائی پر دادر کرو۔ سامنے سے۔ پہاڑوں میں بڑل چھپا کرتے ہیں۔“

”آپ کی بات میرے من کو لگی ہے۔ ہمیں یقیناً افغانوں کے سامنے رہ کر وار کرنا چاہیے۔ پہاڑوں میں نہیں جانا چاہیے۔“ رنجیت سنگھ نے سدا کو رنی یہ تجویز اپنی سپاہ اور سرداروں کے سامنے رکھی تو سب نے اس بات کی پرزور تائید کی۔ وہ سارے اس کی قیادت میں اکٹھے ہونے پر تیار ہو گئے۔ رنجیت سنگھ نے اپنے ساتھیوں سمیت لاہور کا رخ کیا۔ انہوں نے افغان فوج سے جھڑپ کے دوران اسے لاہور کے قریب وجوار سے نکال کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ہر رات وہ اور اس کے جوان شہر کے کسی نہ کسی حصے پر شرب خون مارتے اور چند افغانوں کو ہلاک کر کے اندھیرے میں غائب ہو جاتے۔

جنوری 1797ء میں شاہ زمان کو اطلاع ملی کہ اس کا بھائی افغانستان میں بغاوت پھا کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس نے جہل شاپاچی خاں کی قیادت میں بارہ ہزار فوجوں کو لاہور میں پیچوڑا اور خود بانی فوج کو لے کر کابل روانہ ہو گیا۔ واپس جاتی فوج پر سنگھوں نے جہلم تک کے سارے راستے حملے کیے اور ان سے بہت سا جنگی سامان اور دوسرا لوٹ مار کا سامان چھین لیا۔ جب اس بات کا علم شاپاچی خاں کو ہوا تو اس نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا اور لوٹ مار کر کے آنے والے سنگھوں کو رام گڑھ کے قریب گھیر لیا مگر سنگھوں نے اس کی ساری توقعات کو بر باد کر کے رکھ دیا اور اس کی فوج کو بری طرح شکست کا سامنا کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس موسم سرما میں رنجیت سنگھ شاپاچی کو شکست دے کر پنجاب کا بھرپور بن گیا۔

ادھر شاہ زمان کو اپنی شکست اور شاپاچی کا اس طرح میدان جنگ میں پارنا اپنی تذلزل لگا اور اسے یہ تذلیل بڑی دیر تک ڈیک مارلی رہی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح اپنے گھر کے مسئلہ کو سلجھایا اور ایک بار پھر ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی سوچنے لگا۔ جب ہندوستان کے لوگوں کو اس کے ارادوں کی خبر ہوئی تو وہ ایک بار پھر اپنے گھر بار چھوڑ کر پہاڑوں میں پناہ گزین ہو گئے۔ اکتوبر آتے آتے پنجاب کے سارے بڑے شہر دیران ہو گئے۔ شاہ زمان نے بھی سنگھوں سے خوفناک انتقام لینے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ملک کے لوگوں کو کوچ میں شامل ہونے کی ترغیب

موراں

دینے کا اعلان کیا کہ اس کے ساتھ ہر شخص کو ہندوستان میں لوٹ مار کی آزادی ہوگی۔

پنجاب میں ایک بار پھر افغانی پھیل گئی، یہاں جنگ کے امرتسر میں واقع مقدس عبادت گاہ کی حفاظت کے لیے مٹھی بھر محافظ رہ گئے۔ دہلی میں مغل دربار میں متحین اگر ریڈنڈنٹ کوڑکا کہتا ہے کہ سنگھوں نے بدترین بزدلی کا مظاہرہ کیا۔

صاحب سنگھ بھتیجی شجرات چھوڑ کر بھاگ گیا۔ افغانوں نے شہر کو لوٹ لیا اور شہریوں کو یہ تیغ کر ڈالا۔ ہندو اور سنگھ تو پہلے ہی فرار ہو چکے تھے۔ افغانوں کی لوٹ مار کا شکار ہونے والے پنجابی مسلمان تھے۔ رنجیت سنگھ خود کو جرنوالہ فرار ہو گیا۔ افغانوں نے جو جرنوالہ میں بھی خوب لوٹ مار کی اور شہریوں کا قتل عام کیا۔

امرتسر میں منتقل ہونے والے سربت خالصہ کے شرکاء کی اکثریت نے پہاڑوں میں پناہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اس بار کی سدا کو رنے انہیں احساس دلایا کہ وہ جن لوگوں سے جھڑپیں نہیں وصول کرتے ہیں، ان کو تحفظ فراہم کرنا بھی ان کی ذمہ داری ہے۔ اس نے کہا کہ اگر پھر بھی انہوں نے پہاڑوں میں جانے کا فیصلہ کیا تو وہ اپنے ساتھیوں سمیت نہیں مرے جیے گی۔ اس نے ایک بار پھر رنجیت سنگھ کو نہ صرف حوصلہ دیا بلکہ اسے مکمل طور پر یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ امرتسر ایک مقدس اور پوتر شہر ہے۔ اس نے رنجیت سنگھ کو ہلا کر کہا کہ وہ ایک سنگھ ہونے کی حیثیت سے یہ گنوارا کرے گا، کوئی اس کے مقدس شہر کو یوں اجازت پھرے۔

”نہیں۔ کبھی نہیں۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا۔“ رنجیت سنگھ نے جواب دیا۔

”جو لوگ یہاں سے بھاگ رہے ہیں، وہ نہ صرف بڑل ہیں بلکہ سنگھوں کے نام اور عزت پر ایک دھبا ہیں۔“ رنجیت سنگھ نے دہلی ہوئی ہے۔ ہم ایک بار پھر شاہ زمان سے کھڑے ہو کر کوشش تو کریں۔“ سدا کو رنے رنجیت سنگھ کو دوبارہ سمجھایا۔

رنجیت سنگھ نے اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کر کے ان کے سامنے یہی بات دہرائی۔ رنجیت سنگھ کے ماموں ول سنگھ نے حاضرین کو بتایا کہ افغان اتنے دلیر نہیں ہیں جتنا انہیں سمجھا جا رہا ہے اور سنگھوں کے لیے انہیں مار بھگانا مشکل نہیں ہے۔ اس نے خود اکیلے ہی شاہ زمان کے لیے پھلے جانے والے ایک کارواں کو لوٹا ہے اور اس میں کامیاب رہا ہے۔

دل سنگھ کی باتیں سن کر تمام سرداروں نے ایک بار پھر رنجیت سنگھ کو اپنا سالار منتخب کر لیا۔

افغانوں نے اپنی کارروائی کا آغاز پھر پہلے کی طرح کیا۔ اگرچہ شاہ زمان کا ٹارگٹ سنگھ تھے اور اس نے سنگھوں کو نیست و نابود کرنے کا اعلان بھی کر دیا تھا اور مسلمانوں کو اس بات کا یقین تھا کہ چونکہ افغان ان کے ہم مذہب ہیں، اس لیے وہ افغان فوجیوں کے ہاتھوں لٹنے سے محفوظ رہیں گے مگر افغان فوج نے اپنی ضرورت کی ہر چیز مسلمان کاٹھکاردوں سے چھین لی۔

27 نومبر 1798ء کو شاہ زمان لاہور میں داخل ہو گیا۔ اس مرتبہ اس نے اپنی فوج کو شہر میں داخلے کی اجازت نہیں دی۔ اس نے سخت احتیاطات جاری کر دیے کہ لاہور میں لوٹ مار بالکل نہیں کی جائے۔ جنگ صرف سنگھوں کے خلاف تھی۔ اگر سنگھوں کو پنجابی مسلمانوں اور ہندوؤں سے الگ کر دیا جاتا تو آدمی جنگ دینے ہی جیتی جاسکتی تھی۔ اس کے علاوہ سنگھوں کو مانجھے والوں (منج اور رادی کے درمیان رہنے والوں) اور مالوے والوں (منج کے مشرق میں رہنے والوں) میں تقسیم کر دیا جاتا تو پنجاب کو ایک گوئی بھی چلائے بغیر فتح کیا جاسکتا تھا۔ شاہ زمان کا یہ منصوبہ بظاہر بہت زبردست لگتا تھا۔ اگر گرد کے سردار اپنی اپنی سرداریاں بچانے کی خاطر شاہ زمان کی حمایت کر رہے تھے۔ تصور کے نظام الدین کی یہ خواہش بھی کہ پنجاب کا قبضہ شاہ زمان کے ہاتھوں میں چلا جائے تاکہ اسے لاہور کی صوبیداری مل جائے۔ کانگڑہ کا سنسار چندا اپنے آپ کو ہندوؤں کا ترجمان بتاتا تھا جبکہ صاحب سنگھ اپنی روایت نبھاتے ہوئے زبان خاں کا ساتھی اور خود کو مالوے کے سنگھوں کا نمائندہ ظاہر کرتا تھا۔ ایسے میں صرف رنجیت سنگھ تھا جو کانے کی طرح زبان زمان خاں کو پیچھا رہا تھا۔

شاہ زمان نے افغانوں کا ایک لشکر امرتسر کی طرف بھیجا۔ رنجیت سنگھ نے شہر سے پانچ میل باہر آ کر افغانوں کا راستہ روک لیا۔ تین گھنٹوں کی لڑائی کے بعد افغان لاہور کی طرف بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ رنجیت سنگھ نے ان کا پیچھا کرتے ہوئے لاہور کا محاصرہ کر لیا اور افغانوں کی رسد کے تمام راستے بند کر دیے۔ اس نے لوائی علاقے کی کھڑی فصلوں کو جلوا دیا تاکہ افغانی افواج ان میں نہ چھپ سکیں۔ اس وجہ سے افغان دفاعی جنگ لڑنے پر مجبور ہو گئے۔ دن گزرتے جا رہے تھے۔ کوئی دن ایسا نظر نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی کوئی ایسا امکان دکھائی دیتا تھا کہ افغان سنگھوں کا

بن جائے گی۔ کچھ اور مانگا ہوتا۔“ دوسری نے اسے چھیڑا۔
 ”تو ایسے کرنا وہاں کسی صوبیدار سے، کسی سردار سے
 میرا بھی حکم لگا دینا۔ بس تم میرا تحارف کروا دینا۔“
 ”اسے پچاس میں خود لوں گی۔“ پہلی نے قہقہہ
 مارتے ہوئے کہا۔
 ”نہ مشتری لی لی۔ قاضی کا پیادہ میں تو نہیں بن سکتی۔
 خود ہی کوشش کر کے کسی سرکاری درباری کو بھانسن لو۔“
 موراں نے پہلی بار اس کو نام سے پکارتے ہوئے کہا۔
 ”اوہو۔ نہ اپنے ایسے نصیب ہوں اور نہ میں کسی
 دربار یا سرکار سے سندیں آ کے مشتری مرنے جوگی۔۔۔ تو
 بھی کسی کانے، خاک مرل چوہے کو پسند آگئی ہے۔“
 مشتری نے جلاپے سے جواب دیا۔
 ”میں تو پہلے ہی کتنی تھی کہ جب سے میری بچی کا
 دربار میں جانے کا سنا ہے، سب جمل کر خاک ہوئی جاتی
 ہیں۔ کیوں ری بدبختو۔ کیوں گھبر رکھا ہے موراں کو!“
 خانم نے ان کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔
 ”توبہ ہے۔ یہ کون سا اپنی چال بھول گئی ہے۔
 باتیں ہی جیہا نا۔ ہم نہ کریں گے، دوسرے کریں گے اور
 اب تو پورے امرتسر میں پھیل چکا ہے کہ موراں رنجیت سنگھ
 کے دربار میں بجا کر آئے جارہی ہے۔“ مشتری نے چڑتے
 ہوئے جواب دیا۔
 ”چلو پترو۔۔۔ اپنے اپنے کرد میں اور بیجا جان تم
 میری ذرا۔۔۔ بات سنو۔“ خانم نے سب کو جاننے کے لیے
 کہا تو وہ سب آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنے اپنے کمرے
 میں چلی گئیں۔
 ”بیجا جان! تمہیں یاد ہے۔ آج کتنی تارخ ہوگئی ہے
 اور تم نے ابھی تک کمرے کا کمرہ نہیں دیا۔“
 ”خانم آپ کو پتا ہے۔ کتنے دنوں سے میں بنگار میں
 تھی۔ میرے کمرے میں تو جگہ بھی نہیں ہو سکا۔“
 ”یووا! تمہیں پتا ہے۔ حالات کس طرح کے جارہے
 ہیں۔ پیٹ کاٹ کاٹ کر گزارہ کر رہی ہوں۔ اگر ساری
 نو چیاں یونہی ہاتھ دھر کر بیٹھ رہیں تو خرچہ کہاں سے نکلے گا۔“
 ”خانم! جلد ہی حساب چمکا کر دوں گی۔ ذرا دم لے
 لو۔“ بیجا جان بولی۔
 ”نکر ہو رہی تھی، اس لیے تمہیں کہا۔ سب کے
 سامنے جہیں پتا ہے مجھے بات کہنے کی عادت نہیں ہے۔ سبکی
 ہوتی ہے اس لیے اکیلے میں کہا ہے۔ دوبارہ سے کہنے کی
 ضرورت نہ رہے۔“ خانم نے متنبہ کرتے ہوئے کہا۔

”مہاراجا ہے پورے پنجاب کا۔ مہاراجا تو کاکھ کا
 اوبھی ہو تو مہاراجا ہی کہلاتا ہے۔“ سچ کہا ہے کسی نے سارا
 ”سن دولت میں چھپا ہوا ہے۔“ ماس میں نہیں۔“
 ”سچی بات ہے۔ اب مہاراجا دیکھو اور اس کی پسند
 رکھو!“ انہی وہ باتیں کر رہی تھیں کہ اندر سے موراں نکل
 آئی۔ اسے دیکھتے ہی پہلی نے دوسری کو کندھامارا۔
 ”موراں آگئی ہے“ تقریباً پہلی کو کھینچتے ہوئے کہا۔
 ”کچھ کچھ ہوا؟ مجھے کونسا کسی سے خوف آتا ہے۔ بات
 چمکی ہے!“ دوسری نے جواب دیا۔
 ”کیا سچ ہے؟“ موراں نے ان کے قریب آتے
 ہوئے پوچھا ماس کی بات سن کر تے ہوئے وہی بولی۔
 ”اے موراں! کب اتر رہی ہے دربار میں؟“
 ”ابھی تو صرف سندیں آئی ہیں۔ اللہ جانے کب کھار
 ڈولی لینے آئیں گے۔“ موراں نے شوشی سے جواب دیا۔
 ”اسے سنیں تو کہتی ہوں، خوب بن سونو لجنے دن
 ہیں۔ اجن، مکی، پوڑہ لالی لگلو۔“ اس نے ہستے ہوئے
 مشورہ دیا۔
 ”بے سنو رہے تو وہ جو پہلے سے خوب صورت نہ
 ہو۔ اللہ کا شکر ہے اس نے سارے سن کے خزانے موراں
 کی جھولی میں ڈال دیے۔“ موراں نے اسی انداز میں
 جواب دیا۔
 ”میں تو کہتی ہوں، جاتے ہوئے بنے سنو نہ کا سارا
 سامان ایک کھڑی میں باندھ کر ساتھ لے جانا اور اپنے ہونے
 والے عاشق پر اچھی طرح کا لیا تا کہ اس کے چہرے کے داغ
 چھپ جائیں۔“ اس نے ہنس کر چوٹ کی۔
 ”مگر کافی آکھ کا کیا ہوگا؟“ دوسری نے اپنا حصہ ڈالا۔
 ”مہاراجا ہے۔ سب عیب قبول ہیں۔“ موراں نے
 کچھ اس انداز سے جواب دیا کہ وہ شرمندہ سی ہو کر رہ گئیں۔
 ”ہاں بابا۔ بھوکے پیٹے تو پتھر کو چاٹ کر بھی دلا سائل
 جاتا ہے۔“ اس نے بات بڑھائی۔
 ”کیوں چلتی ہو۔ اگر میں وہاں ان کے دل میں گھر بنا پائی
 تو تمہیں بھی وہاں بلاؤں گی۔ دیکھ لیا۔ موراں کیسے رہتی ہے
 ملکوں میں۔“ موراں نے ان کے حسد کو آگ دکھائی۔
 ”اے موراں! مجھے تو ضرور بلانا۔ سنا ہے وہاں
 ولا جی شراب بھی ملتی ہے۔ بچی۔۔۔ دیکھی شراب لی لی کر
 میرے تو ہونوں پر سگری جم گئی ہے۔ اب تو پچھنے میں مزہ
 بھی نہیں آتا۔“ پہلی نے بات بدلی۔
 ”بڑی لالچی ہے۔“ خیر سے موراں اب وہاں جا کے رانی

چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے اعلان کیا کہ جو بھی محمود کے
 ساتھ اس کا معاملہ طے ہو جائے گا، وہ دوبارہ ہندوستان کو فتح
 کرنے کے لیے واپس آئے گا۔
 یقیناً اس نے ایسا کیا۔ پورے بارہ برس کے بعد وہ
 پنجاب میں دوبارہ واپس آیا مگر ایک سہ سالہ کی حیثیت
 سے ہندوستان کو فتح کرنے کے لیے نہیں بلکہ لاشی لیکتا ہوا
 پناہ کی درخواست لے کر رنجیت سنگھ کے پاس آیا کیونکہ اس
 کے بھائی محمود نے اسے گرفتار کر کے اس کی آنکھوں میں گرم
 اور تھپی ہوئی سلاخیں بھر دیا کر اسے ہمیشہ کے لیے اندھا
 کر دیا تھا۔
 ☆☆☆
 بات کو پر لگ گئے تھے۔ منوں میں یہ خبر پورے۔۔۔
 امرتسر کی کھنچوں میں پھیل گئی تھی کہ رنجیت سنگھ نے بازار حسن کی
 موراں کو دربار کے لیے لاہور منگوانے کی دعوت دی ہے۔
 ایک طرف موراں کی خانم اپنی پوری برادری میں
 اٹھلائی پھر رہی تھی۔ وہ جس سے بات کرتی موراں کے
 حسن، اس کی گھوکاری اور ناپنے کی تعریف کرتے نہیں سکتی
 تھی۔ وہاں اسی کی برادری کی کچھ بچیاں، موراں کی
 بدخواہی میں حسد کی تمام حدود بھلا کر رہی تھیں۔
 ”چشم بد در۔۔۔! میری موراں تو لاکھوں میں ایک
 ہے۔ دیکھو پورے امرتسر سے مہاراجا کی نظر بھی میری ہی
 موراں پر پڑی ہے۔“ خانم تارخ تھی۔ جب وہ درانظروں
 سے ہٹتی تو سننے والیوں میں سے ایک ناک چڑھا کر بولی۔
 ”ہاں ہاں جانتی ہوں۔ کس کس کی سفارشوں سے
 موراں مہاراجا رنجیت سنگھ کی نظروں میں چڑھی ہے۔ ایزھی
 چوٹی کا پورا زور لگا رکھا تھا خانم نے۔“
 تب دوسری نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے
 ہوئے کہا۔
 ”موراں کے مقدر کیا کھلے، خانم کی تو لاٹری نکل آئی
 ہے۔ دیکھتی نہیں کیسے باتیں کرتی کر چھٹکتی ہے۔“
 ”مہاراجا کو بھی تو بس پورے امرتسر میں یہی دانہ
 پسند آیا۔“ پہلی نے آکھ دیا ہاتھ ہوئے جواب دیا۔
 ”دیکھنا تو اب یہ ہے کہ موراں کو مہاراجا پسند آتا
 ہے یا نہیں۔ ایک آنکھ اور چہرہ چمک کے داغوں سے بھرا
 ہوا۔ سنا ہے وہ بھی سننے کی طرح کمزور اور قد میں بھی بس
 ایو بس ہی ہے۔ اور ماشاء اللہ اپنی موراں تو ہاتھ لگائے میلی
 ہوئی ہے۔“ قریب کھڑی ایک اور بچی نے ان کی باتوں
 میں اپنا حصہ ڈالتے ہوئے کہا۔

محاصرہ تو ذکر وہی کی طرف پیش قدمی کریں۔ شاہ زمان نے
 پہلے تو بیمار کے ساتھ اپنے فوجیوں کو آگے بڑھنے پر اکسایا
 پھر ڈانٹ ڈپٹ بھی کی مگر افغانوں پر سکھوں کی اتنی وحشت
 طاری تھی کہ وہ رات ہونے کے بعد اپنی بیویوں سے نکلنے پر
 تیار نہیں تھے۔
 بالآخر شاہ زمان نے سکھوں کو قتل کرنے کا ارادہ
 ترک کر دیا۔ اس نے سکھ سرداروں کو یہ یقین دہانی کروانے
 کے لیے اپنا ایک ایجنٹ امرتسر بھیجا کہ وہ سکھوں کی املاک
 اور شہریوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اگر وہ یہ بتا دیں
 کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ سکھوں نے متفقہ طور پر جواب دیا کہ
 وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتے کہ افغان اپنے ملک
 واپس چلے جائیں۔ شاہ زمان نے اپنے ایجنٹوں کو یہ ہدایت
 دی کہ وہ سکھوں میں چھوٹ ڈالنے کی کوشش کریں اور اس
 کے لیے سرداروں کو بھاری رقوم کی پیشکش کریں۔ شاہ زمان
 کی یہ چال کامیاب رہی۔ بہت سے سرداروں نے اپنے
 نمائندہ سے لاہور بھیج دیے۔ شاہ زمان خاں نے ان کی خوب
 آؤ بھگت کی۔ اس نے شاہانہ انداز میں انہیں کہا کہ میں یہ
 ملک تمہیں عطا کرتا ہوں۔ آزادی کے ساتھ رہو اور اپنی
 زمینیں کاشت کرو۔
 ادھر عین وقت پر ایک غبار دہندہ اٹھا۔ یہ صاحب
 سنگھ بیدی تھا جس نے سرداروں کو سمجھایا کہ وہ غیر ملکی مملکت اور
 سے غدار کرات نہ کریں۔ سرداروں نے اس کی بات مان
 لی۔ جب دوبارہ شاہ زمان کے ایجنٹ اس سرداروں کے
 پاس آئے تو انہوں نے کہا۔
 ”ہم نے یہ ملک گوار سے حاصل کیا تھا اور گوار ہی
 سے اس کا تحفظ کریں گے۔“
 اس پر شاہ زمان کو بے حد غصہ آیا اور اس نے قسم
 کھائی کہ وہ سکھوں کو جنگ ہی کے ذریعے سبق سکھائے گا مگر
 شاہ زمان کا لشکر ہر وقت سکھوں کے آجائیک جملے سے خوفزدہ
 رہتا تھا۔ سکھ رات کو لاہور میں گھس آئے اور لشکروں کے فائر
 کرتے۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی باہر نہیں نکلتا تھا۔
 شاہ زمان کے بھائی محمود نے ایک بار پھر افغانستان
 میں گزربڑ پھیلا دی تھی۔ شاہ زمان نے کئی ماہ سے اپنے
 فوجیوں کو تنخوااں بھی ادا نہ کی تھیں اور وہ شہر کو لونے کی
 اجازت مانگ رہے تھے۔ جب شاہ زمان نے حالات کی
 نزاکت کے پیش نظر ایسا کرنے سے انکار کر دیا تو اس کے
 فوجیوں نے مزید جنگ لڑنے سے انکار کر دیا۔ یہ دیکھ کر شاہ
 زمان نے اپنی فتح کے تمام منصوبے ختم کیے اور کامل واپس

”خاتم! ایک بات میں بھی کہوں۔“ بیگا جان نے بڑے کمزور لہجے میں بات کی۔

”کہو.....“ خاتم نے لامعت سے پوچھا۔

”خاتم! سرکار سے دربار سے تمہاری بڑی واقعیت ہے۔ مائیکہ میں موراس سے زیادہ خوب صورت نہیں ہوں۔ ناز واداش بھی وہ ہم سب سے بڑھ کر ہے۔ میں بڑی دیر سے آپ کی کوششوں کو دیکھ رہی ہوں جو آپ موراس کے لیے کرتی رہی ہو اور یہ سب اسی کا نتیجہ ہے کہ موراس کو مہاراجا کی محفل سجانے کا موقع مل گیا۔ اگر تم اسے خلوص کے ساتھ میرے لیے بھی کوشش کرو اور میرا مقدر بھی کسی دربار، مہاراجے یا سردار کے ہاں کھل جائے تو یقین کرو، آپ کو نہال کر دوں گی۔ میں کتنے دنوں سے بات کرنے کی جرات کر رہی تھی مگر یقین جانو، حوصلہ ہی نہیں پڑ رہا تھا۔“ بیگا جان نے آہستہ آہستہ اپنے دل کی بات خاتم پر واضح کر دی ڈالی تو خاتم نے کچھ دیر خاموشی اختیار کرتے ہوئے پہلی بار اسے اپنی نظر میں تو لے ہوئے کہا۔

”بیگا جان! پچھلے دو دنوں سے خود بخود تمہاری جھولی میں نہیں آگرتا۔ اس کے لیے محنت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ موراس نے جتنی محنت اس مقام تک پہنچنے کے لیے کی ہے اتنی کوئی پتہ بھی نہیں کر سکتی۔ یہ بات درست ہے کہ میری مدد کے بغیر وہ اتنی اونچی اڑان نہیں بھرتی تھی۔ تم بھی میری بات مانو رہو۔ میرے قدموں کے نشانات پر قدم دھرتے چلی آؤ گی تو کامیابیوں کے دروازے تم پر بھی کھل جائیں گے۔ مگر پہلے کمرے کے کرائے کا بندوبست تو کرو۔“ خاتم نے موراس کی کامیابیوں کا سارا صلہ اپنی جھولی میں ڈالنے ہوئے کہا اور بیگا جان کو سوچتا چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

شاہ زمان جب ناکام ہو کر واپس پلٹنے لگا اور اس کی اطلاع امرتسر میں موجود سکھ سرداروں کو ہوئی تو وہ فوراً اپنی اپنی ریاستوں کی طرف روانہ ہو گئے لیکن ان میں سے رنجیت سنگھ ایسا دھڑا سردار تھا جس نے یہ جنگ اپنے ذاتی مفادات کے لیے نہیں لڑی تھی۔ وہ فوری طور پر افغانوں کے تعاقب میں نکل پڑا اور گوجرانوالہ کے قریب افغانوں کو عقب سے چالیا۔ دوسری طرف سے اس نے افغانوں کو سامنے سے بھی پھرنے کی کوشش کی تاکہ وہ پنجاب سے نکلے نہ پائیں مگر افغان اس کے نرنے میں نہیں آئے اور بچ کر نکل گئے۔ رنجیت سنگھ نے دریائے سندھ کے کنارے

تک ان کا تعاقب کیا اور جب تک وہ ہندوستان کی حدود سے باہر نہیں نکل گئے، ان پر حملے کرتا رہا۔ اب رنجیت سنگھ پورے پنجاب کا ہیرو بن چکا تھا۔ اگر وہ اتنی جرات کا مظاہرہ نہ کرتا تو سارا پنجاب برباد ہو گیا ہوتا کیونکہ ان شمالی ویشیوں کو جنہیں افغان کہا جاتا تھا، ان کے گھوڑے جہاں جہاں سے گزر جاتے، اس زمین پر گھاس تک نہیں اگتی۔ افغانیوں کی شکست خوردہ فوج واپس ہوتے ہی لاہور پر تین سرداروں نے قبضہ کر لیا۔ ان میں چیت سنگھ، صاحب سنگھ اور موہر سنگھ شامل تھے۔ انہوں نے برسرِ اقتدار آتے ہی مکمل کھیلنا شروع کر دیا۔ اچانک دولت اور سرداری ہاتھ میں آتے ہی وہ اپنی اوقات بھول گئے۔ وہ ہر وقت شراب نوشی اور زنا کاری میں گزارتے یا آپس میں لڑتے بھڑکتے رہتے تھے جس سے لاہور شہر کا امن و سکون غارت ہو کر گیا تھا۔ سو بہن لال کا کہنا تھا۔

”لاہور کے لوگوں پر اسے ظلم ہو رہے تھے کہ ان کی آہ و فغاں آسمان تک پہنچ رہی تھی مگر حکمرانوں کے کانوں پر جوں بھی نہیں رہتی۔“

نظام الدین کے ایجنٹوں نے لاہور کے ممتاز مسلمانوں سے رابطہ کر کے انہیں تجویز دی کہ وہ ان کے آقا نظام الدین کو شہر پر قبضہ کرنے کی دعوت دیں۔ مسلمانوں نے اس تجویز پر عمل کرنے سے انکار کر دیا بلکہ ہندو اور سکھ شہریوں کے ساتھ مل کر انہوں نے رنجیت سنگھ کو خفیہ طور پر لاہور آنے کی دعوت دی۔

شہریوں کے نمائندے رنجیت سنگھ سے ملے اور اسے ساری صورت حال بتا کر لاہور پر قبضہ کرنے کو کہا۔ رنجیت سنگھ ان کی دعوت سن کر حیران رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ دعوت لاہور کے شہریوں نے ہی بھجوائی ہے یا لاہور کے سرداروں نے اسے پھانسنے کے لیے یہ چال چائی ہے۔ مجھے لاہور کے سرداروں نے پھانسنے کے لیے یہ چال چلی ہے اور تم سب کو میرے بنا کر میرے پاس بھیجا ہے۔“ مہاراجا! آپ کا خدشا، جہاں تک ہمیں کسی سردار نے نہیں بھجوا یا، ہم لاہور کے شہری خود ان سے اسے تنگ اور پریشان آچکے ہیں کہ ان سے جان چھڑانے کے لیے آپ کی مدد مانگتے آئے ہیں۔“ نمائندوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا۔

”اس کا کوئی ثبوت؟“ مہاراجا رنجیت سنگھ نے پوچھا۔

”اگر آپ کو یقین نہیں ہے تو آپ اپنا کوئی بااعتماد

موراس

ہمارے ساتھ بھجوادیں تاکہ وہ صحیح صورت حال کا جائزہ لے کر آپ کو درست اطلاعات دے۔“ وہی نمائندہ دوبارہ بولا۔

”یہ ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا۔ میں اپنے بااعتماد ملازم عبدالرحمان کو آپ کے ہمراہ صورت حال کا درست مطالعہ کرنے کو بھجواتا ہوں اور میں اپنے ساتھیوں سے بھی بطورہ کر کے کوئی قدم اٹھاؤں گا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ نے مہاراجا کو ان کے ہمراہ لاہور روانہ کر دیا اور خود اپنی ماں سدا کو ر سے مشورہ کرنے چلا گیا۔ عبدالرحمان کچھ دن لاہور میں رہ کر وہاں کے ممتاز شہریوں سے گفت و شنید کر کے اس کے پاس پہنچ گیا۔

”ہاں تو عبدالرحمان تمہارا کیا اندازہ ہے؟“ مہاراجا نے عبدالرحمان سے پوچھا۔

”مہاراجا! لاہور کے شہریوں نے واقعتاً آپ کو پایا ہے۔ وہاں کے عیاش سرداروں میں اتنا دھم نہیں ہے کہ وہ حضورِ فوج کا سامنا کر سکیں۔ ان میں سے جو وادعا مل سردار ہے، وہ اس وقت شہر سے دور ہے۔“ عبدالرحمان نے بتایا۔

”آپ کا اس بارے میں کیا مشورہ ہے؟“ رنجیت سنگھ نے اپنی ساس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”رنجیت! فوری طور پر اپنی فوج کو اکٹھا کر دو اور لاہور پر حملہ آور ہو جاؤ۔ تم فوراً امرتسر جا کر اپنی فوج کو ساتھ لو۔ تاخیر نہیں کرنی اور میری مدد کی ضرورت ہو تو بتانا۔“ سدا کو ر نے رنجیت سنگھ کو مشورہ دیا۔

سخت سردیاں ہوں یا گرمیاں اپنے پورے عروج پر ہوں تو یہ وقت کسی بھی ملک کے فوجیوں کے لیے بدترین وقت ہوتا ہے۔ جس وقت رنجیت سنگھ نے لاہور پر حملہ آور ہونے کا سوچا، اس وقت گرمیاں اپنے جوبن پر تھیں اور کسی وقت بھی مون سون شروع ہونے کی توقع تھی۔ اگر حملے کے وقت مون سون شروع ہو جاتی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ جنگ اونے والے میدانِ دلہل میں تبدیل ہو سکتے تھے۔ اس لیے رنجیت سنگھ نے بھی موقع گنوا لے بغیر لاہور پر جلد حملہ کرنے کی خٹائی۔ اس نے اچانک حملہ کر کے عیش و عشرت میں ڈوبے سرداروں کو حیران کرنے کا سوچا اور رنجیت سنگھ نے 10 محرم کو لاہور پر حملہ کر دیا تمام سردار رات کے بعد ’مہول کے مطابق اپنی عیاشیوں میں مشغول ہو گئے جو کہ نہ ہاتھ کب تک جاری رہنے کا پروگرام تھا۔ وہ سب بے نوشی اس معرکہ تھے۔ جب لاہور پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مادی فضا سوگ من رہی تھی تو رنجیت سنگھ لاہور سے چند میل

کی دوری پر تھا۔ اگلی صبح کی آکھ کھلے ہی لوگوں نے اپنی چھتوں پر سے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی فوج نے خاموشی کے ساتھ لاہور شہر کا محاصرہ کر لیا ہے۔ سورج کی روشنی پہلے تک رنجیت سنگھ کے بچپن کے ہزار جوان اپنی اپنی جگہ سنبھال چکے تھے اور وہ دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار تھے۔

رنجیت سنگھ نے سدا کو ر اور اس کے جوانوں کو شہر کی مشرقی سمت دہلی دروازے پر چھوڑا اور خود جنوب کی طرف سے اتارکلی بازار تک پہنچ گیا۔ یہاں اسے لاہور کے شہریوں کی جانب سے خوش آمدید کا خفیہ پیغام پہنچا۔ اس نے شہر کی تفصیل میں مختلف مقامات پر بارود رکھوا دیا۔ جونہی پہلی توپ چلی، لاہوری مسلمانوں کے سالار مہر حکم دین نے فائرہ بجوا کر اعلان کر دیا کہ لاہور شہر پر مہاراجا رنجیت سنگھ نے حملہ کر دیا ہے اور اس نے شہر کا انتظام سنبھال لیا ہے۔ لہذا شہر کے تمام دروازے کھول دیے جائیں اور مہاراجا کی فوج کو خوش آمدید کہا جائے۔ رنجیت سنگھ نے جیسے سمیت جنوب میں واقع لاہور کی دروازے سے داخل ہوا۔ سدا کو ر اپنے گھڑ سواروں کو لے کر دہلی دروازے سے داخل ہوئی۔

حاکمان لاہور شہر کے لیے یہ اچانک اور حیران کن حملہ تھا۔ موہر سنگھ اور صاحب سنگھ کے خاندان کے لوگ اور ان کے ساتھی دوسرے دروازوں سے فرار ہو گئے۔ چیت سنگھ قلعہ بند ہو گیا۔ رنجیت سنگھ نے اعلان کر دیا کہ شہر کے لوگ امن و سکون سے رہیں۔ انہیں کوئی گزند نہیں پہنچائی جائے گی۔ ساتھ ہی اس نے اپنے فوجیوں کو بھی سختی سے حکم دیا کہ وہ شہر میں کسی قسم کی لوٹ مار نہیں کریں گے اور جو فوجی ایسا کرتے ہوئے پایا گیا یا اس نے حکم کی خلاف ورزی کی تو اسے سزائے موت دی جائے گی۔

☆☆☆

لاہور کی فتح رنجیت سنگھ کے لیے بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ اس شہر پر قبضہ کرنے سے وہ شمالی پنجاب کا سب سے طاقتور سردار بن گیا تھا۔ لاہور پہنچنے ہی رنجیت سنگھ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مغل شہنشاہ اورنگزیب کی تعمیر کردہ عظیم شاہی مسجد میں پہلی حاضری دی۔ اس کے بعد وہ مسجد وزیر خاں گیا۔ اس نے قلعے کی تفصیل کے نیچے بادشاہی مسجد کے قریب اپنی فوج کا پڑاؤ ڈالا۔ پھر اپنی ساس کے مشورے پر چیت سنگھ کو تھکایا اور اگلے اور اپنی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ چیت سنگھ نے پس و پیش کی تو اس نے کامیابہ کر کے کافینڈ کیا۔ چیت سنگھ کے حواریوں نے رنجیت سنگھ کے

اور آتش بازی کا زبردست مظاہرہ کیا گیا۔

رنجیت سنگھ کی یہ سیاسی بصیرت اور دانش مندی بھی کہ اس نے مغلوں کی طرح اپنے دربار کی نہ تو شان و شوکت بڑھائی اور نہ ہی خوشامدیوں کی باتوں میں آ کر خود کو مہاراجا بنانے کی کوشش کی۔ اس نے شاہی تاج سر پر پہننے سے انکار کر دیا اور اس کی جگہ دھتانون والی گچڑی کو ترجیح دی۔ اس نے غلی الاعلان کہا۔

”میرے تلواریں مجھے سب سے ممتاز بناتی ہے۔ مجھے اس کے علاوہ کسی نام و نمود کی ضرورت نہیں۔“

اس نے تخت پر بیٹھے سے بھی انکار کر دیا اور پہلی کی طرح ایک معمولی سی کرسی پر پانی مار کر بیٹھتا تھا یا پھر مشرقی روایت کے مطابق قاتیل پر گناؤں کے ساتھ یک لنگر لگا کر ملتا قاتلوں سے گفتگو کرتا تھا۔ اس نے نئے نئے سکے ڈھالنے کا حکم دیا اور یہ حکم دیا کہ سکوں پر اس کا نام یا شعیبہ کے بجائے گرو نانک کی شیبہ نقش کی جائے۔ اس کے کوٹا تک شاہی کا نام دیا گیا۔ اب سدا کوہ پر ہم اور ہر حالے میں رنجیت سنگھ کے ساتھ ساتھ رہنے لگی تھی۔ رنجیت سنگھ نے کاٹھڑہ کارنہ کیا تو کاٹھڑہ کا سردار سنسار چندا اپنا حوصلہ ہار بیٹھا۔ رنجیت سنگھ نے سنسار چند کی ریاست کے کچھ حصوں کو اپنی سلطنت میں ملا لیا اور نور پور کو شوہرہ کے علاوہ سجان پور کے قرب و جوار کا علاقہ سدا کوہ کو روکے دیا۔ اسی زمانے میں وہ..... ملتان کے مظفر خاں کو شکست دے کر تھانوان ادا کرنے کی شرط پر علاقہ مظفر خاں کے پاس چھوڑ دیا اور گنڈل لاہور آ گیا۔

رنجیت سنگھ فتح مند ہو کر واپس آیا تو فتح کی خوشی میں اس نے تین سالہ بیٹے کھڑک سنگھ کی مفتی کی تقریبات کا اعلان کیا۔ اس کی مفتی کھنیا منٹل کے جھلم سنگھ کی شیر خوار بیٹی چاند گور سے کرنے کا ارادہ بنا دیا گیا۔ اسی کھڑک سنگھ کی مفتی پر مورال کو امر سے بلوانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔

☆☆☆

اہمیت تو موراں کی اسی روز ہوئی تھی جب اسے
نجیت سنگھ کے دربار میں مجھے لے گیا۔ ماما تھا۔ پورے
مہر کو چا چل گیا تھا کہ موراں نام کی بچی اس شہر کے بازار
حسن میں موجود ہے مگر جب کتنے دنوں تک دربار کی طرف
سے اگلا سندس نہیں ملا تو چھ بیٹھیاں اپنی موت آپ مر
گئیں۔ باتیں وقت کی گزرتے بیٹھیاں سن بھرا چاک
ایک روز ایک سہی سہائی لاکھی اس کے گھر کے دروازے پر
آکر کی جس کے ساتھ چند خاتون سی سی بھی موجود تھے۔
بازار حسن میں ایک باہر بھلی سی بچی تھی۔ بروکھی اس ٹوہ

۱۔ المیر لے اس کی اطاعت قبول کر لی اور اسے ایک ہاتھی کے ساتھ بیس ہزار روپے نذرانہ پیش کر دیا۔ اس کے بعد اس نے گجرات کے سردار صاحب سنگھ سنگھ کے خلاف قدم اٹھایا جس نے اکال گڑھ کے سردار کے ساتھ مل کر گوجرانوالہ پہلے کی سازش کی تھی۔ صاحب سنگھ بیدی علی انسان تھا جس نے تین سال پہلے سکھوں کو افغانوں سے لڑنے پر متحرک کیا تھا۔ اسے جب پتہ چلا کہ بھٹیوں اور برہمنیت سنگھ کے درمیان چچنٹش جاری ہے تو وہ فوراً گجرات پہنچا اور گردو کے نام پر دووں فریقوں کو علم دیا کہ اپنے ہتھیار زمین پر ڈال دیں۔ سردار اس کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ وہ صاحب سنگھ بیدی کو بابا صاحب کاراجہ دیتے تھے۔ انہوں نے اس کے احترام میں اپنی تلواریں زمین پر رکھ دیں۔ موہن لال اس منظر کو یوں بیان کرتا ہے۔

”رجحیت سنگھ نے گنوار اپنی کمر سے کھولی اور بابا صاحب سنگھ کے سامنے زمین پر رکھ دی۔ تمام سرداروں نے اپاہی کیا۔ گنوار اس ایک کھٹے تک زمین پر چڑی رہیں۔ اس کے بعد بابا صاحب سنگھ نے رجحیت سنگھ کی گنوار اس کی کمر سے باندھ دی اور دعا دی کہ اس کے سارے دشمن جلد ہی ہلاکت و نابود ہو جائیں گے اور پورے ملک پر اس کی حکومت قائم ہو جائے گی۔“

جھوٹے موٹے جھگڑے ٹمٹاتے ہوئے اب رنجیت سنگھ پنجاب کا قائد مانا جانے لگا تھا۔ تاہم وہ مہاراجا کا خطاب اپناتے ہوئے اپجکپا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا جس سے دوسرے سرداروں کو اس کے خلاف سازش کرنے کا موقع ملے جبکہ اسے یہ بھی علم تھا کہ ایک قانونی خطاب اپنانے کے ۔۔۔ کتنے فوائد ہوتے ہیں۔ جب اس نے مہاراجا کا خطاب اپنایا تو عوام نے اس کے اقدام کو بہت سراہا۔

رنجیت سنگھ کا قاعدہ تاج پوشی کے لیے راضی ہو گیا۔

☆☆☆

اب رنجیت سنگھ باقاعدہ تاج پوشی کے لیے راضی ہو گیا تھا۔ اس نے مسجدوں، مندروں اور گروداروں میں مہارات کروانے کا اعلان کیا۔ صاحب سنگھ بیدی نے رنجیت سنگھ کے ساتے پر زعفران لگا کر اس کے پنجاب کے راجا ہونے کا اعلان کیا۔ اسے شاہی قلعے سے توپوں کی سلامتی دی گئی۔ سہ پہر کے وقت جو نوجوان مہاراجا بھی پر سوار ہو کر شہر میں نکلا خوشی سے سرشار عوام نے اس پر پھول اور پاندی کے سکے نچھاور دیے۔ رات کو شہر میں چراغاں کیا گیا

حالات رنجیت سنگھ کے ساتھ تھے۔ شہر سے اسے ضرورت
سردمسلک مل رہی تھی۔ اس کے مخالفوں کے اتحاد میں صرف
ایک قدر مشترک بھی اور وہ قدر رنجیت سنگھ کے ساتھ دشمنی اور
اسے ہر حال میں شکست سے دوچار کرنے کا جذبہ تھا تاکہ
ایک ایک سنگھ سوا لاکھ پر بھاری ہے مگر ان کا سالار گلاب
سنگھ صحت و شباب کا دلدادہ تھا۔ وہ جب بھی فائرنگ ہوتا، نشے
اور پانچے دایوں میں اپنا وقت گزارنے کو ترجیح دیتا تھا۔
ایک روز کثرت شراب نوشی سے اس کے دماغ کی رگ
پھٹ گئی اور وہ مر گیا۔ اس کی موت نے سکھوں کی اتحادی
فوج کو بے حوصلہ کر دیا اور وہ خاموشی کے ساتھ میدان چھوڑ
کر بھاگ گئی۔ رنجیت سنگھ اپنی فوج کو لاہور واپس لے آیا۔
قسمت نے رنجیت سنگھ پر ایک اور مہر پانی کی۔ سکھوں کی
خارجات پونہ کرنے کے لیے وسائل اور دولت کی ضرورت
تھی جو رنجیت سنگھ کے پاس بہت کم تھی کیونکہ اس نے اپنی
تمام تر توجہ جنگی منصوبوں پر لگا دی ہوئی تھی۔ ان وسائل کو پورا
کرنے کے لیے اس نے سوچا کہ شہر کے ساہوکاروں سے
قرض لے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ شہر کی فسیل کے باہر
واقع ”بدھو دا آدا“ نامی کھنڈرات سے سونے کی تیس ہزار
مہر سونے یافت ہوئیں۔ دشمن کے بھاگ جانے اور خزانے
کے اچانک مل جانے سے لوگوں کو پختہ یقین ہو گیا تھا کہ اب
رنجیت سنگھ ہی لاہور کا حقیقی حکمران ہے اور وہ پنجاب پر اپنی
حکومت قائم کر لے گا۔ اس کی پختہ حیثیت کو دیکھتے ہوئے
سارے ملک سے نوجوان سکر جا رہے کہ وہ بار بار رخ کرنے
لگے۔ سرداروں کے بیٹے اس کی فوج میں شامل ہونے، عالم
اور طیب اس کی ملازمت حاصل کرنے، دستکار اور ہنرمند
شاہی سرپرستی حاصل کرنے۔۔۔ نیز بے شمار کزنز بھی اس کا
قرب حاصل کرنے کو پہنچ گئیں۔ رنجیت سنگھ قلعہ میں رہنے لگا
اور باقاعدگی کے ساتھ اپنا دور بارگاز لگاتا تھا۔ انعاموں کے
سالار شاہ زمان نے بھی اس کے لیے صلح کے پیغام کے ساتھ
دو تھ کا ہاتھ دیا تھا۔ جسے رنجیت سنگھ نے کمال بہر بانی سے
قبولیت کا رد دے کر اسے جوابی تحائف میں اس نوپ کے
نکلنے بھی روانہ کیے جسے شاہ زمان فرار ہوتے وقت
پنجاب کے ایک دربار میں کھو بیٹھا تھا۔

لاہور پر قابض ہونے کے بعد رنجیت سنگھ کا آگیا
منصور پور سے پنجاب کا حکمران بننے کا تھا۔ ویسے بھی اب
اس کے دشمن بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ اس نے جنوں کے
راجے کے خلاف اقدام اٹھانے کا سوچا تو جنوں کے راجا

اندام سے جیت نکھو گا وہ کیا۔ اسنے روز جیت نکھو کے
قاصدا آئے۔ انہو نے آکر کہا کہ اگر رنجیت نکھو ان کے
سرداروں کی جان بخشی کا حکم دیں تو قلعہ بند جیت نکھو نہ
صرف خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دے گا بلکہ قلعہ بھی
رنجیت نکھو کے حوالے کر دے گا۔

رجبت سنگھ کا جویتی معاملات میں بے حد ذہین تھا۔ اس نے سوچا کہ چیت سنگھ پر اگر اس کی جان بخشی کر کے آج احسان کر دے تو وہ تمام عمر اس کے زیرِ نگیں رہے گا اور اس سے خوب فائدہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ جویتی اسے چیت سنگھ کی تجویز ملی، اس نے عالی ظرفی کی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف اپنے دشمن کو معاف کرنے کا اعلان کر دیا بلکہ اس کے لئے تاحات وظیفہ مقرر کروا دیا۔

اس طرح 7 جولائی 1799ء کو لاہور قلعے کے دروازے اس اٹھارہ سالہ فاتح پر کھول دیے گئے۔ رنجیت سنگھ قلعے میں داخل ہوا تو اسے توپوں سے سلامی دی گئی۔ دہلی اور آگرہ مغلوں کے دارالسلطنت تھے لیکن لاہور کی ایک اپنی مغرور اور الگ حیثیت تھی۔ ان شہروں کے بعد لاہور سلطنت کا مرکزی شہر تھا۔ لاہور دار الحکومت اور شمال مغربی سرحدی علاقے کے درمیان واقع تھا۔ سکھوں کے نزدیک لاہور امرتسر کے بعد دوسرا مقدس شہر تھا کیونکہ یہ امرتسر کی بنیاد رکھنے والے ان کے چوتھے گرو رام داس کی جائے پیدائش تھا۔ اس بنا پر رنجیت سنگھ اب لاہور کا حکمران بننے ہی شمالی پنجاب کا سب سے طاقتور سردار بن گیا تھا۔

رجحیت سنگھ کو لاہور کے تخت پر کیا بیٹھا، سلطہ کس اداروں کا پوشیدہ حساب کھلی نفرت میں بدل گیا۔ شاہ زمانہ کے خلاف رجحیت سنگھ کے ساتھ مل کر افغانوں کا مقابلہ کرنے والے سابقہ حلیف بھی اب اس کی دشمنی پر اتر آئے تھے۔ انہوں نے لاہور سے نہایت ذلت کے ساتھ بے دخل کیے جانے والے بھنگی سرداروں کے ساتھ اتحاد بنالیا۔ نظام الدین خاں بھی جو اپنے آپ کو لاہور کا صوبیدار بننے کے خواب دیکھ رہا تھا، وہ بھی ان کے ساتھ مل گیا۔ رجحیت سنگھ کے سارے دشمن اتر میں اکٹھے ہو گئے۔ اس وقت انہوں نے اکٹھے ہو کر اتر میں ایک منصوبہ بنایا، کہ کسی طرح رجحیت سنگھ کو لاہور سے بے دخل کر کے اپنی شکست کا بدلہ لیں۔ چنانچہ 1800ء کے موسم بہار میں بھنگیوں کی جمعدہ فوج نظام الدین خاں کی فوج کے ساتھ مل کر لاہور کی طرف بڑھنے لگی۔ رجحیت سنگھ نے شہر سے دس میل باہر آ کر ہمیں نامی ہستی کے قریب ان کی پیش قدمی کو روک دیا۔ وقت اور

میں تھا کہ وہ کون ہے جس کو لینے کے لیے یہ پاکی اور محافظ آئے۔ ہر کوئی اپنے اپنے دروازے سے مندر نکالے سن گن لینے کے چکر میں تھا۔ باتیں ایک بار پھر اٹھرائی لے کر اٹھ بیٹھی تھیں۔

”چتا چلا ہے موراد کو مہاراجا کے دربار میں لے جانے کا محافظ آئے ہیں۔“ ایک کمرے کی ادھ کھلی کھڑکی سے ایک چہرے نے آواز نکالی۔

”جب کچھ روڈ پہنچے پیغام ملا تھا میں نے تو اسی روز کہہ ڈالا تھا کہ موراد بہت بھالوں والی ہے۔“ ایک اور آواز ابھری پھر تو جیسے اس چٹنی کی برداشت سے یہ سب باہر ہو گیا تھا۔ اس نے دروازے کا ایک پت کھولا اور اس میں سے گردن نکال کر سپاہی کو آواز دی۔

”اے دروئے۔“
داروئے نے آواز کی سمت کا تعین کرنے کے لیے ادھر ادھر دیکھا تو جیسے قریب ہی سے بڑی مزمن نہی کا ایک فوارہ پھوٹ نکلا تھا۔

”ارے ادھر ادھر کیا کنکڑے اڑا رہے ہو۔ میں ادھر ہوں۔“

داروئے نے دوبارہ آواز کی جانب دیکھا۔
”یہ سب کیا ہے۔“ ایک گورے سے بازو نے دروازے کی اوٹ سے نکل کر اشارہ چاہا۔
”دیکھتی نہیں ہے، موراد کا بلاوا آیا ہے مہاراجا کے دربار سے!“ داروئے نے نکت سے کہا۔

”ارے واری جاؤں۔ کبھی یہ بلاوا ہمارا بھی آ جائے تو جیوں بھل ہو جائے۔“ وہ دوبارہ بولی۔
”آ جائے گا۔ بہت جلد آ جائے گا۔“ داروئے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ارے سچ۔ تمہارے منہ میں کبھی ٹکڑے تو پھر میں بھی آس لگا رکھوں؟“ وہ ایک بار پھر سے گویا ہوئی۔
”ہاں ہاں۔“ ذرا عزرائیل کو فارغ ہونے دو۔ بلاوا خود بخود آ جائے گا۔“ داروئے نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا تو ٹھٹھ سے دروازہ بند ہو گیا۔

”بڑی آئی بلاوا لینے والی۔ سرکار دربار سے بلاوا ایسے آ جاتا ہے جیسے یہ پتھریا بھجتی ہے۔“ داروئے نے دوسرے سامنے کہا۔

ابھی ان کی باتیں جاری ہی تھیں کہ موراد حویلی سے باہر آ گئی۔ یوں جیسے پری آسمانوں سے اتر آئی ہو۔ کوئی حور رستہ بھول گئی ہو۔

”کہاں جانا ہوگا۔“ آواز کی گھنٹیاں بجیں۔
”لاہور۔ مہاراجا کے تین سالہ بیٹے کھڑک سنگھ کی منگنی ہے۔ اس کی تقریبات میں شمولیت کرنا ہے۔“ ایک سپاہی نے جواب دیا۔

”پھر یہ پاکی کیوں؟“ موراد نے دوبارہ پوچھا۔
”آپ اس میں تشریف رکھیں گی تو کہاں آپ کو لے چلیں گے۔“ ایک دوسرے سپاہی نے موراد کی حیثیت بڑھاتے ہوئے کہا۔

”موراد اپنے پاؤں چل سکتی ہے۔“ موراد نے ہنستے ہوئے کہا۔

”لاہور دوسرے۔“ وہی سپاہی دوبارہ بولا۔
”بیٹہ جا میری بیٹی۔ بسم اللہ کر کے دایاں پاؤں رکھنا پہلے کہ برکت ہوتی ہے۔“ خانم نے موراد کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ موراد نے خانم کی نصیحت کے مطابق پہلے دایاں پاؤں پاکی میں رکھا۔ جب وہ بیٹھ رہی تو کھاروں نے پاکی اٹھائی۔ دیکھنے والیوں کی نظریں ابھی تک اس کی ایک ایک حرکت کا تعاقب کر رہی تھیں۔

شام ڈھلنے سے پہلے پہلے ان کا چھوٹا سا قافلہ لاہور پہنچ گیا تھا۔ لاہور کی عمارتیں نئے نئے کھڑک سنگھ کی منگنی کی خوشی میں جھجکا رہی تھیں۔ لاہور شہر کو بڑی خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ موراد کی پاکی اس وقت کے گاؤں مکھن پورہ کے میدان میں اتاری گئی تھی۔ اس پورے میدان کو دکن کی طرح سجایا گیا تھا۔ ایک بڑا سا پنڈل چھوڑ کر ارد گرد چھو لہار یوں کے کمرے بنائے گئے تھے جن میں ارد گرد کے علاقوں اور ریاستوں کے آئے ہوئے راجے اور سردار رہائش رکھے ہوئے تھے۔

موراد کے لیے بھی ایک ایسی ہی چھو لہاری کا کمرہ بنایا گیا تھا جسے کم خواب اور بہترین کپڑوں سے سجایا گیا تھا۔ چھللاتے خوب صورت اور مین پر دے لہارے تھے۔ موراد کو اس کے کمرے کے سامنے اتارا گیا تو وہ میدان کی سجاوٹ اور اس کی حسن ترتیب دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

”کیا دربار میں نہیں اتارو گے؟“ موراد نے پاکی سے باہر قدم رکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں کا حکم ملا تھا۔ تقریبات کا سارا انتظام ادھر ہی کیا گیا ہے۔ تمام امراء سردار اور رؤسا ادھر ہی ٹھہرے ہیں۔ آپ کا جلسہ بھی اسی پنڈل میں ہوگا۔“ انتظامیہ کے ایک شخص نے بتایا۔

”واہ ری موراد۔ دل میں کیا کیا امیدیں لگا کر آئی

موراد

نئی اور کہاں آ کے اتاری گئی۔ دل میں تو تھا کہ محل کی روشیں اور راہداریاں دیکھنا نصیب ہوں گی مگر ملا کہا۔ ایک چٹیل میدان۔“ موراد نے خود سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔ محل اپنے نصیبوں میں کر کے نہ چھوڑا تو موراد نام نہیں۔“ ایک دوسری سوچ نے اس کے ارادوں کو ہمیز دی۔
”ادھو۔ چل ری موراد۔ جو ہو، دیکھا جائے گا۔“

اس نے اپنے ساتھ لائے ملبوسات اور سچے سنورنے کا دوسرا سامان اپنے بنائے کمرے کی ایک جانب رکھتے ہوئے آہ بھری۔ اس کے سامنے پیچھے اور ساری نوا زوں کے لیے ایک ایسا ہی الگ سا کمرہ بنایا گیا تھا۔ موراد اپنے کمرے میں اکیلی تھی۔ رات کے پچھلے پہر جب ساری نئی معروfiات ختم ہو گئیں تو ایک باگی پھیل چھٹی سی باندی اس کے کمرے میں آئی۔ موراد نے اس کی طرف حیرانی سے دیکھا۔ وہ کسی انگریزی بڑیا کی طرح سجی ہوئی تھی۔

”مہاراجا نے یاد فرمایا ہے۔“
موراد جو پہلے سے ہی تیار تھی، مہاراجے کے حکم کی منتظر تھی، جلدی سے اٹھی اور اس کے ساتھ چل پڑی۔ ”یہ کمرہ اسی طرح کھلا رہے گا، اس کے اندر میرا سامان پڑا ہے۔“ موراد نے ٹٹکتے ہوئے سوال کیا۔

”یہ رنجیت سنگھ کا شہر ہے۔ پنجاب کے شیر کا گھر ہے۔ یہاں باگت ماروں اور اٹھائی گھروں اور چوروں کا کیا کام۔“ لڑکی نے اٹھلاتے ہوئے جواب دیا۔

پنڈال کے ارد گرد حیثیت کے مطابق کرسیاں اور صوفے بچھے ہوئے تھے اور پورا پنڈال بھرا ہوا تھا۔ اس کے ساندے پہلے سے ہی وہاں موجود تھے، سامنے ایک عام سی کرسی پر بائیں مارے دھقانوں کی سی پگڑی باندھے جس پر صوفیوں کی بھال لگی ہوئی تھی اور پگڑی کے اوپر مور پتک لگا ہوا تھا۔ اس کی ایک آنکھ موندی ہوئی اور بڑی مونچھوں کے تلے لی ہوئی جھوٹی ڈانڑھی تھی۔ پگڑی نظریں وہ ایک مرلے سا چوڑا لگتا تھا۔ قہقروں کی روشنی میں اس کے چہرے پر پچپک کے داغ واضح ہو رہے تھے۔

موراد دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے سامنے گئی اور جا کر حسب روایت فرشی سلام کیا تو بوڑھے چوہے کی خاکستری ڈانڑھی نے بھی جھولتے ہوئے اسے خوش آمدید کہا۔

”باندی کا سلام قبول کیجیے۔“ موراد نے دل بچھنے والی اداسی کہا۔

”تو گویا تم موراد ہو۔ لگتا ہے چاند زمین پر اتر

آیا ہے۔“ رنجیت سنگھ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
موراد ایک کچی کچی۔ امر تر جیسے چھٹیل شہر کی جہانمیدہ طوائف۔ جو بندے کو دیکھتے ہی اس کی نیت جان جاتی تھی۔ وہ بھی چھوٹی سی ہنسی ہنس دی۔

”چلو پھر آج ہم بھی نگارہ کرتے ہیں کہ موراد اپنی مستی میں کس طرح ناچتا ہے۔“ رنجیت سنگھ نے رکتے رکتے کہا۔
”زہ نصیب۔“ موراد نے ایک بار پھر اسے فرشی سلام کیا اور پھر ناچ کے لیے اس کے قدم ٹھرنے لگے۔

☆☆☆

”چاند پھر کب ہمارے آگن میں اترے گا؟“
رنجیت سنگھ نے قریب کے آخری روز موراد کو انعام و اکرام سے نوازتے ہوئے دھیرے سے پوچھا۔

”مہاراج اس چاند کو زوال نہیں ہے۔ یہ چاہے ایتھیسوں کا بھی ہو، اسی طرح جگمگاتا اور چمکتا ہے جیسے پورے دنوں کا ہو کر روشنی بکھیرتا ہے۔“ موراد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”خوب ہے۔ رنجیت سنگھ کو کہتے ہیں وہی چیزیں پسند ہیں۔ ایک اتھری گھوڑی اور۔۔۔۔۔ دوسری اتھری دن (عورت) مجھے تمہارا جواب پسند آیا ہے۔“ رنجیت سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ میرا سن ٹن ہے یا کچھ اور لگتا ہے، چاند کی روشنی اور چکا چوند چٹیل میدان اور کھلی جگہ زیادہ چاندنی بکھیرتی ہے۔“ رنجیت سنگھ نے پوچھا۔

”یہ چاند اپنے محل میں اتار کر دیکھیے۔ آپ کے محل کی روشوں اور راہداریوں کو بھی ایسے ہی اجال دے گا۔“ موراد نے تڑپتے ہوئے جواب دیا۔

”ہوں۔“ رنجیت سنگھ نے بات ایسے ختم کی جیسے وہ کچھ سوچنے لگا ہو اور موراد کو بھاری انعام و اکرام دے کر رخصت کر دیا۔ رنجیت سنگھ اگرچہ ان عیاشیوں میں پوری طرح ڈوبا ہوا تھا مگر وہ سلطنت کے کاموں سے بھی نظریں نہ چراتا تھا۔ وہ لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا لیکن کسی چیز کا حساب کتاب رکھنا پڑتا تو وہ نرم لکڑی (چوب) پر اتنے ہی نشان ڈالتا جاتا تھا۔ وہ انگریزوں کا چکا دوست تھا۔ دانا اور زبردست حاکم بھی تھا جو اپنے افسروں اور ہالکاروں کو اچھی طرح قابو میں رکھتا تھا۔ رعایا بھی اس سے بہت خوش تھی۔ اس نے اپنے پاس بہت سی توپیں اور لشکر جرائع کر رکھا تھا جس کو فراموشی تو فراموشی نہ تھا۔ اس نے سدھایا تھا اور فن حرب میں یکساں بنا دیا تھا۔ اس نے پنجاب میں ایک بڑی زبردست

سلطنت بنائی تھی اور شیر پنجاب کہلائے لگا تھا۔
انسانی سرشت ہمیشہ سے تصادات کا شکار رہی ہے۔
اگر ایک طرف رنجیت سنگھ بہترین حاکم اور ہر دہلیز پر حکمران
تھا تو دوسری طرف اس کی شخصیت میں بے پناہ خامیاں بھی
موجود تھیں۔ رنجیت سنگھ کے لاہور کے تخت پر بیٹھنے سے پہلے
پنجاب ایک ایسے خطے کا نام تھا جس کی حدود اور سرحدوں
کا تعین نہیں ہو سکا تھا۔ مگر رنجیت سنگھ نے جب اس کی باگ
ڈور سنبھالی تو اس نے پنجاب کی سر زمین کو متحد کیا اسے مضبوط
بنایا اور اس کے دفاع کے لیے ایک جدید طرز کی فوج قائم کی
اور پورے علاقے میں عدل و انصاف کی بنیادیں استوار
کیں مگر بعض تاریخ نگار اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان
کے مطابق رنجیت سنگھ عیش دوست، حسن پرست تھا۔ اس
کے دور میں استعمال کی چیزوں اور عیاشی کے سامان کی
قیمتوں میں کوئی فرق نہ رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ ایندھن،
اتاج، سبزیوں تک پر محصول طلب کیا جاتا تھا۔ اس کی
سلطنت میں جگہ جگہ سکیم ہاؤس بنائے گئے تھے جہاں
بیوپاریوں کے ساتھ بڑا براسلوک کیا جاتا تھا ہر چیز پر کئی کئی
بار چسکی دینی پڑتی تھی۔ بجلی بار خریداری پر، دوسری بار
دکان کے اوپر چاکے بیچنے پر، تیسری بار دکاندار خود اس چیز
پر محصول وصول کرتا۔ یہاں تک کہ رنجیت سنگھ کے دور میں
کپڑا بنانے والے جولاہوں پر بھی ٹیکس لگا رکھا تھا۔ یہ ٹیکس
دور در پے کی کھڑی اور ایک روپیہ کی تانا بانے پر لاکو کیا گیا
تھا مگر رنجیت سنگھ ان تمام باتوں سے چشم پوش ہو کر اپنی
عیاشیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے جب بھی امور سلطنت کی
دشواریوں سے ذرا فراغت ملتی، وہ اپنی عیاشیوں میں کمی نہ
آنے دیتا۔ اس کے دور میں عیش پرستی زوروں پر تھی۔ وہ
اپنے ارد گرد خوب صورت مردوں اور عورتوں کو دیکھنا پسند
کرتا تھا۔ ارباب نشاط کا ایک بڑا طائفہ ایسا معاملہ اس کا دائمی
ملازم تھا اور ایک بہت بڑی رقم ماہوار اس محلے پر مہاراجا
صرف کرتا تھا۔ مہاراجا چٹپوٹ اور ان ملازم عورتوں کو چٹنی
لباس پہناتا۔ ڈھال، گوار اور تیرکمان سے انہیں آراستہ
کرتا اور اس پر اپنی کشتیوں کی خاطر انہیں آپس میں لڑنے کا
حکم دیتا۔ جب وہ لڑتیں تو ان کی حرکات و سکنات دیکھ کر
تالیاں بجاتا اور خوش ہوتا۔ جب یہ عورتیں اس طرح
سپاہیوں کا لباس پہنتیں تو انہیں مہاراجا کا ہاؤس گارڈ رکھا
جاتا۔ محل شہنشاہ اکبر... اور بہادر شاہ نے دہلی میں اپنے
برائے نام دور میں خوب صورت اور نوجوان لڑکوں کی ایک
اسی طرح کی پلٹن ”ہجیرا چلٹن“ رکھی ہوئی تھی۔ رنجیت سنگھ

نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ عورتوں کو مردانہ لباس پہنایا اور
سپاہی بنا یا وہ اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا کہ میرے ہاؤس
گارڈ سپاہی مجھے تنگ کرتے ہیں۔ وہ لڑائی میں تو لڑنے کے
لیے نکلے نہیں لیکن ان کی آپس کی لڑائیاں میرا تاک میں دم
کردیتی ہیں۔ سارے پنجاب کا میں نے بندوبست کیا۔
اسے اپنی مرضی اور عوام کی فلاح کے قائل بنایا لیکن ہاؤس
گارڈ کا مجھ سے بندوبست نہ ہو سکا۔ میری ساری تدبیریں
ان کی شرارتوں کے آگے عاجز آ گئیں اور دوسرے ہاؤس
گارڈ ہمیشہ دھوکا دیتے ہیں۔ اس لیے بھی میں نے انہیں
اپنے ہمراہ نہیں رکھا بلکہ ان کی جگہ عورتیں ہاؤس گارڈ ہوں تو
مہاراجوں کی شان و شوکت بڑھتی ہے اور دوسرا ان سے کسی
قسم کا جان کو خطرہ نہیں رہتا۔
اسی طرح جب تاج گانے... کا جلسہ گرم ہوتا تو
رنجیت سنگھ بڑے شوق سے ان خوب صورت پتیلیوں کو اپنے
اتھوں سے شراب کے جام بنانا کر متواتر دیتا تھا۔ ایک
کا جام ختم ہوتا تو دوسرا جام اس کے آگے پیش کر کے وہ بہت
خوش ہوتا۔ خود بھی شراب پیتا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اس قدر تیز
شراب پینے کا عادی تھا کہ اگر بڑ بھی وہ شراب نہ پی سکتے
تھے۔ دلائی شراب ہو اور کچھیاں ہوں جو اپنے کونٹوں پر
ویسی شراب ہی پی لیتی تھیں اور دلائی نت نئی شراب پینے کے
صرف خواب ہی دیکھتی تھیں، وہ مہاراجا کی ایسی محفل میں جی
جان سے شریک ہو کر اس قدر شراب پیتیں کہ صراحیاں چھوڑ
کر منکوں تک کو خالی کر دیتیں پھر جب نشہ زور کرتا تو آپس
میں لڑنا جھڑنا شروع کر دیتیں۔ ایک کا ہاتھ ہوتا تو دوسری کی
چوٹی کھینچا تانی تانی ایک دوسرے کے خوب کپڑے پھینچتے۔
غرض کہ ایک طرح کی مکروہات ہوتیں۔ مہاراجا ان کی
حرکات سے نہ صرف لطف اندوز ہوتا، تھقیے لگاتا، تالیاں
بجاتا بلکہ انہیں اور لڑنے پر اکساتا۔ ان کی خوب کشتیاں
کر داتا۔ خوب دست و گریبان کرواتا اور ان پر روپیوں کی
پوچھاڑ کر دیتا جو کپڑے رات کو پھینچنے والوں کو ان سے بہتر اور ہر
قسم کے نفیس کپڑے ان بہادروں کو مل جاتے۔ رنجیت سنگھ
کے یہ چونچلے خوب صورت اور جوان عورتوں کے لیے تھے تو
اس کے علاوہ اس کا دوسرا شوق خوب صورت اور اتھرے
گھوڑوں کا تھا۔ وہ صرف ایک گھوڑا حاصل کرنے کے لیے
قتل و غارت بھی کر سکتا تھا۔ رڈ یا رڈ کھینک نے رنجیت سنگھ کی
انہی حرکات کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
”چار چیزیں ہر چیز پر غالب ہیں۔ عورت، گھوڑا،
اقدار اور جنگ۔“

مورال جب تحائف کے ساتھ بھاری انعام داکرام
لے کر امرتسر پہنچی تو اس کا پتہ بیوں نے والہانہ استقبال کیا۔
نام تو اس کے آگے پیچھے بھی جانی جاتی تھی اور بار بار اس کی
ہلامیں لے رہی تھی۔ اس کی ساسی کچھیاں اس کے ارد گرد
جمع تھیں اور بازار حسن کی وہ طوائفیں جن کا مورال سے
راہلہ اور صاحب سلام بھی وہ بھی آ کر اسے مبارکباد دے
رہی تھیں جب ذرا فرصت ہوئی تو مشتری اس کے قریب
آ کر بیٹھ گئی۔
”کیسا رہا تیرا جلسہ۔۔۔ مہاراجا سے کوئی بات
ہوئی؟“ مشتری نے لگاؤ سے پوچھا۔
”اری مشتری! بس کیا بتاؤں۔ اتنا شاندار تھا جلسہ
اور مہاراجا کا کیا پوچھتی ہو۔ وہ تو بس مجھ پر لٹو، وارجا رہا تھا۔
مرداروں اور مہاراجوں کا کیا پوچھتی ہو، نوٹوں کی بارش...
بھادی تھی۔ اس طرح کہ زمین کا منہ بھی اس میں چھپ گیا۔
ہر کوئی تمہاری بہن کے حسن کی تعریف کرتے مزا جا رہا تھا۔“
مورال نے الفاظ کو خوب سانسوار کر بیان کیا اور اس کے
اشتیاق کو ادھر ہوا دی۔
”اب کب جاؤ گی؟“ مشتری نے دوبارہ پوچھا۔
”بہت جلد وہ پھر مل جائیں گے۔“
”کوئی ایسا بندوبست نہیں ہو سکتا کہ میں بھی تمہاری
محبت میں لاہور دیکھ آؤں۔ کچھ بڑا دل کرتا ہے۔“
مشتری کی خواہش ڈرتے ڈرتے بھی زبان پر آئی گئی۔
”ارے ذرا میرے پاؤں تو جھنجھو۔“ مورال نے
بنتے ہوئے کہا۔
”کیا کچھ ملا مہاراجا سے؟“ مشتری کا اشتیاق گویا
باتی تھا۔
”اتنا کچھ کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔“ مورال نے بتایا۔
”میں نے تو خاتمے سے بھی کہا تھا کہ اب مورال کے
بعد وہ بھی میرے لیے کچھ کرے۔ اس نے ذمہ داری بھی
لی ہے مگر مورال مجھے پتا ہے۔ وہ میرے لیے کچھ نہیں
کر پائے گی۔ حالانکہ وہ ہمیں شاہی دربار میں پہنچانے کا
سارا صلہ اپنے کھاتے میں ڈال رہی ہے۔“ مشتری نے
بتایا تو مورال اک دم ہنسنے لگی۔
”اس بوڑھی محوس نے میرے لیے کیا کرنا تھا۔ یہ
تو میری شہرت تھی جو خوشبو کی طرح امرتسر سے نکلی اور لاہور
تک پہنچ گئی۔ اس میں خاتمہ کا کوئی ہاتھ نہیں تھا، تعین کرو۔ وہ
محبوبت کہتی ہے۔“ مورال نے غصے میں بتایا۔
”لگتا مجھے بھی یہی تھا مگر میں خاموش رہی۔“ مشتری

مہترین سرگزشت
میں نا سائیں رہنے کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

سرگزشت
ماہنامہ

شمارہ مارچ 2018ء
کی جھلکیاں

میل میز

ڈاکٹر ساجد امجد کی لا جواب تحریر
ایک سپر کاسل کی زندگی کے واقعات

تلاش

زویا اعجاز کے شر بار قلم کا شہکار
ایک بڑی شاعرہ کی حالات زندگی

بلبل بستان

انور فرہاد کی ایک دلچسپ تحریر،
پاکستان کی مشہور گلوکار کا احوال

ملازیم کیسی

اس شاعر کا تذکرہ جو دہلی ہند
متا سگرارے نے بی کی موت ملی

پچھتاوا

نضہ خان کی ایک ایسی
سچ بیانی جو برسوں یاد رہے گی

دشمال سے ٹورنٹو، ندیم اقبال کا ایک دلچسپ
سفر نامہ۔ ”ناسور“ ایک لہورنگ آپ بیتی اور بھی
بہت سے سچے واقعات، دلچسپ سچ بیاناں

ایک والہانہ محبت کرنے والے کا اپنی محبوبہ کے لیے اصول تحفہ تھا!

☆☆☆

دھنکی کلاں کا گاؤں پاکستان اور ہندوستان بارڈر سے تین میل واکہ امرتسر کی طرف واقع ایک چھوٹی سی آبادی پر مشتمل ہے۔ یہ امرتسر ریلوے اسٹیشن سے تقریباً 35 کلومیٹر دور ہے۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کی راستے سے گزر کر امرتسر میں داخل ہوا کرتا تھا۔ دھنکی کلاں میں مین بارڈر کے سرے پر مہاراجا جانے اپنے ٹھہرنے کے لیے ایک بارہ دری بنوائی ہوئی تھی۔ وہ جب لاہور سے زمینی راستے کے ذریعے امرتسر جاتا تو کچھ دیر کے لیے اس بارہ دری میں ٹھہر کر آرام کرتا پھر آگے کی طرف روانہ ہوتا تھا۔

مغل شہنشاہ شاہ جہاں نے ایک نہر دریائے راوی سے نکال کر شالیمار باغ تک پانی پہنچانے کو نکالی تھی جو دھنکی کلاں انڈیا سے گزر کر بارگیا تک پہنچتی تھی۔ یہ نہر انکی زیادہ گہری نہ تھی۔ اس کا مقصد صرف پانی..... شالیمار باغ اور ٹھوڑا بہت قریبی زمینداروں کی زمینوں تک پہنچانا تھا۔ نہر چونکہ بارڈر پر تھی اس لیے اس پر آنے جانے کے لیے کسی پل وغیرہ کا انتظام نہ تھا یہ نہ کہ اس زمانے میں زیادہ تر سفر گھوڑوں پر کیا جاتا تھا۔ لہذا امرتسر کو جانے والے گھوڑے نہر میں سے گزر کر جاتے تھے۔

رنجیت سنگھ بھی جب لاہور سے کسی سلفنتی امور کے لیے یا پھر زیارت کے لیے امرتسر جاتا تو یہی نہر عبور کر کے جاتا تھا۔ موراں سے اب اس کے تعلقات محبت میں تبدیل ہو چکے تھے۔ لیکن پورہ گاؤں کے قریب دربار مہاراجا رنجیت سنگھ میں ناچنے کے لیے بلائی جانے والی موراں اب رنجیت سنگھ کی سوچوں بلکہ اس کے خواب و خیال پر پورے طور پر قبضہ کر چکی تھی۔ یہ موراں کی ذہانت تھی۔ ادا میں، حاضر خوابی یا پھر وہ اتھرا پن تھا جس کا رنجیت سنگھ دلوانہ ہو چکا تھا۔ امرتسر کے بازار حسن سے روزانہ لاہور کے دربار میں مہاراجا سے ملنے کے لیے آتا یا مہاراجا کالاہور سے امرتسر... جا کر موراں سے ملنا جہاں دونوں کے لیے نامکمل تھا، وہاں یہ دونوں کی رسوائی کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ لہذا یہ رنجیت سنگھ کی تجویز تھی کہ جب وہ موراں کو بلائے گا، اس بارہ دری میں جو کہ انڈیا سے امرتسر کی جانب تقریباً 500 فٹ کے فاصلے پر ہے۔ اس کی دائیں جانب ایک سڑک ہے جو انال گڑھ جاتی ہے۔ انال گڑھ سے آگے موڈی گاؤں ہے جہاں جا کر نہر کے کنارے یہ سڑک ختم ہوجاتی ہے۔

”یہ بچ ہے اور میرے دل کی آواز ہے۔“ رنجیت سنگھ بارہ والا۔

”نوب صورتی، حسن، دل پذیر اور خوش شکل موراں کی بانی بھی تعریف کی جائے وہ سچ ہے اور کم ہے۔“ رنجیت سنگھ نے ہنستے ہوئے مزید کہا۔

”خوشو کی ذرہ نوازی ہے وگرنہ موراں کہاں اور مہاراج ذی وقار کہاں۔ کہاں آسمان اور کہاں زمین کی غائب۔“ موراں نے جواب دیا۔

”تو آئیے۔ قدم زرخیز فرما لیکن ایک بات کی چلتے چلتے اور اجازت دے دیجیے کہ جب بھی ہندنے کی طبیعت چاہے وہ آپ کو طلب کر سکے۔“ رنجیت سنگھ نے اسی انداز میں دوبارہ کہا تو موراں جی جان سے خوش ہو گئی۔

”یہ میری خوش قسمتی اور بلند نصیبی ہوگی۔ آپ طلب فرمائیں اور ہندی حاضر نہ ہو۔ اسے موت کیوں نہ آجائے۔ مرجائے ایسی موراں جو آپ کی حکم عدولی کرے۔“ موراں نے اواسے جواب دیا۔ وہ باتیں کرتے کرتے پٹنڈال میں پہنچ گئے۔ رنجیت سنگھ اپنی نشست پر دوبارہ جلوہ افروز ہو گیا۔ رات گئے تک ناچنے دایلوں کے ٹھٹھروؤں کی جھین جھین سنائی دیتی رہی۔ شرا میں پلٹی رہیں۔ وہ پٹائیں رات کو گونسا پھر تاجاب موراں کو ناچنے کی اجازت ملی۔

مختل میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ موراں خراماں خراماں مورنی کی طرح چلتی ہوئی پٹنڈال میں پہنچی۔ اس نے حسب روایت پہلے مہاراجا کی خدمت میں سلام پیش کیا اور پھر ناچنا شروع کر دیا۔ ایک تورت بدلتے کا موسم، بہار آنے کی سوندھی خوشبو۔ ہلکی ہلکی ٹھٹھنی نے موسم کو اور بھی دو اتھہ کر ڈالا تھا۔ پھر اوپر سے مہاراجا کی خصوصی توجہ حاصل کرنے کی خوشی میں موراں مستی میں آئے مور کی طرح ایسا جھوم کر ناچی کہ اسے خود اپنی سادہ بدھ نہ رہی۔ ادھر وہ ناچ رہی تھی اور ادھر رنجیت سنگھ اس پر سکوں کی بارش کر رہا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی ہنسٹ بیلے میں شرکت کرنے والے دوسرے مہمان بھی مہاراج کی خوشنودی حاصل کرنے اور توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کے لیے ٹوٹ اور سکے لٹانے میں ایک سے آگے نکلنے کی کوششوں میں تھے۔ جیسے جیسے رات بھٹکتی جا رہی تھی، مختل کا حسن اور عروج بتدریج بڑھتا چلا جا رہا تھا پھر نہ جانے کب موراں تھک کر بیچ کر گئی۔ رنجیت سنگھ بے ساختہ اٹھا اور اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ یہ

اور ایک جگہ سکوتی سر پرستی میں باقاعدہ ناچ گانے کا ارتقا کیا جاتا تھا جس میں لاہور کے سکوتی لہکار، افسران، فوجی سپاہی اور راجے مہاراجے شریک ہوتے تھے۔

اس بار بھی اسی بارغ میں ناچ گانے کا ایک متن پروگرام ترتیب دیا گیا تھا جس میں رنجیت سنگھ بہ نفس شرکت کر رہا تھا اور اس نے ملک بھر سے طوائفوں کو اس میلے میں شرکت کی دعوت دے رکھی تھی۔ امرتسر کے بازار حسن کی مشہور طوائفوں کو بھی ہنسٹ میلے میں شرکت کے لیے باقاعدہ دعوت تانے بھجوائے گئے تھے۔ ان میں موراں کی خصوصی طور پر بلوایا گیا تھا۔

موراں بے حد خوش تھی کہ بہت جلد اسے دوبارہ مہاراجا سے ملاقات کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ اس کے ذہن میں مہاراجا کی پہلی ملاقات میں ہونے والی تمام خوشگوار یادیں اور باتیں دوبارہ سے جھانکنے لگی تھیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اڈکر لاہور پہنچ جائے۔ اس بار اسے ازخود لاہور شالیمار باغ میں پہنچنے کا حکم ملا تھا۔ رنجیت سنگھ کے حاکم لاہور ہونے سے شالیمار باغ اس کا پسندیدہ تفریحی مقام بن گیا تھا۔ سکوتی لہکاروں کے علاوہ یہاں دوسری ممتاز شخصیتیں بھی سیر و تفریح کے لیے آ کر کرتی تھیں۔ رنجیت سنگھ تو اکثر جب لاہور شہر کی جس زوہ فضا سے تنگ آ جاتا تو یہاں آ جاتا تھا اب تو ہنسٹ میلا منانے کے لیے خصوصی طور پر اجہتا کیا گیا تھا۔ دلائی شرایوں کی صراحیاں منگوائی گئی تھیں۔ رات گئے جب موراں شالیمار باغ پہنچی تو اس وقت باغ میں میلے کی تقریبات شروع ہو چکی تھیں۔ شراب پانی کی طرح بہائی جا رہی تھی۔ ملک کی اطراف و اکناف سے ناچنے گانے والیاں یہاں پہنچی ہوئی تھیں۔ رنجیت سنگھ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھان کے گاؤں اور ناچ سے محفوظ ہو رہا تھا اور کبھی جب انتہائی موڈ میں ہوتا تو تالیاں بجا کر ان کو داد دینے کے ساتھ شراب کا جام بنا کر دیتا۔ گویا یہ اس بات کی نشانی سمجھا جاتا تھا کہ مہاراجا کو اس کا ناچ گانا بہت پسند آیا ہے۔

جب موراں شالیمار باغ میں پہنچی تو کسی باندی نے رنجیت سنگھ کو اس کی خبر دی۔ رنجیت سنگھ فوراً اپنی نشست سے اٹھا اور اداری تک موراں کا استقبال کرنے پہنچ گیا۔

”زبے نصیب۔ آج پھر دیدار یار ہو گیا۔“ موراں کو دیکھتے ہی وہ گویا ہوا۔

”مہاراج! کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔ اتنا نہ بنائیے کہ ہندی اپنی اوقات ہی بھول جائے۔“ موراں نے

نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے تم بھی یہیں ہو میں بھی ادھر ہی ہوں، چٹا چل جائے گا کہ وہ تمہارے لیے کیا کا تا نہ سرانجام دیتی ہے۔“ موراں نے اسی انداز میں کہا تو مشتری اداس کی ہنسی پنس کر بولی۔

”مجھے پورا یقین ہے وہ کچھ نہیں کر پائے گی۔ بازار حسن میں آنے والے سپاہیوں اور دروغہ صاحبان سے واقفیت ہمارے بازار تک ہی محدود ہوتی ہے۔ وہ بھی اس وقت تک جب تک ہم ان کی مٹھی گرم کرتی رہیں۔ اب اگر ہم یہ کہیں اور دھوکا کریں کہ ہم پورے پنجاب کے صوبیداروں اور فوج کے افسروں سے کام لگوا سکتے ہیں، جھوٹ ہی تو ہے۔ مجھے علم ہے، غام ایسی ہانکا کرتی رہتی ہے۔“ مشتری نے ادا سے کہا۔

”بہر حال تم رنجیدہ مت ہونا۔ مجھے ذرا مہاراجا کی قربت حاصل کر لینے دو، میں تمہیں بھی وہاں تک لے جاؤں گی۔ بس تم صرف دعا کرتی رہو۔“ موراں نے جواب دیا تو وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

ہنسٹ کی تیاریاں اس وقت پورے ہندوستان میں بڑے زوروں پر تھیں۔ رنگ برنگ کی چٹائیں اور کنکوسے بنانے کی اور ڈوریں لگوانے، انکس خریدنے میں لڑکے بالے پوری دھچکی لے رہے تھے۔ نوجوان لڑکیاں، عورتیں اور بوڑھیاں ہنسٹ رنگ کے ملبوسات تیار کر چکی تھیں۔ امرتسر میں بھی لوگ اس روز کو منانے کی تیاریاں مکمل کر چکے تھے مگر سب کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ اگر ہنسٹ کا میلا دیکھنا ہو تو لاہور میں دیکھنا چاہیے۔

لاہور کے شہری شروع دن سے ہی ایسے میلے ٹیلے منانے میں مشغول تھے۔ یہاں کے لوگ پورے جذبے اور پوری دل جمعی سے ایسے دن تیار منانے میں اپنی مثال آپ تھے۔

اس بار بھی لاہور کے شہریوں نے ہنسٹ منانے میں اپنا پورا جوش جذبہ لگا رکھا تھا۔ شالیمار باغ میں باقاعدہ حکومت کی سرپرستی میں میلے کا انتظام کیا جاتا تھا جس میں سکوتی لہکاروں کے ساتھ ساتھ بھنگوے، ناچ اور عیش و طرب کا پورا سامان موجود ہوتا تھا۔ نوجوان لڑکے ڈھول تانے بجا کر پٹنگوں کے پیچ لڑاتے ہلاکار کرتے۔ اندر بنائی گئی دکانوں پر کھانے پینے کی ہر چیز مل جاتی تھی۔ لڑکیاں جھولے جھولتیں اور ہنسٹ سے متعلق گیت گاتی پھرتی تھیں

موران کے لیے یہ حکم تھا کہ وہ بلا دے پر اس بارہوری میں آ جایا کرے۔

پھر یہی ہونے لگا۔ رنجیت سنگھ جب بھی موران کو بلاتا، وہ اس بارہوری میں کس طرح پہنچتی تھی، اس بارے میں کسی تاریخ میں کچھ نہیں لکھا۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ موران رنجیت سنگھ کے بلانے پر سر کے بل چل کر کہاں پہنچ جاتی۔ پھر رنجیت سنگھ کے دو دو ہوانے جی بھر کر راز و نیاز کرتے۔ موران رنجیت سنگھ کے سامنے ناچا کرتی اور کچھ دیر گزار کر وہ واپس امرتسر پہنچ جاتی۔ اب وہ جہاں عوام کی نظروں سے دور ہو کر ملاقاتیں کرتے، وہاں جگہ جگہ الہکاروں کی نظروں سے بھی چھپ چھپ کر یہاں ملاقاتیں کرنے لگے تھے۔

موران امرتسر سے آتی۔ اس نہر کو عبور کرتی۔ پانی کی روانی میں اپنے نازک اور پیید پاؤں دھو کر محبوب پر حاضری دینے آ جاتی اور رنجیت سنگھ کے سامنے مور کی طرح ہنسی۔ پیار محبت کی باتیں کرتی اور واپس چلی جاتی۔ اب دونوں کے راستے میں موسم کی سختیاں بھی حائل نہ ہوتی تھیں۔ مہاراجا رنجیت سنگھ نے موران کو چاندی کے جوتے بنوا کر دیے ہوئے تھے جنہیں پہن کر وہ عموماً پیدل نہر میں اتر کر اسے عبور کرتی تھی۔

گریسوں کی تیز اور چھیتی دھوپیں ختم ہو چکی تھیں۔ سردیوں کی آدھی اور ٹھنڈا موسم اتر آ جاتا تھا۔ جب ایک روز موران کو رنجیت سنگھ کا پیغام ملا اور وہ دھوئی کلاں کی بارہوری میں اس سے ملنے کے لیے امرتسر کے بازار حسن سے نکل کر نہر تک آ پہنچی تھی۔ وہ حسب معمول نہر کے اندر اپنے چاندی کے جوتوں سمیت قدم رکھ چکی تھی کہ اچانک پانی کے ایک تیز ریلے نے اس کے ایک پاؤں سے جوتی کو نکالا اور بہا کر دروڑ لے گیا۔ پانی کی خشک نے اس کے پاؤں کو بھی برف کر ڈالا۔ اس نے کچھ دیر تک جوتی کو ڈھونڈا مگر وہ اس کی پہنچ سے نکل کر دروڑ چلی گئی تھی۔ چنانچہ وہ ایک پاؤں میں جوتی اور دوسرا پیچ پانی سے سرد پاؤں لے کر بارہوری تک پہنچ گئی جہاں رنجیت سنگھ پہلے سے ہی اس کا منتظر تھا۔

”کیا معاملہ ہوا۔ نصیب و شمنان طبیعت تو خشک ہے اور یہ چہرے پر اس قدر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں۔ اتنا انتظار تو پہلے بھی نہیں کروایا تھا۔“ مہاراجا رنجیت سنگھ نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”سب خشک ہے۔ وہ ادھر آپ کی کم بخت نہر نے میرے ایک پاؤں کی جوتی کھالی جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ میرے محبوب کا حلقہ تھا وہ۔ میں اسے

ڈھونڈتی رہ گئی مگر وہ مجھے نہ مل سکی۔“ موران نے اتراتے ہوئے جواب دیا۔

”بس اتنی سی بات تھی۔ ہم آپ کے لیے نیا جوتا بنوا دیں گے۔“ رنجیت سنگھ نے دلار سے جواب دیا۔

”بات یہ نہیں، مجھے فکر یہ ہو رہی ہے کہ میں اب واپس کس طرح جاؤں گی۔“ موران بولی۔

”یہ انتظام بھی ہم کر دیں گے۔ آپ کی واپسی بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ ہم اپنے کسی خادم کو کہیں گے، وہ تمہیں امرتسر پہنچا دے گا۔“ رنجیت سنگھ نے محبت سے کہا۔ ”آج کیا میری مورانی مجھے اپنا ناچ نہیں دکھائے گی؟“ رنجیت سنگھ نے دوبارہ سے پوچھا۔

”اوں ہوں۔ نہر کے چٹ پانی سے گزرتے ہوئے میرے پاؤں ٹھل ہو چکے ہیں۔ بہت تکلیف میں ہوں۔ ایسے موسم اور اسٹے ٹھنڈے پانی سے میں پوری زندگی نہ گزرتی اگر آپ کی محبت کی زنجیر میرے پاؤں میں نہ بندھی ہوتی۔ آج میں محذرت خواہ ہوں۔ امید ہے سرکار کی طبیعت پر میرا یہ انکار گراں نہ گزرے گا۔“ موران نے بڑے غمزے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔“ رنجیت سنگھ نے گہرے فکر سے کہا اور پھر اپنے ایک گھڑ سوار خادم کو بلا کر حکم دیا۔ ”اسے امرتسر پہنچا دو۔ جہاں اس کا حکم ہو۔“

”ٹھیک ہے مہاراج۔“ گھڑ سوار نے کہا اور موران کو لے کر امرتسر روانہ ہو گیا۔ رنجیت سنگھ اسی وقت جس نے موران کے لیے پہلے جوتا بنایا تھا کہ اسی ساز کے دوبارہ چاندی کے جوتے بنادے اور دوسری طرف اس نے فوراً حکم دیا کہ دھوئی کلاں کی نہر جس کا پانی شالیمار باغ کو زندگی بخشتا ہے، اس کے اوپر فوراً پل تعمیر کر دیا جائے تاکہ امرتسر سے لاہور اور لاہور سے پیدل امرتسر آنے جانے والوں کے لیے آسانی پیدا ہو جائے۔

چنانچہ حکم کی تعمیل میں فوراً اس نہر پر پل تعمیر کر دیا گیا۔ یہاں کے رہنے والوں کو رنجیت سنگھ اور موران کی ملاقاتوں کا تو علم ہو ہی ہو چکا تھا مگر وہ خاموش اس لیے تھے کہ معاملہ لاہور کے مہاراجا رنجیت سنگھ کا تھا۔ پل کیا تعمیر ہوا، دونوں اطراف کے لوگوں کو ایک سہولت مل گئی۔

ان دنوں ناچنے والیوں کی اتنی قدر نہ رہی تھی۔ مغل دور میں جوانی کی حدود میں داخل ہوتی ہوئی تہذیب اور تمدن اپنی آخری سانسوں پر تھا۔ اقتدار کے ختم ہوتے ہی

اقتدار نے بھی اپنا پانا بدل لیا تھا۔ نئی زبانوں کے اشتراک سے ایک نئی زبان نے جنم لیا شروع کر دیا۔ پنجابی زبان کے الفاظ سفر کرتے ہوئے نئی زبان سے باہم گلے ملنے لگے تھے۔ بازار حسن میں تہذیب سکھانے والی لڑائیوں نے اپنے ہنر لپیٹ لیے تھے اور ان دنوں رقاصوں کی بھی اس قدر وقعت نہ رہی تھی۔ اب انہیں پنجابی پاتر بنائیں کہا جاتا تھا بلکہ ان کی تہذیب اور تضحیک کے لیے انہیں کجری کہا جانے لگا تھا۔ جب موران کی سہولت کے لیے اس پل کی تعمیر کی گئی تو اس پل کو کجری کہا جانے لگا اور یہ نام اس قدر مشہور ہوا کہ بہت جلد زبان زد عام ہو گیا۔ رنجیت سنگھ کی محبوبہ نے اس پل کو دیکھا اور پہلی بار اس سے اتر کر بارہوری میں داخل ہوئی تو اس کو پہلی بار رنجیت سنگھ کی چاہت کا تعین ہوا۔ اس ملاقات میں اس نے پہلی بار اپنے دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے کہا۔

”مہاراج! ہم کب تک دنیا کی نظروں سے چھپ چھپ کر اس بارہوری میں ملنے رہیں گے؟ کیا اب بھی آپ کو موران کی محبت کا تعین نہیں آیا؟“

”یہ تم سے کس نے کہا؟ ہم نے تو پہلے دن ہی اپنا دل بار دیا تھا۔“ رنجیت سنگھ نے آگے سے جواب دیا۔

”پھر اس قدر تعجب کیوں؟“ وہ مزید بولی۔

”مہاراج! تو اپنی جھوٹوں کو فوراً اپنے ٹکڑوں میں ڈال لیتے ہیں۔“ موران نے یہ کہہ کر خاموش اختیار کر لی۔

”اوہ۔ تو یہ بات ہے۔ دراصل محبت کی لذت ہی اس قدر شدید تھی، چاہت کا مزہ ہی اتنا زیادہ تھا کہ کسی اور طرف ہمارا دھیان ہی نہ گیا تھا۔ ہم آج ہی تمہیں اپنے ٹکڑے میں ڈالنے کو تیار ہیں۔“ پھر مہاراج کور اور راج کور (مائی نکلیں) کے بعد وہ تیسری عورت تھی جو مہاراجا رنجیت سنگھ نے اپنے ٹکڑے میں داخل کر لی۔ موران اپنے مذہب کو گلے لگے مہاراجا رنجیت سنگھ کے ٹکڑے میں تو آ پہنچی تھی مگر یہ اس کی عالی ظرفی تھی کہ اس نے کبھی موران کو نہ تو مذہب تبدیل کرنے کو کہا اور نہ ہی اس کو دین پر عمل کرنے سے روکا۔ یہ 1802ء کی بات ہے، جب موران رنجیت سنگھ کے حرم میں داخل ہوئی۔

☆☆☆

مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر نے جب اس بات کو محسوس کیا کہ جب تک دوسرے مذاہب کے لوگوں کو اپنا بیروں کا نہیں بنائیں گا، میری سلطنت کا قیام نہ ہوگا تو اس نے دل میں نشان لیا کہ مذہب اور قومیت سے قطع نظر ہندوستان

کی کل قومیتوں کو اور اس کے باشندوں کو اپنا کبھی ملک میں استحکام اور ترقی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے زیادہ تر ہندوؤں کی لڑکیوں کو اپنے حرم میں داخل کرنا شروع کر دیا کیونکہ ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے بھی زیادہ تھی۔ شہنشاہ اکبر کے اس عمل سے ایک مخلوط قسم کی قومیت نے جنم لیا جس میں ہر مذہب کے مردوں اور عورتوں کو یہ عملی پہنچ مل گئی کہ وہ کسی دوسری قوم کے مردوں اور عورتوں سے بلا تفریق رنگ و نسل شادی کر سکتے ہیں اور سردار و مہاراجوں سے ماحور اعام لوگوں کو بھی اس امر کی عملی اجازت معاشرے نے خود ہی دے دی۔ یہ ایک نہ رکنے والا سلسلہ تھا جو دن بدن آگے بڑھتا رہا۔ سکھوں کے دور میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا، اس لیے جب موران کو رنجیت سنگھ نے اپنے حرم میں داخل کیا تو اس کے مذہب پر کوئی پابندی نہ لگئی اور نہ ہی اسے اپنا مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ حرم میں داخل ہونے کے باوجود موران کے لیے رنجیت سنگھ کے پیار میں کمی نہ آئی۔

انہی دنوں ایک روز موران اور رنجیت سنگھ کل میں اپنے کمرے میں بیٹھے ایک دوسرے سے مذاق کر رہے تھے کہ اچانک موران کو نہ جانے کیا سوچھی، وہ بڑے پیار سے بولی۔

”مہاراج! ایک بات پوچھوں۔ اگر آپ کی طبیعت پر گراں نہ گزرے تو؟“

”پہلے ہم نے آپ کی کسی بات کا برا مانا یا ہے اور پھر یہ کوئی اہم بات ہے جس کی تشنگی اجازت مانگی جا رہی ہے؟“ رنجیت سنگھ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور پھر اس کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے خاموش ہو رہا کچھ توقف کے بعد دوبارہ بولا۔

”کہو۔ چپ کیوں ہو گئیں؟“

”مہاراج! بات بڑی اور منہ چھوٹا ہے۔ مجھے لگتا ہے آپ ناراض ہو جائیں گے۔“ موران نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

”دعہ جو کیا ہے۔ نہیں دل کو لگا میں گے۔ آپ کچھ پوچھو تو سہی۔“ رنجیت سنگھ نے بھی اسی انداز میں اصرار کیا۔

”خضو یہ بتائیں کہ جب خدا خوب صورتی باندھ رہا تھا تو..... اس وقت..... آپ کہاں تھے؟“ موران نے رکتے رکتے کہا۔

”بس اتنی سی بات تھی جسے نیکی بنا یا جا رہا تھا۔ سیدھی سی بات ہے..... جس وقت خدا حسن باندھ رہا تھا، اس وقت میں بادشاہت کی تلاش میں گیا ہوا تھا!“ یہ کہہ کر رنجیت سنگھ اور موران دونوں کھٹکھٹا کر خنس دیے۔

موران خوش تھی کہ وہ گناہ کی تاریکی سے نکل کر شاہی حرم میں آ چکی تھی۔ موران نے برسوں تک رنجیت سنگھ کی رفیقہ کی حیثیت سے زندگی گزار دی۔ اکثر مورچین موران کو رنجیت سنگھ کی بیوی کہتے ہیں جبکہ کچھ اسے مصاحبہ کی حیثیت دیتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، جب سے موران رنجیت سنگھ کے حرم میں داخل ہوئی تھی وہ اس سے بے پناہ محبت کرنے لگا تھا۔ رنجیت سنگھ کے متعلق جو کہا جاتا تھا کہ اسے اتھری گھوڑی اور اتھری رن (عورت) پسند ہے۔ وہ سچ ثابت ہو رہی تھی۔ رنجیت سنگھ کو موران کا چلبلا پسند اور اتھرے انداز بے حد پسند تھے۔ دھنولی کلاں پر تعمیر کیا گیا ”پل کھنری“ اس بات کی واضح دلیل تھا کہ رنجیت سنگھ موران سے کس قدر پیار کرتا تھا۔ یہ نشانہ اس وقت کی تھی جب موران رنجیت سنگھ کے حرم میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ حرم میں داخل ہونے کے بعد ایک روز اس نے اپنے نکال میں یہ حکم جاری کر دیا کہ موران کے نام کا سکہ جاری کیا جائے۔ اس کے حکم کی فوری تعمیل کی گئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان میں جاری کیا سکہ جس پر ملکہ وکٹوریہ کی شبیہ بنی ہوئی تھی، اسی طرح کا ایک نیا سکہ جاری کیا گیا جس پر ملکہ وکٹوریہ کی شبیہ کی بجائے مور کی شبیہ نقش کروائی گئی کیونکہ پنجابی زبان میں لفظ مور کی جمع موران ہوتی ہے۔ یہ تاریخ میں خاص طور پر ہندوستانی تاریخ میں پہلی بار ہوا تھا کہ کسی عورت کے نام کا سکہ جاری کیا گیا ہو۔ موران پردہ نہیں کرتی تھی اور اکثر مہاراجا کے ساتھ رہتی تھی۔ اب وہ کھل کر ریاست کے نہ صرف کاموں میں حصہ لینے لگی تھی بلکہ عوامی فلاح و بہبود کے کاموں کو از خود ترتیب دینے لگی تھی۔

کئی دوسرے مذہب کی عورت کو اپنے حرم میں داخل کرنے اور اسے اس قدر اہمیت دینے پر سیکھ قوم کے ماتھے پر اپنے آپ تھوڑیاں بن گئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک بار امرتسر میں رنجیت سنگھ جیسے دوسری اکال تخت صاحب کے سامنے گیا تو وہاں اس سے یہی سوال کیا گیا۔ تب رنجیت سنگھ نے برملا موران کی محبت کا اعتراف کیا۔

جب موران کی حیثیت تسلیم کر لی گئی تو تاریخ اور آرٹ کی بہتری کے لیے دانشوروں نے فیصلہ کیا کہ چونکہ کھنری کا لفظ لٹھیک کا باعث ہے اور تاریخ میں جب اس کا بار بار ذکر ہوگا تو ایک مہاراجے کی تذلیل کا موجب ٹھہرے

گا اس لیے امرتسر کے اسکول پیرن ڈالے کی پرنسپل سنوین کو سندھو نے پہلی بار یہ ہم چلائی کہ ”پل کھنری“ کا نام تبدیل کیا جائے۔ بڑی رو دیکھ کے بعد نہ صرف امرتسر کی انتظامیہ بلکہ پاکستانی حکام نے بھی سنوین کو سندھو کی تجویز پر عملدرآمد کرتے ہوئے اسے ”پل کھنری“ سے ”پل موران“ میں تبدیل کر دیا۔ تب سے یہ پل موران کے نام سے مشہور ہے۔ شہرت تو موران کے سکے کی بھی ہو گئی تھی۔ آج بھی اگر کسی پرانے اور اس دور کے کسی بوڑھے سے پوچھ لیں، وہ آج بھی اس دور کے روپے کو مبراں ہی کہہ کر بلا لیں گے۔ مبراں دو معنی لفظ ہے جس کا ایک مطلب تو مہر کے لیے جاتا ہے یعنی حکومت وقت سے تصدیق شدہ مہر لگا ہوا اور دوسرے معنی موران کے لیے جاتے ہیں یعنی موران کے اعزاز میں جاری کیا گیا سکہ۔ جب ہندوستان کی تقسیم ہوئی اور پاکستان معرض وجود میں آیا تو سرحدی علاقہ ہونے کی حیثیت سے 1965ء میں ہونی جنگ کے دوران پل موران پاکستانی افواج کے قبضے میں تھا مگر 1971ء کی دوسری پاک بھارت جنگ میں یہ پل سکر بھٹن کے قبضے میں چلا گیا۔ ایک تعزیتی ریفرنس کے ذریعے دونوں اطراف کی حکومتوں نے اس پل کی تاریخی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہاں ایک یادگار بنائی جو وقت کی یورش میں آ کر برباد ہو گئی۔ اسے دوبارہ مشرقی آف ٹور ازم ہندوستان نے پنجاب گورنمنٹ کی تحویل میں دے کر اس کی تزئین و آرائش بحال کروائی۔ اس پل کے نزدیک ایک چھوٹی سی مسجد یا مندر بھی موجود ہے جسے از سر نو تعمیر کر کے ساحلوں کے لیے کھول دیا گیا ہے۔ یہ بارہ درمی تین مختلف حصوں میں تقسیم ہے۔ بارہ درمی کے نزدیک شیومندر تعمیر ہے جو پل موران کی دائیں جانب ٹانگ شاہی اینٹوں سے بنایا گیا ہے جس کی دیواروں اور چھت کو جھللاتے اور جلیلے پتھروں سے سجایا گیا تھا اب جس کی چمک وقت کے ساتھ ساتھ ماند پڑنے لگی ہے۔

اس مندر کے قریب ہی پانی جمع کرنے کے تالاب ہیں۔ اس میں رنجیت سنگھ کے زمانے میں قریبی نہر سے پانی لا کر بھرا جاتا تھا۔ یہ تالاب دو حصوں پر محیط ہے۔ ایک ٹھلا ہوا حصہ مردوں کے نہانے کے لیے ہے اور دوسرا ڈھانا ہوا حصہ خواتین کے لیے ہے۔ اس تالاب میں ایک ٹھلی جگہ بھی موجود ہے جو جانوروں کے پانی پینے کے لیے رکھی گئی ہے۔ ان سے ہٹ کر بارہ درمی ہے۔ وہی مشہور زمانہ بارہ درمی

جس میں دو محبت کرنے والے ملاقات کے لیے آیا کرتے تھے۔ اس کے چہار اطراف بارہ دروازے تھے جو اب وقت کی گردش اور اس بارہ درمی کی طرف توجہ نہ دینے کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں مگر آج تک اپنی حیثیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

☆☆☆

محبت اور دھوکا دو ایسے ستون ہیں جن پر پوری دنیا کی تاریخ اپنی عمارت کے لیے کھڑی ہے۔ ہندوستانی تاریخ کو کسی دور سے بھی اٹھا کر دیکھ لیں، انہی دو الفاظ پر یہاں کی تاریخ محیط ہے۔ رنجیت سنگھ کی حکومت بنانے اور اسے پایہ تکمیل تک لے جانے میں بھی یہی دو عمل کا فرما رہے ہیں۔ رنجیت سنگھ اپنے والد کے مرنے کے بعد دس سال کی عمر میں اپنی مہل کا سردار بنا تو اس میں اس کی والدہ راج کور کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ وہ ایک ذہین اور دور اندیش عورت تھی اور اقلی امور میں بھی بہت اوراد رکھتی تھی۔ بالکل اسی طرح اس کی ساس سدا کور بھی بڑی معاملہ فہم اور بہادر عورت تھی۔ وہ رنجیت سنگھ کے سردار بننے سے لے کر آخر تک اس کے حکومتی معاملات میں اس کا ساتھ دیتی رہی۔ رنجیت سنگھ بھی ہر معاملے میں جب تک سدا کور کا مشورہ نہ لے لیتا ہوئی انکا قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ سدا کور کو ہمیشہ ایک ہی دھڑکا کہ اس کی بیٹی مہتاب کو اپنے بطن سے رنجیت سنگھ کے لیے کوئی بیٹا کیوں نہیں پیدا کر سکتی۔

جب رنجیت کی دوسری بیوی راج کور (بائی نکین) کے ہاں بیٹا پیدا ہوا اور رنجیت سنگھ نے اس کی پیدائش پر نہ صرف بہت بڑا جشن منایا بلکہ تین سال کی عمر میں اس کی منگی کر کے اسے اپنا جانشین بھی بنادیا تو سدا کور کے دل میں حسد پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے اندر ہی اندر تملاتی رہتی تھی کہ مہتاب کور کیوں جانشین پیدا نہ کر سکی۔ اس کے اندر چلنے والا حسد اسے رنجیت سنگھ کی سادگی اور اعتماد کو دھوکا دینے کے منصوبے بنانے لگا۔ انہی وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی کہ رنجیت سنگھ ایک اور پری وٹ اور دربار مسلمان راجہ موران کو اپنے حرم میں ڈالنے کے منصوبے بنانے لگا اور پھر بہت جلد وہ اسے اپنے محل کی زینت بنانے میں کامیاب بھی ہو گیا۔ یہ دیکھ کر اس کے جلائے میں اور بھی اضافہ ہو گیا کہ اگر اس کے بطن سے بھی کوئی کھڑک سنگھ پیدا ہو گیا تو وہ بھی راج سنگھان کا حصہ دار بن جائے گا۔ لہذا اسے جلد از جلد اس کوئی تدارک کرنا ہوگا۔ اس وقت تک رنجیت سنگھ لوگوں اور اپنے رشتے داروں کی باتیں سن کر گرج رہا تھا کہ اس

کی والدہ راج کور اور لکھ پتی رائے کے آپس میں ناجائز تعلقات ہیں۔ اس معاملے کو رنجیت سنگھ نے برسرِ اقتدار آتے ہی سنبھال لیا تھا۔ لکھ پتی رائے کو حاصل کی وصولی کے دوران کسی نے مل کر دیا۔ قاتل گرفتار تو نہ ہو سکے البتہ یہ انواہیں ضرور گردش کرنے لگیں کہ اسے مردانے میں رنجیت سنگھ کا ہاتھ ہے۔ اس قتل کی بازگشت باقی بھی کہ رنجیت سنگھ نے اپنی والدہ راج کور کو بھی زبردستی کر مراد یا۔ اب سدا کور کے لیے بھی راستہ صاف ہو چکا تھا۔ کیونکہ رنجیت سنگھ کو کسی ایسے باوقاسی کی ضرورت تھی جو اس کے معاملات میں اس کی مدد کر سکے۔ سدا کور نے بہ احسن و خوبی ان معاملات کو اپنے ہاتھ میں لیا اور ہمہ وقت رنجیت سنگھ کو بہتر سے بہتر مشوروں سے نہ صرف نوازا رہی بلکہ اکثر مہمات میں رنجیت سنگھ کے شانہ بشانہ کھڑی رہی۔

لیکن اس کا کیا عمل تھا کہ جتنا رنجیت سنگھ سدا کور پر اعتماد کرتا تھا اور اس کے ہر مشورے کو قبول کرتا، یہاں تک کہ جب اس نے اپنی سلطنت کی راج دھانی لاہور محل کی تب بھی وہ سدا کور سے مشورہ کرنے بلالہ تک سفر کرتا تھا لیکن اس کی بیٹی اور رنجیت سنگھ کی بیٹی بیوی مہتاب کور کو شروع دن سے ہی رنجیت سنگھ سے نفرت تھی۔ دونوں ماں بیٹی کے اپنے اپنے دکھ تھے۔ سدا کور کے دکھ میں کھڑک سنگھ کی پیدائش اور اوپر سے موران سے رنجیت سنگھ کی مصاحبت نے اور بھی اضافہ کر ڈالا تھا۔ پھر ایک اس کے ذہن میں ایک منصوبہ آیا۔ اس منصوبے پر وہ بی جان سے عمل کر کے اسے پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتی تھی تاکہ دارشان حکومت کے بڑھنے سے پہلے اس کا تدارک کر سکے۔ 1807ء میں جب رنجیت سنگھ کی طرف مہم کے لیے گیا ہوا تھا تو دونوں ماں بیٹی کے لیے یہ وقت انتہائی اہم اور شاندار تھا۔ سدا کور جانتی تھی کہ مہتاب کور جب تک ماں نہ بنی رنجیت سنگھ کے دل میں بھی اپنی جگہ نہ بنا سکے گی اور وہ صرف مہتاب کور ہی کے ذریعے اپنے داماد پر اپنے اختیارات کو بڑھا سکتی تھی۔ اب اس کے سوچے ہوئے منصوبے کے لیے وقت آچکا تھا۔ چنانچہ اس نے پورے علاقے میں یہ انواہ پھیلا دی کہ مہاراجا کی بیوی مہتاب کور حاملہ ہو گئی ہے۔ اسے اس بات کا تو یقین تھا کہ جب تک رنجیت سنگھ اپنی اس مہم سے واپس چلے گا، اس وقت تک بچے کی پیدائش کا وقت پورا ہو چکا ہوگا۔ ہوا بھی وہی۔ جب کچھ وقت گزر گیا تو سدا کور نے انتہائی خوشی کے ساتھ اعلان کیا کہ رنجیت سنگھ کی پہلی بیوی مہتاب کور نے بڑوں

بچوں کو جنم دیا ہے۔ مہاراجا کی عدم موجودگی اس کی ساس کے منصوبوں کے لیے بہتر ثابت ہوئی۔ جس رات عوام میں یہ اعلان کیا گیا کہ رانی مہتاب کو رہنے والے بچوں کو جنم دیا ہے، اس سے ایک روز بیشتر دونوں بچوں کو ان کے والدین سے خرید لیا گیا تھا۔ سدا کو رہنے والے ان بچوں کو رانی مہتاب کو رکھ دیا گیا تھا۔ سدا کو رہنے والے ہی ان کے نام بھی تجویز کر دیے تھے۔ شریٹھ کو صلح ہوشیار پور میں ایک جولا ہے سے خرید لیا گیا تھا جو ایک جاگیر دار کی حیثیت سے مانی سدا کو رکھ لایا تھا اور دوسرے بچے تارا سنگھ کو سدا کو رہنے ایک مسلمان کنیز رانی کی بیٹی سے خرید لیا تھا۔

ان دونوں بچوں کی ماؤں اور خاندان کو بہترین نوازشات اور انعام و اکرام سے نوازا گیا تھا تاکہ ان کے منہ ہمیشہ کے لیے بند رہیں۔ سدا کو رکھ معلوم تھا کہ رنجیت سنگھ باپ بن جانے کے تصور کو پسند کرتا ہے لہذا اس نے بھی ان کو بطور اولاد قبول کر لیا اور اپنی پوری زندگی ان کے ساتھ حقیقی اولاد کا سلسلہ کیا۔

شریٹھ کی نانی اور رنجیت سنگھ کی ساس سدا کو رکھ ایک غیر معمولی ذہانت کی مالک عورت تھی۔ وہ رنجیت سنگھ کی طاقت کا سرمایہ اور اس مہاراجا کے لیے ایک ایسی بیڑی تھی جس کی مدد سے وہ عظمت کی چوٹی پر پہنچنے کے قابل ہو سکا تھا۔ وہ اس کی کوششوں میں اس کی سہمکتی تھی اور اس کی توانائی، سازشوں اور اثر رسوخ کے باعث اپنے ابتدائی کارناموں میں کامیابی حاصل کر پایا تھا۔ وہ ایک بہادر، طاقتور تیز مزاج کی عورت تھی جس نے ایک منصوبے کے تحت اپنے داماد کے اعتماد کو دھوکا دیا مگر اپنی بیٹی کا اپنے داماد کی نظروں میں مقام ضرور بحال کر دیا۔ یوں ایک طرف دھوکا تھا، فریب، خود غرضی اور مکارانہ منصوبوں کی تکمیل کے ارادے تھے تو دوسری طرف محبت تھی۔ صرف محبت جس میں نہ تو کوئی فریب تھا، نہ دھوکا تھا۔ مورال اور رنجیت سنگھ کی یہ محبت اپنے منہم ارادوں سے پروان چڑھتی جا رہی تھی۔

محبوب بھرے ایسے ہی ایک دن مورال نے رنجیت سنگھ کے پیار سے معمول رکھوں میں پوچھا۔

”مہاراج! آپ کی کنیز ایک اور بات کی اجازت چاہتی ہے۔“

”مورال! تم کنیز نہیں ہو۔ میرے دل کی رانی ہو۔ سکھ اپنا وہ چہن دے کر بھی اس سے منہ نہیں موزا کرتے۔“ رنجیت سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مہاراج! جس طرح آپ کے امیروں اور وزیروں کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنے فلاحی اور عوام کے لیے بنائے منصوبوں کی از خود تکمیل کراتے ہیں، ہندی کو بھی اس کی اجازت مرحمت فرمادی جائے کہ وہ بھی اپنے من میں سوچے منصوبوں کو مکمل کر داسکے۔“ مورال نے رکھتے رکھتے اپنی بات پوری کی۔

”یہ تو کوئی بات نہیں۔ تمہیں اس کا مکمل اختیار ہے بلکہ میں آج ہی یہ احکام جاری کر دیتا ہوں۔“ رنجیت سنگھ نے پیار سے جواب دیا۔

”میں یہاں ایک بارغ بنوانا چاہتی ہوں۔ موری دروازے کے سامنے۔“ مورال نے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔ تم جگہ پسند کرو۔ موری دروازے کے اندر کی جگہ خالی ہے۔ وہاں بارغ بنوا سکتی ہو۔“ رنجیت سنگھ نے کہا۔ ”تم تو یہی سوچ رہی ہو۔ لاہور سے شریچور جانے والی سڑک سے ذرا تر کر ایک جگہ خالی ہے۔ میں وہاں تمہارے نام سے گاؤں بنانے کا ارادہ کر چکا ہوں اور میرے اس منصوبے پر کام بھی جاری ہے۔“ رنجیت سنگھ نے توقف کے بعد اپنی بات کو آگے بڑھایا۔ ”وہ تمہارے نام پر مورال والا گاؤں کہلائے گا۔“

”میں کسی زبان سے آپ کی محبت کا اعتراف کروں۔ آپ دائمی عظیم ہیں۔“ مورال نے کمال تشکر آمیز لہجے میں کہا اور اپنا سر رنجیت سنگھ کی چھاتی سے لگا دیا۔

☆☆☆

انسانی زندگی وقت کے بحرِ خزاں میں ایک کشتی کے مانند ہوتی ہے جو خرابیاں خرابیاں پھلتے، لجات کی لہریں جھیلے ہوئے اپنے اتم سائل کی طرف بڑھتی رہتی ہے اور جو بھی وقت آتا ہے، وہ کنارے سے لگ جاتی ہے۔ اس سفر میں آنے والے اٹھری اور اونچی نیچی لہریں رکاوٹیں بھی پیدا کریں تو منزل کی طرف جانے والے راستے خود بخود دینے بڑھتے رہتے ہیں۔ قدرت جہاں منزل تک پہنچنے کا راستہ استوار کرتی ہے، وہاں وہ منزل سے بھٹکا بھی دیتی ہے۔ بہر حال یہ بات طے شدہ ہے کہ انسان پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب وہ گناہوں کی دلدل سے نکل کر مذہب کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ یہی اس کی فلاح کا راستہ ٹھہرتا ہے۔

مورال رنجیت سنگھ کے حرم میں گیا اتری، گویا اس کے ذہن نے تسلیم کر لیا تھا کہ اب اس سے آگے بڑھنا اس کے نصیب میں نہیں ہے۔ وہ گناہوں کی دلدل میں بہت دیر تک ہاتھ پاؤں مار رہی مگر اسے کہیں بھی ذہنی سکون نہ مل

پایا تھا۔ اب اسے ایک بے پناہ پیار کرنے والے انسان کی امیابی کی ملی، اس نے اپنے ذہن کی ساری گندگیوں سے ہمارا حاصل کرنے کا سوچا اور اپنا رجحان دینی، فلاحی کاموں کی طرف لگایا۔ جب سے اس بات کی آزادی ملی تھی کہ وہ جو چاہے منصوبہ بنا کر اس پر عملدرآمد کر سکتی ہے، رنجیت سنگھ نے بھی اس کے ان کاموں کو نہ صرف سراہا تھا بلکہ تمام حکومتی مشینری کو احکامات جاری کر دیے تھے کہ جو مورال کہے، اس پر من و عن عملدرآمد ہونا چاہیے۔ ہوا بھی یہی۔ اس نے جس چیز کی بھی خواہش کی، وہ فوراً اسے میسر کر دی گئی۔ مورال اب نرمی طوائف ہی نہیں تھی جو امر تر کے بازار حسن کی جان تھی بلکہ رنجیت سنگھ کے دل کی ملکہ تھی اور اسے مورال سرکار کا لقب مل چکا تھا۔ اس کے لیے پل مورال بنایا گیا۔ اس کے نام پر مورال والا گاؤں بسایا گیا اور اسی کے نام کا سکڑ ڈھالا گیا جسے ان پڑھا اور عام لوگ موبہراں کا سکھ کہتے تھے۔ یہ سارے اعزازات صرف ایک ہی عورت کو ملے تھے جسے تاریخ مورال کے نام سے جانتی اور پہچانتی تھی۔

ان دنوں نہ جانے مورال کے دل میں کیا پایا کہ اس نے شاہ عالمی اور لوہاری دروازے کے درمیانی بازار میں ایک خالی جگہ دیکھ کر وہاں مسجد بنوانے کا سوچا۔ اس کا ذکر اس نے رنجیت سنگھ سے کیا تو اس نے نہ صرف اس کے ارادوں کو پسند کیا بلکہ وہ بولا۔

”مورال! سرکار! تم نے مسجد کا سوچا۔ یہ بہت ہی اچھا منصوبہ ہے مگر میرے کہنے سے اس میں تھوڑا اضافہ اور کرلو۔“

”کیا مطلب؟“ ”مورال نے حیران ہو کر پوچھا۔“ ”مطلب یہ کہ جہاں مسجد میں تمہارے دین اور مذہب کی عبادت کرنے والے لوگوں کا اجتماع ہوگا اور وہ تمہاری بخشش کی دعا کریں گے، وہاں اس علاقے میں رہنے والے لوگوں کا تم پر اور بھی حق بنتا ہے۔“ مہاراجا بات کرتے کرتے رکا۔

”وہ کیا؟ میں ان ہی کے لیے تو مسجد بنوا رہی ہوں؟“

مورال نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

”جیسا کہ لیکن اگر اس مسجد کے ساتھ بچوں کو دینی تعلیم دینے کا مدرسہ بھی بن جائے تو سونے پر سہاگا ہوگا۔“ رنجیت سنگھ نے کہا۔

”مہاراج! آپ کا دل تمام مذاہب کے لیے کس قدر وسیع اور فراخ ہے میں یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔“ مورال

نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

”مورال! سرکار! دنیا کے تمام مذاہب گردوں کے بنائے ہوئے ہیں اور ہمارے مہمان گردو تا تک کا کہنا ہے کہ سارے مذہبوں کا احترام کرو۔ رنجیت سنگھ مذاہب کے ساتھ ساتھ ان تمام مذاہب کی بھی قدر کرتا ہے جو اپنے اپنے دین کی تبلیغ کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ سے پہلے یہاں حکمرانی کرنے والے سکھوں نے مسلمانوں پر کس قدر مظالم ڈھائے تھے۔ اکثر مساجد، مزارات اور عبادت گاہوں کو تباہ و برباد کیا گیا۔ مسلم بادشاہوں، امراء اور بزرگان دین کے مقابر سے سنگ مرمر اور سرخ پتھر تک اکھاڑ لیے گئے مگر اب یہ نہیں ہوگا۔ میں نے برسرِ اقتدار آتے ہی سب سے پہلے مساجد، بزرگان دین کے مقابر پر سلامی دی۔ میں نے مولوی غلام حسین چشتی، نور احمد چشتی، لال مسجد کے خلیفہ غلام رسول، مولوی جان محمد اور میاں ڈڈا کے مدرسوں میں جہاں درس و تدریس کا کام ہوتا ہے، میری نظروں میں وہ چھبیں قائل قدر اور قابل احترام ہیں۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ میری سرکار جو مسجد تعمیر کرنا چاہتی ہے، اس کے ساتھ بچوں کو دینی تعلیم دینے والا مدرسہ بھی لازمی ہونا چاہیے۔“ رنجیت سنگھ نے تفصیل سے مورال کے ذہن اور اس کی سوچوں میں اضافہ کیا۔

”مہاراج! میں اس بارے میں سوائے منونیت کے اور کیا کر سکتی ہوں۔ اگر آپ میرے ان منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں مدد کرتے ہیں تو اس کی جزا میرا آپ کو دے گا۔“ مورال کی آنکھوں کے گوشے جھپک جھپک تھے۔

”تم ابتدا تو کرو۔ کیا ہوا اگر رنجیت سنگھ تمہارے مذہب سے نہیں ہے مگر اس کے ذہن میں تمہارے مذہب کا اتنا ہی احترام ہے جتنا مذہب تمہارے اپنے ذہن میں بھی نہ ہو۔“ رنجیت سنگھ نے مورال کی آنکھوں سے اتارے آنسوؤں کو اپنی انگلی کی پوروں پر سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

پھر بہت جلد اس علاقے میں ایک خوب صورت مسجد اور ایک مدرسہ تعمیر ہو گیا۔ صاحبانِ فہم و ادراک حکام بالائے اس کو بھی مانی مورال کی مسجد کا نام دے دیا۔ مانی مورال کے دور اقتدار کی یہ تمام نشانیاں آج بھی قائم و دائم ہیں۔

☆☆☆

ستر سال کی عمر میں بھی رنجیت سنگھ کی ساس سدا کو رکھ ریشہ و داناں ختم نہیں ہوئی تھیں۔ اس کے دل میں چھپا ہوا بغض اور حسد ابھی تک زندہ تھا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ ابھی اپنی بیماری سے پوری طرح صحت یاب نہ ہوا تھا کہ کئی سال سے

اس نے نیوی بلور سکرٹ اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا۔ بلاؤز کے اوپری ٹیٹن کھلے ہوئے تھے۔ ایسی تصاویر ہائیس کی دہائی میں ناولوں اور میگزین کے سرورق پر شائع ہوا کرتی تھیں تاکہ پڑھنے والے ان میں کشش محسوس کریں۔ یہ بات اور بھی کہ ان... کامیگزین یا ناول کے مواد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ رچرڈ بھی بچپن میں یہ ناول اور رسالے بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ لیکن وہ کوئی ایسی عورت نہیں تھی جو سرورق کے لیے تصویریں بنواتی اور نہ ہی کوئی مقتدر عورت یا خاتون حکمران جس کا حکم ماننے پر سرور مجبور ہو جائیں بلکہ وہ ایک نوجوان

عہد کی چاشنی میں لپٹی دھوکا دہی کی تخیلوں کا قصہ

وقت اور مستقبل کو پوشیدہ رکھ کر اللہ نے انسان پر احسان فرمایا ہے۔ اگر ان کا پہلے سے علم ہو جاتا تو وہ یہ بستی پھر کہاں سے آتی جو طاقتوں مکار اور مجرموں کے حصے میں بھی اکٹرا جاتی ہے۔ جیسے کہ اس نے ایک چھوٹی سی چوری کر کے شاید اپنی پوشیاری کا جشن بھی منایا ہوگا مگر اسے احساس تک نہ ہو سکا کہ محض بھروسے کی بنیاد پر عنقریب ملنے والی کتنی بڑی جائداد اس کے ہاتھ سے نکل چکی ہے کیونکہ... اسے آنے والے وقت کی کچھ خبر نہ تھی۔

نفع، نقصان

تئوری ریاض



دلپس دیں، بہت کوششیں کیں مگر رنجیت سنگھ نے اپنا فیصلہ بدلنے سے انکار کر دیا۔ سدا کو روک مل تھا کہ اب لاہور میں اس کی کوئی مدد نہ کرے گا تاہم اگر وہ بٹالہ پہنچ جاتی ہے تو کچھ عرصے کے لیے دربار کی فوج کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ پھر بھی اسے مجبور کیا جاتا تو وہ سچ پاراگمریزوں کو اپنی مدد کے لیے بلا سکتی تھی۔ وہ خاموشی کے ساتھ لاہور کے دارالحکومت سے کھسک لی۔ تاہم ابھی زیادہ دور نہ گئی تھی کہ رنجیت سنگھ کو اس کا علم ہو گیا۔ اس نے فوری طور پر گھڑسواروں کا ایک دستہ بھیجا اور اسے قیدی بنا کر واپس لاہور لے آیا۔ دیوان چند اور شام سنگھ کو سدا کو رو کی ریاست کا انتظام سنبھالنے بھیج دیا گیا۔ کہنا قلعوں پر قبضہ کر کے ان کی ملیشیا کو ریاستی فوج میں شامل کر لیا گیا۔ بٹالہ جو کہ ہندیا سرداروں کا آبائی گھر تھا، شہزادہ شیر سنگھ کو دے دیا گیا۔ باقی علاقہ کا ٹکڑا میں ضم کر دیا گیا۔ سدا کو رو قیدی میں مر گئی۔

مہاراجا رنجیت سنگھ اپنے بیٹے کھڑک سنگھ کو اپنا جانشین بنا کر اسے دھیان سنگھ کی سرپرستی میں دے چکا تھا۔ جب 27 جون 1839ء کو اس کا انتقال ہوا۔ مہاراجا کے ساتھ اس کی چار رائیاں اور سات کنیزیں بھی جل کر تھیں۔ اس کے بعد شیر بھر میں اس کا مائی جلوس نکلا۔ تیرہ روز تک اس کی موت کا سوگ منایا گیا۔ شاہی مسجد کے پاس اس کی سادہ تعمیر کی گئی۔ گمیاں گمیاں سنگھ جی کے مطابق مہاراجا نے 8 لڑکے اور 32 رائیاں پھوڑی تھیں جن میں سے چار ستی ہو کر جل گئیں اور باقی زندہ رہیں۔ زندہ رہنے والوں میں موران بھی تھی۔ رنجیت سنگھ کی جینیتی اور پیاری جس کے ساتھ رنجیت سنگھ نے پورے خلوص کے ساتھ جی جان سے پیار کیا اور آخر دم تک اس کا ساتھ دیا۔ موران کا انتقال 1874ء میں ہوا۔ اس وقت لاہور کی سلطنت پر رنجیت سنگھ کا سب سے چھوٹا بیٹا ولپ سنگھ حکمران تھا جو کہ مائی جنداں کا بیٹا تھا۔ اسی کے ہم پر موران کی قبر کو پختہ کر دیا گیا۔ سچ کہتے ہیں، مرنے والے مرجاتے ہیں، مگر ان کی یادیں اور نشانیاں باقی رہتی ہیں۔ سیانوں کا یہ کہا موران پر بھی صادق آتا ہے!

ماخذات:

• عمدۃ التواریخ: سوہن لال سوری توجہ حاکمان پنجاب: اسد سلیمہ شیخ، تاریخ پنجاب: کنہیا لال مہاراجا رنجیت سنگھ، خوشنونت سنگھ، محلہ نقوش: لاہور نمبر، تاریخ پنجاب مع حالات شہر لاہور: سید محمد لطیف، مہاراجا رنجیت سنگھ: سیتا رام کوہلی، کنجڑکا پائل (ناول): یونس جاوید، پنجاب اور بلرونی حملہ آور: پروفیسر عزیز الدین احمد

خوب صورت لڑکی تھی جس نے اپنے ہاتھ میں گن پکڑی ہوئی تھی۔ وہ بریٹا 380 پتول تھا جس نے اسے دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ پتول کا رخ براہ راست رچرڈ کی جانب تھا جو اس وقت لائبریری میں اپنی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ لڑکی نے بائیں ہاتھ کی گن میں ڈی اینڈ کا ٹیسٹس مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا جسے پہچاننے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ ہمارا اس کی سرحد۔ بیوی کی کشانی تھا۔

رچرڈ نے نظریں سمٹھا کر دیکھا تو اسے صوفے پر ایک برساتی پڑی ہوئی نظر آئی جو یقیناً اس لڑکی کی ہی ہوگی۔ گویا باہر بارش ہو رہی تھی۔ وہ حیران تھا کہ بارش کب شروع ہوئی پھر اس نے سوچا کہ کتنے دن سے لارائن اس کے لیے کھانا نہیں بنایا۔ وہ کتنے عرصے سے اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ وہ ان دنوں کا حساب نہیں رکھ سکا۔ اس کا داغ کزور ہوتا جا رہا تھا۔ اسے کوئی بھی مرض لاحق ہو سکتا تھا، چاہے وہ الزائمر ہو، فالج، ہارٹ ایک یا بڑھا چاہے کی وجہ سے ہونے والی کوئی بھی بیماری۔ اسی لیے موت کی خبر دیتے وقت کہا جاتا ہے کہ سب کو ایک دن جانا ہے۔ ممکن ہے کہ اوپر جانے کے لیے کسی خوب صورت عورت کے پتول سے نفلی ہوئی کوئی اتنی بری نہ ہو۔ اس کے باوجود وہ ابھی مرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس کہانی کا آغاز اکتوبر کے آخر میں جے کی ایک سہ پہر سے ہوا۔ نزاں کا موسم شروع ہو چکا تھا اور زرد سرخ چتے ہیز گھاس پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ گھر کی صفائی کے لیے آئی تھی جو کبھی اس کی بیوی کی زندگی میں گھر کی صفائی کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھی وہ اچانک ہی بند ہو گئی۔ رچرڈ اس کی وجہ نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ وہ اس سلسلے میں کس کو ٹون کرے پھر اس کی نظر اخبار میں ہاؤس کلیٹنگ سروسز کے اشتہار پر گئی جس میں ایک عورت کا مسکراتا ہوا چہرہ نمایاں تھا اور اس کے اوپر کھنی کا نام ایس جے فائن کلیٹنگ کھنی درج تھا۔

لارائن اپنے ساز و سامان کے ساتھ اس کے دروازے پر آئی جس میں برش، جھاڑو وغیرہ شامل تھیں۔ وہ ایک پرانے ماڈل کی فورڈ وین میں آئی تھی۔ اس نے کھنی کا یونیفارم سرخ اسکرٹ اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا۔ بلاؤز کے کنارے نزدیک نیل رنگ میں اس کا نام کندہ تھا۔ دیکھنے میں وہ تیس کے لگ بھگ معلوم ہو رہی تھی۔ اسے دیکھ کر رچرڈ کو ناہو کے ناول کی ہیروئن لو لیتا یاد آئی جو کم عمری میں ہی کام کرنے کے لیے گھر سے نکل پڑی تھی۔

اس کی آنکھیں حسرت و یاس کی تصویر بنی ہوئی تھیں، جب اس نے اپنا تعارف کروایا تو رچرڈ کو یوں لگا جیسے وہ اس پیشے سے تعلق نہیں رکھتی۔ کوئی بھی اسے دیکھ کر یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ صفائی کرنے والی عورت ہے۔ رچرڈ نے اسے پورا گھر دکھایا۔ وہ ایک ایک کمرے میں گئے۔ رچرڈ نے غور کیا کہ اس کا یونیفارم کس طرح اس کے متناسب جسم سے چمکا ہوا تھا۔ نہ چاہے کے باوجود رچرڈ کی نظریں بار بار اس کے جسم کا طواف کر رہی تھیں گوکہ وہ جانتا تھا کہ عمر کے اس حصے میں کوئی بھی عورت اس کی جانب متوجہ نہیں ہو سکتی اس کے باوجود وہ اپنی نظروں کو کھینکے سے نہیں روک سکا۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک پردوں والا جھانڈا تھا جس سے وہ بار بار میز، الماری اور کونویں کی طرف اشارہ کرتی۔ اس نے کہا کہ مکان کو مکمل صفائی کی ضرورت ہے اور وہ نہیں سمجھتی کہ اس دھول گرد اور بے ترتیبی میں کوئی کس طرح رہ سکتا ہے۔

”تمہیں شرم آئی چاہے کہ اسے اچھے مکان کا یہ حال کر دیا ہے۔“ وہ تیز لہجے میں بولی، جس میں غصہ اور ناراضی کی جھلک تھی۔ رچرڈ نے اس کی بات کا برا نہیں منایا بلکہ اسے مکان کی تعریف سن کر خوش ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ دکنویرین طرز کا عالی شان مکان تھا۔ بہت سے لوگ اسے حویلی بھی کہتے تھے۔ یہ مکان مرکزی سڑک سے آدھ میل کے فاصلے پر تھا اور وہاں تک جانے کے لیے ایک پختہ سڑک تعمیر کی گئی تھی جس کا اختتام وسیع دھریض پارکنگ لائٹ میں ہوتا تھا۔

”یہ مکان بہت بڑا ہے۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ اس نے رچرڈ کو صاف صاف بتا دیا کہ اسے مناسب حالت میں لانے کے لیے ایک ہفتہ یا ممکن ہے کہ ایک مہینہ بھی لگ جائے۔ رچرڈ نے کہا کہ اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ وہ اس مکان کی صفائی میں... جتنا وقت دے گی وہ اس کے لیے باعث مسرت ہوگا۔ وہ اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنا کام کرے۔ وہ اس کے راستے میں نہیں آئے گا۔ اس نے دل میں سوچا کہ کتنا اچھا لگے گا جب ایک پرخش اور جوان عورت مینگل پیس اور نرنچر سے گھر صاف کرے گی۔ اس کے علاوہ ہاتھ روم، بیڈ روم اور کچن کاؤنٹر کی بھی صفائی کرے گی۔ اسے سب سے زیادہ گھر چاندی کے برتنوں کی بھی جو مناسب توجہ اور صفائی نہ ہونے کی وجہ سے خراب ہو رہے تھے۔

اس مکان کو نظر انداز کرنے اور مناسب توجہ نہ ملنے کی ایک ہی وجہ تھی کہ رچرڈ کو حالات کے مطابق ڈھلنے میں

وقت لگ گیا۔ اس کی بیوی لیزا تیس سالہ رفاقت کے بعد نو ماہ قبل دنیا سے رخصت ہوئی تھی۔ بیوی کی موت اس کی زندگی میں پیش آنے والے حادثات کی پہلی کڑی تھی۔ اس کے بعد تباہیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ یونیورسٹی میں انگریزی کا پروفیسر تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد اس نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی خاطر پھولوں کی دکان میں جزدقی ملازمت کر لی۔ ایک دن وہ گاڑی کے لیے پھولوں کا ایک بڑا گل دان اٹھا رہا تھا، اسے یہ گل دان فرش سے اٹھا کر گاؤنٹر پر رکھا تھا کہ اچانک اسے کمرے کے نچلے حصے میں جھٹکا محسوس ہوا۔ اس کی پوری ٹانگ میں درد کی شدید لہر دوڑ گئی۔ آسنے والے تینوں میں کمر کی تکلیف اتنی بڑھ گئی کہ اسے چلنے میں دشواری محسوس ہونے لگی اور چھڑی کا سہارا لینا پڑا۔ اس نے محسوس کیا کہ جسم سے توانائی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ وقتاً فوقتاً اس نے مکان میں گھومنے کے لیے ڈبل چیز استعمال کرنا شروع کر دی، گوکہ وہ اس کا محتاج نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اس نے موٹر سے چلنے والی وکیل چیز کا بھی آرڈر دے دیا جو اس نے دی کیے اشتہار میں دیکھی تھی۔ چند ہفتے اس وکیل چیز پر سواری کرنے کے بعد وہ اس سے آگاہ محسوس کرنے لگا اور اس نے اس کا استعمال ترک کر دیا اور وہ بھی لائبریری کے ایک کونے میں رکھ دی گئی جس پر گرد و غبار کی تہ جم چکی تھی۔

پھولوں کی دکان میں کام کرنے کے دوران وہ لوگوں کے لیے گلدستے تیار کر کے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ خاص طور پر چھٹیوں مثلاً ویلنٹائن اور درڑے وغیرہ پر اس کی دلچسپی بڑھ جاتی تھی۔ اسے یہ کام کر کے محسوس ہوتا کہ وہ کوئی نیکی کر رہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ پھول اس محبت اور خوشی کی علامت ہوتے ہیں تاہم کمر کی تکلیف بڑھتی گئی اور اسے ملازمت چھوڑنا پڑی۔ دیے بھی اسے کام کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی بیوی بہت دولت مند تھی اور باپ کی جائیداد میں سے اسے معقول حصہ ملا تھا اور اب رچرڈ اس کے اثاثوں کا ادارت تھا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہ دن بدن تنہا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ دن بھر گھر میں اکیلا پڑا رہتا۔ اس سے بات کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے پاس کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ نی دی دیکھے یا کتابیں پڑھنے میں وقت گزارے۔ اس کا قریبی دوست اربل بھی اسی سال کے شروع میں وفات پا چکا تھا۔ دوسرے دوست بھی دنیا سے رخصت ہو گئے یا دوسری ریاستوں میں چلے گئے اور وہ خاص خاص مواقع پر بھی اس کی ٹون کال کا جواب دینے کی

زحمت گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس کے پاس... کوئی مصروفیت نہیں تھی اور وہ اپنی مصروفی کی وجہ سے اتنے بڑے گھر کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا تھا۔ پھر لارائن اس کی زندگی میں آ گئی۔ وہ بڑی جھنجھٹی لڑکی تھی۔ گھنٹوں کے بل جیک کرکچن کا فرش رگڑ رگڑ کر صاف کرتی یا ساری کھڑکیوں کو پانی سے دھو دیتی۔ اس نے پہلے دن کے بعد کچھ نہیں کہا جب اس نے گھر کی حالت دیکھ کر رچرڈ کا مذاق اڑایا تھا تاہم اس کی کچھ باتیں رچرڈ کو بڑی عجیب لگتیں اور وہ انہیں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بہت گہری لپ اسٹک اور آبی شیڈ لگاتی ہے۔ اسے یہ بھی پسند نہیں تھا کہ وہ بار بار بارغ میں جاکر سرکیت نوشی کرے۔

ایک ہفتہ گزرنے کے بعد لارائن نے کہا کہ وہ اگلے سوموار کو آئے گی۔ دوسرے ہفتے کے دوران اس نے رچرڈ سے اس کے گھر والوں خاص طور پر اس کی بیوی کے بارے میں سوالات کرنا شروع کر دیے گوکہ اسے اس کا حق نہیں تھا تاہم وہ ختمہ پیشانی سے اس کا جواب دیتا رہا۔ وہ گفتگو کے دوران بعض مواقع پر ایسا بھی کہتا تھا کہ کوئی نام نہیں دیا جاسکتا تھا جس نے رچرڈ کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ مشکوک کیمیکری کی حامل ہے۔

اپنا کام ختم کرنے کے بعد وہ اس سیاہ رنگ کی ٹویٹا سڈان کا انتظار کرتی جو اسے گھر لے جانے کے لیے آتی تھی۔ رچرڈ نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے اور نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ ٹویٹا چلانے والا کون ہے۔ وہ اس کا بوائے فرینڈ، شوہر یا کھنی کا کوئی ملازم ہو سکتا تھا۔

کچھ بھی ہو۔ اس کی موجودگی کے دوران رچرڈ کو وقت گزرنے کا احساس نہ ہوتا، صبح کا بیٹے یا اخبار پڑھنے کے دوران وہ لارا کو گھر میں منگ منگ کر چلنے پھرتے دیکھتا تو اسے بہت اچھا لگتا اور اسے اپنی جوانی کے دن یاد آ جاتے۔ کبھی کبھی... کام کے دوران وہ کوئی گانا گانے لگتی جسے سن کر رچرڈ مسکراتے لگتا۔

دن گزرتے رہے لیکن وہ یہی کبھی رہی کہ ابھی بہت کام باقی ہے۔ اسے اوپر کی منزل پر تالیفوں، ڈائریکٹ روم کے پردوں اور لائبریری کے فرش کی صفائی کرنا ہے وہ بھی سمجھا کہ لارا کام کو ختم رہی ہے کیونکہ وہ اسے فی گھنٹہ کے حساب سے ادائیگی کر رہا تھا۔ شاید وہ اسی لیے اس کو شش میں بھی کہ اس سے زیادہ سے زیادہ رقم اٹھنے سے رچرڈ کو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ یہ اس کے لیے ایک تفریح

تھی۔ اس کے آنے سے رچڑ کا دل بہل جاتا تھا۔ اگر وہ کچھ نہ کرتی تب بھی وہ اسے صرف آنے جانے کے پیسے ہی دیتا رہتا۔ کم از کم اس کی وجہ سے گھر میں عورت کی موجودگی تو محسوس ہو رہی تھی۔

عرصہ ہوا رچڑ کے لیے پیسے کی اہمیت ختم ہو گئی تھی جس کی بڑی وجہ اس کی صحت تھی۔ وہ ذیابیطس، بلڈ پریشر اور ہائی کولیسٹرول کی دوا میں لیتا تھا۔ اسے سب سے زیادہ غم اس بات کا تھا کہ اس کا کوئی رشتے دار حیات نہیں تھا جس سے لینے دے جاسکا۔ اس کی پرانی مرسدیز گیارہ سال کی کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ایک معقول رقم کی سرمایہ کاری کر رکھی تھی جس کی نگرانی اس کے بنکر کرتے تھے۔ اس کی انکوٹی بنی تیس سال پہلے کار کے حادثے میں ہلاک ہو گئی تھی اور سوتیلا پٹا کٹی رانی کرتے ہوئے ڈوب گیا تھا جب وہ لوگ اپنے گھر والوں کے ساتھ تعطیلات منانے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی بھائی، بھتیجا یا بھانجا تھا جس کے نام جائداد منتقل ہوئی۔ اس کے دیل نے اسے بار بار یہ بات یاد دلائی اور کئی خیراتی اداروں یا درس گاہوں کے نام تجویز کیے لیکن وہ ان اداروں کو کافی طور پر جانکا و منتقل کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ اس کا ماننا تھا، وارثت کے حقدار صرف خونی رشتے یا وہ ہستی ہوتی ہے جس سے محبت کی جائے۔

لارا مستقل طور پر اس کے ساتھ اس بڑے گھر میں براجمان تھی جو پانچ ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف سرسبز قطعہ اراضی تھا۔ وہ چھڑی کا سہارا لے کر اس کے ساتھ باغ میں چہل قدمی کرتا۔ وہ اس سے دنیا جہان کی باتیں کرتی حالانکہ رچڑ کو اس کے ساتھ چلنے میں دشواری ہوتی تھی اور وہ قنات محسوس کرنے لگتا۔ جسم کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی کمزور ہوتا جا رہا تھا اور یہ واضح طور پر انزائم کی علامت تھی جس میں وقت سے پہلے عقل کام کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ اسے اعتراف کرنا پڑا کہ لارا دن بے دن اس کے خیالات پر حاوی ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ شام کو اس کے گھر چلے جانے کے بعد بھی وہ اسی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔

کچھ عرصہ رچڑ نے اس کی نگرانی کی کہ وہ کن کن کام میں کام کر رہی ہے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس نے بھی اس پر نظر رکھنا چھوڑ دی۔ اسے یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ وہ گھر کے کس حصے میں کام کر رہی ہے اور نہ ہی وہ اس سے اس بارے میں پوچھتا بلکہ بعض اوقات تو اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا

کہ وہ کام پر آئی ہوئی بھی ہے۔ اس کا پتا اسے ویکیم کینڑیا لائبریری ڈائریکٹ کی آواز سے چلک جیسے کی سہ پہر وہ اس کی اسٹڈی میں آکر اس ہفتے کا بل دیتی اور وہ خوشی اسے چیک یا نقد رقم کی صورت میں ادا کر دیتی۔

ایک مرتبہ وہ سوموار کے دن نہیں آئی تو رچڑ کو بے چینی ہونے لگی لیکن جب وہ منگل کو بھی نہیں آئی تو اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے اس سے فائن ٹیکنک کمپنی کا کارڈ اٹھایا جو لارے اسے پہلے روز دیا تھا۔ رچڑ نے اپنی عادت کے مطابق اسے اپنے ڈیسک کی خالی دراز میں رکھ لیا تھا۔ اس نے کارڈ پر لکھا ہوا کمپنی کا نمبر ملایا۔

”میں ڈوسری طرف سے کسی نے کہا۔“
”میں کس لارا وائٹ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔“ رچڑ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”کون بول رہا ہے؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔
”میرا نام رچڑ ڈان اسٹڈ ہے۔“

چند لمبے خاموشی رہی پھر اسی آواز نے کہا۔ ”مسٹر رچڑ! تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مس ڈائٹ اب یہاں کام نہیں کرتی۔ اس نے پچھلے ہفتے ہی یہ ملازمت چھوڑی ہے لیکن ہمارے پاس اور بھی ایسے لوگ ہیں اور نیچے بیٹھیں ہے تم تمہارے لیے دوسرا بندوبست کر سکتے ہیں جو تمہیں پسند آئے گا تاکہ آئندہ بھی تمہارے مکان کی صفائی ہوتی رہے۔“

رچڑ خالی نظروں سے اسٹڈی کی دیوار کو گھورنے لگا پھر اس نے کہا۔

”مس وائٹ کے ساتھ کیا ہوا، وہ تمہارے یہاں کام کیوں نہیں کر رہی؟“

ایک بار پھر دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

”میں کس وائٹ کے لیے ہی امرا کروں گا۔“ اس نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ وہ میرے مکان کی صفائی کرے۔“

”میں ٹیبلر سے تمہاری بات کر دیتی ہوں۔“ اس آواز نے کہا۔

کچھ دیر بعد اسے ایک اور زندہ آواز سنائی دی۔

”میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟“

”میں چاہتا ہوں کہ مس وائٹ ہی میرے مکان کی صفائی جاری رکھے۔“

”مجھے افسوس ہے جناب۔“ نیچر نے کہا۔ ”لیکن اب مس وائٹ یہاں کام نہیں کرتی۔“

رچڑ میں ان لوگوں سے بحث کرنے کی مزید طاقت

نہیں تھی۔ اس نے جھلا کر فون رکھ دیا۔ چند قدم چلتا ہوا لڑائی تک گیا اور آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔ وہ سہ پہر ۱ بجے بہت طویل محسوس ہو رہی تھی۔ شام میں بارش شروع ہو گئی۔ اس کی ٹینڈ غائب ہو چکی تھی۔ وہ ہستہ سے اٹھ بیٹھا اور لہائی سے باہر جھانکنے لگا۔

ایک اور دن گزر گیا۔ اس نے چھڑی کی مدد سے گھر سے گھر میں گلی تک کی روٹ گزرا۔ ابھی وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتا۔ کبھی ٹیبلٹس پر کھڑے ہو کر بارش کو دیکھتا پھر گھر میں واپس آ جاتا۔ جمہرات کی سہ پہر وہ اسٹڈی میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ دروازے کی کھٹکی بجی۔

اس نے دروازہ کھولا تو سامنے لارا کھڑی ہوئی تھی، البتہ اس نے کمپنی کی یونیفارم کے بجائے بلیو جینز اور سفید قمیص پہن رکھی تھی اور بال بھی ڈائی کروا لیے تھے اور اب وہ سنہری رنگ کے تھے۔ اس کے ہونٹوں میں مسکرت دیا ہوا تھا اور اس کے ہاتھوں پر سیاہ چھترہ تھے۔ اس کے باوجود یہ حقیقت چھپی ہوئی تھی کہ اس کی بائیں آنکھ ڈیڑھی چھپ چکی تھی اس کا کبھی سے جھٹکا ہوا ہوا۔ اسے دیکھ کر رچڑ کو مارلن سٹرو کی جوانی یاد آ گئی۔

اس کے خیال میں یہی لارا کا اصل روپ تھا۔ ایک بار گھر میں عورت جو مرد کو بہکانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہی وہ لارا تھی جسے اس نے اپنی جوانی میں رسالوں کے سروورق پر دیکھا تھا۔ وہ تصور کر سکتا تھا کہ اس کی عورتیں فحشیت فروشوں، دلالوں اور چوروں کی سہیلی ہوتی ہیں۔ اس نے پہلے ہی اسے میں سے تاثر دے دیا تھا لیکن وہ اس پر انگلی نہ اٹھا سکا۔ شاید کمپنی کی ملازمت نے اسے سمجھیں بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اس کے سامنے تنگ جینز اور پی ٹی شرٹ پہنے یوں کھڑی ہوئی تھی جیسے اس کے لیے پوز بنا رہی ہو اور کہہ رہی ہو، یہ میرا اصلی روپ ہے۔ کیا اب بھی تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟

اس کے عقب میں پورچ پر کچھ نیا سامان رکھا ہوا تھا جس میں ایک بائیں ایک دائیں دو صفائی کے کپڑوں سے بھرا ہوا ایک ہنگ اور کینڑی کی بوتلیں شامل تھیں۔ اس نے ہونٹوں سے مسکرت نکالا اور براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”او پر کی منزل کے کمروں میں کچھ کام باقی ہے۔“

اس نے نرم لیکن سختی ہوئی آواز میں کہا۔ رچڑ کا دل بوچھل ہو گیا اور وہ جواب میں کچھ نہ کہہ سکا۔

وہ اس کے پاس سے گزر کر میزبوی کی طرف جانے لگا تو رچڑ پوچھ بیٹھا۔ ”کیا بات ہے۔ آج تم کمپنی کی ملازمت میں نہیں ہو؟“

اس نے جواب میں کچھ نہ کہہ سکا۔

”ہاں۔ میں نے کمپنی کی ملازمت چھوڑ دی ہے اور ذاتی حیثیت میں صفائی کا کام کر رہی ہوں۔“

”وجہ؟“ رچڑ نے پوچھا۔

”وہ سب میرے لیے ناقابل برداشت ہو گئے تھے۔“ اس نے مسکرت کاش لیتے ہوئے کہا۔

”مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا کہ فضول قسم کے لوگوں کے سوالات کے جواب دوں۔ خاص طور پر وہ غیر جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ انھوں نے کس طرح کام لیا جاتا ہے۔“

”میں نے تمہارے بارے میں پوچھنے کے لیے کمپنی فون کیا تھا۔“ رچڑ نے کہا۔

”ہاں۔ میں جانتی ہوں۔“

اس جواب نے رچڑ کو حیران کر دیا لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ بس چپ چاپ کھڑا اسے اوپر دیکھتا رہا۔ چند منٹوں بعد ہی اوپر سے بالٹی پھینکنے اور فرش رگڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ واپس اسٹڈی میں چلا گیا اور وہ ناول اٹھالیا جسے وہ کئی مہینوں سے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کی نظریں اسٹڈی کی دیوار پر جم گئیں۔ لارا کی موجودگی اسے پریشان کر رہی تھی۔ دوسری جانب وہ اس کے واپس آنے پر خوش بھی تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز اسے دوبارہ مل گئی ہے کوکہ وہ قناعت پسند تھا۔۔۔۔ زندگی نے اسے سکھایا تھا کہ بہت سی چیزیں، عشق اور رشتے غرضی ہوتے ہیں پھر وہ لارا کی اتنی پروا کیوں کر رہا ہے جبکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ محض ایک حماقت ہے۔ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس کی نظر میں وہ پرانی فٹوں کا ایک زندہ زنا نہ رہی جو ایک حقیقی عورت کے روپ میں اس کے گھر اور زندگی میں داخل ہو گئی تھی اور وہ کوشش کے باوجود اس سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔

لارے نے ایک بار پھر صفائی کا کام سنبھال لیا تھا۔ اسے باتیں کرنے کا مرض تھا اور رچڑ بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دیر اس کے ساتھ رہے۔ لارا کو کریدنے کی بہت عادت تھی۔ بہت کچھ جان لینے کے باوجود اس کے سوالات کا سلسلہ ختم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اب بھی اس کے خاندان، بیٹی اور بیوی کے بارے میں پوچھا کرتی۔ ایک دن وہ سٹنگ روم کے فرنیچر پر پالش کر رہی تھی کہ رچڑ کو اپنی بیٹی ایملی یاد آ گئی۔ اس نے بیٹی کی پیدائش سے لے کر اس کے بڑے ہونے تک کے واقعات بیان کر دیے۔ لارا اس کی باتیں غور سے سنتی اور سر ہلاتی رہتی۔ کبھی کبھی وہ اس کی بیوی کے قریبی رشتے داروں کے بارے میں بھی پوچھتی۔ اس

لے باتوں باتوں میں رچڑے اس کے مکان کی مالیت اور دیگر اثاثوں کے بارے میں بھی دریافت کر لیا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ رچڑے کے قریبی رشتے داروں میں کون کون زندہ ہے اور اس نے اپنی سادگی میں اعتراف کر لیا کہ ان میں سے اب کوئی بھی نہیں بچا۔

ٹھیک پانچ بجے لارا کو لینے کے لیے ٹویٹا دین آگئی۔ رچڑے نے کھڑکی میں سے گاڑی کو دیکھا، اس کی کھڑکیوں پر سیاہ شیشے تھے۔ اس لیے اسے کبھی بھی ڈرائیور کی شکل نظر نہیں آئی۔ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اور نہ ہی لارا نے بھی اس کا تعارف کر دیا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ ایک طرف تو اس عورت نے رچڑے سے اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں ایک ایک بات پوچھ لی تھی اور دوسری جانب ایسا لگتا تھا کہ ان کے درمیان کچھ ایسی حدود ہیں جنہیں وہ عبور کرنا نہیں چاہتی۔ اب رچڑے کو اس کے بارے میں محسوس ہونے لگا کہ یہ عورت کون ہے جو اس کی زندگی میں دھڑلے سے داخل ہوئی ہے۔

اس نے ایک بار پھر کھینچی کو فون کر کے اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ صرف یہ تصدیق کر سکے کہ لارا دوائٹ نامی عورت نے صرف تین ماہ اس کھینچی میں کام کیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ اس کے عرصہ ملازمت کی تاریخیں بتا سکتے ہیں کہ اس نے کس تاریخ کو کھینچی میں شمولیت اختیار کی اور کب وہ چھوڑ چلی گئی۔

لارا کی ڈیوٹی آٹھ گھنٹے کی تھی لیکن اب اس نے دیر تک رکتا شروع کر دیا تھا۔ وہ صبح آٹھ بجے کام پر آتی اور رات نو بجے سے پہلے واپس نہ جاتی پھر ایک دن اس نے ٹویٹا کے ڈرائیور کے بارے میں بھی بتا دیا۔ وہ اس کا بوائے فرینڈ لری تھا لیکن اب ان میں ٹھیک کی ہوئی تھی۔

”وہ میرے لیے ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔“ لارا نے کہا۔ ”ہمارے درمیان آئے دن جھگڑے ہوتے ہیں۔ وہ کوئین کا عادی ہے اور اس کے دوسری عورتوں سے تعلقات ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے چھوڑ دے۔ میں اسے چھوڑ رہی ہوں۔“

اس کے بعد رچڑے نے اس دین کو ڈرائیور دے میں نہیں آتے دیکھا۔ لارا چند ہفتوں تک کھینچی سے آتی رہی اس کے بعد ایک اور تبدیلی آئی۔ وہ بھی جتنے کا ہی دن تھا جب رچڑے نے کھڑکی سے اسے سوٹ کس سمیت اپنے گھر کی طرف آتے دیکھا۔ اسے یوں لگا کہ جیسے یہ سب کچھ اسی طرح ہوتا تھا اور یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ اور ناگزیر تھا۔

کہ وہ اس کے ساتھ آ کر رہے۔ لارا نے رسماً بھی رچڑے سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ وہ اس طرح اپنا سامان لے کر آگئی جیسے وہ اس کا اپنا گھر ہو۔ اس پر بھی رچڑے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ ایک طرح سے اسے خوشی ہو رہی تھی کہ اب لارا مستقل اس کی نظروں کے سامنے رہے گی۔ اس نے لارا کو ایسکی کا کمرادے دیا۔

سردیاں گزر گئیں اور بہار کا موسم آ گیا۔ لارا چاہتی تھی کہ اسے ہفتے کے اختتام پر معاوضے کی رقم نقد ادائیگی جائے لیکن جب اسے بتایا گیا کہ قانونی طور پر وہ چیک کے ذریعے معاوضہ ادا کرنے کا پابند ہے تو وہ مان گئی۔ رچڑے نے ٹیکس کے حسابات تیار کرنے کے لیے اس کا پورا نام اور سوشل سکیورٹی نمبر لے کر کاغذاتی کارروائی مکمل کی تاکہ وہ بھی ایک ایمان دار اور ٹیکس گزار شہری بن جائے۔ وہ اسے فراخ دل سے معاوضہ ادا کرتا جبکہ بعض اوقات صفائی کا کام برائے نام ہوتا اور بعض اوقات بالکل نہیں ہوتا تھا۔

وہ اپنا زیادہ وقت باغ میں گزارتی اور رچڑے اسے اکثر ویسٹر سیل فون پر باتیں کرتے دیکھا کرتا۔ لارا نے بتایا کہ اس کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہے اور وہ ان سے باتیں کرتی رہتی ہے کیونکہ اس کے پاس وقت گزارنے اور دل بہلانے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ یہی وہ لیونگ روم میں بیٹھی اپنے تانوں کو پالش کر رہی ہوئی یا ایک باکس میں سے چاکلیٹ نکال کر کھا رہی تھی، وہ چاکلیٹ کے باکس لیونگ روم میں رکھتا تھا یہ اسے اپنی بیوی کی یاد دلاتے تھے جسے چاکلیٹ بہت پسند تھے۔ ایک دفعہ اس نے لارا کو کچن میں کاؤنٹر پر رکھے دی پر پروگرام دیکھتے ہوئے پایا۔ ساتھ ساتھ وہ مائیکرو ویو میں گرم کیے ہوئے پاپ کارن بھی کھا رہی تھی۔

ایک روز رچڑے کو کسی نادلی کی تلاش میں لائبریری آیا تو وہ صوفے پر بے خبر سو رہی تھی۔ وہ اگست کا مہینا تھا اور موسم گرم و مرطوب ہو گیا تھا۔ اس نے جینز اور شرٹ پہن رکھی تھی اور جھکے کی ہوائے اس کی قمیض کچھ اوپر کھینک گئی تھی۔ وہ بلاشبہ بہت خوب صورت تھی، رچڑے نے سوچا کہ اگر اس کی بیٹی ایسی زندہ ہوئی تو وہ بھی اس جیسی ہوتی۔ اسے اعتراف تھا کہ وہ بیٹی کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزار سکا۔ شاید وہ اچھا باپ نہیں تھا۔ وہ بے خودی کے عالم میں لارا کو دیکھے جا رہا تھا اور اس کے دل میں اس کے لیے پیار اور ہمدردی کے جذبات اٹھ رہے تھے۔

کسی زمانے میں وہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے ایک

لیفٹیننٹ ولیم فیلس کے ساتھ کسٹری کلب میں باقاعدگی سے گولف کھیلا کرتا تھا۔ بہت جلد ان دونوں میں گہری دوستی ہو گئی۔ ایک دن اس نے اس بے فائن کھینک کھینچی کو فون کیا اور فیلس سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ فوراً ہی لائن پر آ گئی۔

”میں پولیس ڈیپارٹمنٹ سے لیفٹیننٹ فیلس بول رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”میں تمہاری ایک سابق ملازمہ مس لارا دوائٹ کے بارے میں تحقیقات کر رہے ہیں۔ کیا میں تم سے اس سلسلے میں کچھ سوالات کر سکتا ہوں؟“

اس بار فیلس نے کوئی نئی گلی نہیں رکھے بغیر اس کے جانے کی وجہ بتادی۔ ”ہاں۔ ہم نے اسے ملازمت چھوڑنے پر مجبور کیا کیونکہ کھینچی کی کئی چیزیں چوری کر رہی تھی۔ آخر میں اسے پیش رجسٹر سے رقم چراتے ہوئے پکڑا گیا۔ گوکہ ہم کسی جوتی ملازم کا نہیں منظر جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے لیکن لارا کے معاملے میں ایسا کرنا پڑا۔ جب اس کا غزشتہ ریکارڈ چیک کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک سنگین جرم کے سلسلے میں کافی وقت اصلاحی مرکز میں گزار چکی تھی۔“

”شکر ہے۔“ رچڑے نے کہا۔ ”اگر ضرورت ہوئی تو ہم تم سے دوبارہ رابطہ کریں گے۔“

لارا کے ماضی کے بارے میں جاننے کے باوجود رچڑے کی عنایات میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ اس پر اسی طرح مہربان رہتا جانتا تھا۔ ممکن ہے کہ بڑھتی ہوئی عمر کی وجہ سے اس کی عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا ہو۔ ویل کی شدید مخالفت کے باوجود رچڑے نے اپنی وصیت دوبارہ لکھوائی اور سب کچھ لارا دوائٹ کے نام کر دیا۔ اب وہ اس کے تمام اثاثوں بشمول مکان، کار اور لاکھوں کے اس سربلے کی وارث تھی جو اس نے اسٹاک، بانڈز اور پراپرٹی میں لگا رکھی تھی لیکن اس نے لارا کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی بس وہ چاہتا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد لارا کو اس وصیت کے بارے میں معلوم ہو۔

لارا کے شب و روز بڑے مزے میں گزار رہے تھے۔ اس کا دل چاہتا تو تھوڑا بہت صفائی کا کام کر لیتی۔ روزانہ سارا دن ادھر ادھر پھرتی رہتی۔ گھر کی ہر چیز اس کے تصرف میں تھی۔ وہ بھی باغ میں چل جاتی تو بھی اسٹڈی میں بیٹھ کر کتابیں الٹ پلٹ کرتی۔ رچڑے نے اسے بھی کوئی کتاب پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ایک دن وہ اسٹڈی میں بیٹھی چاکلیٹ کھا رہی تھی۔ رچڑے بھی ٹہلکا ہوا اس طرف چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی

آنکھوں سے اداسی جھلک رہی تھی جیسے وہ سستی اور اکتاہٹ محسوس کر رہی ہو۔ رچڑے کو اس پر بڑا ترس آیا اور وہ سوچنے لگا کہ اس لڑکی کو کوئی مشغلہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس نے اپنے لیے فراموشی شراب کا پیگ بنایا۔ اس نے لارا سے کہا۔ ”میں اسٹڈی میں خالی بیٹھ کر قدرت خالق کرتی ہو۔ کوئی کتاب کیوں نہیں پڑھتیں؟“

لارا نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور بولی۔ ”میں زیادہ پڑھی کبھی نہیں ہوں۔“

”کیا تم نے اسکول میں تعلیم حاصل نہیں کی؟“ رچڑے نے پوچھا۔

”میں نے ہائی اسکول میں داخلہ لیا تھا لیکن پڑھائی میں دل نہیں لگا۔ میں بھی اچھی طالب علم نہیں رہی۔ مجبوراً مجھے اسکول چھوڑنا پڑا۔“

اس نے سگریٹ سلگایا اور لارا اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ اس کی سادگی اور مصمومیت نے رچڑے کا دل موہ لیا۔ اسے لارا کے سنہری بال، سیاہ چہرے کی پتلون اور ہزرتا کی قمیض سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔

”اسکول ہر ایک کے لیے نہیں ہوتے ایم۔۔۔۔۔۔“ وہ اسے ایسی کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے پچھلے چند ماہ میں اس عورت کے ساتھ جو وقت گزارا، اتنا زندگی بھر اس کی بیٹی کے حصے میں نہیں آیا۔ لارا اس کے حواسوں پر بری طرح چھا گئی تھی۔

رات کے کھانے پر لارا نے اس کے لیے بھنا ہوا گوشت اور اسٹیم میں لپائی ہوئی گوشتی بنائی۔ کھانے کے دوران اس نے رچڑے کو دان بھی پیش کی۔ اس نے دیکھا کہ وہ اس کی بیوی کا زیور پہنے ہوئے تھی۔ گلے میں ہیروں کا ہار، ہاتھ میں انگوٹھیاں اور زمر کا پریسلٹ۔ وہ سوچنے لگا کہ لارا کب سے یہ زیور پہن رہی تھی۔ اسے یاد تھا کہ یہ زیور ایک مہمان کی کے پاس میں اس کی بیوی کی دوسری چیزوں کے ساتھ بیڈ روم کی الماری میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے لیزا کی موت کے بعد اس کمرے کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگا تھا اور اب لارا صرف زیور ہی نہیں بلکہ اس کی بیوی کا سیاہ لباس، سیاہ موڑے اور اونچی ایڑی کے سیڈل بھی پہنے اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔

رچڑے کو اس بات کی بالکل پروا نہیں تھی کہ لارا نے اس کی بیوی کا زیور یا کپڑے پہنے اس کے برعکس اسے خوشی ہوئی کہ وہ ان چیزوں میں کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ عورت جو اس کے ساتھ جبر جبر موجد ہوئی۔ اس کے بارے میں رچڑے

نے ایک ہی بات سوچی کہ وہ عورت اس کی بن چکی تھی صرف اس کی۔

اس طرح پورا ایک سال گزر گیا۔ لارا بالکل اسی طرح اس کی زندگی کا حصہ بن چکی تھی جیسے کسی اس کی بیوی ہو کر تھی۔ ایک برس قبل یہ ایک مشکل خیر بات تھی لیکن اب یقین ہو چکا تھا کہ اسے لارا سے محبت ہو گئی ہے۔ اسے تو یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ لارا کو اس کے گھر میں رہتے ہوئے کتنے مہینے ہو چکے ہیں۔ وہ صرف یہ سوچ رہا تھا کہ کیا لارا بھی اس سے محبت کرتی ہے اور اس کا جواب اسے بہت جلد مل گیا۔

وہ آخر اکتوبر کی ایک سہ پہر کی جب لارا اسٹڈی میں داخل ہوئی۔ اس وقت وہ ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ کنگلی باندھ کر اسے دیکھنے لگا۔ جیسے وہ وہی عورت تھی جس سے اس نے ساری عمر محبت کی۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو کھو چکا تھا اور اب ان کی جگہ لینے کے لیے یہ عورت آ گئی تھی۔

اس نے نیوی بلیو اسکرٹ اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا۔ بلاؤز کے اوپر کی بن کھلے ہوئے تھے جسے دیکھ کر چرڈ کو اپنی جوانی میں رسالوں کے سرورق پر برائیاں ملے بے باک و شیرازیاں یاد آئیں۔ تو کیا یہ بھی ان جیسی ہی تھی جو اس کا سکون غارت کرنے آئی تھی یا محض ایک سانپوں خوب صورت لڑکی جس نے ہاتھ میں گن پکڑی ہوئی تھی۔

وہ بریٹا 380 پہنوتل تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ میں ہیرن کا ہار پکڑ رکھا تھا۔ چرڈ نے غور کیا کہ اس نے اپنا سوٹ پیس بھی تیار کر لیا تھا جو اس کے عقب میں دروازے کے پاس فرش پر رکھا ہوا تھا۔

”میں زپور لے جا رہی ہوں۔“ اس نے کہا لیکن وہ اس کی آواز میں گھبراہٹ محسوس کر سکتا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ کیا بھی اس عورت نے گن کا استعمال کیا ہے؟ اسے اس بارے میں شہ تھا۔ اس وقت بھی وہ پورے میک اپ میں تھی سنو ری کھڑی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا کہ وہ اپنے پرانے میسرے سے اس کی ایک تصویر بنالے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے پاس یہ گن کتنے عرصے سے ہوئی اور کیا اس نے اس کا لائسنس بنوایا ہے؟ اس بارے میں بھی اسے شہ تھا۔ ایک صفائی کرنے والی عورت کے پاس گن کا کیا کام۔ ممکن ہے کہ یہ اس نے اپنے پرانے بوائے فرینڈ سے چرائی ہو جو اسے مارتا یا مٹھیاں کا دھندلا کرتا تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود اسی نے یہ گن لارا کو دی ہو۔ شاید وہ دونوں اب بھی مل کر وارداتیں کرتے ہوں۔

چرڈ نے اطمینان سے سر ہلایا اور اس سے کہا کہ وہ پُرسکون رہے۔ وہ یہ سارا زپور اپنے ساتھ لے جاسکتی ہے۔ اسے ان چیزوں سے محروم ہونے کی بالکل پروا نہیں تھی۔ وہ تو بس ایک بار لارا کو اپنے بازوؤں میں لینا چاہ رہا تھا لیکن جلد ہی اس نے اس فضول خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ غیر طبی موت نہیں مرنے چاہتا تھا۔

اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب بارش شروع ہوئی۔ لارا نے لپک کر صوفے سے اہارن کون اٹھایا اور پہن لیا۔ پھر چرڈ نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ وہ اپنے ساتھ تمام زیور، نقد رقم اور گھر کی تمام قیمتی چیزیں لے گئی تھی۔ وہ چیزیں جو سوٹ کیس میں بہ آسانی ساسکتی تھیں۔

چرڈ کو اس بارے میں ذرا سا بھی شہ نہیں تھا کہ اگر وہ کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھے تو لارا سیاہ رنگ کی ٹویلا کی طرف جاتی ہوئی نظر آئے گی جس کی ڈرائیو گنگ سیٹ پر لیری اس کا منتظر ہوگا۔ اس لیے اسے کچھ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لارا نے صرف اپنا اعتبار جمانے کے لیے لیری سے قطع تعلق کی کہانی سنائی تھی، ورنہ حقیقت یہ تھی کہ وہ اب بھی اس کا شریک کار تھا۔

لیکن جو کچھ وہ حاصل کر سکتی تھی وہ اس واردات میں کوئی مٹی نقدی اور زیورات سے کہیں بڑھ کر تھا یعنی چرڈ کے مرنے کے بعد... وصیت کے مطابق وہ اس کی لاکھوں کی جائداد اور اثاثوں کی واحد وارث تھی لیکن وہ اس وصیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اسی لیے اس نے دولت حاصل کرنے کے لیے یہ گھٹیا طریقہ اختیار کیا۔ اگر اسے یہ بات معلوم ہو جاتی تو وہ کبھی چھوٹے سے فائدے کے لیے اتنا بڑا نقصان برداشت نہ کرتی۔ چرڈ نے سب سے پہلے اپنے وکیل کو فون کر کے وصیت منسوخ کرنے کو کہا۔ اسے نئی وصیت لکھوانے کی کوئی جلدی نہیں تھی اور وہ سوچ کچھ کہ یہ کام کرنا چاہتا تھا۔

اس کے بعد نہ چاہتے ہوئے بھی چرڈ نے فون اٹھایا اور پولیس ڈیپارٹمنٹ میں فون کر کے کہا۔ ”آفسیر! میں ایک جرم کی رپورٹ لکھوانا چاہتا ہوں۔“

اسے یقین تھا کہ لارا کے شوٹل سیکورٹی کا ڈر کی مدد سے پولیس اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اس کا جو نقصان ہونا تھا وہ ہو گیا۔ کم از کم دوسرے لوگ تو اس کی کارروائیوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔ اس نے تو ایک مٹی سے اسے فائدہ پہنچانا چاہتا تھا لیکن وہ خود ہی اپنا نقصان کر رہی تھی۔

التجا

محمد شوکی

برے وقتوں میں دوست تو دوست ساتھ چلنے والے سائے کی بھی بڑی قدر ہوتی ہے مگر بدقسمتی سے ضرورت کے وقت سب سے پہلے ساتھ چھوڑنے والے بھی ہوتے ہیں۔ وہ خاندان جو طبقاتی اونچ نیچ کا شکار اور پندرہویں کامسنح تھا لیکن نفرتوں کے تیر معصوم بچوں کو بھی زخمی کر گئے کیونکہ... اونچی ذات والوں کو ہر طرح سے برتری حاصل تھی جبکہ انہیں کھل کر سائنس لینے کی بھی اجازت نہ تھی۔

بعد از مرگ..... پکنتی روحوں کی درد انگیز التجاؤں کا قصہ

ٹھٹھک ٹھٹھک ٹھٹھک..... آواز سن کر کمرے میں بیٹھا ساتھ بیٹھنے سال کا ایک آدمی اپنی نیک سیج کرتا ہوا کمرے سے باہر نکلا اور کچھ کہے بغیر مجھے گھورنے لگا جیسے میں کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں۔

”مٹی مجھے کرائے پر کر چکا ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا تو اس کے چہرے پر حیرت مزید گہری ہوئی۔ اس لیے میں نے خود ہی اس کی توجہ اس عمارت کے بالکل اوپر پر گئے بڑے سے بورڈ پر مرکوز کر دی جس پر لکھا تھا..... ”شہر کے

مرکز میں کرائے پر کرنا..... گریہ نہ ہونے کے برابر۔“ مجھے دیکھ کر وہ ایسا شپٹا پیچھے کوئی عجیب چیز غیر متوقع طور پر دیکھ لی ہو..... مگر اسی اثنا میں ایک مولیٰ سی عورت جو اس کی بیوی لگ رہی تھی، باہر نکل آئی اور معاملہ سمجھتے ہوئے خود ہی میرا ایک کھینچتے ہوئے اندر لے گئی۔

”کرائے کے لیے آئے ہو نا؟“

”جی ہاں۔“ میں نے کہا۔ بس پھر تو وہ خاتون بولنا شروع ہو گئی۔

”بہت اچھا کمرہ ایک..... چوتھی منزل پر ہے، بس تھوڑا اور پر ہے۔ خیر تم جو ان آوی ہو..... عمارت کے مالک مسٹر تیس نے چوتھی منزل پر وہ کمرہ اسٹورم کے طور پر چھوڑ رکھا ہے۔ ویسے چوتھی منزل پر رہتا ہی کون ہے، سارا حصہ ہی اسٹورم سمیٹ لو۔“ پھر خود ہی منہ چاڑھ کر بٹھنے لگی۔

بالی چلی منزلوں میں کمرے پر مختلف کمپنیوں کے آفس سے شاید کمرے کوئی نظر نہیں آیا، نہ کوئی بندہ نہ بندے کی ذات۔ سبز بیک میرا بیک لیے آگے آگے چلنے لگی اور مجھے اشارے سے پیچھے آنے کو کہا۔ مجھے یاد ہے جب میں جانے لگا تو دی بڑے مایاں جنہوں نے دروازہ کھولا تھا، مجھے حسرت بھر سے انداز میں غور نے لگے۔ آج میں سوچتا ہوں کہ کاش میں نے ان کی نظروں میں چھپا بیٹام پڑھ لیا ہوتا جو گویا مجھ سے مت کر رہا تھا کہ یہاں کمرے پر مت رہو۔ شاید بڑے مایاں اس عمر میں اس خرافت عورت سے کوئی جھگڑا مول لینے کے موڈ میں نہیں تھے۔

بہر کیف وہ خاتون جس نے اپنا نام سبز بیک بتایا تھا، مجھے کمرے کی بے شمار خصوصیات بتاتی رہی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ بلڈنگ بہت پرانی ہے اور اس کے مالک مسٹر تیس شہر کے مرکزی حصے میں رہتے ہیں مگر اس وقت مسٹر تیس کی ملکیت میں اس بلڈنگ کے کچھ ہی حصہ رہ گئے ہیں۔ بالی وہ بیچ چکے ہیں اور جو باقی ہیں، وہ کمرے پر دے دیے ہیں..... اور اس مقصد کے لیے مسز اور مسز بیک کو چوکیدار کے طور پر نگران رکھا ہوا ہے۔

چوتھی منزل پر پہلے عرصہ پہلے آگ لگ گئی تھی جس کے بعد مرمت کی نوبت نہیں آئی اس لیے یہ دونوں منزلیں خالی پڑی تھیں جہاں تک مجھے یاد ہے سبز بیک نے خالی عمارت ہی کہا تھا مگر میں سمجھا کہ لوگ کم ہوں گے مگر جب میں چوتھی منزل پر پہنچا تو جو بھونکا رہ گیا اس لیے کہ پوری راہداری ایک خوفناک منظر پیش کر رہی تھی۔

دیواریں سیاہ اور دونوں جانب ادھ بے دروازے اور دیواریں..... البتہ آخر کے دو کمرے ٹھیک نظر آرہے تھے۔ غالباً آگ اس طرف سے شروع ہوئی ہوگی مگر آخر تک پہنچ کر بجھ گئی ہوگی۔ اس منظر کو دیکھ کر میرا دل خراب ہونے لگا اور میں نے کہا، میزم یہاں میرا دل بہت گھبرا رہا ہے، براہ کرم میں چلتا ہوں۔ کہیں اور دیکھ لوں گا۔ میری یہ بات سن کر اس نے تونٹو اور نظروں سے مجھے گھورا۔

”دوسری بجیوں کے کمروں کا کرایہ پتا ہے؟ شہر کے اس حصے میں نہیں جانتے کہ..... کرایہ کیا ہوتا ہے؟“ اور یہی میری

دکھتی رگ تھی۔ اس لیے کہ یہ میری زندگی کی پہلی جانب تھی..... میرا آفس شہر کے مرکز میں تھا اور یہ عمارت بھی مرکز میں تھی اور یہاں سے آفس پہنچنا بہت آسان تھا..... اور چونکہ شروع میں مجھے کچھ مہینے انتہائی کم تنخواہ میں بطور ٹرینی کام کرنا تھا اس لیے میرے لیے کسی اور آپشن کا سوچنا چھٹی ٹانگیں تھا۔ اسی اثنا میں ہم کمرے کے سامنے آگئے۔ سبز بیک نے ایک بڑے سے چابیوں کے کچے میں سے ایک چابی نکالی اور کمرے کا دروازہ کھولا۔ میری امیدوں کے برعکس کمرہ اندر سے بہت اچھا اور سجا سجا لگا رہا تھا جس کو دیکھ کر میرے اعصاب پر جو تکی تاثر چھا رہا تھا، وہ زائل ہو گیا۔ اس بڑے سے کمرے میں قالین، بیلے، میز، کرسیاں وغیرہ سب کچھ تھا..... میری حیرت کو دیکھ کر سبز بیک خود ہی بولی۔ ”مسل میں یہاں ایک اور بھلا ناس لڑکا رہتا تھا، تمہاری ہی عمر کا ہوگا..... بے چارہ۔“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”کیا ہوا..... بے چارہ کیوں کہا آپ نے؟“

”اس لیے کہ اس نے کمرے پر آنے کے چند دن بعد ہی کمرے کی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔“

”خودکشی کر لی.....؟“ میں نے گھبرا کر کہا۔

”ہاں..... خودکشی..... مگر اس میں کمرے کا کیا قصور..... اس کا خودی کوئی نفسیاتی مسئلہ تھا۔ کچھ دنوں بعد ہی کہنے لگا ساری رات آوازیں آتی ہیں۔ بچوں کے دوڑنے کی، بچوں کے کھیلنے کی آوازیں۔ اب بھلا دیکھو، یہ عمارت جب سے بنی ہے کوئی پانچ سال ہو گئے۔ اس کا کس عداوت میں لٹکا ہوا ہے جس کی بنا پر اس کی مرمت بھی نہیں کی جاسکتی اس لیے اگر اب مسٹر تیس نے اونے پونے پر کمرے پر کمرہ چڑھانے کا فیصلہ کیا ہے تو اس میں میرا بھی فائدہ ہے۔ اس بہانے مجھے بھی کچھ کیشن مل جاتا ہے۔“ سبز بیک نے اصل بات بتا دی۔

سبز بیک نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا مجھے کون سا یہاں سارا دن رہنا ہے۔ صبح سے شام تک آفس، صرف رات کو ہی آتا ہے اور چھٹی والا دن تو ویسے بھی اکثر دوستوں کے ہاں ہی گزارتا ہے۔

بہر حال اس طرح میں نے کمرہ کرائے پر لے لیا۔ کرائے پر مگر کھینے کے بعد کے چند دن بہت معروف رہے۔ سامان کی منتقلی کے ساتھ چاب کے نئے دن اکثر اوقات رات گئے واپسی ہوئی اور آتے ہی ٹینڈی دادیوں میں کھوجاتا۔ کچھ دنوں بعد میں اس نئی روشنی کا عادی ہو گیا اور مجھے اس ویران اور ادھ بے طور کے آخری کونے میں موجود اپنے کمرے سے ایک طرح کی انسیت ہو گئی اور خوف کا جو احساس ساتھ، وہ نہ

مسل ٹم ہو گیا بلکہ مجھے اپنی قسمت پر رنج آنے لگا کہ شہر کے اس حصے میں کم..... کمرے پر مجھے کمرہ لیا گیا۔ روز جب میں آفس جانے کے لیے بیڑیوں سے نیچے اترتا تو سبز بیک کے کمرے کے سامنے سے ہوتا ہوا گزرتا اور اٹک رہا ہوتا کہ دروازے پر ہوتی یا ان کا مظلوم سا شوہر ہوتا تو مجھے دیکھ کر ہاتھ ہوا میں لہرا دیتا۔ سبز بیک کے برعکس مسز بیک کی آنکھوں میں نظر آنے والا خوف البتہ مجھے ہر بار بے چین سا کر دیتا تھا۔

کوئی تین مہینے بعد ایسا ہوا کہ مجھے دفتری ٹریننگ کے سلسلے میں دوسرے شہر جانا پڑا اور شاید میں چار دن بعد رات دیر گئے واپس آیا۔ واپسی پر مجھے حیرت کا ایک جھٹکا سا لگا کیونکہ میں جس فلور پر رہتا تھا، وہاں کا نقشہ بدل چکا ہوا تھا۔ نئی ہوئی عمارت کے بجائے ایک صاف ستھری سی عمارت، صبح سالم کروں کے دروازے..... میں حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہو گیا۔ اتنی جلدی عمارت کیسے مرمت کر دی گئی..... بہر حال میرا کمرہ ان کا توں تھا اور میں جلدی سے بستر پر دروازہ ہو گیا۔ فالیکارات کے کسی سپر میری آنکھ مل گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اوپر کی منزل پر پہنچے دوڑ رہے ہیں۔ میں بہت حیران ہوا..... کیونکہ اوپر کی منزل خالی بلکہ صرف چھت تھی۔ ہاں ایک دو غالی کوارٹر سے بنے ہوئے تھے جس کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ پہلے عمارت کے ملازمین کے کمرے ہوا کرتے تھے۔ میں نے کچھ برسوں کی کوشش کی مگر آواز بار بار رہی تھی۔ مجھے کافی کوفت محسوس ہوئی اور سوچا کہ صبح سبز بیک سے شکایت کروں گا۔

رات کو آخر کار کسی پہرینڈ آئی تھی۔ صبح سبز بیک سے شکایت کے لیے سوچا مگر پھر یہ خیال آیا کہ عمارت کی مرمت کے بعد سبز بیک لازمی کرایہ بڑھانے کا کہے گی جس سے پہنچنے کے لیے میں جان بوجھ کر کئی کئی کرائے لگاؤں۔ اسی طرح واپسی پر بھی میں نے کوشش کی کہ سبز بیک کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ان کی نظروں پڑنے پائے۔

واپسی پر بھی وہ منظر تھا۔ ایک دو لوگ بھی نظر آئے جو لالہ پنے کرائے دار تھے اور وہ مجھے عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر ایک عجیب سی بے نوری اور زندگی سے دوری کا احساس غالب تھا۔ یہ لوگ اپنے لباس اور چہروں میں ہر دے سے مجھے کافی امیر سمجھ کر دیکھ رہے تھے۔ میں نے نظر انداز کرتا ہوا حسب معمول اپنے کمرے میں چائے پی بستر پر دروازہ ہو گیا اور ٹینڈی دادیوں میں کھو گیا۔ رات کے کسی پہر پچھلی رات کی طرح دوبارہ بچوں کے

ماہر ریاضی

ایک اسٹور کے مالک نے نئے ملازم کو گودام دکھا کر کہا۔ ”تمہیں اس گودام کے سارے سامان کی فہرست بتانی ہے۔“

دو پہر کو مالک نے آکر پوچھا۔

”کہاں تک پہنچے؟“

ملازم فخریہ انداز میں بولا۔ ”جناب! ابھی مونگ پھلی کی ایک ہی پوری سے فارغ ہوا ہوں۔ اس میں کل پندرہ ہزار نو سو ساٹھ مونگ پھلیاں ہیں۔ یہ بالکل صاف ہیں۔ سچرے کی کتنی ابھی باقی ہے۔“

اچھی بات

مالک ملازم سے۔ ”بے وقوف لوگ بھی کبھی کبھی اچھی بات کہہ جاتے ہیں۔“

ملازم۔ ”یہ بات آپ نے بہت اچھی کہی ہے۔“

مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال

دوڑنے بھاگنے کی آوازوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سوچا آج اوپر جا کر ذرا ان بچوں کی خبر لیتا ہوں۔ ہمت کر کے میں نے دروازہ کھولا اور چھت پر آ گیا۔ وہاں واقعی چند گندے سندے سے بچے کھیل رہے تھے۔ یہ چہروں سے بڑے مصحوم لگ رہے تھے مگر ان کے بچنے پرانے معمولی کپڑے دیکھ کر مجھے بہت ترس آیا۔ مجھے دیکھ کر بچے بہر کر رک گئے۔ میں نے قریب جا کر ایک بچی کو ہاتھ سے پکڑا۔ اس کا ہاتھ برف کے مانند ٹھنڈا ہوا تھا۔ چہرہ ایسا ہوا تھا جیسے جسم کا سارا خون نچوڑ دیا گیا ہو۔ خوف کے احساس سے میں نے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیا۔ البتہ بچی کی آنکھوں میں موجود ایک گہری مظلومانہ مصحومیت سی تھی جو مجھے متاثر کر رہی تھی۔ آخر کار خوف کے تاثر اور دم کا جذبہ غالب آ گیا۔ میں نے پیار سے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”نئیسی! بچی نے مصحومیت سے کہا۔“

”تم اتنی رات گئے کیوں کھیل رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔ اس نے ایک عورت جو غالباً اس کی ماں تھی کمرے سے باہر نکلتی نظر آئی۔ ”مسل! ادھر بھر بیٹاری بچی کام کاج میں لگی رہتی ہے۔ رات کو بھی کبھی بچوں کے ساتھ کھیل لیتی ہے۔“

چودھویں کی رات کے چاند میں ذرا روشنی ہو جاتی ہے تا یہاں۔ اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ میں نے اوپر دیکھا۔

دائمی چومیں کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا اور بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ میں بچی کی ماں کی بات سن کر مسکرا دیا جیسے کہہ رہا ہوں اچھا کھیلو، خوب کھیلو اور کچھ دیر بعد نیچے آگیا۔ وہ آوازیں نہ جانے کتنی دیر تک اور آتی رہیں مگر جب میری آنکھ کھلی تو دن نکل چکا تھا اور آفس کو پرہیزی تھی۔ اس طرح کچھ دن اور گزر گئے آوازیں اب بھی کبھی آتی رہتی تھیں مگر میں نے غصے سے غصے میں اس کا غادی ہو چکا ہوں۔ چند دن بعد ایک عجیب بات ہوئی۔ رات کے کسی پہر دروازے پر زور دار دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سات آٹھ افراد جن میں مرد اور عورتیں دونوں ہی تھے، ایک دند کی سی صورت میں کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھا۔ ان میں سے ایک آدمی بولا۔ ”مسز؟“ وہ رکا۔ میں خود ہی بولا۔

”شوٹن۔“

”میں مسز شوٹن۔۔۔۔۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہم سب معززین ہیں اور ہم سب کو کچھ دفاتر جانا ہوتا ہے۔ ملازمین کے بچے جو چھت پر رہتے ہیں، رات بھر شور کرتے ہیں۔ ہماری فینڈ خراب ہوتی ہے۔ یہاں تک کہہ کر وہ رکا اور میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا پھر دوبارہ کہنے لگا۔ ”ہم یہاں ایک درخواست لکھ کر لائے ہیں جس پر تمام کرائے داروں کے دستخط لے رہے ہیں جس کا مقصد ملازمین اور ان کے بچوں کو سزا دینا ہے۔“

”مسز اوینا؟“ میں نے نہ سمجھے کے انداز میں کہا۔

”جی ہاں، سب کے دستخط ہم لے لیں گے تو اس کا مطلب ہوگا کہ ہم سب ہی کا یہ مطالبہ ہے کہ ملازمین کے بچوں کو سزا دی جائے۔ اس طرح انتظامیہ کو بھی اعتراض نہیں ہوگا اور پھر ہم سب مل کر ان کو سزا دیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر انتہائی سفاکانہ کوشی مسکراہٹ آئی۔ میں نے دیکھا اچھے تمام لوگوں کے چہروں پر بھی ایسی ہی مسکراہٹ اور مکروہ مسکراہٹ دیکھ کر رہی تھی۔ اسی لمحے مجھے دائیں جانب کونے میں سکڑی سستی دی وہ پتلی ماں اور اس کی ماں نظر آئی جن سے رات کو میں نے بات کی تھی۔ ان کی آنکھوں میں، میں نے ایک واضح احتجاج دیکھا۔ مجھے ایسا لگا یہ بغیر کہے مجھ سے بیک مائنگ رہی ہوں کہ خدا را اس پر دستخط نہ کرو۔۔۔۔۔ میرا دل بچ گیا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ دستخط نہیں کروں گا۔ میں نے دل کڑا کر کے کہا۔

”دیکھیں حضرات! آپ شیک کہہ رہے ہیں۔ میں نے خود بھی صبح آفس ہی جانا ہوتا ہے مگر اس کا کل یہ نہیں کہ ہم

یوں ان معصوم بچوں کو سزا دیں۔ اس کا کچھ اور مل جیٹھ کر نکال لیتا چاہیے۔“

”کیا؟“ یعنی آپ دستخط نہیں کر رہے؟“ اس نے انتہائی کراخت لہجے میں کہا۔ میں نے دیکھا تمام لوگ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ غالباً اس جواب کی انہیں بالکل توقع نہیں تھی۔

”جی ہاں میں دستخط نہیں کروں گا۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور دروازہ بند کر لیا۔ کچھ دیر تک مجھے دروازے سے باہر غصے میں پھری کھسک پھسکی آوازیں آتی رہیں پھر وہ آوازیں آتا بند ہوئیں۔ میں نے سکھ کا سانس لیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ ابھی کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ ایسا لگا دروازے پر کوئی آہستہ سے دستک دے رہا ہو۔ میں جھلا کر اٹھا اور بیڑی سے دوبارہ دروازہ کھولا مگر اس دفعہ دروازے کے باہر وہی مظلوم عورت اور اس کی معصوم بچی کھڑی تھیں۔ ان کو دیکھ کر مجھے کیوں ہمیشہ کی طرح میرا دل رم سے بھر گیا۔

”ہم آپ کا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں۔ آپ نے دستخط نہیں کیے۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔“ وہ رک گئی۔

”ورنہ کیا؟“

”ورنہ یہیں جان سے مار دیتے؟“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔ جان سے کیسے مار دیتے؟“

”جی ہاں، یہ سب لوگ بہت ظالم ہیں۔ پہلے ہمیں بہت مارتے پھر چھت سے دھکا دے دیتے اور یہ کہہ دیتے کہ ہم نے غربت سے تنگ آ کر خود کشی کر لی۔“ عورت روتے ہوئے بولی۔ میں نے دل میں سوچا یہ عورت بھی ڈر اور خوف کی ایک انتہا پر پہنچی ہوئی ہے۔

”نہیں، نہیں۔۔۔۔۔ ایسا نہیں ہوگا۔ آپ جائیں آرام کریں۔“ یہ کہہ کر میں نے اسے بہلا بھلا کر چلا کر دیا۔

صبح اٹھ کر جب میں آفس جانے کے لیے تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو میرے قدم وہیں رک گئے بلکہ خوف کی ایک لہری میری ریزہ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ میری نظروں کے سامنے وہی پتلی ہوئی خالی عمارت، ادھ جلتے دروازے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ چند دن پہلے جو مرمت شدہ عمارت دیکھی تھی، ابھی یہاں تھی۔ کیا راتوں رات دوبارہ آگ لگ گئی؟ میں نے خود سے سوال کیا پھر جلدی جلدی نیچے آیا۔ اب مسز بیکر کو بتاتے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میں نے سارا ماجرا مسز بیکر کو سنا دیا۔ میری بات سن کر مسز بیکر جو پاس ہی تھے، ہاتھ کا پتے میرے نزدیک آگئے۔ میں وہ لمحات بھول نہیں سکتا جب مسز بیکر کو میں نے بچلی بار بولتے سنا تھا اور ان

لمحظوں میں بھلا بھول بھی کیسے سکتا تھا۔

”سارہ (غالباً مسز بیکر کا نام) اب مجھے اس نوجوان کو بنا ہی لینے دو۔“ مسز بیکر نے لمبا سانس کھینچا جیسے اس نے اٹھارہ ڈال دیے ہوں۔ ”بنا اس عمارت کی ایک تارخ ہے جو ہم سے چھپنا چاہتے تھے اور اس کی وجہ یہی تھی کہ ہم کو اکیسک خود نہیں بنایا تھا اس لیے بھی کہ اس بات کو چند ہی تو ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ آج سے چھ ماہ اس بلڈنگ میں ہی طرح طرح کے لوگ رہتے رہتے تھے۔ خصوصاً جو تھانور جہاں رہائشی کمرے ہیں اس پر کافی لوگوں نے کرائے پر کمرے لیے ہوئے تھے۔ یہ کچھ امیر قسم کے اور کافی حد تک مغرور اور سخت دل تھے۔ سب سے اوپر کی منزل پر دو کمرے تھے جس میں اس بلڈنگ کے ملازمین کا ایک خاندان رہتا تھا جس کے کچھ بچے تھے۔ کبھی کبھار بچے رات کو مکمل کھیل میں مچھت پر چڑھ جاتے تھے جس کی شکایت ان لوگوں نے عمارت کے مالک سے کی۔ اس پر عمارت کے مالک نے کہا۔ کہ اگر سب مالک یہ شکایت ہیں تو ایک درخواست لکھی جائے جس پر تمام کرائے داروں کے دستخط ہوں۔ اگر سب راضی ہوں گے تو ان کے طور پر برطرف کیا جاسکتا ہے۔ ان کرائے داروں کی بھی کیا البتہ مزید یہ۔۔۔ کیا کہ سب نے دستخط کرنے کے بعد ہم ملازم کی بچی کو خود سے بہت مارا تھی کہ زخمی بھی کر دی تھی کہ کچھ دن بعد پتلی ہو گئی۔ کچھ دن بعد اس غم میں ان کی ماں نے بھی عمارت سے چھلانگ لگا کر خود کشی کر لی۔ اس پر تنگ دل کرائے داروں نے بجائے غصے کرنے کے اور خوشیاں منا لیں کہ جان چھوٹی۔ مگر اس اندوہناک واقعے کے چند دن بعد ہی عمارت میں اچانک رات کو آگ لگ گئی اور بہت سے لوگ مر گئے۔ عجیب بات یہ تھی کہ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے ملازم کی بچی پر تشدد کیا تھا اور ان کو قاتل کے لیے درخواست پر دستخط کیے تھے۔“

”درخواست؟“ مسز بیکر کو مجھے اچانک کچھ یاد آ گیا تھا اور وہ خوفزدہ ہو گئے تھے۔

”کیا ہوا، کوئی خاص بات ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا تھا۔

”ہاں، مسز شوٹن آگ لگنے کے بعد عمارت سے ایک مظلوم لڑکی درخواست تھی جس پر سب نے دستخط کیے تھے۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وہ بالکل بھی نہیں جانتا تھا۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک دراز میں سے ایک پرانا مگرج سالم ملچہ نکالا جس میں کوئی تھیں کہ قریب نام لکھے تھے۔

”یہ آخری نام۔۔۔۔۔ یہ تو لکھ رہا ہے بدشعور لکھا گیا ہے۔“

”آخری نام۔۔۔۔۔؟“ مسز بیکر ہنسیائی انداز میں چلائی۔ ”یہ نام ان لوگوں کا نہیں لکھا ہوا۔ یہ اس کرائے دار کا ہے جو تم سے پہلے اس کمرے میں رہا تھا۔ اس کمرے میں رہنے کے کچھ دنوں بعد اس نے عجیب عجیب سی شکایات کرنا شروع کی تھیں کہ رات کو بچوں کے کھیلنے کو نے کی آوازیں آتی ہیں۔ جس پر میں نے غور نہ کیا مگر بعد میں اس نے یہ بھی ذکر کرنا شروع کر دیا کہ اس فلور پر رہنے والے لوگ آگئے ہیں اور فلور کی بھی مرمت کر دی گئی ہے اور یہ کہ دوسرے لوگ بھی اس کھیلنے کو نے سے تنگ ہیں اور وہ سب دل کا لک بھارت سے ایک شکایت کی درخواست لکھ رہے ہیں تو میں اس کے نفیاتی ہونے پر کوئی شبہ نہیں رہا اس لیے کہ ایسے لوگ پہلے ہی آتے رہے ہیں لہذا ہم تو اسے عام سا نفیاتی مریض ہی سمجھ کر گذر رہے ہیں نہ تو نے کرائے دار نظر آئے تھے، نہ ہی عمارت مرمت شدہ نظر آئی تھی۔ پھر۔۔۔۔۔ پھر ایک دن صبح کو اس کی لاش عین کھڑکی کے نیچے مڑ کر پر پڑی نظر آئی جس پر ہم نے یہی سمجھا کہ اس نے خود کشی کر لی۔ اس کے اگلے دن یہ مغلہ میں دوبارہ باہر تین اسی جگہ نظر آیا جہاں پہلے ملا تھا اور اس میں واضح طور پر نئے کرائے دار کے نام کا اضافہ بھی ہو گیا تھا۔“

یہ کہہ کر مسز بیکر تو خاموش ہو گئی مگر کچھ پر صورت حال واضح ہو گئی اور میرا خیال ہے مسز اور مسز بیکر بھی کچھ چکے تھے۔ نئے کرائے دار نے درخواست پر دستخط کر دیے ہوں گے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ملازم کی بچی (روح) کو سزا دینے پر راضی تھا جس کے بدلے میں وہ ملازم اور اس کی بچی (روح) کے انتقام کا نشانہ بنا۔ اس کا صاف مطلب تھا اگر میں کل دستخط کر دیتا تو آج میری لاش بھی ملتی۔ گویا یہ دستخط موت کے پردانے پر دستخط تھا۔

مسز اور مسز بیکر خاموش تھے۔

میں جلالت کے انداز میں ان کے کمرے سے نکل آیا اور اس بلڈنگ سے ٹھوڑا ہٹ کر لیے لیے سانس لے کر اپنے اوسان بحال کرنے لگا۔ اسی اثنا میں میں نے جو مڑ کر دیکھا تو چوتھی منزل پر اپنے کمرے کی کھڑکی پر میری نگاہ پڑی۔ میں نے واضح طور پر دیکھا اور میں یہ بھول بھی نہیں سکتا کہ کھڑکی کے اس پار وہی ملازم اور اس کی معصوم بچی میری طرف دیکھ رہی تھیں اور ان کے چہروں پر ایک مسکراہٹ تھی جو میرے لیے اب اجنبی نہیں تھی۔ البتہ میں بیٹھنے میں شراوردہشت زدہ انداز میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں آج آفس سے واپس اس آئینی عمارت میں رات بسر کرنے دوبارہ آسکوں گا؟

پانچواں حصہ

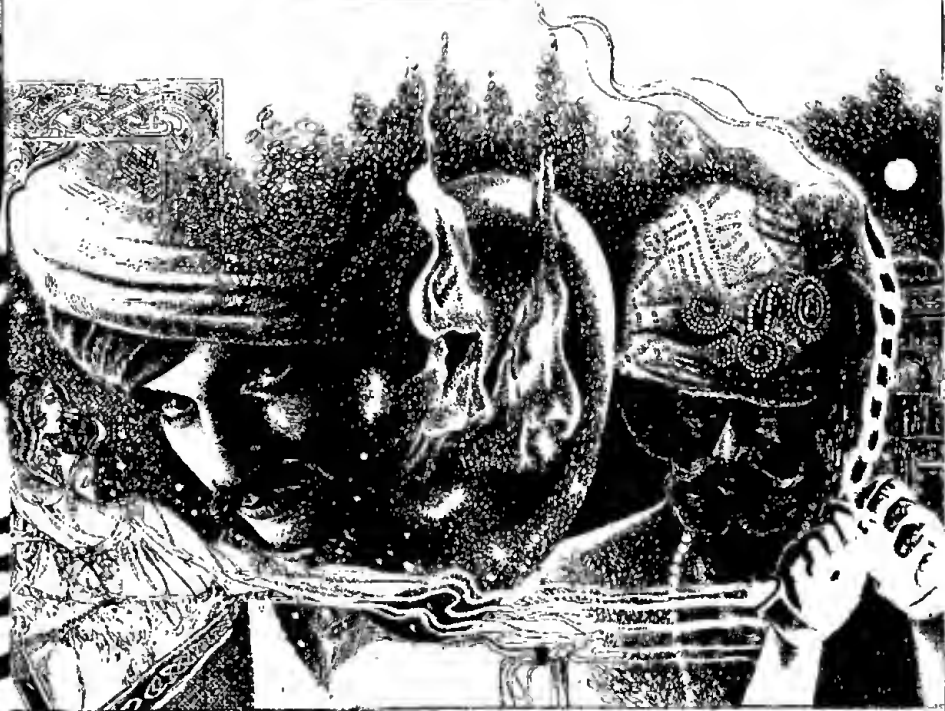
رنگ آسمان

اے۔ آر۔ راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات و شواہد نے خود ترتیب دے کر ان کی زندگی کی بے قرار یوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدان جنگ میں یوں اتر آئے کہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکین کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ... وہ فرنگی حسینہ دلی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرے دیا اور نہ ہی جذباتوں کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

شرق و مغرب کے عجیب استراحت اور تاریخی جنوں خیریں کے عبرت

اثر اثاروں میں لہرائی دلچسپ داستان



مہاراجا چندر گپتا کے لیے بڑی مشکل صورت حال پیدا ہوئی تھی۔

اسے مقدسے کی کارروائی اور اس دوران ہونے والے جھگڑے کے بارے میں اطلاع مل چکی تھی بلکہ یہ اطلاع ایک شکایت کے طور پر مہاراجا کی بددیانتی کے خلاف راج محل آکر اس کے گوش گزار کی گئی۔ اس کے ہمراہ اس کا چہنچا پرس رام بھی تھا۔

بددیانتی کے خلاف ایک دھڑائی ہوئی تھی۔ بانی جسم برہنہ تھا۔ شانے میں مینو پڑا تھا۔ ہاتھ پر بڑا سناٹا تھا۔ گھٹنے ہوئے سر پر موٹی سی چوٹی تھی۔ مہارانی جوبائی بھی چندر گپتا کے بائیں ہاتھ والی ایک نشست پر شاہانہ شکست کے ساتھ براجمان تھی۔ بددیانتی کے کوئی نے شکایت کے لیے بلوایا تھا اور اب یہ ظاہر خاموشی سے جھوٹا تھا۔

”حضور آپ کے مہمانوں کے تو مقدمہ ہارتے ہی کالی کے مندر جیسی پوتر جگہ پر دو گنا فساد کر ڈالا۔ میرے پجاریوں کے ساتھ خوب مار پیٹ کی۔“ بددیانتی کے ساتھ خوب مزاح کر رہا تھا۔ اس نے دانستہ شوکت حسین کا نام نہیں لیا تھا، وہ جانتا تھا کہ شوکت کی حیثیت محض ایک ملازم کی کی گئی تھی۔

”سارار! اب دیکھتے ہیں“ پرس رام نے بھی لقمہ دینا ضروری سمجھا۔ ”مقدسے کی ہارنے اس فرنگن دو شیرہ کے ساتھیوں کے درمیان آپس میں بھی پھوٹ ڈال دی تھی۔ پھر ان کے ہی ایک سٹے کو کر شوکت نے اپنے ہی مالگوں کے ایک آدمی کو بھی گواہی دینے پر پھینک ڈالا اور جب ہمارے ساتھیوں نے ان کے درمیان سچ بچاؤ کرنا چاہا تو وہ مسٹر اسلامان کے ساتھ بھی مار پیٹ کرنے لگا۔ بہت سرچڑھا رکھا ہے اس فرنگن دو شیرہ نے اپنے اس نوکر کو۔“

”مجھے تو حضور اس رنگین مزاج فرنگن اور اس سٹے نوکر کے درمیان کوئی چکر لگتا ہے۔“ بددیانتی نے مہارانی جوبائی والی آگ کو مہاراجا کے دل میں مزید فرزاں کرتے ہوئے کہا۔

”معاف کیجئے گا حضور! اوپر سے دلی عہد نے اس مقدسے کی کارروائی کو عام کر ڈالا تھا، یوں سب لوگوں نے یہ مناظر دیکھے اور اب ریاست میں عام لوگ باگ مشتمل ہو رہے ہیں کہ کالی کے مندر میں دھارمک پجاریوں کے ساتھ اس سٹے نوکر اور فرنگن نے بڑا اہمان کیا ہے۔ لہذا انہیں راج

محل سے ہی نہیں بلکہ ریاست سے بھی بے دخل کر دیا جائے۔ ورنہ پرجا پر اس کا برا اثر پڑے گا۔“ پرس رام نے ہجرز ہر میں بجا لقمہ دیا۔

ان دونوں سازشیوں نے راج محل میں آنے اور مہاراجا چندر گپتا سے ملاقات سے پہلے ہی ایک کل کھلا تھا۔ ایک شریمنڈ ٹولا تیار کر کے ریاست کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا، تاکہ وہ عام لوگوں کو راج محل کے مہمانوں کے خلاف بھڑکانے کا کام انجام دے سکے، ساتھ ہی اس بات کی بھی ٹولے کو سختی سے تاکید کی گئی کہ مہاراجا یا راج محل کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے مت نکالیں، کیونکہ یہ جانتے تھے کہ اس معاملے میں مہاراجا چندر گپتا کی قدر سخت تھا، وہ ایک لفظ بھی اپنے خلاف سنا پڑنے میں کھڑا تھا۔

”یہ سب جھوٹ ہے۔“ اچانک کمرے میں ایک بارعب سی آواز ابھری۔ بددیانتی نے مہاراجا پرس رام نے چونک کر نظر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دلی عہد پر تاب بڑی شاہانہ چال کے ساتھ اندر داخل ہو رہا تھا، اس نے ان دونوں شاطر یوں کی باتیں سن لی تھیں۔ مہاراجا چندر گپتا کے بائیں بازو پریشی جوبائی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے تھے، ساتھ ہی وہ کچھ فکر مند سی بھی نظر آتی تھی۔

راج محل میں صرف دلی عہد اور مہارانی کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ بغیر اجازت کے مہاراجا چندر گپتا کے کمرے میں داخل ہو سکیں۔

یہ کہنے کے بعد راج کار پر تاب نے بڑے احترام کے ساتھ باپ کو سلام پیش کیا اور اس کے قریب والی ایک نقشین مسند پر براجمان ہو گیا۔ وہ اب مہاراجا سے مخاطب ہو کے بولا۔

”جوبائی! یہ درست ہے کہ مقدسے میں جیت ہماری ہی ہوئی تھی، لیکن بلوے کے ذمے دار وہ مہمان لوگ نہیں بلکہ وہ چار بٹے کئے پجاری تھے جنہوں نے نیچے اور اکیلے شوکی گونا گونا پینا شروع کر دیا تھا۔“

مہارانی جوبائی جواب تک دانستہ مکارانہ خاموشی اختیار کیے ہوئے تھی، فوراً بولی۔

”یہ غلط ہے، جھگڑے کی ابتدا اس آوارہ فرنگن دو شیرہ کے سٹے عاشق شوکت حسین نے کی تھی۔ مقدسے کی شکست پر آگ بگولا ہو کر وہ اپنے ہی ساتھی رابرٹ کو مارنے کے لیے لگا تھا۔ سچ بچاؤ کی صورت میں اس نے دھارمک پجاریوں کو بھی نہ چھوڑا۔“

رنگی آسمان

عہد پر تاب کے لیے شوہر کی زبان سے اس طرح کی عدم اعتمادی کا اظہار کرتے سنا تھا۔ اس نے لوہا گرم دیکھ کر پھر چھوٹ کی بولی۔

”یہ تو بھلا دینی مشکل پڑ جائے گی۔ ریاست کے وسیع تر مفادات میں سرکار انگلیہ کو ناہنراش کرنا ہرگز مناسب نہ ہوگا۔“ وہ زار کی اور پھر شوہر کی پریشانی کو مزید بھارتے ہوئے دوبارہ مکاری سے بولی۔

”جوبائی! اسی کو تو جزل مانیکل شا کا رد عمل سامنے نہیں آیا ہے کہ اپنے دوست پر دھیس بھری برادر کی موت پر اس کے دل و دماغ کی کیا کیفیت ہوگی۔ میں نے سنا ہے کہ بھری، مانیکل شا کے بہت پیارے اور قریبی دوستوں میں سے ایک تھا۔“

”جوبائی!“ حسب توقع مہاراجا جوبائی نے انتہائی ڈھلپوہ لگے ہیں۔ ”مجھے اسی کے رد عمل کا انتظار ہے مگر یہ بھی سوچنا ہوں کہ اسے جواب کیا دیں گا؟ پروفیسر بھری کے سلسلے میں جزل نے مجھے خصوصی طور پر کہا تھا کہ ان کا خیال رکھا جائے لیکن یہاں تو سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔“

”جوبائی! آپ ابھی سے اپنے دل پر کوئی بار نہ لیں۔“ جوبائی بولی۔ ”پہلے مانیکل شا کا رد عمل سامنے آنے دیں۔ بلکہ انہیں پہلی فرصت میں ساری تفصیل لکھ کر روانہ کر دیں کہ ان کے مہمانوں نے یہاں کیا کل کھلایا اور اگر انہیں جلد ہی یہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور نہ کیا گیا تو صورت حال کسی کے حق میں نہیں رہے گی، پھر دیکھیں وہ کیا۔“

”جوبائی! آپ جتنا کیوں کرتے ہیں؟“ دلی عہد پر تاب اپنی ماں کی بات پر باپ سے بولا۔ ”میں خود ہی اس مسئلے کو خوش اسلوبی سے حل کروں گا۔“

”جیسے پہلے کیا تھا؟“ جوبائی، جوبائی عہد کی سبکی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی، فوراً طنز سے لہجے میں پر تاب کی طرف جھپکے چوتھوں سے دیکھ کر بولی۔ ”تم اب رہنے ہی دو، پہلے کی طرح پھر اسے اٹھا دو گے۔ دیکھتے نہیں ہو کہ تمہارے ہتھی پہلے ہی بات پریشان ہیں۔ میں اپنے بیٹے ایش کمار سے بات کرتی ہوں۔ وہ بہت ذہین اور بھدار ہے، اگر پہلے ہی یہ مسئلہ اس کے سپرد کر دیا جاتا تو اب تک خوش اسلوبی سے حل ہو چکا ہوتا۔“ جوبائی نے بڑی مکاری سے اپنے بیٹے کی توصیف کر ڈالی۔

”وہ کیا کر سکتا ہے جوبائی! اسے تو سرسائوں اور بھگن رلیوں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔“ مہاراجا نے کہا تو

ایسے میں بددیانتی کے چیلے پرس رام نے مکاری سے کہا۔ ”میرا خیال ہے اگر ہم اسی بحث میں الجھے رہے تو کہیں ایک اور مقدسے کی ضرورت پیش آجائے۔ بہتر یہی ہے کہ اب اس تازہ صورت حال سے نپٹنے کے بارے میں سوچا جائے جس سے ریاست اور پرجا پر غلط اثر پڑنے لگا ہے۔ کیونکہ ہم پر اور کالی کے مندر کی پرتا پر از نام لگانے والے مقدمہ ہار چکے ہیں اور اب حضور کو اس سلسلے میں فوری طور پر کوئی آخری فیصلہ کر لینا چاہیے۔“

پرس رام اپنی بات پوری کر کے چپ ہو رہا۔ اس نے بڑی مکاری سے اس طرف سے دھیان بنانے کی کوشش کی تھی۔ ”جوبائی! مہارانی جوبائی اپنے بچے سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”جوبائی! میرا مشورہ تو یہی ہے کہ اس فضول اور لاعمل مسئلے سے ترنت جان چھڑالی جائے۔ جس کا یہ سلسلہ اسلحہ بھی کچھ میں آتا ہے کہ مہمانوں کو یہاں سے ہجرت کر دیا جائے۔ پر جاشانت ہو جائے گی۔ ریاست اس سے زیادہ کئی اہم معاملات میں اس وقت الجھی ہوئی ہے۔ ان پر توجہ رکھنا ضروری ہے۔“

مہاراجا چندر گپتا اپنی بیوی اور بیٹے پر تاب سے بعض اہم ریاستی معاملات کے سلسلے میں مطلع و مشورہ کیا کرتا تھا۔ مانیکل شا کے اپنی جان پال سے کی گئی اہم نشست کے بارے میں اگرچہ ابھی وہ ان دونوں سے کوئی مشاورت نہیں کر رہا تھا، وجہ یہی تھا کہ مسئلہ تھا۔ تاہم جوبائی، جان پال کے علم میں تھا کہ وہ بہت تھکا کرٹش گوشہ نشین اس کے بچے سے کیا چاہتی تھی اور جب جان پال کی آمد ہوئی تو وہ بھانجی جوبائی کی سرکار ڈھکیے ان سے کون سا کام لینے والی تھی۔ چنانچہ جوبائی کا پلٹر چل گیا اور مہاراجا جوبائی بڑے پریشان کن لہجے میں بیٹے کی طرف دیکھ کر بولا۔

”پر تاب! میں نے تمہیں یہ معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹانے کی ہدایت کی تھی لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم نے بجائے اس معاملے کو نمٹانے کے مزید اٹھا کر رکھ دیا ہے۔ کاش! جان پال کے ساتھ میں معروف نہ ہوتا تو خود ہی اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرتا۔ اب ہم کیسے ان مہمانوں کو یہاں سے چلے جانے کا کہیں؟ یہ بات ہماری شان کے ہی خلاف نہیں بلکہ مانیکل شا سے ناراضگی کا بھی سبب بن سکتی ہے اور اس وقت ہم ان کے ساتھ ایک اہم ریاستی معاملہ وادری کے معاہدے میں ہیں جو ہمارے ہوسکتا ہے۔“

شوہر کی بات سن کر جوبائی دل ہی دل میں خوش ہوئی کیونکہ آج پہلی بار اس نے اپنی آنکھوں میں کھٹنے والے دلی

نوجوانی درخشاں ہو کے شوہر سے بولی۔

”آپ تو بس ایسے ہی میرے بیٹے ایٹھ کو بڑا کہتے رہتے ہیں۔ آپ کو تو بس پر تاب ہی اچھا لگتا ہے اور ہر سے آپ اسے ہی میرے بیٹے پر فوقیت دیتے رہتے ہیں۔“

”بات اچھے باؤسے لگنے کی نہیں ہے۔ پر تاب کی طرح ایٹھ بھی میرا بیٹا ہے، میرا ہی خون ہے وہ۔۔۔۔۔۔ بیوی کو ناراض پا کر مہاراجا بولا۔

”آپ نے بھی ایٹھ کو کچھ کرنے کا موقع ہی کب دیا ہے بھلا؟ کبھی کہتی ہوں کہ ایک بار تو آپ کو اس کی ذہانت کو آزمایا لیتا چاہیے۔“ نوجوانی بدستور اسی لہجے میں بولی تو مہاراجا حیرت سے بیوی کی طرف دیکھ کر بولا۔

”ایک بار۔۔۔۔۔۔ اہم تو اسے کئی بار آزمایا ہے۔ اول تو وہ کسی معاملے میں دلچسپی ہی نہیں لیتا اور چارو چار لیتا بھی ہے تو آئی لگا بھاتا ہے۔“

”رہنے دیں اب۔۔۔۔۔۔ آپ کے لاڈ کی وجہ سے وہ ایسا کرتا ہوگا آپ ایک بار اسے کہہ کر تو دیکھیں۔ وہ تو خود بھی آنا چاہ رہا تھا آپ سے اس مسئلے کے بارے میں بات کرنے کے لیے میں نے ہی منع کر دیا۔ کیا فائدہ، جب آپ اسے اہمیت ہی نہیں دیتے۔“

”یہ غلط ہے، اہم اپنے چھوٹے راجہ کار کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جن کی کہ بڑے کو کر۔۔۔۔۔۔ مہاراجا نے دانستہ اپنا جملہ اصرار چھوڑا اور بولا۔

”اچھا ذرا بلاؤ۔۔۔۔۔۔ ایٹھ کو۔“

”وہ اس وقت مہمانوں کے ساتھ ہے اور ان کی۔۔۔۔۔۔ دل چاہی کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“ نوجوانی نے بڑی مکاری سے جھوٹ بولا۔ ”آپ کے کہنے سے پہلے ہی وہ اس معاملے کو حل کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ پتائی سے کہہ دیتا چتا کرنے کی ضرورت نہیں، میں کل تک اس پورے مسئلے کو ستوا دوں گا۔“

بیوی کی بات سن کر مہاراجا کو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی مگر پوری طرح وہ مطمئن نہیں ہوا۔ تاہم خاموش رہا۔

درحقیقت نوجوانی کے شاطرانہ ذہن میں ایسے نازک وقت میں ایک اور چیلنج کا ریلے کی ترکیب بھائی دی تھی۔ کہہ کر انہیں نے خود ہی تھا مگر وہ اس کا ”کریڈٹ“ اپنے بیٹے ایٹھ کو مار کر دینا چاہتی تھی تاکہ مہاراجا چند گہٹا کے دل میں بھی ایٹھ کے لیے اتنی ہی اہمیت اجاگر ہو سکے جن کی کہ بڑے راجہ کار پر تاب کے لیے تھی۔

سازشی عناصر یعنی مہاراجا کی بددیانتی کا ٹھکانا مہاراجا

نوجوانی کے ساتھ تھا اور اس کے اشارے پر ہی وہ ناچتا تھا۔ نوجوانی کے شاطرانہ ذہن میں جو ترکیب آئی تھی، وہ اب اس گفتگو کے بعد فوراً اس پر عمل کرنا چاہتی تھی۔ لہذا یہ نشست تمام ہوتے ہی وہ فوراً انہایت خاموشی مگر چابک دہی سے اپنی راہ پر بولی۔

نوجوانی نے اپنے خاص غلام چھوڑا مگر بولا اور اسے مہاراجا کی بددیانتی کے لیے خصوصی ہدایات دیں اور اسی وقت کالی کے مندر کی جانب روانہ کر دیا۔ وہاں سے وہ اپنے بیٹے چھوٹے راجہ کار ایٹھ کے پاس آئی تو وہ ماں کو دیکھتے ہی بے چینی سے بولا۔

”ماتاجی! پتائی نے مہمانوں کے لیے کیا عندیہ دیا ہے؟ کہیں انہیں راجہ کار سے بے دخل ہونے کا حکم تو نہیں دے ڈالا؟“ لاڈ لے بیٹے کی بات سن کر نوجوانی نے اپنا سر پکڑ لیا اور بولی۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں ایٹھ! اہم آخر یہ بچوں والی باتیں کرنا کب چھوڑو گے اور کب جوان ہو گے؟“

”کیا ہوا ماتاجی! بہت غصے میں ہیں آج آپ۔۔۔۔۔۔“ ایٹھ کمار، ماں کے تہوہر دیکھ کر فوراً دیو سا ہو کے بولا۔ وہ دراصل اپنی ماں سے دیتا تھا۔

”غصہ تو مجھے اپنے آپ پر ہے کہ تمہارے جیسے بے وقوف اور نا سمجھ بیٹے کو ختم دیا۔“ نوجوانی اچھا پیٹ کر بولی۔ ”میں تمہیں ریاست سے کوئی عہدے کے روپ میں دیکھنا چاہ رہی ہوں اور تم۔۔۔۔۔۔ آخر تمہارا ان لوگوں سے کیا لیا دینا ہے جن سے پوری ریاست کی پر جانت رت کرنے لگی ہے۔“ نوجوانی کا اشارہ ریاست وغیرہ کی طرف تھا۔

”لیکن ماتاجی! وہ سب جھوٹ اور دھن پر پیٹلڑا ہے۔“ ”ایٹھ!“ نوجوانی کو غصہ آ گیا۔ ماں کو برہم دیکھ کر ایٹھ بھی خفیف سا ہو گیا۔ ”میں تمہیں جو بات کہنے اور سمجھانے آئی ہوں، تم صرف اسی پر اپنی توجہ مرکوز کیجئے تم۔“

”جی ماتاجی! اہم کریں، میں سن رہا ہوں۔“ بالآخر ایٹھ نے سر جھکا لیا۔ اسے اب اپنی ماں کا ہر وقت دباؤ والا لہجہ کھلنے لگا تھا مگر وہ چپ تھا۔

”تم اسی وقت اپنے پتائی کے پاس جا کر کہو گے کہ تم یہ مسئلہ آسانی سے حل کرنے کی سکت رکھتے ہو۔ وہ تم سے پوچھیں گے کہ تمہارے ذہن میں ایسا کیا ہے، تم نہایت ادب سے کہنا کہ میں ابھی مصلحت اندیشی سے کام لوں گا۔ آپ بس ابھی مجھ پر کھول دھواں کریں۔۔۔۔۔۔ اور جزل مانگیل شا کے جوابی خط کا انتظار کیا جائے۔“

رنگ آسمان

”اور اگر۔۔۔۔۔۔ پتائی نے بتائے پر اسرار کیا تو۔۔۔۔۔۔؟“ ”بے وقوف! وہ نہیں کریں گے جاؤ تم۔۔۔۔۔۔“ نوجوانی ہلک کر بولی اور ایٹھ اسی وقت چل دیا۔ اس نے اپنے باپ سے وہی جا کر کہہ دیا جو اس کی ماں نے اسے سکھایا تھا۔

اس کے بعد متفقہ فیصلے سے درمیانی راہ اختیار کی گئی تاکہ سب زیادہ نہیں تو چھوڑے بہت راضی رہیں۔ مہمانوں کو جو وہ حالات کے پیش نظر نہایت معذرت اور احترام کے ساتھ ریاست سے تو نہیں البتہ راجہ کار سے ملے جانے کا کہہ دیا جاتا۔ اس کے لیے نوجوانی نے بددیانتی کا ٹھکانا پڑھا دیا تھا کہ اس فیصلے کے بعد ”غافلہ“ نہ چلایا جائے۔۔۔۔۔۔ بلکہ اس معاملے کو فراموش ہی کر دیا جائے۔ جب تک کہ ریاست کے خلاف خود سے کوئی قدم نہیں اٹھائی۔ ایسا ایٹھ کے ایما پر غائب کیا جاتا تھا۔ اگرچہ اس کے در پردہ نوجوانی کے دماغ کی کارستانی ہی کارفرما تھی۔ جبکہ بددیانتی کا ٹھکانا جو مہاراجا نے اسے پہلے سے ہی سکھایا تھا۔

اب صرف جزل مانگیل شا کے جوابی خط کا انتظار تھا۔

☆☆☆

والی کے قلعہ بند کر کے میں بیٹھے جزل مانگیل شا کو راجہ مانگیل میں متیقز، کارا اپنے لیفٹیننٹ برادر کا اطلاع نامہ ملا تو وہ سانس میں آ گیا۔

اپنے دوست پروفیسر ہنری کی اس جانکا موت پر جہاں اسے بے حد غم و غم تھا، وہاں وہ بہت برہم بھی ہوا۔

لیف برادر نے ریاست کی زبانی یہ سارا قصہ سننے کے بعد رجن و رجن ویسا ہی لکھ دیا تھا، جیسا کہ ریاست نے اسے بتایا تھا کہ اس کے باپ ہنری کی موت کیسے اور کن حالات میں ہوئی تھی۔ جس کے مطابق۔۔۔۔۔۔ اس کے باپ کی موت کو، جو ایک موقعی بھی سازش کے تحت ایک قتل تھا مگر اسے حادثاتی موت کا شائبہ نہ تھا۔

اپنے عزیز دوست کی بیٹی رینا کے اس خط پر جزل مانگیل شا کچھ اچھن آ میر سوچ کا بھی شکار ہو گیا، بھلا ایک سادہ لوح پروفیسر، جو سیاست اور اس قسم کے معاملات سے دور تک کا بھی واسطہ نہیں رکھتا تھا، وہ بھلا کیونکر کسی سازش کا شکار ہو سکتا ہے؟

لیکن ایک دور دور بعد اسے لیف برادر کا دوسرا خط ملا تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ کیونکہ اس خط میں رینا نے نہ صرف تفصیل سے بتایا تھا بلکہ لیف برادر نے اپنے بھی جو قصہ و خیلالات کا اظہار کیا تھا۔ رینا نے لکھا تھا۔۔۔۔۔۔

”ذیر انگل شا! فاگڈ میک! امیری مدو کیجی، میں تیرم

ہو گئی ہوں بلکہ کر دی گئی ہوں۔ میرا اب دنیا میں آپ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ خدا امیری بد کریں۔ میرے پیارے پاپا کو یہاں ایک سازش کے تحت قتل کر دیا گیا ہے اور اسے دانستہ ایک حادثے کا رنگ دیا جا رہا ہے۔

”آپ ضرور سوچ رہے ہوں گے کہ بھلا ایک سادہ لوح انسان کا کون کون سا دشمن ہو سکتا ہے؟ تو آپ کی یہ بات صحیح ہے۔ وہ آپ کے بچپن کے اور سب سے عزیز ترین دوست تھے۔ آپ ان کی فطرت جانتے تھے کہ انہیں نیچر سے کتنی محبت تھی۔ اسرار دوس کے سربستہ راز جاننے کا انہیں کس قدر جنون تھا۔ وہ تحقیق اور ریسرچ کے کس قدر دلدادہ تھے۔ وہ ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے ”شرق کے سربستہ راز۔“ یہ کتاب وہ انگلستان کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں متعارف کروانا چاہتے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ کتاب ان طالب علموں کے لیے کس قدر اہم اور مددگار ثابت ہوئی۔ اپنے ملک کا نام پوری دنیا میں روشن ہوتا۔ خیر! میں آپ کو دجہ بتاتی ہوں جو میرے پاپا کے قتل کا محرک تھی۔

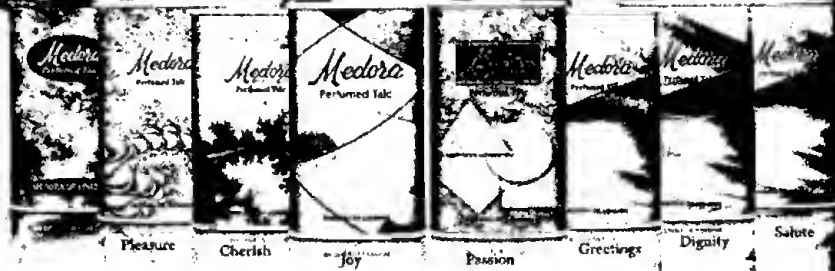
”در اصل۔۔۔۔۔۔ ناگرہ میں پہلے ہی سے خلائی سازشیں در پردہ پروان چڑھ رہی ہیں۔ پاپا نے کسی بھی کی رد و خانہ پر درش پانے والی سازش سے تادانستہ طور پر پردہ اٹھانا چاہا تھا، جہاں تک میرا خیال ہے۔۔۔۔۔۔“

اس کے بعد رینا نے اطلاع نامے میں مقدمے کی کارروائی سے لے کر وہ سب بتا دیا تھا کہ کس طرح اب ایک سازش کے تحت انہیں۔۔۔۔۔۔ ریاست ناگرہ سے بے دخل کرنے کی ایک نئی سازش تیار کی جا رہی ہے۔ جبکہ وہ اپنے آنجنابانی پاپا کا دشمن پورا کرنے کا ارادہ بھی رکھتی ہے، جواب اس کی زندگی کا ایک اہم مقدمہ بن گیا ہے۔ لہذا مائی ڈیر انگل! آپ برائے مہربانی چند گہٹا کے سلسلے میں سخت احتکامات جاری کریں کہ وہ آپ کے عزیز دوست اور میرے پاپا کے قاتلوں کو نہ صرف بے نقاب کریں بلکہ انہیں کیفر کر دینا بھی پہنچائیں۔ میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔“ رینا نے پچھلے اس طرح خط میں آدھ زاری کی تھی کہ مانگیل شا کا دل کچل گیا۔ یوں بھی انگریز اپنے ملک اور قوم کے ساتھ بہت سچے اور بہت سخت اصول پرست ہوتے ہیں۔ ان کی قوم کا ایمان کے ملک کا چاہے عام آدمی ہی کیوں نہ ہو وہ اگر کسی اور ویش میں قتل یا ہلاک ہو جائے یا اس پر کوئی مشکل آن پڑے تو وہ اسے اپنی ضد اور نا کامیابی سے سمجھتی ہیں اور اس کی مدد کے لیے ہر قسم کا انتہائی قدم اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتے، چاہے وہ قصور وار ہی کیوں نہ ہو۔ اپنی قوم اور



Medora
Perfumed Tale

عشوق جو دل کو بہا لے
تاریق جو ہر کوئی چاہے



عشوق کی دنیا کے 8 شگفتہ احساس

MEDORA OF LONDON

ہے اور اگر اپنے عزیز... دوست کی بیٹی کی باتیں رو کر...
تو اپنوں کے طعن و تشنیع کا نشانہ بننا تھا۔ اس نے کوئی درمیان
راہ سوچی اور پھر اس کے بعد اس نے ریٹا اور لیف برادر
جواب میں لکھ دیا۔

”ریٹا ڈیزائرم خود کو بالکل تھامت سمجھتا۔ مجھے اپنے
عزیز ترین دوست ہنری کی موت کا دکھ ہے۔ اگر تم واقعی مجھ
ہو کہ ایسا ہے۔ یعنی وہ کسی سوچی سمجھی سازش کا شکار ہوئے ہیں
اس بارے میں شفاف اور غیر جانبدارانہ تحقیقات کے لیے
میں انہی مہاراجا چندر گپتا کو بھی ایک خصوصی پیغام بھیج
ہوں۔ کچھ سیاسی شخصیتوں کی وجہ سے ہم انہی کوئی سخت ذرا
اٹھانے سے قاصر ہیں لیکن تم فکرمند کرو۔ اپنے طور پر تم جو کچھ
وہاں کرنا چاہتی ہو کرتی رہو، تمہیں یا تمہارے ساتھیوں کو مارا
حمل یا ریاست ناگرہ سے کوئی بھی بے دخل کرنے کی جرات
نہیں کر سکتا اور اگر ایسا ہو بھی جاتا ہے تو تم حالات کے مطابق
کوئی بہتر فیصلہ کر سکتی ہو۔ لیف برادر وہاں تمہاری مکمل پشت
پناہی کرے گا۔ لیکن مائی ڈیزر بے لی امیں اس وقت
مجبور ہوں لیکن میری یہ مجبوری عارضی ہے۔ گوہ ٹالیہ میں ہمارے
کچھ پتلے حکوتیں قائم ہونے کے بعد جس کا وقت کچھ زیادہ دور
نہیں، میں تمہارے یہ سارے مسائل کو تار کی دھار اور بند و
کی نال سے بیک قلم حل کروں گا۔“

دوسرا خط جنرل شانے اپنے متین کارلیف برادر کا
لکھا۔

”برادر! جنہیں جن پر شبہ ہے، ان پر کڑی نظر رکھ
رہو کہ تمہیں وہاں اسی اہم مقصد کے لیے راج محل میں متین
کیا گیا ہے اور ایسا ہی مضامندی اور مشترکہ مفادات کے
لیے ہی کیا گیا ہے۔ رہی بات راج محل میں عدم تعاون کی
تو ابھی تمہیں یہ کڑا گھونٹ پینا پڑے گا۔ تم جانتے ہو کہ
ہمارا ناگرہ میں اصل مشن کیا ہے۔ اتنا لکھنے کو کافی جانو اور جن
جاسوسوں پر تمہیں شبہ ہے ان کے خلاف تم خفیہ کارروائی مکمل
میں لاسکتے ہو۔ تاہم میں پھر بھی اس بارے میں تعاون کے
لیے مہاراجا گپتا کو بھی ایک پیغام رسید کر رہا ہوں۔“

تیسرا خط اس نے گپتا کو لکھا جسے دانستہ مائیکل شانے
مختصر ترین رہنے دیا تھا۔ اس میں پروفیسر ہنری اور ریاست
متعلق اور برادر سے تعاون کے علاوہ یہ مسئلہ اس کی اپنی
(مہاراجا وغیرہ کی) صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

مائیکل شانے... انہی مہاراجا کے خلاف کوئی سخت
کارروائی کرنے سے قاصر تھا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ وہ ان کے
وسیع تر مفادات میں ان کا حلیف تھا۔ جان پال سے کامیاب

اپنے ملک کے فرد واحد کی مدد اور اس کی کامیابی کو وہ اسے پوری
دنیا میں اپنی سرخروئی سمجھتے ہیں۔

مائیکل شاپیسے فرنگی کا بھی یہی حال تھا۔ واصل فرنگیوں
کو اپنے دیس انگلستان کے مقابلے میں مشرق کا یہ دیس
(برصغیر) بہت بھایا تھا۔ وہ اس پر اپنے خاصانہ قبضے پر بہت
فخر کرتے تھے، جنگی بات تو یہی تھی کہ لندن میں اس وقت
الوپولاکرتے تھے، وہاں کی معاشی و اقتصادی حالت
اچھری۔ ہاں اسے ضرور کہا جاسکتا تھا کہ وہ مسلم سائنسدانوں کی
تھیروری سے استفادہ ضرور کرتے تھے اور اب اسی روش پر قائم
تھے۔ اگر یہ کتنا ہی متعصب ہو لیکن وہ غیروں کی اچھی اور
منفید باتوں سے استفادہ اٹھانے میں کسی قسم کے بخل یا تعصب
سے کام نہیں لیتا۔ نفرت اپنی جگہ لیکن اپنے مفاد کو ترجیح
دیتا ہے اور شاید یہی ان کی ترقی کا راز بھی ہے۔ پھر برصغیر میں
ایک طویل عرصہ گزارنے اور ہندوؤں کی بیویوں کے ساتھ گھ جوڑ
کے دوران تو ان کی مکاریاں دو چند ہوئی تھیں۔

ریٹا سے متعلق اطلاع تارے کی بین السطور پڑھنے کے
بعد اس نے آخر میں لیف برادر کی سطور بھی ملاحظہ میں۔ اس
نے لکھا تھا۔

”آزمائیل میجی جنرل مائیکل شا... اراج محل میں
مجھے کچھ باقی گروپ کے جاسوسوں کی آمد کا شبہ ہے۔ ان کی
تعداد متین ہے اور میں ان پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہوں
مگر انہوں سے کہنا پڑتا ہے کہ اس سلسلے میں مہاراجا
چندر گپتا اور ان کے سینا پتی سوج سنگھ میرے ساتھ بالکل بھی
تعاون نہیں کر رہے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے میں اپنی
کوششوں میں لگا ہوا ہوں جس کے لیے مجھے آزمائیل میجی نے
یہاں تعینات کر رکھا ہے۔“ آخر میں لیف برادر نے اپنا نام
اور عہدہ درج کر دیا تھا۔ اس اطلاع تارے نے جنرل مائیکل
شا کو گہری اور پرجوش سوج میں غلغلان کر ڈالا تھا۔

کوئی اور سوج ہوتا تو وہ اپنے متین کارلیف برادر کی
اس اطلاع پر کوئی نہ کوئی ایکشن ضرور لیتا لیکن ابھی وہ مجبور
تھا۔ اٹھائے راہ... اسے مہاراجا چندر گپتا کا بھی اطلاع
نامہ موصول ہو گیا۔ اس نے من و عن وہی کچھ لکھ ڈالا تھا
جیسا کہ اس کی بیوی مہارانی گجوبائی اور مہاراجا کی بددیانتی
نے اسے بتلایا تھا۔ اس خط نے تو مائیکل شا کی سوچوں
اور نظرات کو اور بھی گہمیر تائیں بدل ڈالا۔ وہ پہلے ہی
ریاست ناگرہ میں سیاسی چھڑی پکانے میں مصروف تھا۔
ایسے میں اس نے سوچا کہ اگر وہ مہاراجا کی بات رو کر تارے
تو اس کے دیرینہ مقاصد کے متاثر ہونے کا احتمال ہو سکتا

اس کی بات پر گورنر ڈینی نے اپنے سر کو برطانیہ انداز میں اٹھائی جیش دی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب اس کی چست و گماگما نظروں نے قریب کھڑے پست قامت ہندوستانی شیورائے بھولکر کے چہرے کو تازہ کیا اور مفتی خیر انداز میں مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”شیورائے! برٹش آرمی جہازے مشورے کے بغیر ایک انچ بھی پیش قدمی نہ کر سکتی۔ تم ان خود مختار ریاستوں کی ساری داخلی صورت حال سے واقف ہو۔“

شیورائے بھولکر اس کی بات کا مطلب سمجھ کر بولا۔

”ہراسی لیس! خود مختار ریاستوں کا اندرونی خانہ جنگی کی زد میں لیتے ہوئے جو جواز میں درکار ہے وہ جنگ کی راہ ہوا کر کے لیے کافی ہے۔ پھر بھی ہمیں ان نوابوں اور مہاراجوں کے کامدھے کی محتاجی رہے گی اور یہی روش جنگ کے لیے بہتر بھی رہے گی۔ اسی لیے ان کی خلائی سازشوں کے نتائج پر نظر رکھتے ہوئے اور ان کے دوسری ریاستوں پر قبضہ کرنے کے خواب اور لالچ کو خفیہ طریقے سے اٹھارتے رہنا ہمارے منصوبوں کے لیے مفید رہے گا۔“

”ہوں۔۔۔۔۔۔“ رونی نے ایک گھبر بھرا خارج کیا تھا۔ شیورائے بھولکر کے رائے ان کے عسکری عزائم کے لیے کافی تھی۔ اس کے بعد رونی اپنی رجسٹری کے کمانڈنگ افسر جرج الیکس کے ساتھ پہلی آواز میں باتیں کرنے لگا۔ وہ اپنے سر کو اٹھائی جیش دیتا رہا۔ سیاست کے کھیل کے ساتھ بلیئر ڈاکٹیل بھی جاری رہا اور کاروبار حکومت بھی۔۔۔۔۔۔

سب سے آخر میں یہی طے پایا۔ کہ ایکشن پلان کو وہیں روک کر پہلے جنگی حکمت عملی پر توجہ دینی چاہیے، تاہم اس عرصے کو مختصر رکھا جائے تاکہ باقی مسلم گروہیں کو زیادہ عرصے تک وہاں اپنی خفیہ کمین گاہیں بنانے کا موقع نہ مل سکے۔

فرنگیوں کو اپنے اقتدار کے لیے سب سے زیادہ خطرہ کوہ شمالیہ سے تھا۔ اس کی سب سے بڑی مسلم ریاست تریپال تھی جس کے نواب شہباز خان سے انہیں یہی خطرہ تھا کہ۔۔۔۔۔۔ وہ ان باغی گروہوں کو سپورٹ کر سکتے تھے تاکہ انہیں اپنی بکھری ہوئی طاقت کو نکال کر اپنے کا پورا موقع مل سکے۔ یوں بھی فرنگی یہاں اپنے اقتدار کے قبضے کا خواب دیکھتے ہوئے تھے۔ لیکن یہ قبضہ کتنے جلد ہی کی شکل میں ہی ممکن تھا۔ یعنی ایسا مہاراجا جونا کی (فرنگیوں کی) خلائی کامد بھرتا رہے اور ریاستی معاملات کو بھی ان کے حق میں ہوا دے سکے۔

اس ”بلیئر ڈوم مینٹگ“ کے بعد مائیکل شاپینی اتامت گاہ میں آکر کمرے میں بند ہو گیا۔ وہ اپنی میز پر بیٹھا

ہاتھ آجائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ایکشن پلان تو تیار ہے، فائنل وار سٹریجی کو ابھی محفوظ رکھا جائے، یوں بھی کوہ شمالیہ میں ابھی سخت برف باری کے موسم کی آمد آمد ہے۔ تاہم جنگی حکمت عملی کے مکمل ہوتے ہی بہر صورت ایکشن پلان پر عمل کیا جاسکتا ہے۔“

برفینے موکی اثرات کا ذکر رونی نے جنس اس لیے کیا تھا کہ یہ اس پرانے سلیقے سے اپنا کام نہ سنبھالیں۔

”تم کیا کہتے ہو کرل؟“ رونی کا سنو فرنے بلسروڈ کی طرف دیکھا جو بیچر ڈی فارسٹ کی باری کے بعد اپنی باری کی دہری میں تھا۔ وہ جواب بولا۔

”میں مسٹر ڈان کیورٹم کی بات پر اتفاق کرتے ہوئے ہوں۔ یہاں کوہ کا کوہ شمالیہ اس وقت ہمارا سب سے زیادہ ہاٹ اسپاٹ ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہمارا مقصد صرف پالپن پور اور تریپال پر چڑھائی کرنا نہیں، بلکہ ناگرہ کو بھی قبضے میں لینا ہے۔ ناگرہ چونکہ ہمارے حلیف کی حیثیت رکھتا ہے لہذا اس پر قبضہ ہونے کا یہی طریقہ ہوگا کہ وہاں کوئی ایسا جواز بنایا جائے جو جنس اس کی زد میں آتا ہو۔ ورنہ دیگر ریاستوں کے نواب اور مہاراجے ہماری اس سیاست کو سمجھ جائیں گے اور ہم اراہہ ہم سے خیر سگالی اور مشترکہ مفادات کی آڑ میں معاہدہ کرنے سے کترائیں گے۔ یوں ہمارا آزاد ریاستوں پر قبضہ کا خواب۔۔۔۔۔۔ اور مارا جائے گا۔“

”ہوں۔۔۔۔۔۔“ رونی نے ایک بار پھر خیال انگیز ہکاری مہر کی۔ پھر اس نے استفسار یہ انداز میں۔ بیچر ڈی فارسٹ کی طرف دیکھا۔

”میں۔۔۔۔۔۔ بیچر ڈی فارسٹ۔۔۔۔۔۔؟“

”سرا! ان باتوں سے اتفاق کرتا ہوں۔“ گھٹی ہوئی جسامت اور درمیانے قد کے بچے کے مالک۔ بیچر ڈی فارسٹ نے ترنت کہا۔

”جنگ کی صورت میں وہاں کتنے پونڈ کی توپوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے؟“ رونی کا اگلا سوال بریگیڈیئر ڈان کیورٹم کے لیے تھا۔ اس نے جواب دیا۔

”چنانچہ ان کی سختی اور جنگ کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اور پونڈ کی چھ توپیں کافی ہوں گی۔“

”ان کے پاس توپوں کی کیا صورت حال ہے؟“ رونی کا سوال تھا۔

”ان کے پاس صرف چار سے چھ پونڈ کی توپیں ہیں۔ ان کا اسلحہ زیادہ تر ”بھرتو“ بندوقوں پر مشتمل ہے، جو ہماری پورٹل ”لی افیلڈر“۔۔۔۔۔۔ انکوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔“

کا جام بنایا اور ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

”جنرل شا۔۔۔۔۔۔!“ گورنر ڈینی کا سنو فرنے کیو (cue) بال کو ”بلیس پوائنٹ“ پر رکھتے ہوئے کہا۔

”تمہاری کپنی میری لین الارم ڈیوٹی پر ہے نا؟“ یہ کہتے ہی اس نے اپنی ہانگ سے کیو بال کو ہٹ کیا۔ شلٹ کی شکل میں رکھی مختلف رنگوں کی بالز جمیل کیں اور ان میں سے ایک رنگ کی بال پاکستان ہوئی۔

”میں سرا“ جنرل شا نے فوراً سر ہلایا۔ 1809ء کے سول اینڈ آرمی معاہدے کے تحت گورنر ڈینی کا سنو فرنے اختیارات واضح تھے۔

”ہوں۔۔۔۔۔۔“ گھٹکتاتی ہوئی ایک لمبی ہکاری خلیج کرتے ہوئے رونی کا سنو فرنے ذرا گھبر کر میز پر نظری اسٹچ بنایا پھر کیو اسک کی فپ کو اوپنٹ چاک سے رگڑا اور میز پر جبک گیا۔ لائن نہ بن سکی تو دوبارہ کھڑا ہو گیا۔ بولا۔

”آپریشن کریٹن انز جمنٹ کی تفصیل بتاؤ دوستوں کو؟“ جنرل شا نے مخصوص شارٹ لیگ کو ڈس مختصر ترین پیرامیٹرز اپنے نشن کی صراحت سے چند منٹوں میں آگاہ کر دیا جو اسوائے شیورائے بھولکر کے سب نے سن کر بڑے توسیعی انداز میں مسکرا کے اپنے سروں کو اٹھائی جیش دی تھی۔ دیوان بھولکر کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا مگر وہ خاموش تھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے الجھن آمیز تاثرات دیکھنے میں نہیں آتے تھے۔ یوں۔۔۔۔۔۔ جیسے وہ اپنا کام باحسن خوبی منا چکا ہو۔

”گڈ۔۔۔۔۔۔!“ رونی کے منہ سے نکلا۔ ”بریگیڈیئر! حکمت عملی پلان کرو۔“

ایک لائن اور گھوسٹ بال کا نظری خاکہ تیار ہوتے ہی وہ دوبارہ میز پر جبک گیا۔ تلے اوپر تین بالز پکارتے ہوئے بعد اس نے بیچر ڈی فارسٹ کی طرف دیکھا اور خود ایک طرف جٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ڈی فارسٹ اپنی باری لینے کے لیے آگے بڑھا اور غور سے میز کی سطح پر پہلی گیندوں کی لائن اسٹڈی کرنے میں مصروف ہو گیا۔

”سر۔۔۔۔۔۔!“ بریگیڈیئر ڈان کیورٹم نے کہتے ہوئے اپنے قریب کھڑے کرل بلسروڈ کی طرف ایک نظر دیکھا تھا۔ شان سے پہلے ہی ڈسکر کرچکا تھا اور کرل انہیں اپنے جیتی مشورے سے آگاہ کرچکا تھا۔ بلسروڈ نے کیورٹم کو سر کا مخصوص اشارہ کیا، جیسے کہہ رہا ہو کہ وہ جو آپس میں ڈسکر ہو چکا ہے۔ لہذا وہ رونی سے بولا۔

”ناگرہ میں چونکہ ایک سازش پر دان چڑھنے کا انکشاف ہوا ہے۔ ہم چاہ رہے تھے کہ پہلے اس کے نتائج

نشست کے بعد جنرل مائیکل شا نے تریپال اور پالپن پور سمیت ناگرہ پر اپنا فوجی قبضہ قائم کرنا تھا۔ فرنگیوں کی چال ایسی تھی کہ دشمن کو اپنا حلیف بنا کر اس کے کاندھوں پر بندھن چلائے، اپنا الویدھا کرتے اور پھر آخر میں اس کی پشت پر چھرا گھونپنے کی صورت میں اپنی رچ کا جھنڈا ڈھڑیا کرتے تھے۔ وہ لڑاؤ اور حکومت کر دہی اس دیرینہ پالیسی پر ہمیشہ سے کارفرما تھے۔ تجارت کا کاروبار کرتے کرتے اب یہ فرنگی ”مکھوتوں کا کاروبار“ کرنے لگے تھے۔

جان پال کی اسی روز راجپوتی کے بعد جنرل شا نے تریپال اور پالپن پور کے خلاف جنگی حکمت عملی تیار کرنا شروع کر دی تھی۔

یہ جنگی حکمت عملی گورنر ڈینی کا سنو فرنے کی شاہانہ رہائش گاہ کے ایک کمرے میں۔۔۔۔۔۔ ”بلیئر ڈوم“ کی میز پر تیار ہوئی تھی۔ تجارت کا کاروبار کرتے کرتے اب مکھوتوں کا کاروبار کرنے والے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سات اعلیٰ درجہ کے جباری افسران اس وقت میز کے گرد موجود تھے۔

ان میں اوجیز اور بھاری جسامت کے گورنر ڈینی کا سنو فر سمیت جنرل مائیکل شا، بھولی اور لیو تریپال کی شکل کا مالک دراز قامت کرل بلسروڈ مضبوط اور چوڑے شانوں مگر درمیانے قد کا مالک بیچر ڈی فارسٹ، جوتیسو لائن کیوری کا کمانڈنگ افسر بھی تھا۔ بریگیڈیئر ڈان کیورٹم کرل بلسروڈ کی اپنی رجسٹری کا ایک کمانڈنگ آفیسر جرج الیکس اور ساتواں آدمی ایک پست قامت ہندوستانی تھا۔ وہ راج پور کا دیوان تھا۔ تمام ناموں کو قانونی شکل دینا یا کا کام تھا۔ اس کا نام شیورائے بھولکر تھا۔ مہاراجوں کی خلائی سازشوں اور ان کے نتیجے میں ہونے والی تبدیلیوں پر نظر رکھنا، بلکہ ان ”منہج“ کو برٹش سرکار کے لیے ”مفید“ کیسے بنانا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ بھی اس کا کام تھا۔ اس کی رنگت۔۔۔۔۔۔ سیاہ تھی اور چہرے پر چونچ کے وارے تھے، آنکھیں چند ہی چند ہی تھیں، وہ بار بار اپنی کمر پر بندے خنجر پر ہاتھ پھیرتا تھا، جس پر جواہرات بڑے ہوئے تھے تو اس کی آنکھوں کی ہیرے روئی میں چمک اٹھتے تھے۔

خانہاں نے ایک ٹرائی کھسکا کر کمرے کے ایک طرف کھڑی کر دی تھی اور خاموشی سے باہر نکل گیا تھا۔ ٹرائی پر ایک دس لیر کا براس ٹیک دھرا ہوا تھا اس پر چھوٹا سا ناکا لگا ہوا تھا۔ ان کے گرد سات بلوریں پیگ سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ ٹرائی کے دوسرے پہلے جیسے پر ایک بڑا سا بال رکھا تھا جس میں برف کی ڈلیاں رچی ہوئی تھیں۔ سب نے اپنے اپنے حصے

کچھ کہنے میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

کوہ شمالیہ کی سنگلاخ پہاڑیوں اور اس کی شگرفی ڈھلوانوں کے جنگلوں میں ایسا وہ برکد اور کھرنی کے سایہ دار درختوں اور گل پوش جھاڑیوں پر کاسنی اور شگرفی ڈنڈیوں والے پھولوں نے رنگ بدلتا شروع کر دیا تھا۔ ہنرے سے ڈھکی چٹانوں اور بسنت رچتا کی بہار دکھائی دیتی تھی جیوں پر اب کے کبرے کا ڈیرا پڑنے لگا تھا۔ ہوا میں سرد اور کاٹ دار ہو چلی تھی۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں کو محفوظ جگہ پر لے جانے کے لیے پرتو لے ہوئے تھے۔

مختلف جانور ٹھنڈے موسم کی برف باری کے سرد چہنم سے بچنے کی تیاری میں اپنی گھماکیں، غار اور ٹھکانے بدلنے لگے تھے۔

کھربے کے بادلوں نے صبح کے سورج کی روہیلی کرنوں کو روک رکھا تھا۔ ہوا مرطوب اور فضا رک رکی تھی۔ سردی کا احساس بڑھ گیا تھا اور طبعی ریحان ڈھلوانی جنگلوں کی آڑ لیتا ہوا جیز تیز قدم اٹھائے مقررہ سمت کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ یوں تو اس کی منزل تریپال تھی، لیکن یہ منزل ابھی اس کے لیے، ہنوز دلی دور است والی بات تھی، مگر اب یہ اس کی راہنمائی کرتے ہوئے یہ ہدایت کی تھی وہ راج محل سے نکلتے ہی پورب کی سمت والی ڈھلان سے تقریباً پندرہ کوس تک پیادہ کام تاک کی سیدھ میں چلتا چلا جائے، پھر ایک کھجور پارہ ہو جائے۔ جب چھوٹے بڑے پہاڑی ٹیلوں کا سلسلہ شروع جائے تو..... ایک پختہ راہ گزرا جائے گی۔ اس راہ گز پر اسے چند کوس چلنا پڑے گا کہ سامنے ایک پڑی نظر آئے گی۔ یہ پڑی پورب سے پچھم کی طرف جاری ہوگی، اسے پچھی سمت کی راہ لیتا ہوگی جہاں دائیں جانب ایک پہاڑی ندی بہتی نظر آئے گی۔ اسی ندی سے ایک چٹانی کار یز نکل کر ٹین کے کھالے سے پڑی کے اوپر ایک ٹنکا سا بنا رہی ہوگی۔ یہاں کوئسے والے انجن کی ریل کار آ کر ٹنکیاں بھرنے کے لیے تھوڑی دیر رکتی ہے۔ وہ اس میں سوار ہو کر تریپال کی سرحد کے قریب سر پہر یا شام سے پہلے پہنچ سکتا ہے۔

علی ریحان اب اریہ کے بتائے ہوئے اسی راستے کی راہ پر تھا۔ اسے سخت سردی بھی لگ رہی تھی، حالانکہ وہ تیز تیز قدموں سے چلا جا رہا تھا، مگر سردی کی کاٹ سواھی۔ وہ بچھٹانے لگا تھا کہ وہ عام سے کپڑوں میں ہی نکل پڑا تھا۔ مقصد اور مشن کو پورا کرنے کی دھن میں وہ اس طرف توجہ نہ

دے سکا تھا اور فوراً ہی راج محل سے روانہ ہو گیا تھا۔ ورنہ ہال سے وہ گرم پوشاکیں بے آسانی اٹھا سکتا تھا۔

خاصی ویرنگ پیدل چلنے کے بعد اس نے ڈرارک کر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اس نے کتنا فاصلہ طے کر لیا ہوگا۔ مگر وہ کچھ سوچ کر پایا اور تھوڑی دیر سنانے کے بعد پھر چل پڑا۔

اس کے لیے یہی علمائیت بھرا ہتھین کاٹی تھا کہ وہ بالکل درست راستے اور صحیح سمت پر رواں دواں ہے۔ کچھ اور منزل مارنے کے بعد اسے لگا کہ وہ تقریباً آٹھ نوکوس کا فاصلہ طے کر ہی چکا ہوگا۔

صبح تازہ دم اور بھرے پیٹ ہونے کے باعث..... ابتدائی پیادہ سفر بے آسانی کٹ گیا تھا مگر اب وہ بھوک کے ساتھ تھکاوٹ بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ اریہ نے اسے ایک مقررہ وقت پر کھانے والی جگہ تک پہنچنے کی تاکید کی تھی۔ برصورت دیگر تاخیر کی صورت میں اسے اگلے دن کی صبح کا انتظار کرنا پڑتا کیونکہ ہر روز ریل کار ایک ہی جاتی تھی، البتہ ایک مال گاڑی تین دنوں بعد گزرتی تھی۔ اب یہ اندازہ اریہ لگانے سے صاف صریح کہ اس روز مال گاڑی کا گزرتا تھا یا نہیں؟

علی کی کوشش یہی تھی کہ وہ وقت پر پہنچنے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔ تاکہ وقت پر مسافر ریل کار پر سوار ہو سکے۔

یہ سوچ کر اس کی ہمت کچھ اور سوا ہوئی اور اس نے آہستہ رومی چھوڑ کر ایک بار پھر تیز گامی اٹھائی لیکن کب تک.....؟ آخر کو وہ بھی گوشت پوست کا ایک عام انسان تھا۔ جلد ہی تھک کر چور ہو گیا۔ بھوک کے ساتھ اب پیاس بھی اسے ستانے لگی تھی۔ ہرے بھرے جنگل سے آب و دانہ ملنا کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا لیکن بات وقت بچانے کی تھی۔ وہ جلد سے جلد تریپال پہنچ کر نو اب شہباز خان سے ملنا چاہتا تھا۔ خالی پیٹ ہو جانے کی وجہ سے سردی اور زیادہ لگنے لگی تھی۔

بالآخر یہ سوچ کر کہ کھانے سے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں اس نے کچھ تازہ ریلے چل توڑ کر کھائے اور انہی سے پیاس بجھائی۔ پانی کے لیے ندی یا چشمہ تلاش کرنے میں وقت صرف ہو سکتا تھا۔ اس نے ریلے چلوں سے ہی کام چلا یا اور ایک بار پھر چل پڑا۔

بادلوں اور دبیز کبر سے سورج کی چھدری چھدری دھوپ پڑنے لگی تھی۔ اسی دھوپ سے علی نے اندازہ لگا لیا کہ وہ منزل سے چند کوس کے فاصلے پر تھا۔ اریہ کے مطابق جب تک دھوپ تیز نہیں ہو جاتی، وہ اپنے مطلوبہ مقام تک بروقت پہنچ سکتا تھا، مگر مسئلہ یہ تھا کہ کھربے اور بادلوں کی وجہ سے

رنگ آسمان

وقت کا صحیح اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ دھوپ کتنی کھل آئی تھی اور سورج نے اس کے ساتھ کتنا سفر طے کر لیا تھا۔

ابھی وہ اسی جگہ کا شکار تھا کہ سفید دودھیا پڑے آسمان کا رنگ سنولانے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سیاہ پڑ گیا۔ علی ریحان کو تشویش ہوئی۔ یوں بارش پڑنے اور سردی میں اضافے کی ایک نئی مصیبت نازل ہونے کا اندیشہ ستانے لگا۔ لیکن اس کے سر پر بھی بس ایک ہی دھن سوار تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر تریپال پہنچ جائے اور نو اب شہباز خان کو فرنگیوں کی غنی سازش سے فی الفور آگاہ کر دے۔ اسے ڈر تھا کہ اسے تریپال پہنچنے میں ذرا بھی دیر ہوگی تو کہیں فرنگی اپنی اس گھناؤنی سازش میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ کیونکہ یہ حقیقت تھی کہ بعض حریت پسند مسلمانوں کے ہاں گروپ، کوہ شمالیہ کا یہی خفیہ خیمہ گاہ ہی نہیں بلکہ یہاں اپنا مستقل ٹھکانا قائم کرنا چاہتے تھے، تاکہ اپنی بکھری ہوئی قوت کو یکجا کر سکیں۔ ان کی اسی سازش کو سبوتاژ کرنے کے لیے علی ریحان کو ساتھیوں کے ساتھ یہاں روانہ کیا گیا تھا۔ ان کے تین ساتھیوں نے تورہ ہی میں جام شہادت نوش کر لیا تھا جبکہ..... ان پانچوں میں صرف علی ریحان اور شاہ زمان ہی باقی بچے تھے اور باہری جانوں کو خطرے میں ڈال کر اپنے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بڑی بہادری، پامردی اور دلیری کے ساتھ مصروف کار تھے۔

علی ریحان اور شاہ زمان نے تو بلکہ اپنی جان جو قسم میں ڈال کر اس سازش کا کھوج لگا تھا۔ اپنے تین ساتھیوں کے بدلے میں انہیں اریہ کی صورت میں ایک ایسی مجاہدہ بھی ملی تھی جو تربیت یافتہ تو تھی لیکن اس نے ان پر ظاہر بھی کر دیا تھا کہ وہ کسی تربیت یافتہ ساتھی سے کم بھی نہیں ہے۔ دیکھا جاتا تو علی ریحان اور شاہ زمان یہاں تک اریہ کی مدد سے ہی پہنچے تھے اور آئندہ بھی وہ ان کے کام آنے کا پختہ عزم کیے ہوئے تھے۔

علی ریحان یہ سب باتیں سوچتا ہوا بارش میں بیٹھا اور ٹھنڈا آگے بڑھا چلا جا رہا تھا۔ جنگل بیک رہا تھا، ترائیوں سے برساتی پانی اب ریلوں کی شکل میں تیزی سے بہہ رہا تھا۔ ڈھلان، جھلسواں ہونے لگی تھی۔ جنگل جل نکل رہا تھا۔ آن کی آن میں اندازے والی کالی گھٹاؤں نے دن میں رات کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ علی کو ٹھیکر آ میر تشویش نے پڑائی نے آن ٹھیکر آ تھا۔ اسے اپنا مشن کھٹائی میں بٹھا نظر آ رہا تھا۔ موسلا دھار بارش نے طوفان باد و باران آسمان پیدا کر دیا تھا۔ اب تو اسے اپنا پیدل سفر کرنے میں بھی

مشکل پیش آرہی تھی۔ نہ ہی وقت کا اندازہ ہو پا رہا تھا۔ بس ایک اندھا جھڑپ تھا کہ منزل پر جلد از جلد پہنچ جائے۔ بارش میں سردی بھی بڑھ گئی تھی۔ کئی جگہوں پر وہ پھسلا بھی تھا مگر پھر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ڈھلان ختم ہو گئی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ اچانک اس کے کانوں سے ایک آواز نکل گئی۔ یہ انجن کے دھڑکنے کی آواز تھی۔ بارش کے شور میں اگرچہ آواز ریل کی کئی بھی محسوس آہنگ سے اس کی شوریدہ ہاتھوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ انجن کی دھڑکنے کا مطلب تھا کہ وہ منزل کے قریب تھا۔ وہ کسی نے کہا ہے تاکہ بے خبری بھی ایک نعمت ہوتی ہے، یہی علی کی وقت سے بے خبر تھا مگر سر پر جلدی پہنچنے کی فکر سوار تھی۔ اسی لیے وہ بغیر رکے چلا رہا تھا۔ اگرچہ کہیں کہیں وہ ٹھیکر آ بھی تھا مگر چل پڑا تھا۔ اسی کوشش ہی میں اسے شاید بروقت منزل پر پہنچا یا تھا۔ امید جاگتی تو ہمت و حوصلہ بھی سوا ہوا۔ وہ رکا نہیں، اگرچہ اب اس کے چلنے کی رفتار پہلے کی نسبت کم ہو گئی تھی۔ تاہم اب اسے زیادہ تر کاستانے لگا کہ کہیں ریل کار چھوٹ نہ جائے۔

باوصف کوشش کے وہ اپنی رفتار میں خاطر خواہ اضافہ نہ کر سکا۔ ایک بار بے دم اور تھک کر گرا تو اٹھ نہ پایا۔ وہ موسیٰ کی بیٹی کی ہوئی جھاڑیوں پر گر اسانس بری طرح پھولی ہوئی تھی۔ جسم تھک کر چور ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے گھٹنے سیٹھ کر اور بازوؤں کے سہارے کھڑے ہونے کی سعی کی اور ذرا اٹھ کر پھر گر گیا۔ مسلسل تیز گامی، تھکاوٹ اور سانس بھولنے کے باعث آئین کی کی داغ ہونے لگی تھی اور اس پر طرہ یہ کہ دھواں دھار بارش نے وہی سب کچھ پوری کر دی تھی۔ کیونکہ ایسی حالت میں طوفانی بارش بھی آئین کی کی کاسب بنتی ہے۔

یہی وہ وقت تھا جب اس پر غشی کی طاری ہونے لگی تو اس کی ذوقی ساتھیوں سے ایک تیز کی آواز نکل گئی۔ اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور پھر اسے ہوش نہ رہا۔

کے حالات بھی مزید اسی طرف اشارہ کرتے دکھائی دیتے تھے۔

”مجھے رابرٹ سے ایسی گھٹیا حرکت کی بالکل بھی توقع نہ تھی۔“ رینا نے ہولے سے کہا۔ شوکت نے کن آگلیوں سے ایک ذرا..... مسہری پر شرم و رازنی بیٹھی گاراشیا کی طرف دیکھا اور رینا سے بولا۔

”رابرٹ کی اس حرکت پر ہم سب کو ہی انہوں ہے مس رینا!“ وہ صرف تہائی میں رینا کو اس سے نہیں پکارتا تھا، نیز کسی تیسرے کی موجودگی پر وہ اس سے گفتگو میں تکلف بھی برتتا تھا۔ ”لیکن کیا کیا جاسکتا ہے۔ ویسے آپ نے اپنے انکل شوکو کو مطلع کر دیا ہے نا.....؟“

”ہاں!“ رینا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”میں نے خط میں سب کچھ لکھ دیا ہے مگر میں پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ اپنے بابا کے قاتلوں کو نہ صرف بے نقاب کر کے رہوں گی بلکہ انہیں کیفر کردار تک بھی پہنچا کر رہوں گی۔“ کہتے ہوئے رینا کے خوبصورت چہرے پر غم کی چٹکی اور جوش بھرے جذبات کا ارتعاش سا اٹھ اٹھا تھا۔

”تم کیا کیا کر رہی ہیں..... رینا ڈیر.....؟“ گاراشیا نے اس کی طرف دیکھ کر طنز بھری نگاہ سے کہا۔ ”اپنے بابا کا شتم پورا کر دو گی، یا ان کے قاتلوں کو بے نقاب کر دو گی..... یا پھر..... کسی سے محبت کو پروان چڑھا دو گی.....“ کہتے ہوئے اس نے شوکت کی طرف نیچھی نظروں سے دیکھا تھا۔

رینا اور شوکی دونوں ہی اس کی ڈومنی بات کا مطلب سمجھ کر کچھ بھر کو خفیف سے ہوتے ہوئے شوکت خاموش رہنے پر مجبور تھا لیکن رینا نے گاراشیا کی طرف تیزی سے انکسار سے بھرتے ہوئے کہا۔

”اگر تمہارا چہیتا بھائی جھوٹی گواہی نہ دیتا تو آج یہ سب نہ ہوتا۔ ویسے میں تمہاری آخری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔ محبت..... کس سے محبت؟ کیا کہنا چاہتی ہو تم۔“

”اوہ..... کس سے محبت.....؟“ گاراشیا نے زہریلے طنز سے کہا۔ وہ کتاب بند کر کے مسہری پر پاؤں جھلائے اٹھ بیٹھی۔ پھر ایک نگاہ شوکی پر ڈال کر مزید بولی۔

”ایک نوکر سے محبت تمہیں بہت مہنگی پڑے گی رینا! تم نے میرے بھائی کو ٹھکرانے کے لیے دھمکی مول لی ہے۔ اس نے اگر جھوٹی گواہی دی ہے تو اس کی وجہ تم اور انکل ہنری تھے جنہوں نے ایک نوکر کو تریخ دی اور اب تم بھی وہی کچھ کر رہی ہو۔“

”اچھا تم تو..... ایسے کہہ رہی ہو جیسے تمہیں اپنے

”کون گولی مارے گا؟“

”یہ کام میں ہی کرتا ہوں تم ذرا گھومو اس کی ری کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا، دنا کے کی آواز پر یہ بھاگ نہ کھڑے ہوں۔“ جیکب نے اس سے کہا۔

”میں انہیں ذرا دور ہی لے جاتا ہوں تم ذرا جلدی اپنا کام ختم کر.....“ روبر نے کہتے ہوئے..... قدم بڑھائے اور دونوں گھوڑوں کی رسیاں پکڑے اس سے چند قدم دور جانے لگا۔

اوجھڑا جیکب نے اپنی بندوق سنہالی، چند قدم پیچھے ہٹا اور نرم کھاس پر بے سدھ پڑے علی ریمان کے سینے کا نشانہ بننے لگا۔ اس کی انگلی لمبی پرتھر کے کی اور پھر اگلے ہی لمحے اس کی بندوق نے دھماکے سے شعلہ اگلا۔ فائر کی آواز سے جنگل گونج اٹھا تھا۔

☆☆☆

مہمان گاہ کے کمرے میں رینا افسردہ سی بیٹھی تھی۔ شوکت اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھا منتظر نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رانیدار عجب خان، تندو بابا اور شانتا مہمان گاہ کے گوشہ عام میں موجود تھے جبکہ رابرٹ باہر کھین تھا۔

البتہ کمرے میں رینا اور شوکت کے علاوہ ایک تیسرا فرد بھی موجود تھا۔

یہ گاراشیا تھی۔ وہ ایک قریب دھری پڑی ایک مسہری پر گاڑ کچے سے پشت ٹکائے بے غماہ کوئی کتاب پکڑے بیٹھی تھی، مگر اس کی ساری توجہ اور گاہ بے گاہے نگاہیں ان دونوں کی جانب اٹھتی تھیں..... اسے ان چندایام میں ہی ادراک ہو چلا تھا کہ شوکت حسین اور رینا ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے ہیں اور گاراشیا اس کی وجہ پر دوسرے ہنری کی موت کا نکل اور بعد میں اس کے بھائی رابرٹ کی جھوٹی گواہی دینے کو مجبوری تھی۔ اگرچہ کچھ دن پہلے گاراشیا نے یہ جھوٹ بول کر شوکت کا رینا سے دل خراب یا اس کی طرف سے مایوس کرنے کی.....

کوشش کی تھی کہ..... رابرٹ اور رینا ایک دوسرے کو بچھین سے چاہتے آ رہے ہیں اور بہت جلد شادی بھی کرنے والے ہیں۔ مگر اب گویا چند ہی دنوں میں جیسے بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے گزر گیا تھا۔

یہی سب تھا کہ گاراشیا کے دل میں رینا کے لیے پہلے سے زیادہ رقیبانہ جذبات پروان چڑھنے لگے تھے۔ اس نے ان دونوں کا بھتا راستہ کھونا کرنے کی کوشش کی تھی وہ اتنا ہی ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے تھے اور اب آئندہ

ضرورت پڑی تو ریل کار کو چیک کرنے کے بعد جانے کی اجازت دیں گے۔“ جیکب نامی اس کے سامنے نہ کہا۔ پہلے والے نے اپنے سر کا شاپی جینش دے کر اس سے اتفاق کیا۔ اس کا نام روبر تھا۔

دونوں نے اپنے گھوڑے آگے بڑھا دیے۔ اچانک روبر کو اپنے دائیں جانب گیلی..... گھاس پر ایک درخت کے پاس کوئی گرا پڑا نظر آیا۔

”جیکب.....!“ اس نے اپنے آگے جاتے سپاہی کو آواز دی۔

”کیا ہوا؟“ جیکب نے اپنا گھوڑا روک کر گردن موڑ کر پوچھا۔

”اس طرف کوئی بے ہوش پڑا ہوا ہے۔“ روبر نے کہتے ہوئے فوراً اپنی نعل میں جھولتے ہوئے کارتوسوں کے تھیلے سے ایک کارتوس نکال کر چانا اور بندوق میں بھر لیا۔ اپنے سامنے کی دیکھا دیکھی جیکب نے بھی یہی کیا تھا۔

روبر نے فوراً فزورستہ کی جانب اپنا گھوڑا موڑ دیا اور بے سدھ پڑے آدی کے قریب لے جا کر روک دیا۔ دونوں محتاط انداز میں اپنی ہندوئیں سنبھالنے لپے اتر آئے۔

”ارے.....“ روبر کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔ ”یہ تو وہی ہے..... ہمارا شکار..... سوئیل۔“

”مگر..... اسے کیا ہوا ہے روبر!“ جیکب بولا۔

”دیکھو ذرا..... مرنو نہیں گیا ہے کہیں؟“ روبر آگے بڑھا اور سوئیل جو درحقیقت علی ریمان ہی تھا، پر جھک کر اس کا جنازہ لینے لگا پھر سیدھے کھڑے ہو کر جیکب سے بولا۔

”یہ زندہ ہے، ہمارا لگ رہا ہے۔ لگتا ہے سرد موسم اور تھکاوٹ نے اسے نڈھال کر کے بے ہوشی پر مجبور کر دیا ہے۔“

”میرا خیال ہے اسے اوجھڑا کوئی مار کر دواہن چل پڑے ہیں۔“ جیکب نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔ ”موسم بہت خراب ہو رہا ہے۔ کہاں اس مصیبت کو ساتھ لیے پھریں گے۔“

”تجویز تو تمہاری بری نہیں لیکن..... لیف روبر.....“

روبر نے دانستہ اپنا جملہ اوجھڑا تو جیکب بولا۔

”اس کی پروا امت کر دو..... بتاؤں گے کہ ہمیں دیکھ کر فراہ ہونے کی کوشش میں چلتی ہوئی ریل کار پر سوار ہو رہا تھا، ہم نے گولی مار دی۔“ جیکب نے تجویز بھائی۔

”چلو پھر جلدی کرو۔“ بالآخر روبر نے اس کی سفاکانہ تجویز پر صاف دے کر دے ہوئے کہا۔

ثبوت کی ضرورت تھی۔ تاکہ وہ سینا اپنی موج سنگھ کو نہ توڑ جواب دے سکے۔

اس کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ اس نے سب سے پہلے سردوں پر ناکا بندوں کو کلی ریمان کا ناک نقشہ بنا کر ہوشیار کر دیا۔ اس کے بعد بہت غور و خوض کے بعد وہ اپنے فوجی دماغ کے ساتھ سوچنے لگا کہ سوئیل (علی ریمان) ریاست کی حدود پار کرنے کے لیے خفیہ اور چور راستہ ہی اپنا سکتا ہے۔ ریاست سے باہر نکلنے کے وہی چور راستے تھے۔ ایک ایسٹ اور دوسرا تھو ویسٹ۔ ایسٹ کا راستہ اس عظیم کوہستانی سلسلے سے باہر نکلتا تھا اور وہ بہت زیادہ طویل اور دشوار گزار تھا۔ متوقع طور پر میٹنگ کے اغراض و مقاصد جان لینے کے بعد سوئیل بھی اپنا طویل راستہ اختیار نہیں کر سکتا تھا، جبکہ دوسرا چور راستہ تھو ویسٹ کا تھا اگرچہ یہ بھی دشوار گزار تھا مگر اس راستے کے ڈھلوانی راستے پر پٹری تھی۔ وہاں سے ہر روز ایک ریل کار اور دوسرے تیسرے روز مال گاڑی گزرتی تھی۔ اسے شک تھا کہ سوئیل، بالکل پورا یا تریپال پہنچنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اول الذکر طویل راستہ اس نے بعد میں چیک کرنے کا سوچا تھا، اس کے گھوڑا سہا پہلوں کے لیے بھلا کیا مشکل تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے دو سپاہی الگ الگ گھوڑوں پر تھو ویسٹ والے راستے پر روانہ کر دیے۔

ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ بارش نے انہیں آن لیا۔ ڈھلوان پھسلواں ہوئی تو انہوں نے اپنے گھوڑوں کی رفتار آہستہ کر دی۔ گھوڑے پھسلنے لگے تھے، تاہم سدھائے ہوئے تھے اسی لیے ڈھلوان سے اترنے لگے۔ انہوں نے لمبے رین کوٹ پہن رکھے تھے۔

ابھی یہ جنگل میں ہی تھے کہ ان کا سامنا خونخوار بھیڑیوں کے ایک غول سے ہو گیا۔ انہیں ایسی ”افاد“ کا تجربہ تھا۔ ایک سپاہی نے سوراگائے کی چرپی والا ایک کارتوس چاٹ کر (منہ سے کھول کر) بندوق میں ڈالا اور غول کے پیچ میں فائر کر دیا۔ دھماکا ہوا۔ بھیڑیوں کا غول ایک طرف کو بھاگ کھڑا ہوا۔

اسی وقت انہیں کسی ریل کے انجن کی دھل سنائی دی۔

”جیکب! لگتا ہے ہم منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔“ ایک فرنگی سپاہی نے گرد و پیش کے طوفانی مناظر میں ایک نظر ڈال کر اپنے سامنے سے کہا۔ ”لیکن اس جاسوس کا کہنا ہوتا نہیں چل رہا ہے۔“

”ریل کار کی سیٹی گونجی تھی۔ پٹری تک پہنچتے ہیں،

لاڑے بھائی رابرٹ کی حرکتوں کاظم ہی نہ ہو۔ اس کے کڑوٹوں سے بھلا ایک بہن سے زیادہ کون واقف ہو سکا ہے۔" رینا کی اس چوٹ پر گارشا گرم ہوئی اور مسہری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ چند قدم ان دونوں کے قریب آئی اور رینا سے پھٹکارے مشابہ آواز میں بولی۔

"میں پھر یہی کہوں گی کہ رابرٹ کو تم لوگوں نے خود اپنا دشمن بنایا ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ یہاں سے اپنا پورا بستر اٹھاؤ اور واپس ولی کی راہ لو۔"

"تو جاؤ تم۔" انہیں بھلا کس نے روکا ہے جانے سے.....؟" رینا نے بھی غصے سے کرسی سے کھڑے ہو کر اسے جواب دیا۔ شوکت پریشان ہو گیا۔ ایک لوکر کی حیثیت سے دونوں ہی اس کے لیے قابلِ احترام تھے۔ اس پر ستر اور گارشا ان کی محبت سے واقف ہو چکی تھی۔ شوکت کو یہی ڈر تھا کہ کہیں رابرٹ کی طرح گارشا بھی کوئی گل نہ کھا ڈیٹھے۔ ان حالات میں وہ ان دونوں غبی اور کینہ پرور بھائی بہن کی مخالفت مول لینے کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم غیر جانبدارانہ انداز میں ثالثی کا کردار نبھانا اس کا فرض تھا، اسی ناتے اس نے دونوں کو خاموش کراتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے آپس میں لڑنے کے بجائے موجودہ صورت حال کو اپنے حق میں بہتر کرنے پر غور کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ہماری آپس کی لڑائی سے ہمارے دشمن فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

گارشا نے جیبتی ہوئی نگاہوں سے شوکی کی طرف دیکھا اور اسی لمحے میں بولی۔ "یہ سارا کیا کر رہا تمہارا ہی ہے، مسٹر شوکی! تم نے ہی رینا سے اپنی ذاتی دلچسپیاں بڑھانے کے لیے اس کی ہر جائز و ناجائز باتوں کو درست قرار دیا اور نوبت یہاں تک آ پہنچی۔"

شوکت جانتا تھا کہ وہ کس برستے پر ایسا کہہ رہی تھی۔ وہ بھی خاموش نہ رہا۔ بولا۔ "مس گارشا! آپ کو میری طرف سے یقیناً کوئی خطرناک قسم کی غلط فہمی رہی ہے۔ میں تو ایک ملازم ہوں اور میرے امور فرائض سب کے لیے سنبھالے ہیں۔ اس کی بات پر گارشا نے بڑی ملتی سلتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو رینا بول پڑی۔

"گارشا! زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اور رابرٹ سمیت ہم سب پاپا کے ساتھ اپنی مرضی اور میرپائے کی نیت سے ہی چلے تھے۔ میرے پاپا اس قافلے کے سالار تھے اور شوکی کی شجاعت اور جفاکاری کو دیکھتے ہوئے انہوں نے ہی اسے اپنا نائب سالار مقرر کیا تھا اور یہ اب بھی

ہے۔ اس لیے برائے کرم تم اس کے ساتھ اچھے کی کوشش مت کرو، تم نے یارا رابرٹ نے یہاں سے جانا ہے تو خوشی سے جاؤ مگر یوں بے جا تنقید کے کہیں مزید پریشان نہ کرو۔" شوکی نے دیکھا رہتا دیکھتے ہوئے رو پائی ہوئے تھی۔ رینا کو رنجور اور آزرده خاطر دیکھ کر اس کا دل بھی اندر سے گھٹنے لگا تھا، مگر گارشا کی موجودگی میں وہ رینا کی ڈھارس بندھانے سے قاصر تھا۔ تاہم اس کے چہرے سے رینا کے دکھ کا کرب ضرور جھلکنے لگا تھا۔ گارشا کی گندی کبھی کی طرح بھانپنی نگاہوں سے شوکت کے چہرے کے یہ تاثرات تا زور ہی اور اس کی صورت کوئی نیا گل حلائی ہوئی جوش آتش و انتقام سے جلتی نظر آنے لگی تھی۔

"سنبھالو اسے اور اپنا فرض نبھاد، ہونہ۔" گارشا بالآخر اسے اندر کی گندری ظاہر کیے بغیر اندر سے باؤں کی طرف گھٹکی اور دوبارہ مسہری پر جا کر کتبہ تھامے لیٹ گئی۔ وہ جلد اور کینہ پروری کی اپنی ہی آگ میں اندر سے اندر گھٹنے لگی تھی۔ شوکت نے اس کے لیے یہی مزاجیہ کر رکھی تھی۔ اس کے منہ لگے بغیر ہی اسے اپنی ہی آگ میں جلتا چھوڑ دے کہ یہی سزا اس کے لیے کافی تھی کیونکہ یہی اس کا مقدر بھی تھی۔

وہ اب کی بار گارشا کی موجودگی کی پردا کیے بغیر رینا کے ساتھ ہوئے سے مخاطب ہو کر بولا۔

"مس رینا! تجیز، آپ دل چھوٹنا نہ کریں اور نہ ہی اس بات کی پردا کریں کہ کون ہمارے بارے میں کیا سوچتا ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں، ہم مل بیٹھ کر کوئی حل سوچ لیں گے۔" کہتے ہوئے شوکی نے رینا کے معصوم اور دکھ چہرے پر اپنی نظریں گاڑے رکھیں۔ اس نے دانستہ اپنی آواز چنی رکھی تھی کہ کہیں گارشا کے کانوں تک نہ پہنچ جائے اور وہ پھر نہ ہر گمان شروع کر دے۔ ادھر گارشا بھی بظاہر کتب پرنگا ہوا جتانے ہوئے بھی مگر درون خانہ وہ ان دونوں کے کان کترنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے شوکی کو رینا سے بڑی آہستگی سے کچھ کہتے تو سنا تھا مگر اس کے کہے ہوئے الفاظ وزن نہ تھے۔

اچانک شوکی کو رینا کے چہرے سے کچھ عجیب سی بے چینی کے تاثرات مترشح ہوتے محسوس ہوئے۔ وہ اپنا ٹیلا ہونٹ موتیوں جیسے دانتوں کی بالائی قفا تلے دبائے ہوئے تھی اور ساتھ ہی چورسی نگاہوں سے کوئے میں بھی مسہری پر شرم دراز کتاب پڑھتی گارشا کی طرف دیکھنے لگی۔ جب ہی اس نے اپنی پوشاک سے ایک خط نکال کر شوکی کو دکھایا اور ہوئے سے بولی۔

"اسے پڑھ لو جلدی سے۔۔۔۔۔ یہ مجھے اکل بائیکل شائے بھجا ہے۔" شوکی نے حیران سی نظروں سے خط لیا اور پڑھا۔ پڑھنے کے بعد اس نے وہ خط رینا کو واپس کر دیا۔ "کیا کہتے ہو اس خط کے بارے میں.....؟" رینا نے اس کی رائے لینا چاہی۔

"انگل شامی اس معاملے میں کوئی مدد کرنے سے قاصر ہیں۔" خط پڑھنے کے بعد شوکی فقط یہی کہہ سکا اور رینا کا دل ایک بار پھر اندر سے گھٹنے لگا۔ وہ شوکی کی بات کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

☆☆☆

بائیکل شا کا دوسرا خط لیف برجر اور تیسرا مہاراجا چندر گپتا کو موصول ہوا۔

ان خطوط کے آنے کی دیر تھی کہ مہانوں سے کہہ دیا گیا کہ وہ تقصیر اس کی خاطر راج محل کو چھوڑ کر کہیں اور ٹھکانا بنائیں۔ ریاست کی طرف سے ان کے ساتھ ہر قسم کی مدد شامل حال رہے گی۔

رینا پر یہ سحر بجلی بن کر گر۔ رابرٹ کا منہ لگ گیا۔ گارشا بھی ٹھٹھا لیکن راج محل کے دو افراد ایسے بھی تھے جنہیں اس حکم پر بے حد غصہ نہیں ہوا تھا۔ ان میں سے ایک تو خود ایش کمار ہی تھا۔ رینا سے وہ انیت رکھنے لگا تھا۔ وہ بچوں کی طرح اداس ہو گیا تھا جبکہ ولی عہد پر تاب کو قلعہ اس بات کا تھا کہ مہانوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا تھا۔ رینا کی دوری نے اس کے دل پر زبردست چوٹ کی تھی۔ وہ اس سے ملنا چاہتا تھا، اس کی دل جیتی اور ولداری کرنا چاہتا تھا مگر اس میں اس فیصلے کے بعد رینا کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہو پارہی تھی۔

اس فیصلے کے بعد مہاراجا شدت سے خطر تھا کہ پر جا کی طرف سے کیسا رد عمل ظاہر ہوتا ہے؟ اہل اداوی ہوا عیسا کہ سوچتی سمجھتی اسکیم کے تحت ہونا تھا۔ اس فیصلے کے بعد سب کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ مہاراجا چندر گپتا کو اپنے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹا محسوس ہوا۔ مہاراجا کی جوابی نے خوب بڑھا چڑھا کر مہاراجا کے سامنے اپنے ایش کمار کی تحریروں کے پلے باندھ دیے اور وہ بھی مردود ہوئے۔

ادھر ان باتوں اور سمجھ معاملات سے بے خبر رابرٹ..... سوچنے کے گرد اپنا جان ڈالنے میں مشغول تھا۔ وہ دونوں ایک بارہوری اور شہنشاہ کے قریب قدرے تباہ ہوئے

رنگ آسمان

مالی حیثیت

"ایک آدمی نے اپنے ڈاکٹر دوست سے پوچھا۔ تم جس مریض کو بھی دیکھتے ہو سب سے پہلے یہی پوچھتے ہو کہ رات کو کیا کھا تھا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر جواب دیا۔ "اس سے مریض کی مالی حیثیت کا پتا چلتا ہے۔"

کیا آپ جانتے ہیں؟

☆ دنیا کا قدیم ترین پرچم ڈنمارک کا ہے۔
☆ پھولوں اور پھلوں کا شہر شیراز (ایران) کو کہا جاتا ہے۔

☆ دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی امریکا کے شہر کیلفورنیا میں ہے۔

☆ دنیا میں سب سے زیادہ اسکول چین میں ہیں۔
☆ افریقا کے شہر "نیم زرا" میں تمام مکانات نمک سے بنے ہوئے ہیں۔

مرسلہ: غلام حسین اختر۔ پھر انوار

میں کھڑے ہاتھیں کر رہے تھے۔ سوچنا آج کل ان رنگت کی بنا رہی ساڑی پہن رہی تھی۔ وہ ایک کم عمر اور نازک اندام نظر آنے والی دو شیرہ تھی۔ اس کی طبیعت میں شرمیلا پن مگر سوچوں میں متون سزا جی تھی۔ ہر لمحے کا ناپا پن اس دو شیرہ کے لیے ایک تحس کا درجہ رکھتا تھا۔ اب بھی وہ رابرٹ کی باتوں پر ایک تحیر آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یہی وہ اس کی کسی بات پر شرم سے سرخ ہو جاتی تھی اور سر جھکا لیتی تھی۔ رابرٹ اسے انگشتان اور لندن کی باتیں بتا رہا تھا۔ وہاں کی آزاد خیال زندگی، نیا ماحول اور ہر قسم کی اقدار بھری پابندی سے عاری زندگی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہاں کے کلبوں کا بھی اس نے خاص طور پر ذکر کیا تھا اور کچھ ایسے انداز میں کیا تھا کہ سوچنا کا چہرہ ایک بار تو شرم سے سرخ ہو گیا، مگر پھر وہ بھی رابرٹ کی ایسی باتوں پر دلچسپی لینے میں مجبور ہو گئی۔

"میرا دل کرتا ہے تمہیں ایک بار انگلستان ضرور لے کر جاؤں۔ وہاں تمہیں سب سے پہلے لندن کی سیر کرنا ڈن کلبوں میں لے جاؤں۔ مجھے یقین ہے تم بہت انجوائے کرو گی۔" رابرٹ کسی عیدے لومڑی کی طرح اس پر ڈورے ڈالنے میں مصروف تھا۔

"نہیں..... لیکن میں بھلا کیسے اتنی دور سفر پر جا سکتی

مجھے تو یہاں کے جنگلوں سے بڑا خوف آنے لگا ہے۔ وہ آخر میں تھر تھرا کے بولی۔
”ہم راکا کٹی کی وادی میں ڈیرا ڈالیں گے۔“ رینا نے جیسے بہ یک کلمہ ان کی سامعوں میں دھماکا کر ڈالا۔ ماسوائے شوکی کے سب کے چہروں سے خوف کے آثار چمکتے گئے۔

☆☆☆

لیف بروجر نے اپنے دونوں گھڑسوار سپاہیوں کو علی ریحان کے تعاقب میں روانہ کرنے کے بعد فوراً اریبہ اور شاہ زمان کو طلب کرنے کا حکم جاری کر دیا۔
اریبہ اور شاہ زمان اپنے دل و دماغ میں ہزار قسم کے دوسوے لیے اس کے روبرو حاضر ہو گئے۔ اریبہ نے یہاں اپنا نام دینا کوری، شاہ زمان کا بھوتے جیسے اپنا شوہر کہا جبکہ تیسرے علی ریحان کا نام سوشل بتاتے ہوئے اسے اپنا بھائی ظاہر کیا تھا۔

لیفینٹنٹ بروجر..... سینا پتی موج ستھ کی تادیب کے بعد ذرا غلط بھی تھا ہی لے وہ ان سے سخت لہجے میں تو بات کر سکتا تھا اور دھماکا بھی سکتا تھا لیکن جسمانی طور پر وہ انہیں ہاتھ بھی لگانے کا جاز نہ تھا۔ تاہم اپنے چہرے پر خوشخواری لاتے ہوئے اس نے پہلے پڑیش نظریوں کے ساتھ دونوں کو گھورا اریبہ اسے پچھا کہ کر بھاگ گئی تھی، وہ بھی اس کے دل میں تھا لیکن ابھی وہ اس بارے میں کوئی بات کرنے کے سوا نہیں نہ تھا، یوں بھی اریبہ کے ساتھ شاہ زمان بھی تھا۔

”تمہارا تیسرا ساتھی کہاں ہے؟“ لیف بروجر نے دانستہ اریبہ کو نظر انداز کرتے ہوئے شاہ زمان کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔ اریبہ نے جواب دینے کے لیے منہ کھولنا چاہا تھا کہ بروجر نے نہایت دشتی سے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر اس سے کہا۔

”جس سے میں سوال کروں، صرف وہی اپنا منہ کھولے۔“

”ہاں تو بھوتہ! کیا کہتے ہو؟“
”جناب! وہ اپنے گھر گیا ہے۔“ شاہ زمان نے نارمل لہجہ اختیار کرتے ہوئے جواب دیا۔

”گھر..... کون سا گھر.....؟ کیا تم لوگوں کا گھر بھی ہوتا ہے؟“ بروجر نے قرش لہجے میں طنز کیا اور آگے بولا۔
”جہاں تک میری معلومات ہیں تم پابند ڈے ڈو منوں کا گھر تو نہیں ہوتا۔“

”ہم باندھے یا خانہ بدوش نہیں ہیں جی! کوئی ہمیں..... کا بجا گھر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ یہ شیک ہے ہم بھی

یا کر مار کم بحث و مباحثے سے منع کر رکھا تھا، بلکہ رابرٹ اور گارشا سے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اسے اب تو ان کا بھی ان کے ساتھ (رینا اور شوکی کے ساتھ) رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں بچا ہے۔ لہذا۔۔۔ وہ لیف بروجر سے رابطہ کر لیں تاکہ وہ ان کی ریاست سے ولی روائی کا بندوبست کر دے۔ آج کا سارا دن ان کے پاس تھا لیکن..... چونکہ رابرٹ اور گارشا کے ”معاہلات“ ایسی ہیج رہتے کہ وہ..... رینا اور شوکی کا ”ساتھ“ چھوڑنے سے قاصر تھے۔ رابرٹ، سونجنا پر ڈورے ڈالے ہوئے تھا، نیز وہ شوکی اور رینا کا راستہ کھونا کرنے کا دل میں تہیہ کیے ہوئے تھا، وہ دیش بھی کینا اور بغض گارشا کے دل میں بھی تھا۔ اسے راج محل سے تو کوئی لینا دینا نہیں تھا مگر وہ شوکی کو حاصل کرنے کے لیے بے چین تھی۔ اس نے بھی اپنے دل میں نیکارا وہ باندھ رکھا تھا کہ اگر شوکی اس کا نہ ہو سکا تو وہ اسے رینا کا بھی نہیں ہونے دے گی۔ مگر یہ ظاہر مکاری سے کام لیتے ہوئے انہوں نے رینا سے یہی کہا تھا کہ..... وہ رینا کو شخص کو کروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ کر جاسکتے۔ لایہ کہ رینا ان کی بھی ”ڈسے داری“ ہے۔ کل نکلاں رینا کو کچھ ہو گیا وہ انکل شا کا کینا نہ دکھائیں گے اور انگلستان کس منہ سے لوئیں گے وغیرہ۔ رینا ان کے دو غلے بن کر تو کچھ یادہ محسوس نہ کر سکی البتہ شوکت حسین ان شہر پسند بہن بھائی کی مکاری کو کچھ طرح سمجھ رہا تھا، جبکہ امجد خان اور مندو بابا کا معاملہ شوکی جیسا ہی تھا، یعنی وہ رینا کے ساتھ تخلص ہی تھے۔

چنانچہ سردست رابرٹ اور گارشا نے بھی کسی بحث یا لڑائی میں پڑنے کے بجائے یہی سوال اٹھایا۔

”آخر اب ہم جاہیں کہاں.....؟“

”اگر تم لوگوں نے میرے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں نے سوچ رکھا ہے کہ ہمیں کہاں جانا ہوگا۔“ رینا نے گہری متانت سے کہا۔

”یہاں سے بھلا ہم کہاں جاسکتے ہیں؟ راج محل کے ہاہر اور ریاست کے اندر ہی کسی دور افتادہ گوشے میں خیمہ زن ہو جائیں گے، جیسا کہ پہلے انکل ہتری بھی چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ آزادوں سے اپنا کام کرنے کا تھا اور وہ اس مقصد کے لیے ہمیں یکم قائم کرنا چاہتے تھے۔“

”لیکن برادر! تم بھول رہے ہو کہ ہماری ریاست میں حدود مقرر کر دی گئی ہیں، جس کے تحت ہم راج محل سے ایک فاصلہ پر رہتے ہوئے کیسے لگا سکتے ہیں۔“ گارشا نے کہا۔
”اس حساب سے تو ہم آبادی سے بہت دور ہو جائیں گے۔ یعنی جنگل میں ڈیرا ڈالنا پڑے گا۔ اف.....!

اڑتے ہوئے حسرت سے دیکھا کرتی ہوں۔“ سوچنا نے بھی اپنے اندر کا اظہار کر ڈالا اور رابرٹ اسی طرح اس کے اندر کو ابھار کر اسے جاننے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہوئے آگے بولا۔

”تمہاری یہ راج محل کی زندگی کلی بندی ہے۔ دولت کے دھیر میں محض ایک پنجرہ ہے۔ صبح و شام ایک ہی طرح کے..... نہ کوئی روتی نہ کوئی کشش۔ کہیں جاؤ تو تم لوگوں کے ساتھ پچاس لوگ ہوتے ہیں۔ انہی کے دائرے میں قید رہتے ہوئے تم کہیں باہر ہوتے ہوئے بھی ایک قیدی ہی تو ہوتی ہو۔ مزہ تو اکیلے اپنے کسی ایک دل پسند ساتھی کے ساتھ آزاد ماحول میں گھومنے بھرنے کا ہے۔ ایسا ساتھی جو تمہیں بہت چاہتا ہو، تم سے بے حد پیار کرتا ہو۔ جیسے میں اور تم.....“ چالاکی سے یہ کہتے ہوئے رابرٹ نے سوچنا کے چہرے کی سرخ پڑی رنگت کو دور اور چاہتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ اس وقت ایک بھوکا مگر خاطر لومڑ دکھائی دے رہا تھا جو اپنے کسی شکار کو پھانسنے کی کوشش میں لگا ہو۔ اس نے دیکھا کہ سوچنا اس کی بات پر شرمانی تو ضرور کی مگر ایک آہی بھر کر اس نے رابرٹ کو ایک حسرت زدہ سی مسکراہٹ سے بھی نوازا دیا تھا۔ رابرٹ مزید جرات کرنے اور چکر چلانے کے موذ میں تھا مگر کسی کی آمد پر اسے اپنا یہ سلسلہ موقوف کرنا پڑا۔

رابرٹ..... قصور میں سوچنا کو ایک سونے کی ایسی چڑیا سمجھنے لگا تھا جسے وہ حقیقتاً ایک ہی بار ذبح کر کے..... سارے انڈے تھہ لیتا چاہتا تھا۔ اسے یہ کہہ کر وہ یہاں سے سونے کی گھنٹری کے ساتھ ہی..... بھگالے جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ یہاں رہتے ہوئے رابرٹ نے ایسے ایسے نادر و نیش قیمت نمونے دیکھے تھے، جن کی انگلستان میں بڑی کمیت اور مانگ تھی۔ خود رابرٹ انگلستان میں ایک تیسرے درجے کی زندگی گزار رہا تھا مگر سوچنا سے وہ یہی کہتا تھا کہ اس کا باپ بہت امیر کبیر اور جاگیردار شخص تھا۔ لندن کے مضافات میں ایک بڑی کاؤنٹی کا مالک، جس کے مرنے کے بعد اب وہی مالک تھا۔ وغیرہ۔

☆☆☆

راج محل سے بے دخلی کی سبکی کوسب سے زیادہ رابرٹ اور اس کی بہن گارشا نے محسوس کیا تھا۔ یہ لوگ سب مہمان گاہ میں موجود تھے اور رینا کے ایما پر ڈرائیور امجد خان مندو بابا اور شائنا بھی مہمان گاہ کے گوشے میں موجود چہرے لٹکائے موجود تھے۔

رینا نے کسی نفسا کو گرم دیکھتے ہوئے کسی بھی قسم کی لڑائی

ہوں؟“ سوچنا نے بھی اندر ہی اندر رابرٹ کے سینچے ہوئے نقشے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔
”پانی کے جہاز میں.....“ وہ بولا۔ ”کیا ہے سفر بھی تم نے پانی کے جہاز میں؟“

”نہیں تو.....“ سوچنا نے ساوہ لوجی سے نفی میں اپنا سر ہلایا۔

”تو کچھ یاد دیکھا ہے تم نے دنیا میں.....؟“ رابرٹ اس کے معموم سے تنہا کوا بھارتے ہوئے بولا۔ ”بھئی کر کے دیکھو پانی کے جہاز میں سفر..... کتنا مزہ آتا ہے، بیکراں پھیلے ہوئے سمندر کی گود میں بھگورے لیتے ہوئے۔“

”ہے بھگوان! مجھے تو سمندر بہت اچھا لگتا ہے، مگر کبھی دیکھا بھی نہیں میں نے۔“ وہ بولی۔
”صاف کرنا..... تم کہنے کو تو ایک راج کساد ہو..... لیکن سچی بات کہو! گا تمہاری حیثیت یہاں ایک قیدی سے بڑھ کر کچھ نہیں۔“ وہ مکار لومڑی طرح بولا۔ ”ان پہاڑیوں اور جنگلوں میں گھری ہوئی یہ قلعہ بند زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ ہونہ۔“

سوچنا کو رابرٹ کی باتوں میں بے حد کشش محسوس ہو رہی تھی مگر وہ اس بھی ہوئی جسے رابرٹ کی لومڑ جیسی مکار آنکھوں نے فوراً تان لیا۔ یوں اسے ایک ذرا ”جرات“ کا موقع ملا اور اس نے سوچنا کی نرم و نازک گھڑی پر ہاتھ رکھا سوچنا کچھ نہیں بولی تو وہی ہاتھ پھیل کر سوچنا کی گردن اور پھر اس کے دائیں مہین سے گول تک چلا گیا۔

سوچنا بیسی ان چھوٹی دوشیزہ کے لیے ایک بھر پور مرد کے کھرورے ہاتھ کا یہ کس بہت مستی خیز اور الگ انوکھے پن کا احساس دلاتا محسوس ہوا۔ وہ سرخ ہونے لگی اور دھیرے سے اس نے اپنا کول سا چہرہ تھوڑا پیچھے سر کالیا۔ وہ اپنے لطیف اور عذرا و چود پر ایک جوان مرد کے کسی گری کو برداشت نہیں کر پارہی تھی۔

”سوچنا! اب کہتا ہوں۔ یہ کوئی زندگی نہیں۔“ وہ بہت کر کے آگے بولا۔ ”بے شک تم ریشم و کم خواب میں سوئی ہو، شامانہ زندگی گزارتی ہو لیکن کسی تم نے ان چو باروں سے کھلے نیلے آسمان پر اڑتے آزاد پنچھیوں کو دیکھا ہے؟ کتنے خوش ہوتے ہیں یہ..... اپنی آزادی پر..... بیکراں پھیلے آسمان کی وسعتوں پر اڑان بھر کے انکس خوشی ہوتی ہے۔ آؤ نالو..... بھی انہیں سونے کے پنجرے میں بند کر دو، یہ ایک دم اداس ہو جائیں گے۔“

”ہاں! میں اکثر ان آزاد اور درست المست پنچھیوں کو

نجاہوں کی طرح ہی زندگی گزارتے ہیں لیکن.....
 ”بس“ بروجر نے اچانک اسے چپ کرا دیا۔
 ”جو پوچھوں اسی کا جواب دو۔ سوئیل کو تم نے کہاں بھیجا ہے؟“
 ”اسے گھر“ شاہ زمان نے وہی جواب دہرا دیا۔
 ”گھر کہاں ہے؟“

اسی دوران شاہ زمان نے محسوس کیا کہ اریبہ بہت بے چینی سی نظر آ رہی تھی۔ یوں، جیسے وہ اس سوال کا جواب دینا چاہ رہی ہو۔ ضرور اس کے ذہن میں کچھ تھا۔ شاہ زمان نے جلدی سے سوچا۔

درحقیقت بروجر کے ہاں اس طرح اچانک چلی ان کی توقع کے خلاف تھی۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ بروجر جی رہا ان کے یوں اچانک راج محل سے چلے جانے سے واقف ہو چکا ہے۔ ورنہ وہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار رہتے۔ تاہم اس بات کا امکان ان کے ذہن میں تھا کہ کئی کیوں اچانک روٹ گئی ہو اور کوئی نہیں تو بروجر ضرور شکسکتا ہے۔

بہر طور..... اسی سبب شاہ زمان نے ایک دم بہانہ بناتے ہوئے اپنے ساتھ کھڑی اریبہ کی طرف ایک نظر ڈالنے کے بعد بروجر سے کہا۔

”وہی..... سچی بات یہ ہے کہ میں تو اس وقت سویا ہوا تھا جب اس کا بھائی اچانک کہیں چلا گیا تھا۔ اسی لیے آپ کے سوال کا صحیح طرح جواب میری چٹی مینا کوری ہی دے سکتی ہے۔“

”ہوں.....“ بروجر نے پرخیاں ہی ہکا بکا خارج کی اور اریبہ کی طرف سوا ہر گرد دہشتی سے دیکھا تو وہ فوراً بولی۔
 ”حضور.....! ادھر پان پور میں مغربی ایک میلا لگنے والا تھا۔ سوئیل وہی معلوم کرنے گیا ہے۔ کب اور کس دن میلا لگے گا، تاکہ ہم بھی یہاں سے اپنی تیاری باندھ لیں۔“ اریبہ نے دانستہ ریاست تریپال کا نام لینے سے اجتناب برتا تھا۔

”تم نے سوئیل کو بغیر مہاراجا کی اجازت کے کیوں راج محل سے باہر بھیجا؟“ بروجر نے اریبہ سے اگلا سوال کیا۔
 ”سرکار.....! ہم اتنے کہاں اہم ہیں کہ کسی سے پوچھتے پھریں۔ وہ تو آپ جیسے بڑے لوگ ان باتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ہم تو کم ذات کے چھوٹے لوگ ہیں حضور.....! یوں بھی مہاراجا صاحب نے ہم پر تو ایسی کوئی پابندی نہیں لگا رکھی ہے۔“

”بہت چالاک بن رہی ہو تم.....“ کہتے ہوئے بروجر نے اسے بڑی سنسنیاتی ہوئی نظروں سے گھورا۔ وہ ان کے

جواب سے قطعاً مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ان دونوں میاں بیوی کو اتنا لنگھ کر اور ان کے جسموں کو برہنہ کر کے ان پر کوڑے برساکر جھانکے۔

اریبہ تو نہیں البتہ شاہ زمان کی جست نظریں ضرور بروجر کے چہرے پر اس کے اندر کے اٹھنے والے جوار بھانا کو تازہ رہیں اور یہ بھی کہ وہ ان کے منہ سے اٹھانے کے لیے کوئی بھی راستہ اختیار کرنے کی نیت رکھے ہوئے ہے، مگر کسی وجہ سے وہ یہ سب ان کے ساتھ نہیں کر پا رہا۔ وجہ ظاہر ہے یہی تھی کہ انہیں جارحی طور پر یہی، راج محل کے شاہی گویوں کی حیثیت حاصل تھی لیکن یہ حقیقت اریبہ اور شاہ زمان دونوں ہی نہیں جانتے تھے کہ لیف بروجر کی اس معاملے میں سینا پتی سے بھی گرامر بحث ہو چکی تھی، یا پھر شاید انہیں ایسا ہی کچھ اندازہ تھا۔

بروجر نے اسی وقت ان دونوں کو ساتھ لیا اور موج سنگھ کے پاس پہنچا۔ پھر سرا مال اس کے سامنے رکھ دیا۔ سینا پتی موج سنگھ کو بھی اپنے عہدے اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا۔ بے شک اس کی دوایک روز پہلے لیف بروجر سے تو کھرا ہو چکی تھی، مگر بہر حال یہ دونوں مشترکہ مفادات اور مصالحت کوئی کے پیش نگاہ ایک دوسرے کی باتوں کو سننے اور اس پر غور کرنے پر مجبور بھی تھے۔

موج سنگھ کے سامنے جب لیف بروجر نے یہ سوال رکھا تو اس کے فوجی ذہن نے بھی اسے کھد یڑا کہ بات غلط نہیں تھی۔ الا یہ کہ اپنی جگہ جواب طلب بھی ضرور تھی۔ لہذا اس نے پہلے تو ان دونوں کی طرف باری باری بہت غور سے دیکھا اور پھر جیسے دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

”دیکھو! ہم تم پر جاسوس ہونے کا شبہ تو نہیں کرتے مگر ہمیں یہ دھڑکاؤ تو ہر کسی سے ضرور لگا رہتا ہے کہ وہ جاسوسوں کے کسی جھانے یا لالچ میں آکر ایسا کوئی خطرناک کام نہ کر ڈالیں جو تم لوگوں کی بھیاں موت کا سبب بنے۔ کیونکہ ان لوگوں کی رسائی بہ آسانی راجاؤں اور نوابوں کے محلات تک پہنچتی ہے۔ کوئی بھی جنہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہے بھی تو بتا دو ہمیں..... میرا وعدہ ہے میں معاملہ ادھر ہی ختم کر دوں گا اور معافی بھی دلا دوں گا۔“

لیف بروجر موج سنگھ کے اس سوال پر اندر ہی اندر بری تھلا طرح رہا تھا جبکہ وہ ان دونوں کے ساتھ کسی قسم کی بھی نرمی برتنے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ریاست کا یہ سینا پتی ان سے خست باز پرس کرے۔

رنگ آسمان

”ارے حضور! کیسی باتیں کرتے ہو، ہم غریب گوئے ایسا خطرناک کام کیوں کرنے لگے۔ اگر ایسا ہوا بھی تو ہم سب سے پہلے آپ کو خبردار کریں گے۔ ہم تو نوجوانے والے لوگ ہیں ہمیں بھلا ایسا خطرناک اور مشکل کام کہاں آتا ہے۔“

اریبہ نے چالاک سے کہا۔
 ”تو پھر تم نے اپنے ساتھی سوئیل کو کہاں بھیجا ہے؟“
 موج سنگھ نے پوچھا۔

”بتایا نا..... حضور! وہ پان پور گیا ہے۔ وہاں محیش دیوتا کا عقرب میلانے والا ہے۔ اس کے بارے میں پتا کرنے گیا ہے کہ کون سے دن کو لگے گا۔“ اریبہ نے بتایا تو اسی وقت لیف بروجر نے موج سنگھ کے کان میں کچھ کہا۔ اریبہ اور شاہ زمان کا دل اندر سے بری طرح دھڑکا جا رہا تھا۔ انہیں خدشہ تھا کہ اگر موج سنگھ، لیف بروجر کے بھانے میں آگیا تو ان کے ساتھ برا ہو جائے گا۔

موج سنگھ نے اپنے کان میں پڑی بروجر کی سرکشی پراٹھات میں سر کو جنبش دی اور ان سے بولا۔
 ”کب تک لوٹے گا سوئیل؟“
 ”دو..... دو تین روز میں.....“ اریبہ کے منہ سے نکلا۔
 اس کی آواز تو مڑی اور کھڑانے کی گئی۔

”ٹھیک ہے، ہم ابھی اپنے کچھ آدمی اس کے پیچھے روانہ کرتے ہیں۔ اگر وہ وہاں نہ ملا تو ہم تمہارے اس جواب کو جھوٹ پر محمول کرتے ہوئے اپنے شبہ کا اظہار بھی مہاراجا صاحب سے کر دیں گے پھر وہی تم لوگوں کے بارے میں آخری فیصلہ کریں گے لیکن اب یہ بات یاد رکھنا..... تم دونوں میں سے کوئی بھی بغیر اجازت کے راج محل سے باہر نہیں جائے گا۔ سمجھ گئے؟“

”سمجھ گئے حضور..... سمجھ گئے۔“ دونوں نے جلدی سے اپنے سروں کو اٹھائی جنبش دیتے ہوئے ساڑی سے کہا۔
 اس کے بعد موج سنگھ نے ان دونوں کو جانے کی اجازت دے دی۔ وہ دونوں کمرے سے نکل گئے تو لیف بروجر نے سینا پتی سے کہا۔

”میں اپنے دو سپاہی پہلے ہی روانہ کر چکا ہوں۔ لیکن ان دونوں پر بھی یہاں لڑکی نگاہ رکھنا ضروری ہے۔“

”ہاں! تم نے اچھا کیا۔ ہم بھی اپنے آدمیوں سے کہہ دیں گے۔“ موج سنگھ نے اس سے ہچکا چڑھاتے ہوئے کہا۔
 دراصل موج سنگھ کو فزنی سپاہیوں کی راج محل میں تعیناتی شروع ہی سے ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ یوں بھی بروجر اس کا ہم منصب نہیں تھا۔ تاہم برٹش گورنمنٹ کے دور میں

☆☆☆

سہ پہر کا وقت تھا۔ سردی کی کاٹ کسی دقت بھی شروع ہونے والی برف باری کا پتا دیتی تھی۔ قلعے کی جنوب مشرقی سمت کی فصیل کی ڈھلوانی راہ گزر پر ڈاک گاڑی تیار کھڑی تھی۔ (ڈاک گاڑی اس زمانے کی گھوڑا گاڑی کو کہتے تھے۔ جو بالکل بند ہوتی تھی اور عموماً سخت سردی اور بارش اور برف باری کے موسم میں چلا کرتی تھی) اس کے اندر مہارانی نوجوانی اور بچہ ورام بیٹھے تھے۔ بوڑھے کوچیان نے ان کے سوار ہوتے ہی ڈاک گاڑی میں بچے ہوئے دو گھوڑوں کو ہلکے سے چاک مار کے ٹھکارا اور پھروہ چل پڑی۔

نکلنے تاریخیک جنگوں میں گھری اس راہ گزر پر ڈاک گاڑی مناسب رفتار سے دوڑتی ہوئی کالی کے مندر تک جا پہنچی۔ مندر کے گرد و جوار میں آسپہی سناٹا طاری تھا۔ ایک ٹھنڈا ہوا مٹکا اندر مہارانی کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا۔ مہارانی اپنا لباس سنبھالی ہوئی بچہ ورام کے سہارے سے نیچے اتری اور پھر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

اندر ہال کمرے میں ایک شخص جیسے اسی کا... خنجر کھرا تھا۔ اس نے نوجوانی کو نہایت احترام کے ساتھ پرنام کیا اور اسے لیے ایک اور کمرے میں آگیا۔ بچہ ورام بھی ساتھ تھا۔ اس کمرے میں مہاراجا کے ساتھ اس کا خاص چیلہ پرس رام بھی موجود تھا۔ اس نے بھی کھڑے ہو کر مہارانی کو پرنام کیا اور پھر دونوں آگئے سامنے ایک کونے میں بھیجی نشستوں پر براجمان ہو گئے۔ ان نشستوں کا بندوبست خاص طور پر کیا گیا تھا جبکہ پرس رام اور بچہ ورام ایک طرف فرش نشست پر ابھی مار کے بیٹھ گئے تھے۔

”حالات قابو ہیں آپکے ہیں بدری نا تھا تم نے آگے کیا سوچا ہے اب.....؟“

مہارانی نے چھوٹے ہی مہاراجا سے پوچھا۔ بدری نا تھا نوجوانی کی بات کا مطلب سمجھتا تھا بولا۔

”مہارانی جی! میں نے بہت محنت سے اور خود کو خطرے میں ڈال کر دلی عہد کی کھیا کھوی کرنے کے لیے ایک پورا چکر بنایا تھا۔ مگر فسوس وہ آپ کی وجہ سے ضائع چلا گیا۔“
 ”میری وجہ سے..... ہوا یا تمہاری ترنت کاری (جلد بازی) کی وجہ سے ہوا.....؟“ مہارانی نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

کے انداز میں خود سپردگی تھی۔

”اے یہ احم بہت بہادر ہو، آخر کب تک تم خود کو ہماری خاطر خطرات میں ڈالتے رہو گی؟ ہم کوئی اور ترکیب بھی تو سوچ سکتے ہیں۔“

”تمہاری خاطر؟“ ”اڑیہ؟“ اسکی سے جدا ہو کر بولی۔ ”ہرگز نہیں، میں جو کچھ کر رہی ہوں تمہاری خاطر نہیں بلکہ اس نیک مقصد کی خاطر کر رہی ہوں۔ لیکن ذرا سوچو زمانا! ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ ہمارا بھی یہاں قیام ضروری ہے۔ تم دعا کرو میری کامیابی کی..... اور میرا ساتھ دو۔ بس اسب ٹھیک ہو جائے گا۔“

شاہ زمان سوچتا رہ گیا۔ وقت گزر چلا جا رہا تھا۔ اریبہ نے اس کی طول پکڑنی خاموشی کو اشکات میں جانا اور پھر اس سے اجازت لے لی۔

☆☆☆

لیف روج..... اپنے کمرے میں پشت پر دونوں ہاتھ بندھے جھپٹی سے ٹہل رہا تھا کہ چانک اس کے کانوں سے ہلکے شور کی آواز گھنٹی..... اس نے ایک سیاہی کا آواز دے کر نذر بلایا اور اس شور کا سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ باہر وہ دونوں گویے میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ہو رہا ہے۔ لیف روج چونک سا گیا اور یہ ”ظفر“ کو کہنے کے لیے خود ہی..... کمرے سے باہر آ گیا کیونکہ اسے پتا چلا کہ یہاں کبھی اپنے شوہر بوجھت کا گھر میاں بیوی کے لئے لے رہی تھی۔

”تو اس کو یہاں کیوں بلانا چاہتا ہے میں خوب جانتی ہوں۔ میرے بھیا مشیل کیا گئے یہاں سے تم نے بھرہوی رنگ روپ دکھانے شروع کر دیے۔“ ازیبہ، شاہ مان کا گریبان پٹڑے مسلسل یہ کہے جاری تھی اور لیف ورجر قدر سے حیرت سے یہ ”نظارہ“ دیکھنے میں مگھوٹا۔ اس کے ہنرے کی ترشی اس منظر کو یکے کر چاک ایک ”خاص“ قسم کی کچی میں بدل کر گئی۔

”میرا دشو اس کر دینا! تم غلط سمجھ رہی ہو مجھے۔ کا منا کو
 یں اسی لیے.....“

”مت لو بار بار اس حرافہ کا نام میرے سامنے.....
لینے دو میرے سوشل بھیا کو..... پھر میں چھپیں مرہ چکھاتی
وں۔“ اریہ غصے سے شاز زمان سے بولی۔ شاز زمان کو بھی
نصا گیا۔ اس نے ایک چھپر اریہ کے چہرے پر جڑا۔ پھر تو
یہی قامت آگئی۔ اریہ نے چلاتے ہوئے اس کا منہ لوچنے
کے لیے اپنے دونوں ہاتھ اس کے چہرے کی طرف
دھرائے۔ شاز زمان اس کی انگلیوں کے نیچے ناخنوں سے بننے

”تمہاری بات ٹھیک ہے، لیکن اس طرح ہمارا راج محل چھوڑنا ان کے نقصین کو پہنتے بنا دے گا۔“

”جہاں تک صرف اس فرنگی انسر بردار کے شکوک کی بات تھی تو مجھے اس کی پروا نہ تھی، لیکن علی بھائی کے یوں چاٹک راج محل سے روانگی نے لگتا ہے سیہنہ پتی موج ستھکدہ کبھی ملک میں جتلا کر دیا ہے۔ یہ ایک خطرناک علامت ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے اریدہ الیکن باوجود اس کے ہم یہاں سے چپ چپاتے فراریں ہو سکتے۔ اس طرح... ان کا شبہ تعین میں بدل جائے گا اور کوئی بعید نہیں کہ وہ جی پلان میں بند ہلی کر لیں، اگر اکیس کیا تو ہمارے ساری محنت اور قربانیاں کالت چلا جائیں گی۔“ شاہ زمان نے گہری ٹھیک سے کہا۔

اریدہ کو کبھی یہ بات سمجھ آ رہی تھی اسی لیے وہ بھی چندھوں کے لیے چپ کی ہوئی۔ دونوں دھم کی سرگوشیوں میں باقیں کر رہے تھے۔ شاہ زمان نے مزید کہا۔

”جب تک علی تریہ پال کچھ کر لو اب شہزاد خان سے مل کر اسے مانگیں شاور چندر گپتا کے خطرناک عزائم سے کچھ نہیں کر دیتا، ہمارا یہاں سے کوچ کرنا اس مشن کو ناکام بنانے کے مترادف ہوگا۔ بلکہ مشن کے زیادہ سے زیادہ مودوں میں تاج حاصل کرنے کے لیے ہمارا بھی ادھر ہی قیام کرنا بہت ہی اچھے ہے۔“

اے یہ فطرتِ باہت زیرِک دماغِ محی! بعض خاص قسم کے حالات میں اس کا ذہن تیزی سے کام کرتا تھا۔ وہ کوئی مضمون نہ پڑھتا تھا۔ تب ہی جیسے اس کا چہرہ ایک دم پرسکون نظر آنے لگا۔ اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکی تھی اور ہر اس لمحے میں وہ شاہِ زمان سے بولی۔

”میرے ذہن میں ایک منصوبہ آیا ہے، اس میں خطرہ ہے مگر کامیابی کی بھی اتنی ہی امید ہے۔“

”کیسا مضروب؟“ شاہ زمان نے اس کے چہرے کے
 اندر تانتوش پر نظر اس کاڑتے ہوئے پوچھا۔ اربہ اسے اپنے
 مضروبے سے آگاہ کرنے لگی۔ جسے سننے کے بعد شاہ زمان کا
 ہاتھ رگڑتے ہوئے کہنے لگا۔

”نہیں! میں نہیں اس خطرناک منصوبے پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ مجھے اپنی پروا نہیں، لیکن ہماری زندگی میرے لیے اہم ہے۔“

”کیا مشن اہم نہیں.....؟“ اریریہ نے خفیف سی ایک دمائے مسکان سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ شاہ زمان کو اس بات پر یقین نہیں تھا کہ اس قدر بھاریا کہ اس نے بے اختیار اریریہ کو دیکھ کر ہنس پڑا۔

”مہارانی صاحبہ! اب یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہا ہے۔“

”ایک کام کرو، بددی! یہی اچھا کارگر رہنے والا.....“ چون ماشی کے تہوار میں ولی عہد کو سناؤں سے ڈسوا دیتے ہیں۔“ نوجوانی نے سفاکی کے کہا ٹھکڑے کے لہجے سے قدروے عجب جالہٹ مترشحی، اس پر بددی اتھ کی آنکھیں پھیل گئیں درودہ اسی حیرت و پریشانی سے بولا۔

”کی سی۔۔۔ کیا کہہ رہی ہیں مہمانی کی آپ؟“
دوبارہ اسی ہتھیار کو اٹا کر ہمارے لیے خطرناک ہو جائے گا۔ بڑی مشکلوں سے تو ہم نے اس شخص سے جان چھڑائی ہے، سب کو ہم پرشیرہ دو جائے گا۔ یہ زہر لیے سانپ ہمارے ہاتھ ہیں۔ ہم دھریے جاوے گا۔ مسند اور ہماری سارے تار ہوگا۔“

مہارانی محبوبائی بولی۔ ”مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔“

”وہ تو خفک ہے مہارانی صاحبہ! لیکن سمجھنے کی کوشش کریں۔ اب حالات وہ نہیں رہے، پھانڈا بیٹو نے کاندیش رہاں بھی ہے، بلکہ یہاں زیادہ خطرہ ہے۔ آپ کو میں بالکل صحیح مشورہ دے رہا ہوں۔ پانی والے زہر میں خطرہ ہوتا ہے، مگر خفک زہر میں نہیں۔“

مہاجاری کی بات سن کر مجھ پاکی بھی تھانے کے لیے
 ہر سوچ انداز میں چپ رہی اور سوچنے لگی کہ بددی تاجھ کی
 بات ماننا ہی پڑے گی۔ دونوں کے مفادات مشترک تھے۔
 اس کی سناپ والی ترکیب کی طرح خفک زہر والی ترکیب
 اگر کار ہو سکتی تھی۔ نیز یہ کہ اب بددی تاجھ کی صورت میں بھی
 صاحبِ دالہ تھا۔ وہ ہمارے ممبرِ آزات۔

”ٹھیک ہے، اب تک مجھے زہر دے دو گے؟“ بالآخر بہارانی نے پوچھا۔
 ”کل تک دے دوں گا۔“ مددگار نے جواب دیا۔

☆☆☆

”اب ہمارا بھی یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں رہا۔ شاہ زمان،“ مہمان گاہ کے اپنے گوشے میں آکر اریہ نے فکرمندی سے کہا۔ شاہ زمان بھی کچھ ایسے ہی حالات میں خطرے کی یوسٹوہ رہا تھا۔ اریہ کی بات کی تائید میں اپنے سر کو اشاری جبینش دے ہوئے بولا۔

”آپ کو مجھے نئے اور دلی لوگوں کے بارے میں مطلع کرنا چاہیے تھا کہ وہ راج محل میں مقیم ہیں۔“ بدری ناتھ بولا۔ مہارانی فوجبائی کو مہاراجپوری کا یہ جواز لکھنؤ لولا محسوس ہوا۔ ہوا۔ ہوا۔

”مطلع کر تا میرے لیے کوئی ضروری بات نہ تھی بدری
 ناتھ!“ مجھ بانی نے ہلکی محروعب دار آواز میں کہا۔ ”مگر تم نے
 اتنا اہم تھہرایا ایک عام سے جھکی پر دفسر پر کیوں ضائع کر
 ڈالا؟ اور پھر بھلا اسے ہلاک کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”وہ ہماری راہ پر گئے تھے۔“ بدری ناٹھ نے جواب دیا۔ اسے اپنی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔
”تو پھر کسی اور عام طریقے سے بے آسانی اٹھانے لگا دیتے۔ کیا ضروری تھا سائپو سے ڈسٹو؟“

اب بھاری بھاری تاحہ مہارانی کو کیا بتاتا کہ اس کے لیے دو بیٹوں کا کالی کے مندر میں مداخلت کرنا خطرناک تھا۔ کیونکہ وہ یہاں پوجا پاٹ کی آڑ میں ایک عرصے سے جو گھنٹا ڈانڈ اور ہراساں کر چکے تھے، اب اس کے بارے میں صرف وہی جانتا تھا یا پھر اس کے سیوک کار..... محرمہ مہارانی سے بحث بھی کرنا نہیں چاہتا تھا، کیونکہ ان دونوں کا مفاد ایک دوسرے سے متضاد تھا۔ وہ خاموش رہا۔

”ٹھیک ہے، اب جو ہو اسو ہوا۔۔۔۔۔“ بالآخر مجو باکی نے بھی اسے خاموش یا کر بات ختم کرنا چاہی۔ آگے بولی۔

”اب کوئی“ اور طریقہ سوچو..... مگر جلدی۔ سیاسی حالات بدلنے والے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس سے پہلے کچھ ہو جائے۔“

”مہارانی جی! اب آپ کو بھی مچھو چڑا اور کراڑے کرنا پڑے گا۔ ترکیب میں بتائے دیتا ہوں، جو خوب ظاہر سادہ سی ہے، مگر ہے بڑی چترائی ہوئی۔“ پجاری بوری ساتھ نے بڑی مکاری سے مہارانی سے کہا۔ وہ اب مزید رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔

”میں آپ کو ایک خطرناک سانپ کے زہر کو سکھا کر اس کی پڑیا بنائے دیتا ہوں، وہ کسی دودھ وغیرہ میں ڈال کر ولی عہد مرثب کو ملا دس، قصہ ختم۔“

”ہوں..... بڑی چترکاری بتا رہے ہو ہمیں۔۔۔۔۔“

مہارانی طغریہ لیجے میں بولی۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ راج محل کے اندر کی بھی فرد کے لیے زہر کا استعمال خود ہی سازش کا پھول کھول دیا کرتا ہے؟ میں دلی عہد کی موت کو سونے کی شکل میں ہوتا دیکھنا چاہتی ہوں تاکہ حشک کی ذرا سی بھی گنجائش باقی نہ رہے۔“

RUMATIL

درد کی

آرام

... بنی آرام کی

100% Natural

موج، پٹھوں کا کچھاؤ، کمر درد، جوڑوں کے درد کے لیے



Pain Relief Oil

روماتیل

درد سے آرام

مسکراہٹ ہو کر آئی تھی۔ شاہ زمان اسے روک کر رہ گیا مگر اریہ غصے سے تنہا ہی ہوئی فرنگی سپاہی کے ساتھ چلی گئی۔

☆☆☆

تیز بارش کے پانی کی برودت... علی ریحان کے چہرے پر پڑتی رہی تھی... اسی لیے وہ جلد ہی بے ہوش سے نیم بے ہوش کی حالت میں آ گیا اور فوراً ہی جب اسے خرد کا بھی یار اہونے لگا تو اس نے کچھ آوازیں سنیں۔ کسی گھوڑے کے جھینانے کی اور پھر ایک انسانی آواز.....

”جیکب.....!“

”کیا ہوا؟“

”اس طرف کوئی بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ ارے..... یہ تو وہی ہے..... ہمارا شکار..... سوئیل۔“

اپنے فرضی نام پر علی نے بے حرکت رہتے ہوئے ایک آنکھ کی جھری بنا کر دیکھا۔ سونے اتفاق وہ اسی رخ پر پڑا تھا جہر سے رعب اور جیکب گھوڑوں پر چلے آ رہے تھے۔ وہ قریب پہنچ چکے تھے پھر اس نے ان کو قریب آتے دیکھا۔ کیا ہوا ہے رعب اور کھوڑا..... مرنے کو نہیں گیا ہے کہیں؟“

”یہ زندہ ہے، بیمار لگ رہا ہے۔ لگتا ہے سرد موسم اور تھکاوٹ نے اسے نڈھال کر کے بے ہوش پر مجبور کر دیا ہے۔“ ”میرا خیال ہے اسے ادھر ہی کوئی مار کر واہیں چل پڑتے ہیں، موسم بہت خراب ہو رہا ہے۔ کہاں اس مصیبت کو ساتھ لیے پھریں گے۔“

”تجویر تو تمہاری بری نہیں لیکن..... لیف بروجر.....“ علی ریحان کا ماتھا ٹٹکا۔ وہ لینے لینے ہی اپنے حواس جمع کرنے لگا۔ جان گیا تھا کہ ایک سفاک موت اس کے سر پر کھڑی ہے۔

”اس کی پروا مت کرو..... بتا دیں گے کہ ہمیں دیکھ کر فرار ہونے کی کوشش میں چلتی ہوئی ریل کار پر سوار ہو کر ہاتھ تو ہم نے گولی ماری۔“

”چلو پھر جلدی کرو۔“

”کون گولی مارے گا؟“

یہ سفاکانہ گفتگو علی ریحان کے دماغ میں ہتھوڑوں کی طرح ضربیں لگاتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اسے سر پر کھڑی موت سے خود ہی تیرا فزا ہونا پڑے گا۔ یہ اپنا بار پکا کرنا چاہ رہے تھے مگر وہ نہتا تھا۔ پتوئل وغیرہ اس نے اسی لیے ساتھ نہیں رکھا تھا کہ پکڑے جانے کی صورت میں ایک گویے کے پاس سے ہتھیار ملنا کسی کو بھی اس کی طرف سے شک و شبہ

مارچ 2018ء

کے لیے پرسے ہٹ گیا۔

”الوکی پچی اوی عورت کی عورت ہی رہی۔ جتنی نہ بن سکی۔ بلاوجہ کاشفک کیے جا رہی ہے۔“ پھر شاید اسے خود ہی پچھتاوا بھی ہوا اور وہ ایک بار پھر اریہ کو مٹانے سمجھانے کے لیے اس کی طرف بڑھا۔

اسی وقت برد جرنے..... ایک سپاہی کو اشارہ کر کے اپنے پاس بلا یا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ سپاہی فوراً حرکت میں آیا اور ان دونوں کی طرف بڑھا اور انہیں خاموش ہونے کی تلقین کرتا رہا۔ برد جرنے دیکھا کہ دینا اپنی سوتی سازی کے پلو میں منہ دے کر ایک طرف کور دیتی ہوئی چلی گئی اور بیہوش سے مٹانے کی کوشش میں اس کے پیچھے ہولیا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں اپنے کمرے میں آ گئے اور اندر آتے ہی شاہ زمان بے اختیار ہو کر..... اریہ کے اسی نرم گال کو چومنے لگ گیا تھا اس نے تھپڑ مارا تھا وہاں ہلکی سی سرخی آ گئی تھی۔ کیونکہ اریہ کا رنگ اسی قدر کور اور جلد شفاف اور نازک تھی کہ ایک ذرا ہاتھ لگتا تو داغ پڑ جاتا۔ یہ پھر شاہ زمان کے بھاری ہاتھ کا پھپھڑ تھا۔ وہ بجا کر مارتا تو ذرا سے میں وہ حقیقت کا رنگ نہ بھیر پاتا اسی لیے اریہ نے شاہ زمان کو سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ کوئی رعایت نہ کرے۔

”اریہ! اچھڑ زور سے لگا تا نہیں.....“ شاہ زمان نے...

الگ ہو کے بڑے دھکی لچھے میں اس سے کہا۔

”بالکل سچی نہیں، اپنے محبوب کی مار بھی پھولوں کی جھڑی لگتی ہے اور کون سا تم نے مجھے ہٹا چکی مارا تھا۔“ اریہ محبت سے اٹھلا کر بولی۔ شاہ زمان ایک بار پھر اسے خود سے بچنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اریہ نے روک دیا۔

”ارے..... روے رے..... بس اور نہ ڈراے کا سارا راز کھل جائے گا۔ ابھی دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

وہی ہوا..... لگ بھگ کوئی نصف گھنٹے بعد اریہ کی توقع کے عین مطابق ایک فرنگی سپاہی اندر داخل ہوا اور اریہ سے تھکسا نہ انداز میں بولا کہ اسے ”صاحب“ نے فوراً بلایا ہے۔

سپاہی کی متوقع آمد سے وہ دونوں پہلے ہی ہوشیار تھے۔ اسی لیے منصوبے کے عین مطابق دونوں نے پہلے والا ”منظر“ ترتیب دے دیا تھا۔ یعنی شاہ زمان، اریہ کو مٹانے کی کوشش میں جتا ہوا تھا۔

”میں ضرور جاؤں گی صاحب کے پاس..... اور اس سے کہوں گی کہ میرے سوا کسی اور ذمہ داری کو راج محل میں نہ گھسنے دے۔“ اریہ نے دانستہ اس فرنگی سپاہی کے سامنے غصے سے شاہ زمان سے کہا جس پر سپاہی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکرتی خیر

سپینس ڈائجسٹ

اچانک اس کا دل کچھ عجیب طرح کی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک دم کیوں بے چین ہونے لگا تھا؟ پریشانی اپنی جگہ لیکن..... اس کے دل کی بے چینی کسی اور ہی بات کی طرف اشارہ کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ بے چینی اس کی چھٹی حس سے بیدار ہو رہی تھی جس کا تعلق اس کین سے تھا۔ تب ہی دفعتاً وہ چٹکا۔

اس نے ایک نگاہ یونہی بیک بیڈ پر کھل اوڑھے گہری نیند میں مستغرق آدمی کی طرف دیکھا اور اپنے اندر کی اسرار بھری بے چینی کو سواہوتے محسوس کیا۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کے وجدان میں فوراً ہی ادراک ہوا کہ اس کی نامعلوم بے چینی کا تعلق کھل میں سوئے پڑے اسی آدمی سے تھا۔ تب ہی جانے کیوں اس کے جی میں آئی کہ وہ ایک ذرا اس آدمی کا مکمل سر کا کر دیکھے تو..... بس یونہی ایک خیال اس کے ذہن میں ابھرا تھا۔

وہ کھڑا ہو گیا۔ باہر تاریک جنگلوں اور پہاڑیوں میں دھواں دھار ہونے والی بارش کا شور جاری تھا۔ گاڑی رکی ہوئی تھی۔ ایک بار اس کے ذہن نے عجیب سا تاثر چھوڑی وصل دی تھی۔

وہ دھیرے دھیرے قدموں سے چلتا ہوا رنگ آلود اور سا کھردرے سے بیک بیڈ کے قریب آیا اور چہرے کے کھڑے ہو کر اسی طرح مکمل اوڑھے سوئے ہوئے شخص کو گھورتا رہا۔ وہ پشت کے ٹل لیتا ہوا لنگ تھاپلی نے اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو اسے اپنے ہاتھ میں ارتعاش نمایاں طور پر محسوس ہوا..... پھر جب اس نے سر کی طرف سے اس کا مکمل چھو کر اٹھکے سے ہٹایا تو اسے ایک بھیاں بیک چہرہ اپنی پھیلی ہوئی آنکھوں سے اسے گھورتا ہوا محسوس ہوا۔

ٹھیک اسی وقت بجلی کا زوردار کڑا ہوا تھا اور علی ریحان جیسا مضبوط دل کر دے کا آدمی جس اس بھیاں بیک منہ کی تاب نہ لاتے ہوئے بری طرح دھکی کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

☆☆☆

کالی کے مندر کے مہا بھاری بدری تاتھ کا اصل منصوبہ اور مقصد کیا تھا، یہ مہارانی نجو بائی کو پتا نہیں تھا۔ یہی نہیں مہارانی، بدری تاتھ کے... گھٹاؤنے راز سے بھی واقف نہ تھی کہ اس نے ولی عہد کے لیے تیار کیا ہوا ہتھیار پروڈیوسر بن کر کیوں آزادی لائی تھی؟ جبکہ اسے بتایا یہی کیا تھا کہ ایسا نا اعلیٰ یا غلطی سے ہو گیا کہ اس کے در پر وہ حقیقت کچھ اور تھی۔

در اصل بدری تاتھ کے لیے ولی عہد پر تائب نہیں بلکہ پروڈیوسر بن کر "خطرناک" ثابت ہونے لگا تھا۔ لہذا یہ کہا جاسکتا

ہیکے جنگلوں اور سنگلاخ چٹانوں کے درمیان میں سانپ کی طرح تل کھاتی مال گاڑی مناسب رفتار سے دوڑی چلی جا رہی تھی۔ اس کی رفتار پہلے سے تیز ہوئی تھی۔

علی ریحان کی ہڈیوں کے اندر تک اتری ہوئی ٹھنڈک کم ہوئی تو اس کا ذہن کچھ سوچنے کے قابل ہوا۔ اس نے ایک نظر بیک بیڈ پر دراز کھل اوڑھے شخص کی طرف دیکھا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ شخص بے مددہ سو رہا ہے۔ اسے جھپٹ کر مناسب نہیں۔ سو اسے اس نے نہیں تھا، سرحد پار کرتے ہی اور تریپال میں داخل ہونے کے بعد وہ فوراً مال گاڑی سے خاموشی کے ساتھ اتر جائے گا۔

لہذا اس نے بیٹی کیا اور خاموشی سے اسی طرح ابھٹھکی کے پاس بیٹھا رہا۔ رات کا جانے کون سا پہرہ سر رہا تھا۔ مال گاڑی اپنی مخصوص..... کھٹکھٹ..... کھٹکھٹ..... کی آواز سے منزل کی جانب گامزن تھی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اس نے ناگہرے تریپال تک کے اپنے سفر کے دورانے پر غور کیا۔ یعنی ناگہرے مال گاڑی میں روادی کو اسے نہیں سے چھبکیں منٹ ہو چکے تھے۔ اس نے ریل کار کی رفتار پر بھی دھیان دیا۔ جس کی رفتار اس کے محتاط انداز سے کے مطابق درمیانی رفتار سے کم تھی۔ درمیان میں اگرچہ تھوڑی دیر کے لیے رفتار بڑھی تھی مگر پھر کم ہو گئی تھی۔ بس اتنی ہی تھی کہ ایک انسان اپنی پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے اس پر چڑھ اور اتر سکتا تھا۔

اس نے اپنی معلومات کو بد نگاہ رکھتے ہوئے سوچا۔ وہ ناگہرے کی حدود کے بعد ترین گونے میں جو سفر تھا۔ مزید نہیں سے چھبکیں منٹ کے بعد وہ اس کی حد سے پار ہو سکتا تھا۔ ٹھیک اسی وقت شرانے دار بارش پھر شروع ہو گئی۔ بارش کا زور ایک دم ہی پھوٹ پڑا تھا۔ تب ہی اس نے محسوس کیا کہ گاڑی کی رفتار بھی بتدریج ٹپکی ہونے لگی تھی۔ جمہوتے ہوئے اتنی باقی رہ گئی کہ کوئی بھی مسافر (اگرچہ یہ مال گاڑی تھی) نیچے اتر کر ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد دوبارہ... بد آسانی سوار ہو سکتا تھا۔

علی شکر سوار ہو گیا۔ ابھی وہ ہنسوج انداز میں اپنے ہونٹ کھینچے ہوئے کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ گاڑی رک گئی۔ اب صرف ماحول میں تیز شرانے دار بارش کے شور کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے تھوڑی سا کھڑکی سے باہر جھانکا تو اسے گھور غمخیز ہوتی سردرات کے برستے ہوئے اندھیاروں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ دوبارہ آگ بھٹکی سے پاس آ کر بیٹھ گیا جس کے کونوں کی سنگن بھی اب مانند پڑنے لگی تھی۔

اندراک ہی مختصر سا کین تھا۔ دو چکر چھوٹی کھڑکیاں تھیں۔ ان کے درمیان میں دروازہ تھا جو بند تھا۔ کھڑکیوں میں سے ایک بندھی، جبکہ دوسری کا ایک پٹ ٹوٹا ہوا تھا اور اس کے خلا کو بڑھانے اور سرد ہواؤں کے گزر کو روکنے کی مقصدور بھر کوشش کرنے کے لیے اس پر کوئی کتا سا لٹکا دیا گیا تھا۔ وہی کتا ہٹا کر علی نے اندر جھانکا تھا۔

اندردم ہی برقان زدہ روشنی تھی۔ درمیان میں لوہے کی رنگ آلود گول اسٹول نمایاں نصب تھی۔ اس پر درجسز رکھا تھا۔ پاس ہی کرسی تھی۔ دائیں بائیں لوہے کی دیواروں سے دو بیک بیڈ نصب تھے۔ ایک پر کوئی مونا سا بوسیدہ مکمل اوڑھے سو رہا تھا۔ لائین اسی اسٹول پر رکھی تھی جس کی لوہہ تھی۔ اندر اسے کونوں کی ایک آگ بھٹکی بھی سنگتی نظر آئی تھی۔

علی کا سردی سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے دروازے کو ہٹکے سے اندر دھکیل کر کھولنے کی کوشش کی مگر حسب توقع دروازے کو اندر سے بندھی پایا۔ وہ ہونٹ کھینچ کر دیوں کھڑا رہ گیا۔ گاڑی کی اس چھوٹی سی بوٹی میں دونوں طرف چھت تھی۔ اس کا فرش لوہے کی بنیوں کے چٹچ میں چوبی چھتے نصب کر کے بنایا گیا تھا۔ علی ایک جگہ پر کھڑا تھا۔

ریل کا داخلی انجن راست کی تاریکی میں وصل دیتا ہوا اپنے پیچھے مال بو کیوں کو پاندھے مناسب رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ دائیں جانب تاریک جنگل تھا اور بائیں طرف گہری سنگلاخ کھائیاں اور چٹانیں تھیں۔ ان کے درمیان ریل ٹل کھاتی پڑی پر گامزن تھی۔

علی نے بالآخر اس کھڑکی کو تھین مشق بنانے کا فیصلہ کیا جس کا ایک پٹ ٹوٹا ہوا تھا اور اس کے خلا میں گتے کا ٹکڑا پھنسیا گیا ہوا تھا۔ اس نے کتا یہ آسانی آکھڑا لا اور کھڑکی سے سکڑ سکتے کر بہ مشکل کین کے اندر آ گیا۔

کین کے اندر آتے ہی بے اختیار اسے سکون کا احساس ہوا۔ کین کا محدود ماحول سنگتی آگ بھٹکی کی وجہ سے کچھ گرم تھا۔ علی نے اس کرم نوازی پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور جلدی سے کتا دوبارہ سے وہیں لٹکا دیا، تاکہ سرد اور برفاب ہواؤں کا زور کم سے کم رہے۔ اس کے بعد وہ آگ بھٹکی کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور آگ تپانے لگا۔

اچانک گاڑی کسی چٹانی سرنگ کے اندر داخل ہو گئی۔ اس سے کین کا ماحول کچھ دیر کے لیے ہی کسی اور بھی گرم ہو گیا۔

سر و شمرتی رات..... اور کٹ دار بریلی ہواؤں کو جرتی، محاق کے چاند کی مدد ملتا رہتی روشنی میں بارش سے ہیکے

ادھر گھوڑے کی سواری سے جو امید بندھی تھی وہ ٹوٹ ہوئی۔ وہ کسی بھی صورت میں کسی کی گرفت میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ابھی تک وہ ریاست ناگہرے کی حدود کے اندر ہی تھا۔ حدود کے اختتام پر ضرور اس پڑی پر بھی ناکا بنایا گیا ہو گا لیکن تریپال بھی جلد سے جلد پہنچنا ضروری تھا۔ بالآخر اس نے بیٹی فیصلہ کیا کہ وہ اسی طرح اللہ کے بھروسے پر تار بیک میں اس پڑی کی راہنمائی میں گھوڑے پر چلا رہے گا اور گرد و پیش سے بھی پوری طرح چوک رہنے کی کوشش کرے گا۔ جہاں ذرا سا بھی خطر محسوس ہو گا وہ گھوڑے سے اتر کر سرحد پار کرنے کی کوشش کرے گا۔

چنانچہ اس نے گھوڑے کو دھکی رتار سے دوڑانا شروع کر دیا۔ دو پہلی پار کرنے کے بعد پڑی رات کی تاریکی میں دائیں جانب سانپ کی طرح تل کھاتی جا رہی تھی اور جب وہ ایک مقام پر بالکل سیدھی ہوئی تو وہ چونک پڑا۔ وہ سرخ بنی کی روٹی تھی۔

پہلے تو وہ اسے سنگل سمجھا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے وصل کی آواز سنائی دی۔ اس آواز کو اس کا دل بے پایاں مسرت تلے زور سے دھڑک اٹھا۔ ریل کار اس کے آگے آگے جا رہی تھی اور سرخ روشنی لائین نمادہ تھی جی جویل کے آخری ڈبے پر باندھی جاتی ہے۔ اسے حیرت تھی کہ ریل کار تو کب کی اس سے چھوٹ چکی تھی۔ کبیں یہ مال بردار گاڑی تو نہیں تھی؟ جس کی رفتار یوں بھی دھبی ہوئی تھی۔

بہر کیف..... کچھ بھی تھا اس نے گھوڑے کی رفتار اور تیز کر دی اور جلد ہی آخری بوٹی کے قریب پہنچا تو اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ یہ مال گاڑی ہی تھی جس کے آخر میں بوسیدہ سا گارڈ کا ڈبہ تھا۔

اسے اندر گاڑی کی موجودگی کا ذر بھی تھا تاہم وہ اللہ کا نام لے کر بڑھتا رہا، حتیٰ کہ ڈبے کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے ہوشیاری سے خود کو گھوڑے کی پشت سے الگ کیا اور ایک ہاتھ بڑھا کر ڈبے کے عقبی کھلے گونے میں نصب فولادی رینگ کو تھام لیا اور گھوڑے کی پشت سے اچک کر ڈبے میں سوار ہو گیا۔ گھوڑا تھوڑی دیر تک آخری ڈبے کے پیچھے ساتھ ساتھ دوڑتا رہا اس کے بعد جب علی نے مخصوص انداز میں اسے زور سے ایک اشارہ کرتے ہوئے ٹھٹھا مارا تو وہ راستہ بدل کے جنگلوں کی طرف نکل گیا۔

علی ریحان پلٹا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو آپس میں زور سے رگڑ کر سردی کے احساس کو کم کرنا چاہا۔

”اگر دھڑکا کر رکھ دیا۔ اس کی بات غلط بھی۔۔۔ تو نہیں تھی۔
ریتا نے سوچا تھا۔ پھر اس نے سراٹھا کر دلی عہد کے چہرے کی
طرف دیکھا۔

یہ حقیقت بھی تھی کہ ریتا کو دلی عہد سے انصاف دلانے
کی پوری امید تھی۔ اگر رابرٹ ذاتی عداوتی آگ میں جل کر
..... چھوٹی کوئی نہ دیتا تو آج حالات ان کے حق میں ہو سکتے
تھے لیکن دلی عہد کے پولی انکھار معذرت و معافی نے ریتا کو
از خود متاثر کر ڈالا، کیونکہ یہ کسی عام انسان کے اس سے معافی
مانگنے کی بات نہ تھی۔ ریاست کا دلی عہد اس کے سامنے مجرموں
کی طرح کھڑا تھا۔ یہ اس کا بڑا پین تھا۔ ریتا کو کسی بات نے
متاثر کیا تھا، وہ بولی۔

”راجا صاحب! آپ نے یقیناً ہمارے لیے جو کرنا
چاہا تھا اس میں آپ کی نیک نیتی کا ہی دخل ہوگا لیکن جس
اعزاز سے ہم مقدمہ پارٹیشن اس کا مجھے بے حد قلق ہے۔ آپ
کو تو کوئی دوش نہیں لیکن.....“ یہ کہتے ہوئے ریتا نے دانستہ
قریب کھڑے اپنے کزن رابرٹ کی طرف ترش نگاہوں سے
دیکھا تھا۔ پر تاب نے بھی اسی کی طرف دیکھتے ہوئے ریتا سے
دوبارہ مخاطب ہو کر کہا۔

”میں نہیں جانتا کہ آپ لوگوں کے اندرونی معاملات کیا
ہیں۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ لوگ جہاں بھی جائیں،
جدھر بھی اور جب بھی ہماری ضرورت پڑے مجھے ضرور یاد
رہیے گا۔ ریتا صاحبہ! خاص کر آپ کے لیے میرے یہ الفاظ
ہیں۔ انہیں یاد رکھیے گا، چلتے ہیں۔“ بگوان آپ کی
رکھشا کرے۔“

دلی عہد یہ کہہ کر داپس لوٹ گیا۔ گار شیا تر بھی اور معنی خیز
نگاہوں سے ریتا کے ہک دک سے چہرے کو ٹکٹنے لگی تھی
جو جاتے ہوئے راج کمار کی طرف ہک تک دیکھے جا رہی تھی۔
گار شیا کو شوکی کے علاوہ اب ایک نئی چھڑی کپنے کی پوائے کلی
تھی۔ گار شیا کی مثال گندی بھٹی کی سی تھی۔ وہ اس گندی میں سے
ایک گندا خیال اخذ کرنے کی کوشش کر رہی تھی جو اس کے لیے
نئی طرح ”سودمند“ ہو سکتا تھا۔

ریتا چند تپتے تو خاصی گہری اور خیال انگیز سوچ میں
مستغرق رہی۔ اس کے دل کا ایک بار بھڑکی عہد پر تاب کی
باتوں سے ڈھارس ہوئی تھی۔ آج اس نے پر تاب کی آنکھوں
میں اپنے لیے ایک خاص جذبے کی جھلک دیکھی تھی۔ اسی
بات نے ریتا کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ
وہ رواں گئی کی تیاری کے دوران بھی کافی دیر تک کھولی کھولی سی
رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں ہنوز راج کمار پر تاب کے

معترض تھے۔ باقی سب ریتا کے ہر حکم کے آگے سرخم کیے
ہوئے تھے۔ وہ کبھی شوکی تو اس نے پہلے ہی ریتا کے ہر حکم
کا ساتھ دینے کا عہد کر رکھا تھا۔ تاہم اسے ہی نہیں بلکہ امجد خان
و غیرہ کو بھی اس بات کی حیرت تھی کہ ریتا کے ساتھ شدید مخالفت
کے باوجود..... رابرٹ اور گار شیا کیوں ان کے ساتھ تھے
تھے؟ وہ وہیں شہر کا رخ بھی کر سکتے تھے؟ ریتا کا ساتھ
چھوڑنے میں آخر ان کو کیا مسئلہ درپیش تھا؟ وہ ان دونوں بہن
بھائیوں سے یہ سوال پوچھنے کے لیے لے چیں تھے مگر نہیں پوچھ
سکتے تھے کیونکہ ملازموں کا کام صرف حکم ماننا ہوتا ہے سوال
کرنا نہیں.....

بہر کیف..... رابرٹ اور گار شیا کی کوئی بھی..... پیش
ریتا کے آگے نہ چل سکی۔ یہ لوگ راج محل سے اپنا پورا باستر
میں لے گئے۔ مہمان گاہ کے اس گوشے میں باتوں کی جھنجھٹ
بھی جاری تھی جسے دروازہ پر بعد اچانک بریک لگ گئی۔

دلی عہد پر تاب اندر داخل ہوا تھا۔ ڈرائیور امجد خان،
مہند بابا اور شانتا احترام سے سر جھکا کر دوسرے گوشے کی
طرف سرک گئے۔ شوکت حنیف بڈ رہا، کیونکہ اسے ریتا کی
طرف سے ایسی کوئی ہدایت نہ تھی۔ تاہم دلی عہد کے سامنے وہ
اس کیفیت کا شکار رہا تھا۔ ریتا نے نگاہ اٹھا کر خود ہی پاس
کھڑے شوکی کو نگاہ کر دیکھا تو وہ بھی اندر چلا گیا۔

اب صرف وہاں رابرٹ اور گار شیا سمیت ریتا اور دلی
عہد رہ گئے تھے۔

پر تاب کی نظریں ریتا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں
اور..... ریتا نے ایک نگاہ راجا صاحب پر ڈالنے کے بعد جھکی تھیں
تاہم اسے ادب سے سلام ضرور پیش کیا تھا، جبکہ رابرٹ
اور گار شیا نے بھی اسے سلام کیا تھا۔ اب ان دونوں کی نظریں
پر تاب اور ریتا کو تاکنے میں لگی ہوئی تھیں۔

دلی عہد پر تاب نے رابرٹ اور گار شیا کی موجودگی کو محسوس
مگر تے ہوئے ریتا کو ٹوٹنے سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ریتا! میں اس طرح آپ کے راج محل سے جانے
دلی صدمہ ہو رہا ہے۔ میں تمہارا اس بات کا فحش رویہ گاہک ہم
سے یہ کیا گیا اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے۔ کوشش ہماری بھی تھی کہ
کو پورا پورا انصاف دلا جائے..... مگر ہم ایسا نہیں کر سکے۔ ہم
اس سے یہاں اس بات کی معافی طلب کرنے آئے ہیں۔ لیکن
بات کہہ دیجئے ہیں کہ اس میں ہمارا بھی کوئی قصور نہ تھا اگر آپ
میں سے سچی بھولی کوئی نہ دیتے۔“

ریتا..... جس نے پر تاب کی اس طرح آمد کو محسوس نہیں
تھا، دلی عہد کی اس ”معافی“ والی بات نے بے اختیار اس کا

لگا دیا ہے۔ وہ آج رات تک بتا دیں گے۔“ پرس رام نے
جواب دیا۔

”اور سنو پرس رام.....!“
”کہہ کر دیتی!“

”ذہر کی پڑیا پھانسی تھی؟“
”ہاں کر دیا پھانسی تھی۔“ پرس رام نے جواب دیا۔

”پر گردی ایک ایک بات میں سوچ رہا ہوں۔“
”کیا بات.....؟“

”اگر اب کے بھی مہارانی نجوبائی سے یہ کام نہ بن
پڑا تو وہ پھر ہمارے گلے پڑ جائیں گی۔ ڈرتا ہوں اس کی وجہ
سے کہیں ہمارا کام نہ بگڑ جائے۔“

”اس کی چٹانست کر دو پرس رام!“ مہا پجاری نے
سانپ کی سی ہچکناک سے مشابہ آواز میں کہا۔ یہ محلات کی
مہارائیاں کوئی نہ کوئی کل کھاتی رہتی ہیں۔ جہاں ان کے من میں
کہاں..... ہوتا ہے۔ میں دیکھ لوں گا۔ مغرب سب کی رسم کو میں
پردان چڑھانے والا ہوں۔ پھر دیکھنا سب کچھ ہمارے ہاتھ
میں ہوگا۔“

”اوش..... اوش..... (ضرور) گرومی.....! کیوں
نہیں۔“ پرس رام خوشامد لہجے میں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

☆☆☆

ان سب کو اپنے آئندہ کے وہ عزائم پیارے تھے
جو انہوں نے اپنے سینوں میں چھپا رکھے تھے۔ اسی لیے
مخالفت اور ناپسندیدگی کی اس مکدر فضا کے باوجود وہ سب
ریتا کا حکم سامنے پر مجبور تھے کیونکہ رابرٹ اور گار شیا ان سے
جدا ہونا نہیں چاہتے تھے۔ تاہم پھر بھی وہ اس آئینی بستی میں
ذیر اڈا لے کر کانپ گئے تھے۔

رابرٹ نے ریتا سے جرح کرنے کے انداز میں کہا۔
”ریاست میں اپنا تیس کیپ قائم کرنے کے لیے جگہ کی کیا کمی
ہے، کیا ضروری ہے کہ ہم اسی آئینی بستی کا رخ کریں؟“

بھائی کی دیکھا دیکھی اس کی تائید میں گار شیا نے بھی
ریتا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ریتا! لگتا ہے صدمے نے مہارانی
سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں چھین لی ہیں۔ کیا تم نہیں جانتی ہو کہ
وہاں ہم نے کن عجیب و غریب لوگوں کو دیکھا تھا؟ میں یقیناً
سے کہتی ہوں کہ وہاں کسی وجہ ڈاکٹر کی کھراکی ہے اور وہ
بدروحوں کی بستی ہے۔“

”وہاں نہ کوئی وجہ ڈاکٹر رہتا ہے نہ ہی وہ بدروحوں کی
بستی ہے۔“ ریتا نے ہموار لہجے میں جواب دیا۔

اس کے منصوبے میں صرف یہی دونوں بھائی بہن

تھا کہ بدروحوں نے غلطی سے نہیں بلکہ جانتے بوجھے ہوئے ہی
پروفسر ہنری کا قتل کر دیا تھا کیونکہ ہنری اس کے ایک بھائی
منصوبے سے پردہ چاک کرنے والا تھا جو بدروحوں کا تھک کو کسی
صورت میں بھی گوارا نہ تھا کہ وہ راز آشکار ہوتا۔ بے شک اس
کا مفاد بھی مہارانی نجوبائی کے مفادات سے قسماً تھا مگر اپنا مفاد
بدروحوں کا مفاد پر غلبہ تھا۔

اپنی اس شاندار رخ کے بعد وہ بہت خوش تھا۔ وہ اس رخ
کو اپنے خفیہ منصوبے کے لیے اچھا ٹھکانہ سمجھ رہا تھا۔ ریاست
میں اس کی عزت اور شہرت بڑھ گئی تھی۔ یہی بدروحوں کا تھک
چاہتا بھی تھا۔ وہ ریاست میں ایک ایسا مذہبی راہنما بن کر
ابھرنا چاہتا تھا کہ ساری..... رعایا کے لیے وہ سب سے
زیادہ قابل احترام اور عزت دار و حاکم کی حیثیت
اختیار کر لے۔ یہ اس کے شیطانی منصوبے کا ایک ابتدائی اور
..... اہم حصہ بھی تھا۔ وہ مذہب کی آڑ میں اپنے خفیہ شیطانی
منصوبے کا فروغ چاہتا تھا۔

اب پروفسر ہنری کو موت سے ہمکنار کرنے کے
بعد بدروحوں کا شیطانی نظریہ ریتا اور اس کے ساتھیوں پر
مركز ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے چیلے پرس رام کو ہدایت کر رہی تھی
کہ وہ ان پر کڑی نگاہ رکھے۔ آج وہ یہی پتا چلانے کے لیے
راج محل کی طرف گیا تھا اور اب مندر لوٹ کر وہ اپنے گرو ٹھکانہ
کو ایک نئی خبر سے مطلع کر رہا تھا۔

”گرو! وہ فرنگن ہے نا..... کیا نام تھا سہی.....! ہاں
ریتا..... وہ تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ راج محل چھوڑ رہی ہے۔“

”یہ ابھی خبر ہے۔“ پجاری بدروحوں کا تھک نے خوش ہو کر
کہا۔ ”پر تو یہ بتا پرس رام کہ انہیں صرف راج محل سے بے دخل
کیا گیا ہے یا..... ریاست سے.....؟“

”میں تو بری خبر ہے گرو! انہیں ریاست سے نہیں کیوں
راج محل سے بے دخل کیا گیا ہے۔“ پرس رام نے جواب
دیا تو بدروحوں کا تھک کی سانپ جیسی آنکھوں میں نکا یک تیشوئیں کے
سامنے نمودار ہو گئے، بولا۔

”ممکن ہے وہ لوگ اب بدروحوں کو خدوئی ریاست سے
بھی نکل جائیں۔“

”مگر ایسا ہوتا تو ہمارا جان و خدان کی شہرہ ابھی کا بندہ ہوت
کر دیتا۔ جس کا اس نے ان سے کہا بھی تھا، پر تو اس فرنگن
نے انکار کر دیا۔ اب پتا نہیں اس سہی کا اور کیا ارادہ ہے؟“

”تم یہ پتا چلانے کی کوشش کر دو کہ وہ لوگ کہاں گئے
ہیں؟ اب ان کا کیا ٹھکانہ اور آئندہ ان کے عزائم کیا ہیں.....؟“

”میں نے دوسرا ہیوں کو ان کے تعاقب میں

کرا، رات کو بین وقت پر بڑی ہوشیاری سے زہری پڑا کوئی عہد پر تاب کے دودھ والے گلاس میں ملاوایا تھا۔

راجہ عالی کے کینوں میں صرف تین افراد ایسے تھے جو رات کو دودھ کا ایک گلاس پینے کے عادی تھے۔ مہاراجا چندر گپتا، راجکمار سونچیا اور دلی عہد پر تاب۔ بلکہ پر تاب کو تو دودھ سے بنا نیند ہی نہیں آتی تھی۔ البتہ سونچیا اور مہاراجا کو جب نیند زیادہ ستاتی تو دودھ کھنچا جاتا تھا اور وہ بغیر دودھ پیے سو جاتے تھے۔ البتہ دلی عہد پر تاب کا معاملہ الگ تھا۔ وہ رات کو دودھ پیتا ہی اسی لیے تھا کہ اسے نیند آجائے۔ دودھ سے بنا اسے نیند ہی نہیں آتی تھی۔

جبکہ راجکمار کی نجوبائی اور اس کے بیٹے، یعنی چھوٹے راج کمار انیش کا معاملہ مختلف تھا۔

رات اپنے ابتدائی پہر میں تھی۔ دلی عہد اپنے کمرے میں مسہری پریم دراز سوچوں میں مستغرق تھا۔ اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ پردچہہ چہرہ رنجور سا نظر آتا تھا۔ وجہ یہی تھی اس کی کہ اسے ریناکے جانے کا دکھ تھا۔ وہ اندری اندر اس معصوم صورت اور نازک اندام کی نیلی آنکھوں اور کھل چہرے والی پری شل رینا کو چاہنے لگا تھا۔ اسے اس بات کا بے حد رجحان بھی تھا کہ وہ اس کے باپ کے تانکوں کو بے نقاب نہیں کر سکا تھا اور نہ ہی اسے انصاف دلا سکا تھا۔ اگرچاس میں اس کا بھی کوئی تصور نہ تھا لیکن بہر حال وہ رینا سے کیا گیا پنا وعدہ پورا نہیں کر سکا تھا۔ اس کا دل ریناکے لیے آج بہت بے چین ہو رہا تھا۔ ایک تڑپ بھی شدت کی کہ وہ..... یہاں سے رخصت ہوتی رینا کو جا کر روگ لے..... اسے جانے نہ دے یہاں سے..... اس کے آگے رو پڑے، اس کی نہیں کرے مگر وہ یہ نہیں کر سکا تھا۔ اس کا مرتبہ، رینا اور اس کے درمیان نامعلوم تعلق کے سامنے مانع ہوتا تھا۔ اسے پہلی بار کدھر کو کسی ہجرت بھی ہوئی تھی کہ اسے یہ کیا ہو گیا تھا؟ وہ ایک فرنگن دو شیرہ کی محبت میں کیوں گرفتار ہو گیا تھا؟

رینا کی بارے میں سوچے سوچے کافی رات بیتے گئی۔ وہ سوچا پتا تھا اب..... تب ہی اس نے مسہری پر لینے قریب ہاتھ بڑھا کر دودھ سے بھرا گلاس اٹھالیا۔

اب بھی اس کا دھیان ایک لمحے کے لیے بھی رینا کی طرف سے ہٹا نہیں تھا۔ انہی سوچوں میں غلطاں اس نے دودھ کا گلاس اپنے منہ سے لگا لیا اور چند منٹوں میں خالی کر دیا۔

اگلے دن کا سورج..... راج محل میں ایک کھرام ہوا کرتا طلوع ہوا تھا۔

(جاری ہے)

الفاظ گونج رہے تھے۔ ”جدھر بھی اور جب بھی ہماری ضرورت پڑے مجھے ضرور یاد رکھیے گا۔ رینا صاحبہ! خاص کر آپ کے لیے میرے الفاظ ہیں۔ انہیں یاد رکھیے گا۔ چلتے ہیں۔ بھگوان آپ کی رکھشا کرے۔“

شوکی نے بھی اس درمیان میں یہ محسوس کیا تھا کہ دلی عہد کے جانے کے بعد رینا کچھ زیادہ ہی گھولی گھولی سی ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ اس سے بھی کوئی بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

یہ لوگ ایک مختصر قافلے کی صورت میں راج محل سے باہر نکل آئے تھے۔ دلی عہد پر تاب نے ان کے لیے سواری کا بندوبست کروایا تھا۔ وہ سواری دو گھوڑوں کی ڈاک گاڑی تھی۔ ڈاک گاڑی نے تقریباً نصف گھنٹے بعد انہیں راکاشی ہستی کی طرف جانے والے راستے پر اتار دیا اور وہیں لوٹ گئی۔ ایسا ریناکے کسے پر ہی ہوا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ڈاک گاڑی اس ہستی میں داخل ہو۔ یوں بھی وہ ہستی یہاں سے زیادہ دور نہیں گئی۔ وہ لوگ اپنے اپنے سفر کی بیگ پشت پر لاوے پیدل چل پڑے۔ اپنے اس سفر میں انہوں نے آنجناب کی پروفیسر ہنری برنارڈ کو بہت یاد کیا تھا۔

سہ پہر ہو چکی تھی۔ شام کی لمباہٹ دور پہاڑی چوٹیوں پر اترا تھی محسوس ہو رہی تھی۔ ان کے گرد گھنے جنگل کا حصار تھا۔ وہاں جانے کیوں مجیدوں بھری خاموشی کا گمان ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی یہ لوگ راکاشی ہستی کی وادی کے دامن میں فروکش ہو چکے تھے۔ اس ہستی میں آتے ہی انہیں یہاں ایک ایسی ہی عجیب سی شہنشاہ کا احساس ہونے لگا تھا۔

☆☆☆☆

مہارانی نجوبائی کو خشک زہری پڑا پہنچادی گئی تھی اور وہ اس نے پچھو رام کے حوالے کرتے ہوئے سرسراہٹ میں کہا۔

”پچھو رام.....! یہ کام آج ہی ہو جانا چاہیے۔ تم کام ہو جانے کے بعد اپنی چھوٹی کو بھرا ہوا ڈاک گے۔“

”آپ چنا نہ کریں مہارانی صاحبہ! آپ کا غلام یہ کام آج ہی نہ دے گا اور اوش (ضرور) نمٹائے گا۔“ چند ہی چندی آنکھوں والے پچھو رام نے کہا۔ انعام کے لالچ سے اس کا دل خوشی سے جلیں اچھل رہا تھا۔

اس نے اسی رات وہ ڈہروٹی عہد کے دودھ کے اس گلاس میں ملا دیا جسے ایک ملازمہ نرملاس کے کمرے میں پہنچاتی تھی۔ دودھ کا گلاس پہنچانا اسی کے ذمے تھا۔ ہر کسی کے گلاس مختلف سائز اور سٹل کے تھے۔ دلی عہد کا گلاس مخروطی اور کھلے پینڈے والا تھا۔ پچھو رام نے نرملاس کی غیر موجودگی تاک



جسس

ناہید سلطان اختر

دور چاہے قدیمی ہو یا جدید... ظالم مظلوموں پر ظلم کی انتہا کرتے رہے ہیں... جرم کی نہ کوئی سمت ہوتی ہے نہ قسم۔ یہ واقعہ بھی اگرچہ تیس سال پرانا ہے مگر آج بھی دور حاضر کے حالات پر نوحہ کثرت ہے۔ خبیث روحوں پر نور میں بدی پھیلاتے ہوئے اپنے انجام کو یکسر فراموش کر دیتی ہیں۔

معصوم بچوں کا چہرہ چین لینے والے استبداد اور عالم انسانوں کا مارجا

دادی اسے اپنے گھر کی رونق اور پایا چہرہ کس کہا تھے بھیا کی وہ دوست تھی اور ماما کی نرنا..... گڑبا جو تھی۔ جس کی خوب صورت آنکھوں میں چکنو چکنو تھی۔ جو روتی تو پھول بکھر جاتے۔ جو روتی تو موتی برستے تھے۔ اسکول کی ابتدائی جماعت میں وہ پہلے ہی دن اپنی فیکری کی من پسند بن گئی تھی۔ اسکول سے گھر واپس لوٹتے ہی چہرہ کس کھل جاتا۔ وہ دروازے سے بعد میں داخل ہوتی، اس کی زبان پہلے ہی چلنے لگتی۔

”دادی! آج تھری اسٹارز دیے ہیں بچہ پر۔“
 ”دادی! آج تھری فرینڈ نے مجھے گراؤنڈ میں دھکا
 دے دیا۔“
 ”ماما! بچہ بہت مزیدارتھا..... کل بھی آپ یہی دیتا۔“
 ”دادی! ہمارے اسکول میں فن فنیز ہوگا..... آپ
 چلو گی نا؟“

سید مے ہاتھ کی پہلی دو انگلیاں جو ذکر اس کی طرف بڑھا تا۔ وہ بھی جو بابا ایسا ہی کرتے ہوئے دادی جان کے سکھائے الفاظ دہراتی۔ ”لا الٰہ الا انت۔ دوست بننے ہم۔“

ابتدائی جماعت میں بچوں کا داخلہ میٹرک کی بنیاد پر کیا جاتا۔ بعد ازاں یہی طلبہ اعلیٰ جماعتوں میں ترقی پاتے جاتے۔ چنانچہ اعلیٰ جماعتوں میں نئے طلبہ کے داخلے نہ ہونے کے برابر ہوتے۔ کوئی غیر معمولی لائق طالب علم، کوئی فراسٹر کس یا کمپوزر بڑی سفارش انتہائی سال کا آغاز ہوتے ہی داخلے کے خواہشمندوں کے لیے نوٹس بورڈ پر جلی حروف میں یہ نوٹس لگا دیا جاتا کہ پہلی جماعت میں داخلے مکمل ہو چکے ہیں، دیگر جماعتوں میں نئے داخلوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کے باوجود انتہائی سال کے ابتدائی چند ہفتوں میں داخلے کے خواہشمند طلبہ اور ان کے والدین کا جنگنا ٹکا رہتا۔ امیدوار کی غیر معمولی اہلیت یا کسی بڑی سفارش کی بنیاد پر گھسنے پھنسنے داخلے ہو بھی جاتے۔

میقات سوم شروع ہونے کے چند ہی دن بعد اس کی اسکول سے مسلسل غیر حاضری شروع ہو گئی۔ میقات سوم کا اختتام سالانہ امتحانات پر ہوا تھا، سو یہ دور اسی نہایت اہم تھا۔ اساتذہ کو اس کی مسلسل غیر حاضری پر تشویش ہونے لگی۔ یہ تشویش جب تک پہنچی۔ میں نے والدین سے رابطہ کیا۔ والدین نے بہت متعطل سی آواز میں فقط اتنا کہا۔ ”میں آپ کو اسکول آ کر بتاؤں گا میڈم۔“ میرے دل نے کہا شاید وہ تیار کیا شاید کوئی اور مسئلہ..... باپ کی آواز بلاوجہ متعطل نہیں ہو سکتی تھی۔

باہمیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلیوں سے دباتے ہوئے گھاسل لہجے میں کہا۔ ”میڈم! ہماری بیٹی کا سر ڈوب گیا۔“
”مر ڈرا!“ میں چونکی۔ ”کیسے؟“ میں نے پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر ہی اگلا سوال کیا۔ ”کتنی بڑی تھی؟“
”چھوٹی تھی..... کلاس دن میں تھی۔“

”کلاس دن میں!“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔
”کس بے رحم نے مر ڈر کر دیا اس کا؟“

”شاید آپ نے اخبار میں خبر پڑھی ہو۔“ باپ نے کہا۔
ان دنوں ایسی خبریں اخبارات ہی سے ملتی تھیں۔ نہ الیکٹرونک میڈیا یا انٹارگریم تھا، نہ بریکنگ نیوز کا غلط۔
”اخبار تو میں باقاعدگی سے پڑھتی ہوں، آپ کس خبر کی بات کر رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”بیٹی کی ڈیڈ باڈی..... جو اب بوری میں بند..... بلڈنگ کے قریب سے گزرنے والی بیٹی کی تاروں میں انگی ہوئی تھی۔“ باپ نے نہایت کرب سے بتایا۔
”اوہ بانی گاڈ!“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ میں اپنے روبرو بیٹھے شخص کو آنکھیں میچاڑے بکا بکا دیکھ رہی تھی۔
”تو کیا..... وہ..... وہ بیٹی.....؟“ میں اپنا سوال مکمل کرنے سے قاصر رہی۔

”جی ہاں..... وہی ہماری بیٹی تھی۔“ باپ کی آواز میں آنسو گھلے تھے، میں دم بخود رہ گئی۔

چند دن قبل اخبار میں شائع ہونے والی وہ خبر میں بھلا کیونکر بھولی گئی تھی۔ بیٹی کے قتل کی وہ بہانہ خبر اور اس کی لاش کا المناک طریقے سے ملنا تو کئی دن تک میرے گھر میں افرادِ خانہ اور اسکول میں رفتائے کار کا موضوع گفتگو بنا رہا تھا۔

اخبارات میں شائع خبر کے مطابق شہر کے ایک منجانب آباد محروف رہائشی علاقے میں ایک کم سن بیٹی نہایت پر اسرار حالات میں گمشدہ ہوئی تھی اور اس کی تلاش میں اس کے اہل خانہ اور پولیس اہلکاروں کی ناکامی کے بعد اس کی لاش اسی عمارت کے قریب سے گزرنے والی بیٹی کی تاروں میں الجھی ایک بوری سے برآمد ہوئی تھی جس عمارت کی تیسری منزل پر واقع ایک فلیٹ میں بیٹی اور اس کے اہل خانہ قیم تھے۔ بعد کی خبروں کے مطابق پولیس بیٹی کے قاتل کو پکڑنے میں کامیاب ہوئی تھی جس نے بیٹی سے زیادتی کے بعد اسے قتل کر دیا تھا۔

”کون تھا وہ؟ کیسے ہوا یہ سب؟“ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھ بیٹھی۔

مرد نے خاتون کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہتا ہو۔
”تم بتاؤ۔“ خاتون نے اپنی نمناک آنکھوں کو پونچھا پھر جیسے خود کو آدھ نکلم کرنے لگی۔ میں خاموش بیٹھی اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے بوسل آواز میں یوں اشارہ کر دیا۔

”ہماری بلڈنگ کے آس پاس چند دکانیں ہیں۔ بلڈنگ کے سامنے سڑک کے کنارے درخت کے نیچے ایک موچی بیٹھا ہے۔ اس روز.....“ خاتون نے توقف کیا اور اس دن کو یاد کر کے اس کے چہرے پر کرب والہ الم کی ناقابل بیان کیفیت ہویدا ہوئی۔ ”سہ چہر کا دقت تھا۔ وہ درختی دکان سے اپنے لیے چیز خریدنے کے لیے نیچے اتری..... وہ اکثر خود ہی چلی جایا کرتی تھی اپنے لیے چیز لینے..... میں..... میں بالکونی میں کھڑی ہو کر اسے دیکھتی رہتی..... اس روز بھی میں بالکونی میں کھڑی تھی۔ اس نے میری آنکھوں کے سامنے دکان سے چیز لی اور گھر واپس آنے کو مڑی..... اتنے میں میرا بیٹا بھی بالکونی میں آ گیا۔ اس نے اپنے جوتے حرمت اور پاش کے لیے موچی کو دے رکھے تھے۔ اس نے بہن کو اوپر سے پکارا اور کہا میں پیسے نیچے بھیج کر رہا ہوں، تم موچی سے میرے جوتے بھی لے آؤ۔ میرے اور اپنے بھائی کے دیکھتے ہوئے اس نے نیچے جھینکے گئے پیسے اٹھا کر موچی کو دیے۔ موچی نے ایک شاپر میں جوتے ڈال کر اسے تھمائے۔ اس نے اوپر ہم دونوں کو دیکھا۔ شاپر زور سے لہرایا اور ہمیں دیکھتے ہوئے مسکرائی پھر بلڈنگ کے اوپر جانے والے زینے کی طرف مڑ گئی۔ وہ اس کی آخری مسکراہٹ تھی بس۔“

”پھر؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔
”میں اور چنا کچھ دیر اس کا انتظار کرتے رہے پھر میں نے بیٹے سے کہا کیا بات ہے، وہ ابھی تک آئی نہیں..... آ جائے گی اسی..... کسی دوست کے ساتھ باتیں بنانے کھڑی ہو گئی ہوگی..... بیٹے نے کہا..... کچھ دیر اور گزرنی پھر دادی بولیں..... جا کر دیکھو تو وہ ابھی تک آئی کیوں نہیں..... میرا بیٹا نیچے گیا۔ اسے واپس آنے میں بھی کچھ دیر لگی..... واپس آیا تو اس نے کہا امی وہ تو نیچے ہے ہی نہیں..... میں نے کہا شاید پردوس میں کسی گھر چلی گئی ہو..... داوی بولیں..... اسے بالاکر لاؤ..... چنا پھر نیچے گیا اور کافی دیر بعد پلٹا..... اس نے کہا میں نے بلڈنگ کے ایک ایک گھر میں پوچھ لیا، وہ کسی کے ہاں نہیں گئی..... مجھے ہول سوار ہوئی۔ داوی گھبرا کر نہیں..... ہم تینوں گھر سے باہر نکلے۔ اپنی

بلڈنگ میں، بلڈنگ کی چھت پر، آس پاس، سارا کمپلیکس بھان مارا مگر وہ کہیں نہیں ملی۔ اتنے میں یہ آفس سے آگئے..... ہم چاروں اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈتے رہے۔ پردہ نہیں ملی۔“

”پھر؟“ مجھے خاتون کے خاموش ہونے پر پھر پوچھنا پڑا۔
”رات ہونے لگی تو یہ پولیس اسٹیشن گئے اور انہوں نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ کھوا دی۔ پولیس دو دن (معدلتی رہی۔ کچھ پتا نہیں چلا۔“

”جبکہ آپ نے اسے اپنی بلڈنگ کے زینے کی طرف خود جاتے دیکھا تھا؟“ میں نے لقمہ دیا۔

”ان آنکھوں سے۔“ خاتون نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی دو انگلیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے کہا پھر ایک ان کی آواز بھرائی۔ ”بس وہ آخری بار تھا۔“
”میں نے اسے دیکھا۔ وہ مجھے اور اپنے بھائی کو دیکھ کر گھبرا گئی۔“ خاتون ایک مرتبہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ مجھے اپنا دل بارہ بارہ ہوتا محسوس ہوا۔

خاتون کے آنسو تھکتے تو میں نے مرد سے کہا۔ ”اچھا تو میں لگتا کہ میں زخم کریدوں لیکن..... میرا بچوں سے تعلق..... پتا چلے کہ آپ کی بیٹی کیونکر اس سامنے کا شکار ہوئی تو شاید ہم ان بچوں کو اپنی حفاظت کرنا سیکھا سکیں جن کو مارا داسطرہ پتا ہے۔“

”معاف کیجئے گا میڈم۔“ مرد نے نہایت تلخ لہجے میں کہا۔ ”اس بے رحم بھیڑیا معاشرے میں صرف اللہ ہی ہمیں کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔“

میں اس شخص کے دروکی انتہا کو سمجھ سکتی تھی۔
”ماٹھ نہ کیجیے تو کیا میں پوچھ سکتی ہوں آگے کیا ہوا؟“ مجھے ڈر تھا کہ وہ مجھ پر پھٹ ہی نہ پڑے مگر میری توقع کے برعکس اس نے نکل سے بتایا۔

”دو دن بعد کسی نے اس بلڈنگ کے جس میں ہم..... میں، قریب سے گزرتی بیٹی کی تاروں میں ایک بھاری بوری انگی ہوئی دیکھی اور اس خدشے کے تحت کہ کہیں..... کے گھرانے سے بیٹی نکل نہ ہو جائے، متعلقہ خیمے کو..... بوری اتاری گئی تو اس میں ہماری بیٹی کی ڈیڈ.....“

”میرے خدا!“ میرے جسم میں تھر تھری تھی۔
”پکارا کیا؟“ میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
”ڈیڈ باڈی ملنے کے بعد پولیس کو متین ہو گیا کہ ہماری بلڈنگ کے قرب وجوار میں کی گئی تھی۔“

تفتیشی اہلکاروں نے اپنی توجہ آس پاس کے گھروں پر مرکوز کر دی۔ خاص طور پر ہماری بلڈنگ میں واقع لٹینس پر کیونکہ بیٹی کو آخری مرتبہ بلڈنگ کے زینے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ بلڈنگ کے ایک ایک گھر کو سرچ کیا گیا۔ ان گھروں میں رہنے والے افراد سے پوچھ پچھ کی گئی، پتا چلا بلڈنگ میں واقع ایک فلیٹ کے سب مکین سوائے اس خاندان کے ایک نوجوان لڑکے کے، کسی قریب میں شرکت کے لیے گھر سے دور گئے ہوئے تھے۔ اس لڑکے کے ایک ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پولیس نے اس بارے میں پوچھا تو اس نے آئیں بائیں شاخص کی کوشش کی مگر عمل خانے کی ایک دیوار پر خون آلود انگلی کا نشان دیکھا گیا۔ پولیس معاملے کی تہ تک پہنچنا چاہیے تو بڑے سے بڑا مجرم بھی نہیں بچ پاتا۔ وہ بھی اپنا جرم قبول کیا۔ اس نے بیٹی کو گھر کے غسل خانے میں پانی سے بھری بالٹی میں الٹا پوکر مارا تھا اور اس پر تشدد میں اس کا ہاتھ بھی زخمی ہو گیا تھا زخمی ہاتھ کے خون کا ہلکا سا نشان غسل خانے کی دیوار پر رہ گیا تھا۔ بعد میں اس نے اپنا جرم چھپانے کے لیے بیٹی کی ڈیڈ باڈی ایک خالی بوری میں ڈال کر رات کے وقت اپنے فلیٹ کی بالکونی سے باہر پھینک دی وہی جو بیٹی کے تاروں میں انگی گئی۔“

میں دم بخود رہی کہ ایک نوجوان لڑکا اور ایسی سفاکانہ واردات! اخباری اطلاعات کے مطابق اس نے بیٹی کو قتل کرنے سے قبل اس کے ساتھ زیادتی بھی کی تھی۔
”بیٹے کا اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ کیوں لینا چاہ رہے ہیں آپ؟“ میں نے باپ سے پوچھا۔
”میڈم! ادبی بیٹے تھے ہمارے۔ ایک بیٹی ایک بیٹا..... بہن کی موت نے بیٹے کو بہت اب سیٹ کر دیا ہے۔ وہ بہن سے بہت پیار کرتا تھا۔ اس کی موت سے اور وہ بھی اس طرح سے..... وہ شدید دکھ اور کرب میں ہے۔ اس نے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا ہے..... وہ دوستوں سے تعلق نہیں رکھتا چاہتا..... لوگوں کا سامنا کرنے سے کتر اسنے لگا ہے۔ وہ اسکول بھی نہیں جاتا چاہتا..... ہم اسے کسی نفسیاتی دواؤں میں نہیں رکھنا چاہتے..... وقت بڑا مہم ہے..... زندگی رہی تو وہ پڑھ سچی لے گا۔ فی الحال اسے ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔“

”اوکے۔“ مجھے اپنے سامنے بیٹھے مرد وزن سے غیر معمولی ہمدردی محسوس ہوئی۔
”آج مل جائے گا سرٹیفکیٹ؟“ باپ نے پوچھا۔

سسپنس ڈائجسٹ

تمام رپورٹرز پر ایس ردم سے باہر نکل آئے اور اس کا تعاقب کرتے ہوئے دفتر میں پہنچ گئے۔ وہ محوم کو اپنی میز پر پہنچا، ٹیلی فون کو دیکھ کر منہ بنایا۔ جیسے توقع ہو کہ وہ اسے کوئی اطلاع پہنچائیں گے اور پھر اپنی کھونٹے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس دوران اس کی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں ہوا۔

ٹریبون کے نمائندہ شون نے بولنے میں پہل کی۔ وہ گراہم کو کافی عرصے سے جانتا تھا۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ ڈینی ٹریبل نے انسپکٹر پولیس کے آدی فونل کر دیا ہے؟“

گراہم نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”قدرتی بات ہے۔“

”تمہیں اس کا کوئی سراغ ملا؟“ یہاں پر سوال ایک نوجوان رپورٹر نے کیا تھا جسے گراہم نے نظر انداز کر دیا۔ وہ اپنی معلومات اور کارروائی کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتا تھا۔

”اب تم لوگ جانتے ہو۔“ اس نے اخباری نمائندوں سے کہا۔ ”مجھے بہت کام کرنا ہے۔“

تمام نمائندے باہر راہداری میں آ گئے۔ ہیڈ لائن کارپورٹرز بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”اس شخص میں ذرا سماجی رک رکھاؤ نہیں ہے۔ میں نے اس سے زیادہ سرد و دھڑ آدی نہیں دیکھا۔“

شون لاؤنچ میں جاتے ہوئے بولا۔ ”پولیس والے ایسے ہی سخت گیر ہوتے ہیں اور نایک گراہم بھی ان میں سے ایک ہے۔ وہ کوئی انسان نہیں بلکہ علامت ہے۔ بے حس، اکھڑ اور جھگڑالو۔ ہمیں یہاں رک کر کسی خبر کا انتظار کرنا چاہیے۔“

گراہم کے کمرے میں تین فون تھے۔ ایک دفتر کے اندر بات کرنے کے لیے، دوسرا مین بورڈ سے منسلک اور تیسرا پرائیویٹ نمبر تھا۔ پولیس کمشنر نے اس پر اعتراض کیا تھا لہذا گراہم اس کے بل کی ادائیگی اپنی جیب سے کرتا تھا۔ یہ ٹیلی فون اس کا واحد معاون اور اطلاعات پہنچانے کا بہترین ذریعہ تھا کیونکہ اس کے خبر سرکاری فون پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ رپورٹرز کے جانے کے بعد گراہم نے پرائیویٹ فون اپنی طرف کھینچا اور کسی اطلاع کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسپونڈ نہ کیا اور اپنی بھاری آواز میں بولا۔ ”گراہم! دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا، اسے سننے کے بعد وہ بولا۔ ”تمہاری اطلاع درست ہو سکتی ہے۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور تہی دروازے سے نکل کر اس گلی میں چلا گیا جہاں اس کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ نوجوان رپورٹر نے اسے جاتے دیکھا تو بولا۔ ”میں اس کا پیچھا کرنا چاہیے۔“

شون نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”نہیں۔ اگر اس نے

ڈینی کو تلاش کر لیا تو ہمیں قبرستان میں پھنک کر خیر بنا دیا۔“ کیونکہ ان میں سے ایک نیکی طور پر وہاں جانے کا اور گراہم کی زیادہ امید ہے۔“

ڈینی ایک ایسا خطرناک جرم تھا جو کبھی پولیس کے ہاتھ نہیں آیا اور کچھ لوگوں نے تو یہاں تک کہنا شروع کر دیا۔ یہ پولیس کا ہی تحقیق کردہ ایک کردار ہے اور بر غیر حل جرم اس کے نام ڈال دیا جاتا ہے اور شون جیسے لوگوں پریش کوئی تھی کہ وہ بہت جلد جرم کی دنیا کا لیجنڈ بننے والا ہے اگر وہ واقعی اس راہ پر گامزن تھا تو پھر وہ کوئی فرضی کردار نہ بلکہ زندہ حقیقت تھا۔ وہ نائیک گراہم سمیت تمام پوئلہ والوں سے نفرت کرتا تھا۔

صرف چند ما قبل وہ ڈینی اور ہوشیار جرموں نے، کا سرخندہ چکا تھا، وہ خود ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھا۔ وہ بد معاشوں کے ساتھ نہیں رہا اور نہ ہی کسی جکی آبادی پیداوار تھا۔ اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا تھا کہ وہ شاد شدہ تھا اور ایک باعزت، بائٹ علاقے میں رہتا تھا۔ اب اس کا کوئی گروہ نہیں تھا جس کا سرگرم گراہم کے سر جاتا تھا۔

گراہم قانونی پیچیدگیوں میں الجھنے کے بجائے جرم کے خلاف براہ راست کارروائی پر یقین رکھتا تھا، جب اسے معلوم ہوا کہ ڈینی اور اس کے تین سماجی ماری کے سیلون عقیق کمرے میں ملاقات کرنے والے ہیں تو وہ اکیلا ہی دا چلا گیا۔ اس گروہ نے جنک کے پیغام رساں اور دو نوٹس دا نوٹل کیا تھا۔ گراہم نے زوردار لٹ مار کر دروازہ توڑ دیا۔ گمن سمیت اندر داخل ہو گیا۔ اس وقت ڈینی وہاں موجود تھا۔ گراہم نے دروازے میں کھڑے کھڑے اس کے تین ساتھیوں پر فائر کھولا اور انہیں ہلاک کر دیا۔

اس کے بعد صرف ڈینی ہی زندہ بچا۔ اس بارے میں افواہ تھی کہ وہ شہر چھوڑنے والا ہے لیکن جان سے پہلے گراہم کو قبرستان پہنچا کر جانے کا اور اس نے انتظار کارروائی کے طور پر ایک انسپکٹر پولیس کے سپاہی کو کر دیا تھا۔

گراہم نے اپنے منبر کے بتائے ہوئے پتے ایک ہلاک کے فاصلے پر کار کھڑی کی اور بقیہ فاصلہ پیو طے کیا۔ اس نے اس چھوٹی سی اپارٹمنٹ بلڈنگ پر نظر انداز اور سر ہلا کر وہ گیا۔ ڈینی جیسے شخص کے پیچھے کے لیے بہترین جگہ تھی۔ اس عمارت کے دیگر رہائشی غالباً دفتر میں کام کرنے والے محرک اور کارکن تھے۔

عمارت کے صدر دروازے پر کوئی چوکیہ دار نہیں تھا۔

ڈینی کے فلیٹ کا نمبر 307 بتایا تھا۔ گراہم نے اس کے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ یہاں تک کہ کسی رہائشی نے آڈیٹنگ ڈور کھول دیا۔ وہ عمارت میں داخل ہوا اور لفٹ کو نظر انداز کر کے سیڑیوں کے ذریعے تیسری منزل پر پہنچ گیا۔

تین سوسات کے باہر کھڑے ہو کر اس نے اپنی گمن لائی اور دروازے سے کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اندر سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ اس نے آہستہ دروازے پر دستک دی اور خود چوکنہ ہو گیا۔ قدموں کی چاپ نزدیک آئی۔ جیسے ہی دروازہ کھلا وہ تیسری سے اندر داخل ہو گیا لیکن اپنے سامنے ایک لڑکی کو دیکھ کر اس کی آنکھیں جھپک جھپک گئیں۔

”تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟“ لڑکی نے پوچھا۔

گراہم حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے کمرے پر نظر ڈالا کہ شاید اسے وہاں کوئی بد معاش نظر آجائے لیکن وہاں لڑکی کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

”کیا تم آکس کر کریم لائے ہو؟“ اس لڑکی نے پوچھا۔

گراہم نے اپنے ہاتھ پیچھے کیے اور بولا۔ ”لڑکی۔“

”میں نہیں جانتی۔“ لڑکی نے کہا۔ ”انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ جلدی گھر آ جائیں گے۔“

گراہم کو اپارٹمنٹ میں کھانا پکینے کی خوشبو محسوس ہوئی۔ اس نے پوچھا۔ ”تمہاری ماں یہاں ہیں؟“

لڑکی نے فنی میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ”مجھ یہ کھانا کون کھا رہا ہے؟“

”میں۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”بینی۔ آج میں آٹھ سال کی ہو گئی ہوں۔“

گراہم نے گمن ہوش میں رہی اور جیب سے ڈینی کی پرائیویٹ تھویر نکال کر اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے بھی اس آدی کو دیکھا ہے؟“

”بالکل میرے پاپا ہیں۔“

”تم جانتی ہو کہ یہ کون کس آکس گے؟“

”کسی بھی وقت۔“ بینی نے کہا۔ ”وہ میرے لیے گئے ہیں۔“

گراہم نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا ہے کہ مجھے انتظار کر لیتا چاہیے۔“

”تم کچن میں آ جاؤ۔“ بینی نے پیشگی کی۔ ”میں پاپا کھانا بنا رہی ہوں۔“

وہ اس کے چھوٹے سے کچن میں چلا گیا اور ایک اسٹول پر اس طرح بیٹھا کہ اس کی نظریں اپارٹمنٹ کے دروازے پر رہیں۔

”بینی برتن دھوئے ہوئے یولی۔“ تمہارا نام کیا ہے؟“

”گراہم۔“ نایک گراہم۔“

”کیا تمہاری کوئی چھوٹی بینی ہے؟“

گراہم نے فنی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ابھی میری شادی نہیں ہوئی۔“

”پاپا کہتے ہیں کہ ہر ایک کو شادی کرنا چاہیے۔ ہم بہت جلد ایک دوسرے شہر جانے والے ہیں جہاں وہ کسی خوب صورت عورت سے شادی کریں گے جو میری ماں بن سکے۔“

”اچھا خیال ہے۔“ گراہم نے کہا۔

”پاپا کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ بینی یولی۔ ”وہ بہت خوش شکل ہیں۔“

کچن میں بہت گرمی ہو رہی تھی۔ گراہم نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ مجھے چلنا چاہیے۔“

بینی یولی۔ ”کھاؤ کھا کر جانا۔ پاپا بس آتے ہی ہوں گے۔“

”شاید میں دوبارہ آؤں۔“ گراہم نے کہا اور دروازہ کھول کر راہداری میں چلا گیا۔ وہ گروڈ فلور پر پہنچا ہی تھا کہ اسے ڈینی آتا ہوا دھنکی دیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چابی اور دوسرے میں آکس کریم کا ٹیکٹ تھا۔ گراہم اس کا ایک ہی اس کے سامنے آ گیا۔ ڈینی نے تھینکے کی کوشش کی لیکن جیسے ہی اس نے ہسٹول کی طرف ہاتھ بڑھایا، گراہم نے اس کے سر پر زوردار ضرب لگائی۔ وہ گھٹنوں کے بل جھکا اور آکس کریم اس کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر گر گئی۔ گراہم نے اسے کالر سے پکڑا اور سڑک پر گرادیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھنے کی کوشش کرتا، گراہم نے اس کے ہاتھوں میں پھنکڑی ڈال دی۔

اب وہ اس کا قیدی تھا۔ اسے اس کی بالکل بھی توقع نہیں تھی۔ ڈینی نے ایک پولیس والے کو بل کیا تھا اور اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ زندہ گرفتاری نہیں دے گا۔ اس طرح گراہم نے بھی عہد کیا تھا کہ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا لیکن اب اس پر قابو پانے کے بعد اس کے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا کہ وہ اسے ہیڈ کوارٹر لے جائے۔

اسے ایک گھنٹے تک بینی کا خیال نہیں آیا۔ وہ ڈسٹرکٹ اٹارنی کے دفتر میں سرکاری وکیل اور اخباری نمائندوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ سرکاری وکیل کے چہرے سے خوشی چھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس نے کئی تصویریں بنوائیں

اور اخباری نمائندوں کے سامنے اس تہقین کا اظہار کیا کہ
ڈینی کو سزائے موت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔
شون نے گراہم کی یادداشت کو جھٹکا دیتے ہوئے
کہا۔ ”ایک افواہ یہ سننے میں آئی ہے کہ ڈینی کی ایک جینی بھی
ہے۔ تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟“
گراہم نے فرماتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا بکواس ہے؟“
شون طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔
”راسو جو کہ جب اس کی تین کام میں تصویر شائع ہوگی تو
تمہارے لیے جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔“
گراہم اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔
”میرے پاس فضول باتیں سوچنے کے لیے وقت نہیں ہے۔“
یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔
راستے میں ایک جگہ رک کر اس نے آئس کریم کے
دو پیکٹ خریدے اور ڈینی کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ دروازہ کھینچ
نے ہی کھولا تھا۔ اس نے آئس کریم کے پیکٹ اسے
پکڑا دیے۔
وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”پاپا ابھی تک نہیں آئے۔“
تم اندر آ جاؤ اور میرے ساتھ ڈنر کرو۔“
گراہم ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ”میں کھانا
کھا چکا ہوں۔“
وہ جلدی سے بولی۔ ”لیکن تم ابھی تک بھوکے ہو۔“
کھانا خاصا بد مزہ تھا جس کا اعتراف پپا نے بھی کیا
لیکن گراہم اس کا دل رہنے کے لیے بولا۔ ”بہت مزے کا
ہے۔“ پھر اس نے محتاط لہجے میں کہا۔ ”جینی! تمہارا کوئی
رشتے دار ہے؟“
”صرف پاپا۔ لیکن وہ ابھی تک کیوں نہیں آئے؟“
”پریشان مت ہو جینی۔ ممکن ہے وہ کسی سے ملنے
چلے گئے ہوں یا چند دنوں کے لیے کسی کام میں مصروف
ہو گئے ہوں، جب میں آخری بار اس سے ملا تو اس نے کچھ
ایسی ہی بات کی تھی۔“
”تم ان سے کب ملے تھے؟“
”زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔“ وہ اپنی پلیٹ پر نظریں
ترکاتے ہوئے بولا۔
وہ سوچ رہا تھا کہ اگر واقعی پپا کی تصویر اخبار میں
شائع ہوگئی تو اس کے لیے بہت مشکل کھڑی ہو جائے گی۔
یکسو جینی۔“ اس نے کہا۔ ”میرا نہیں خیال کہ تمہارے پاپا
آج رات گھر واپس آئیں گے۔ فرض کرو میں تمہیں اپنے
ساتھ لے جاؤں۔“

اس نے مزید سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی اور چینی کو لے کر کہاں میں بیٹھ گیا لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ اسے لے کر کہاں جائے۔ وہ دو گھنٹے تک بلا مقصد گاڑی چلاتا رہا یہاں تک کہ چینی کی آنکھیں بند سے پوچھل ہوئے لگیں۔ وہ اسے اپنے ہوٹل میں لے جا سکتا تھا اور گراہم کو اڈر لے جاتا تو وہ اسے قیمتی طور پر دارالاطفال بھیج دیتے اور گراہم اڑا رہا نہیں جاتا تھا۔

اب جبکہ اسے جان پال کا خیال آیا جو شہر کے وسط میں ایک ریسٹوران چلاتا تھا اور پال بچوں والا تھا۔ شاید وہ کوئی تمصرہ کیے بغیر چینی کو اپنے پاس رکھ لے۔ گراہم اس کے ریسٹوران پہنچا۔ جان پال پوچھنے والوں سے دوستی کرنے کا شوقین تھا اور ویسے بھی گراہم نے اس سے پہلی بار کوئی فرمائش کی تھی لہذا وہ ایک رات کے لیے چینی کو اپنے قایم لے جانے پر رضامند ہو گیا اور گراہم ہیز کو اڈر واپس آ گیا۔ ویسے تو گراہم ہر وقت ہی کام کرتا رہتا تھا لیکن شیدول کے مطابق اس کی ڈیوٹی نصف شب سے صبح آٹھ بجے تک ہوتی تھی۔ ابھی آٹھ بجی نہیں بجے تھے کہ جان پال کا فون آ گیا۔

”گراہم! تم نے آج کے اخبارات دیکھے؟“

”نہیں۔“

”بہتر ہوگا کہ تم انہیں دیکھ لو۔“ جان نے مشورہ دیا۔ ”اور براہ کرم اس چینی کو یہاں سے لے جاؤ۔ میں کسی مشکل میں پڑنا نہیں چاہتا۔“

”تم آرام سے بیٹھو اور اپنی زبان بند رکھو۔“ گراہم نے اسے تنبیہ کی اور فون بند کر دیا۔

اخبار کی خبر پڑھ کر گراہم کے ہوش اڑ گئے۔ اس کے مطابق ڈینی نے اپنے ایک دوست کو چینی کی دیکھ بھال کے لیے کھینچا تھا لیکن وہ اسے وہاں نہیں ملی۔ ویسل صفائی نے اپنے ایک بیان میں الزام لگایا کہ پولیس نے ڈینی پر دہاؤ والے کے لیے چینی کو اغوا کیا ہے لیکن ڈسٹرکٹ انٹاری نے اس الزام کی تردید کی اور کہا کہ اس طرح قیدی کے لیے ہر روز کے جذبات پیدا کیے جا رہے ہیں۔ خبر کے مطابق پولیس چینی کو سرگرمی سے تلاش کر رہی تھی۔

گراہم نے اخبار ایک طرف رکھا اور چیف سے بات کرنے کے لیے فون اٹھایا لیکن اسے اپنے نمبر کی آواز نہ مل سکی۔

”سوچ کیا رہے ہو چیف کو بتا دو کہ“

”جی ہاں۔ وہ اسے بڑے جیل بھیج دیں گے جہاں اس کی پرورش لاوارثوں کی طرح ہوگی۔ اس کا بچپن اور

رانی جیل کی محدود دنیا کی نذر ہو جائے گی اور اسے
 فطرے میں کوئی مقام نہیں مل سکے گا۔“
 گراہم کو یہ سوچ کر ہی جھرجھری آگئی اور اس نے
 بالوں رکھ دیا۔

سر پہر پنازیوں کے دامن میں واقع کھیتوں میں رنگ
 لگے پھول بہاؤ رکھا رہے تھے۔ ان کھیتوں میں کئی اور گندم
 کاشت ہوئی تھی۔ چینی کے لیے یہ مناظر بالکل نئے تھے۔
 ساتھ راستہ گراہم سے سوالات پوچھتی رہی اور وہ اپنی کچھ
 معلوماتی جواب دینا رہا پھر اس نے ہتھیرا ڈال دیے۔
 ”دیکھو چینی۔ میں دیہات کے بارے میں کچھ نہیں
 جانتا کیونکہ وہاں کبھی نہیں رہا۔“

”پھر تم یہاں کیوں آئے ہیں؟“

اس نے نائے کی غرض سے کہا۔ ”میں نے سوچا کہ
 یہاں کا دل شہر سے باہر گرا ا جائے۔“

یہ جگہ شہر سے قریب تھی اور وہ جب چاہے یہاں
 آ سکتا تھا۔ اس نے ایک سروں اسٹیشن سے فارم کا پتہ پوچھا
 وہاں سے دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہاں پہنچ
 گیا۔ وہ ایک چھوٹا سا رہتا پتھروں کا بنا ہوا مکان تھا جس
 کے ساتھ کھلیاں، پانی کا تالاب، ایک گائے کچھ مرغیاں اور
 بلیے بالوں والا کتا بھی نظر آیا۔ کار سے اتر کر گراہم نے
 زمین کی طرف قدم بڑھائے جہاں ایک بوڑھی عورت کھڑی
 تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ صاف کر دی تھی۔

اس سے بات کرنے کے بعد گراہم نے واپسی کا
 ارادہ کیا لیکن وہ عورت جس کا نام ویل تھا، اصرار کرنے لگی
 کہ وہ کھانا کھا کر جائے۔ گراہم نے گزشتہ بیس سالوں میں
 کھانا کھانا کھا نہیں کھایا تھا۔ اس نے کچھ زیادہ ہی کھایا
 اسے خود کی محسوس ہونے لگی، ابھی تک سورج کی تپش
 محسوس نہیں۔ مسز ویل نے تجویز پیش کی کہ وہ شام میں واپس
 آئیں لیکن اس نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ اسے آٹھ بجے
 کو پہنچنا ہے۔

روانہ ہونے سے قبل چینی نے اس سے وعدہ لیا کہ وہ
 روز ضرور واپس آئے گا لیکن عملاً یہ ممکن نہیں تھا۔
 اسے سوچا کہ وہ کم از کم ایک ہفتہ چینی کو وہاں رکھے گا۔
 اب تک اخبارات میں اس کی گمشدگی سے متعلق خبریں
 دیں گی اور وہ خاموشی سے چینی کو حکام کے حوالے
 گا اور اس کی کوشش ہوگی کہ چینی کو کچھ جیل نہ بھیجا
 جائے۔ اس نے اس بارے میں کچھ ادھی سوچ رکھا تھا۔

اسی دوران ایک دن گراہم ایک برعاش کا اقبال

شاعری

ایک زمانہ تھا کہ شاعری اور عشق یا عشق کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے اور ایسا سمجھنا بے وجہ نہ تھا۔ اول تو خود شعر کا حادث ہی دنیا میں اس جوش اور ولولے سے ہوا ہے جو عشق اور محبت کی بدولت انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور شعر کی ذات میں جو ایک آتش گیر مادہ ہے وہ بھی اپنے متشعل ہونے میں کسی آگ کی اشتعالک کا محتاج ہے۔ پھر قوم کا کلام بھی جہاں تک دیکھا گیا اسی خیال کی تائید کرتا تھا۔ غزلیہ ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہ ہوتی تھی اس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی مضائقہ ہوتا تھا۔ خود بھی جب بھی یہ سودا اچھلا آکھیں بند کیں اور اسی شارب عام پر پڑے جس پر راہ گیروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ قافلہ کا ساتھ راہ کی ہمواری اور راہ گزری فضا چھو کر دوسرا راستہ اختیار کرنے کا بھی خیال بھی نہ آیا۔ مگر آفتاب عمر نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہوا۔ وہ تمام سیاسی جلوے جو خواب غفلت میں حقائق سے زیادہ دل فریب نظر آتے تھے رتہ رتہ کا نور ہونے لگے۔ غزل و تنسیب کی امگ افغانال کے ساتھ بدل گئی اور جس شاعری پر ناز تھا اس سے شرم آنے لگی۔ ہر چند سمجھا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب آئے ہیں مگر یہی جواب دیا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب گئے۔ جو لوگ عاشقانہ گوئی کے چٹارے سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خون جہاں من کو لگا کہ پھر ذرا مشکل سے چھتا ہے مگر زمانے کی ضرورتوں نے سبق پڑھایا کہ دلفریب مگر کئی باتوں پر آفریں سننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفرس سننا بہتر ہے اور حاکم وقت سے یہ دھکم دپا کہ پروانہ و ملیں کی قسمت کو تو بہت رو چکے کبھی اپنے حال پر بھی دوا نہ سہا ہے ضروری ہیں۔

انتخاب : محمد رفیعان، منڈی بہاؤ الدین

کرتے ہوئے ایک اسٹور میں پہنچ گیا۔ وہ بد معاش چوری کی کئی دادر آؤں میں مطلوب تھا۔ اس اسٹور میں خواتین کے ملبوسات اور دیگر اشیا فروخت ہوتی تھیں۔ اس بد معاش کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ وہ وہاں ایک لڑکی سے ملنے آیا تھا۔ اس لڑکی نے دل کھول کر خریداری کی اور اس بد معاش نے ان چیزوں کی قیمت ادا کی جیسے ہی وہوں اسٹور سے باہر آئے، گراہم نے انہیں پکڑ لیا۔ دوسرے دن وہ پھر اسی اسٹور میں گیا اور سبز گرل سے کہا کہ وہ بچی کے لیے ایک خوب صورت لباس خریدنا چاہتا ہے۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے ٹھکر سے کہہ دیا کہ جب لباس تیار ہو جائے تو وہ اس کے دفتر پہنچا دیا جائے۔

جب اسٹور کا بارودی ڈیپوڑی مین دوسرے دن دو ڈبے لے کر پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچا اور اس نے سارجنٹ بائیکل گراہم کے دفتر کے بارے میں جانا چاہا تو استقبالیہ ٹھکر مافی خیر انداز میں مسکرا دی، تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر پریس روم میں پہنچ گئی کہ سخت گیر سارجنٹ گراہم نے کسی عورت کے لیے خوب صورت لباس خریدے ہیں۔ زیادہ تر رپورٹرز کو اس افواہ پر یقین نہیں آیا تاہم شون کا خیال اس سے مختلف تھا۔ اس نے کہا۔

”جو بظاہر سخت نظر آتے ہیں۔ وہی پھسلنے بھی ہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم میں سے کون اس کے پاس جائے گا۔“

ٹائمز کے نمائندے نے کہا۔ ”میں تو نہیں جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ وہ جب یہاں آئے گا تو ہر اس سے پوچھ لیں گے۔“ شون بولا۔

گراہم اس روز پریس روم میں نہیں آیا۔ پچیس سالوں میں یہ دوسرا موقع تھا کہ اس نے دفتر سے چھٹی لی تھی۔ وہ اسی ارادے سے فارم ہاؤس گیا تھا کہ چینی کو داپس لا کر متعلقہ حکام کے حوالے کر دے گا لیکن وہاں پہنچ کر وہ شش و پنج میں پڑ گیا۔

چینی نے مختصر سا پلے سوٹ پہن رکھا تھا جو اس کے بدن کو چھپانے کے لیے کافی تھا۔ اس کے جسم کی رنگت بھی تبدیل ہو کر سفید سے گولڈن براؤن ہو گئی تھی۔ وہ ایک کرسی پر کھڑی اپنے کپڑے استری کر رہی تھی۔ جیسے ہی گراہم کمرے میں داخل ہوا، وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ گراہم گھبرا گیا اور اسے شرمندگی محسوس ہونے لگی۔

”دیکھو لڑکی۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“

”ان ہنڈلوں میں کیا ہے؟“ چینی نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ کھسپا ہوتے ہوئے بولا۔

”تمہارے لیے کچھ چیزیں ہیں۔“

وہ فرش پر بیٹھ کر کھولنے لگی۔ وہ ایک ایک چیز کو اپنے جسم پر رکھ کر دیکھ رہی تھی۔ اس کی غویت کو دیکھتے ہوئے گراہم کو یہ کہنے کا موقع ہی نہیں سکا کہ وہ اس کے ساتھ شہر جانے کے لیے تیار ہو جائے۔ اس سے پہلے کہ چینی کی فیشن پر یہ ختم ہوئی، مسز ویلس کمرے میں داخل ہوئی۔

”چینی کتنی اچھی لگ رہی ہے۔“ وہ جھٹکتے ہوئے بولی۔ ”گرمیاں ختم ہونے سے پہلے اس کی رنگت بالکل براؤن ہو جائے گی۔ کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا۔“

”ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔“ گراہم نے کہا۔

چینی نے اسے وہ سب کچھ بتایا جو وہ فارم پر سیکھ رہی تھی۔ اس نے گائے کا بھی تعارف کر دیا۔ اس کا نام ایلینس تھا۔ چینی نے اپنے کپڑوں پر استری کرنا بھی سیکھ لیا تھا۔ اس کی نظر گراہم کے سسلے ہوئے سوٹ پر پڑی تو اس نے اس پر بھی استری کرنے کی پیشکش کر دی، جس میں اسے اپنی بے عزتی محسوس ہوئی۔ بعد میں جب اس نے مسز ویلس کے سامنے یہی پیشکش دہرائی تو وہ شرمندہ ہو گیا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس طرح اس کی زبان کو روکے۔ اس کا ایک ہی حل تھا کہ وہ کمرے میں جا کر اپنی پتلون اتار کر دروازے سے باہر پیچیک دے اور پتلون استری ہو جانے کا انتظار کرے۔

چینی نے اپنا کام مدگی سے کیا کہ وہ پتلون پر دہری کر یز بن گئی تھی لیکن پھر بھی وہ بہتر نظر آ رہی تھی۔ گراہم چینی کو لیے بغیر ہی ڈیوٹی پر چلا آیا البتہ اس کے کپڑے استری شدہ تھے۔ یہ دیکھ کر ڈبیک ٹھکر اپنی حیرت پر قابو نہ پاسکی۔ اس نے شون سے کہا۔

”گراہم اور ایک عورت کے بارے میں جو خیال تھا اس میں ضرور کوئی سچائی ہے۔ مجھے تو اسی وقت شک ہو گیا تھا جب زنا نہ کپڑے یہاں آئے تھے لیکن اب اس کے استری شدہ کپڑے دیکھ کر میرا شک یقین میں بدل گیا۔ اس نے جب سے یہ سوٹ خریدا ہے، اس پر استری نہیں ہوئی۔“

اس کے بعد گراہم چار مرتبہ چینی کو لینے گیا لیکن ہر مرتبہ اس کا ارادہ کمزور پڑ گیا۔ باؤخر اس نے یہ خیال دل سے نکال دیا۔ وہ خود بھی چینی کو بھائی کے مرکز میں سمجھتا چاہتا تھا لیکن اس کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ چینی کو گوڈو لے لے۔ یہ سوچتے ہی اسے غصہ پھیلنے لگا۔ ”پہلے آئے گئے لیکن آرا سے چینی کو اپنے پاس رکھنا تو یہی کرنا ہوگا۔“

اس نے اپنے طور پر عطا طریقے سے معلومات

حاصل کیں تو پتا چلا کہ ڈینی کی زندگی میں اس کی اجازت کے بغیر وہ چینی کو گوڈو نہیں لے سکتا۔ اس بارے میں گراہم نے بہت زیادہ سوچ بچار کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ اسے ڈینی سے بات کر لینی چاہیے۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے رومانس کی کہانی جیل کے اندر بھی پہنچ گئی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈینی سے ملنے کے لیے اناؤن ۲۳۱۳ ڈینی نے اسے بلا بھیجا۔

وہ بے وقوف نہیں تھا۔ اس نے دو اور دو جمع کیے اور سچ معلوم کر لیا۔ جب گراہم ملنے کے لیے اس کے سیل پہنچا تو ڈینی نے لگی لپٹی بغیر کہا۔ ”تم میری چینی کو لے گئے ہو۔ وہ تمہارے پاس ہے۔ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔“

وہاں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ اس لیے وہ کھل کر بات کر سکتے تھے۔

”میں تمہیں بے وقوف نہیں بنانا۔“ گراہم نے۔

”ہاں وہ میرے پاس ہے۔“

ڈینی اس کے بالکل قریب آیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”اس دنیا میں مجھے صرف اپنی چینی کی پروا ہے۔“

”بہت خوب۔“ گراہم نے کہا۔ ”لیکن میں بھی ایسا ہی محسوس کرتا ہوں اور اسے گوڈو لینا چاہتا ہوں۔“

ڈینی داہیں اپنی لپے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے بہت زیادہ پی پی ہو۔ گراہم اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں پچائی ہو جائے گی اخبارات کو تمہاری بیٹی کی کہانی چاہیے۔ میں اسے بہت دور لے جاؤں گا۔“

”کیوں؟“ ڈینی نے پوچھا۔

گراہم نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ ”کاش میں جان سکتا۔“

ڈینی کا دیرینہ کاموش بیشار ہا پھر بولا۔ ”گراہم! میں تم سے شدید نفرت کرتا ہوں۔ تم ایک بے حس اور جذبات سے عاری انسان ہو۔ بے شک میری بیٹی مر جائے لیکن میں اسے تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔ تم ابھی اسے میرے پاس لے کر آؤ۔ ورنہ میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

”تم کسی کو نہیں مارو گے۔“ گراہم نے خشک لہجے میں کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

وہ ڈینی کی جھمکیوں سے پریشان نہیں تھا۔ وہ جیل میں ہڈا تھا اور جس دن اسے پچائی پر لٹکا یا جائے گا تو وہ اس مسئلے سے آزاد ہو جائے گا۔ اسے صرف یہ فکر تھی کہ کہیں ڈینی

اخباری نمائندوں اور ڈسٹرکٹ انٹرنی کو نہ بتا دے کہ اس کی بیٹی گراہم کے پاس ہے اس طرح اس کے خلاف اسکینڈل بن جائے گا۔

گراہم بڑی باقاعدگی سے اخبارات دیکھ رہا تھا لیکن ایک ہفتہ گزر جانے کے باوجود بھی اسے اپنے اور چینی کے بارے میں کوئی خبر نظر نہیں آئی تو اس نے فون کر کے مسز ویلس کو بتایا کہ وہ اگلے روز چینی سے ملنے کے لیے آ رہا ہے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ ان کے لیے ٹھکانے تیار کرے گی اور پورے دن کے لیے فارم ان کے حوالے کر دے گی کیونکہ وہ اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے دوسری کاؤٹنی جانا چاہتی ہے۔

گراہم کو ابھی تک اس شرمندگی سے نجات نہیں ملی تھی جو چینی کے سوٹ پر بس کرنے کی وجہ سے اسے ہوئی تھی۔ لہذا اس مرتبہ اس نے جانے سے پہلے اپنا سوٹ اچھی طرح استری کر لیا تھا۔ اس کا ارادہ ڈیوٹی ختم ہونے کے فوراً بعد علی الصبح روانہ ہونے کا تھا لہذا اس نے استری شدہ سوٹ پہن لیا۔ ڈبیک ٹھکر نے اسے غور سے دیکھا اور چند منٹوں میں یہ خبر پکھیل گئی کہ گراہم اپنی بیٹی سے ملنے جا رہا ہے۔

بائیکل گراہم کی کار میں ریڈیو نہیں تھا۔ اسے یہ بات پسند نہیں تھی کہ دفتر سے دائر لیس کے ذریعے اسے بتایا جائے کہ وہ کیس کو کس طرح پینڈل کرے گا چنانچہ خراس کی اس خوشگوار صبح بھی وہ کار ریڈیو کے بغیر ہی چینی سے ملنے جا رہا تھا۔ کار کی پہچانی نشست پر چینی کے گھنے رکھے ہوئے تھے۔ ریڈیو نہ ہونے کی وجہ سے اسے یہ اطلاع نہ دی جا سکی کہ ڈینی جیل تو ڈکر فرار ہو گیا ہے۔ بائیکل اس صورت حال سے لاعلم تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا بے فکری سے کار چلا رہا تھا اور اسے یہ علم ہی نہ ہوسکا کہ مناسب فاصلے سے اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔

چینی فارم کے گیٹ پر ٹپ رہی تھی۔ اس نے ٹچ پیک کر لیا تھا اور اس کا انتظار کر رہی تھی۔ گراہم نے سوچا کہ پہاڑی پر چڑھتے وقت اس کا کندھا ہانپا یاں ہو جائے گا۔ اس لیے اس نے تھوڑی سی کچکا ہٹ کے بعد... اپنا ہولسٹر اور گن کار کے خانے میں رکھ کر مقتل کر دی۔ وہ چینی کے ساتھ فارم کے عقب میں واقع جنگل میں چھپا گیا۔

شکاری کتا ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔

گراہم پیدل چلنے کا عادی نہیں تھا۔ لہذا ایک کھٹے کے سفر کے بعد وہ ٹھنڈی گھاس پر چٹ لیٹ گیا اور چینی کی باتیں سننے لگا۔ ”باؤخر اس نے اسے نوکا اور بولا۔ ”چینی!

کیا تم میری بیٹی بننا پسند کرو گی؟“
 ”میرے پاس کیا کہاں ہیں؟ وہ کب آئیں گے؟ میں ان کی بیٹی ہوں۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“
 گراہم نے غصہ سے سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ پھر کچھ دیر توقف کرنے کے بعد بولا۔ ”کیا تمہارے پاس تم سے بہت پیار کرتے تھے بیٹی؟“
 اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔“
 ”کبھی وہ مجھے رات کو کچھ کر پیار کرتے تھے۔“
 ”غرض کرو کہ وہ واپس نہیں آئے پھر تم میری بیٹی بننا پسند کرو گی؟“

بیٹی نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”وہ ضرور واپس آئیں گے۔“
 اس کے بعد گراہم نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ وہ سہ پہر کے بعد واپس آئے۔ اس وقت سورج ڈھل رہا تھا۔ گراہم خوش تھا کہ وہ اپنا کونٹ اور ہوسٹرا تار کر آرام سے بیٹھے گا لیکن اس کی خوشی خاک میں مل گئی جب اس نے کچن میں ڈبئی کو بیٹھے دیکھا۔ وہ اپنی کانٹا نظر کر رہا تھا۔ ایک چھوٹا آٹو بیک پتول اس کے ہاتھ میں تھا جس کی نال کارخ اس نے گراہم کی جانب کر لیا۔

گراہم کی نظر اس پر اس وقت گئی جب اس کے پاس کچھ کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ اس صورت حال میں وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ لہذا وہ خاموش کھڑا اس کی انگلی کارروائی کا انتظار کرتا رہا۔

بیٹی خوشی سے چلائی اور دوڑتی ہوئی ڈبئی کے پاس جا پہنچی۔ ”اودہ پاس میں جانتی تھی کہ تم ضرور واپس آؤ گے۔“
 ڈبئی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے ایک طرف کر لیا تاکہ پتول کی نال کارخ گراہم کی طرف رہے پھر گراہم کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“
 گراہم کرسی پر بیٹھ گیا لیکن اس کی نظریں ڈبئی پر تھیں۔ بیٹی اس کے گلے گلے ہوئے بولی۔ ”تمہارے ہاتھ میں گن کیوں ہے؟“

”تم اس کی گن کمرٹ کرو۔“ ڈبئی نے کہا۔ ”سڑک پر سب کے درخت کے پیچھے ایک کار کھڑی ہوئی ہے۔ تم اس میں جا کر بیٹھ جاؤ اور میرا انتظار کرو۔“

”لیکن ہم کہاں جا رہے ہیں؟“
 ”جو میں نے کہا ہے وہ کرو۔“ اس نے تیز آواز میں کہا۔ گراہم کو ڈبئی کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات اچھے نہیں لگے۔ ”بہتر ہے کہ وہی کرو جو تمہارے پاس ہے۔“ وہ فرماتے ہوئے بولا۔ ”شاید مجھے سے

کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔“
 ”لیکن میں پاس کو وہ سب چیزیں دکھانا چاہتی ہوں جو تم میرے لیے لائے ہو۔“
 وہ چلائے ہوئے بولی۔

اس نے اپنا بازو پھیرا اور ڈبئی کے روکنے کے باوجود کمرے سے چلی گئی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو گھورا اور بیٹی کے قدموں کی آواز سننے رہے جو بیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

”میں نے عہد کیا تھا کہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“
 ڈبئی نے کہا۔ ”مجھے تین دن پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ تم نے بیٹی کو کہاں رکھا ہے لیکن مجھے جیل سے فرار ہونے کا موقع آج ملا۔“
 گراہم فرماتے ہوئے بولا۔ ”مجھے چاہیے تھا کہ تمہیں گرفتار کرنے کے بجائے اسی وقت شوٹ کر دیتا۔“
 ”تمہارے پاس موقع تھا پھر اس سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا؟“

گراہم.... ناک چڑھاتے ہوئے بولا۔ ”تم اس بچی کے ساتھ کیا کرو گے؟“

”اسے تمہاری دسترس سے دور لے جاؤں گا۔“
 گراہم کچھ دیر توقف کرنے کے بعد بولا۔ ”میں جانتا تھا کہ تم ایک قاتل ہو پھر بیٹی نے مجھے بتایا کہ تم اسے کتنا چاہتے ہو اور ہمیشہ اسے وقت دینے کا وعدہ کرتے رہے تب میں نے سوچا کہ شاید میں غلطی پر ہوں۔ ممکن ہے کہ اس کڑواہٹ کے پیچھے شائستگی چھپی ہوئی ہو۔ بہر حال تم اس کے باپ ہو اور جب تم نے اخبارات کو یہ نہیں بتایا کہ بیٹی میرے پاس ہے تو میں نے سوچا کہ تم نے اس کی محبت میں ایسا نہیں کیا لیکن میں غلطی پر تھا۔ تم محض ایک قاتل ہو۔“
 ڈبئی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ”تم نے اسے میرے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا؟“

”نہیں۔“ ابھی تک تو کچھ نہیں بتایا۔“
 بیٹی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے بہت خوب صورت لباس پہن رکھا تھا۔ وہ دونوں اپنی گفتگو روک کر اسے دیکھنے لگے۔

”دیکھو پاپا! یہ کتنا خوب صورت لباس ہے۔ یہ ہائیک نے میرے لیے خریدا ہے۔ پاپا! کیا ہم یہاں نہیں رہ سکتے؟“ پھر وہ گراہم کی طرف گھومتے ہوئے بولی۔ ”کیا یہ اچھا نہیں ہوگا۔ اگر پاس یہاں رک جائیں؟“

ڈبئی نے غصے سے کہا۔ ”یہاں سے نکلو اور کار میں جا کر بیٹھو۔ ہمیں جلدی یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ جلدی کرو۔“
 اس کی آنکھیں میچک گئیں اور وہ بھرائی ہوئی آواز

میں بولی۔ ”لیکن پاپا ہم ہمیشہ ہی جلدی میں جگہ بدلنے رہتے ہیں۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ ایک دن ہمارا اپنا گھر ہوگا اور میں تم کا پال سکوں گی۔ میں اس جگہ کو چھوڑنا نہیں چاہتی اور اگر ہم یہاں سے دور چلے گئے تو میں ہائیک سے کبھی نہیں مل سکوں گی۔“

گراہم نے اپنی آنکھیں ڈبئی کے چہرے پر جمائیں۔ اس نے بیٹی سے کہا۔

”تمہارے ڈیڈی کا کام ہی ایسا ہے کہ وہ کسی ایک جگہ زیادہ دیر نہیں رہ سکتا۔“

”لیکن میں یہاں بہت اچھا محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے مسوون اور ویلس سے محبت ہوگئی ہے اور ہائیک کا کہنا ہے کہ میں سڑک پار کر کے اسکول جا سکتی ہوں اور دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل سکتی ہوں۔“

اس کی باتیں جاری تھیں کہ گراہم کی نظر ڈبئی کی گن پر پڑی جو اس نے بے دھیانی میں نیچے کر لی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ڈبئی کے چہرے سے دھشت اور نفرت غائب ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ مایوسی اور اضطراب نے لے لی تھی۔ گراہم نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی! تم اوپر جا کر نیلا لباس پہنو اور بالوں میں بھی کچھ لگائی کرو۔“

اس کے جانے کے بعد ڈبئی نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتی۔“

گراہم نے نفی میں سر ہلا دیا۔ گراہم اپنا چہرہ پوچھتے ہوئے بولا۔ ”میں نہیں جانتا کہ تمہیں قتل کیوں نہیں کیا۔ حالانکہ میں یہ ارادہ کر کے آیا تھا۔ مجھے تمہاری ہر بات سے نفرت ہے۔“

”شاید میں نے بھی اسی وجہ سے تمہیں نہیں مارا۔“
 ڈبئی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یہ بچی میرے لیے سب کچھ ہے۔ ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔“

گراہم سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”تم کہیں نہیں جا سکتے۔ تم نے کئی کئی بار کہاں کہاں تھلاؤں کر کے ہی رہیں گے۔ تم اس بچی کو لے کر کہیں بھی چلے جاؤ لیکن جب ہم تمہیں پکڑ لیں گے تو بیٹی کو ایک جرم کی بیٹی ہونے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔“

ڈبئی اپنے ہونٹ ترکرتے ہوئے بولا۔ ”میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں لیکن اسے تم اس کی پرورش مجھ سے اچھی کر سکو۔ تم اسے اپنے پاس رکھ لو اور مجھے جانے دو۔“
 ”میں پولیس آفیسر ہوں ڈبئی اور تم سے کوئی سودا نہیں

کر سکتا۔ جیسے ہی تم باہر نکلو گے، میں تمہارا پیچھا کروں گا۔“
 ”تم مجھے صرف آدھا گھنٹا دے دو۔ بیٹی کی خاطر۔“
 ”آدھے گھنٹے میں تم کسی محفوظ جگہ تک نہیں پہنچ سکو گے۔“

ڈبئی کا چہرہ زرد ہو چکا تھا۔ ”میں بہت تیز گاڑی چلاتا ہوں آدھے گھنٹے میں بہت دور نکل جاؤں گا۔“

گراہم نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ صرف آدھا گھنٹا۔ اس کے بعد میں تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔“

ڈبئی نے سیز جیوں کی طرف دیکھا اور اس نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ گراہم نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی اور سگریٹ سلگا لیا۔ بیٹی جب نیچے آئی تو باپ کو نہ دیکھ کر رونے لگی۔ گراہم نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور پیار سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”بیٹی! تمہارے ڈیڈی کو ایک لمبے سفر پر جانا تھا۔ وہ تمہیں بہت پیار کرتے ہیں لیکن ان کا جانا بھی ضروری تھا۔ ممکن ہے کہ کسی دن تمہاری ان سے پھر ملاقات ہو جائے۔“

”اب میں ان سے کب مل سکوں گی ہائیک؟“
 ”تمہیں اس دن کا انتظار کرنا ہوگا۔“

وہ تجوڑی دیر اس کے کندھے سے لگ کر دوڑتی رہی پھر اسے نیند آ گئی۔ گراہم نے گھڑی دیکھی۔ آدھا گھنٹا ختم ہونے والا تھا۔ اسی وقت مسز ویلس اندر داخل ہوئی اور معذرت کرتے ہوئے بولی۔ ”معاف کرنا۔ مجھے آنے میں دیر ہوگئی۔ کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑا حادثہ پیش آیا ہے۔ ایک کار بہت تیزی سے جا رہی تھی کہ چٹان سے ٹکرا کر الٹ گئی۔ اس میں ایک ہی آدمی تھا۔ وہ موقع پر ہی مر گیا۔“

”وہ واقعی بہت خطرناک موڑ ہے۔“ گراہم نے آہستہ سے کہا اور بیٹی کو گود میں اٹھا کر اس کے کمرے میں لے گیا۔

مسز ویلس کچن کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے بیٹی کو محفوظ اور مطمئن دیکھ کر بہت سکون ہوا ہے۔“

گراہم غصہ سے سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”ہاں اب وہ واقعی محفوظ اور مطمئن ہے۔“ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے گراہم کو آدھے گھنٹے کی مہلت دے کر کوئی گھائے کا سودا نہیں کیا تھا۔



آوازِ حق

سرزا امجد بیگ

جب صبر اور قناعت کی جگہ ہوس اور زریں سستی لے لے تو انسان کو زندگی شیب و فراز کے دائرے میں سفر کرتے ہوئے ایک ایسے دورِ آپ پر لا کھڑا کر دیتی ہے جہاں سوچ کی کئی سمتیں اسے الجھا دیتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی منظر عدالت کا یہ کمرہ بھی پیش کر رہا تھا جہاں بیگ صاحب ایک ایسی ہی جان بوجھ کر کی جانے والی غلطی کو سدھارنے کی کوشش کرتے نظر آ رہے ہیں۔ وہ اپنی موجودہ پوزیشن سے مطمئن نہ تھا اور خیالات کی بلند پروازی اسے بہت اونچی آڑان بھی نہ رہی تھی کہ اچانک ایک ہی قلابازی نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔۔۔ قسمت اچھی تھی کہ سدھالنے والے ہاتھ موجود تھے وگرنہ ہر ایک کو ایسی مسیحائی میسر نہیں آتی۔

بیرون ملک جا کر روزگار کے خواہش مند لوگوں

کے لیے ایک عبرت اثر واقعہ

ممکن ہے، سویش سے دو چار دیگر ونگ ایجنٹ ایمان دار، سچے اور کھرے بھی ہوں۔ وہ اپنی زبان کا پاس کرتے ہوں اور اپنے کلائنٹ کو کوئی چکما دیے بغیر معینہ مدت میں وہ اسے بیرون ملک بھجوا دیتے ہوں مگر ایسی خوشخبریاں بہت کم سننے اور دیکھنے میں آئی ہیں۔ زیادہ تر دیگر ونگ ایجنٹس کے بارے میں ہمارے معاشرے کے خاص و عام کی رائے یہی ہے کہ یہ لوگ جھوٹے اور دھوکے باز درجہ اول ہوتے ہیں۔ اپنی چھ دار باتوں سے یہ کلائنٹ کے دماغ کو اس طرح شگفتے میں لے لیتے ہیں کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھند ہو کر رہ جاتی ہے۔ جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو سب کچھ لٹ چکا ہوتا ہے۔

اس تمہید کے بعد میں اس واقعے کی طرف آتا ہوں۔ وہ موسم سرما کے ابتدائی دن تھے۔ کراچی کے ہا ہی موسم سرما کی حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ یہاں پر جاڑا صرف

کاروبار کوئی بھی ہو، اس کے معاملات کو چلانے کے لیے صاف گوئی کے ساتھ بہر حال کسی حد تک غلط بیانی کا عنصر بھی شامل کرنا پڑتا ہے، چاہے اسے مصلحت کا نام دے کر خود کو مطمئن کر لیا جائے یا کاندھے اچکا کر خاموش اختیار کر لی جائے، اس سے حقیقت بدل نہیں جاتی۔ اگر سچ میں جھوٹ کا تناسب ”آٹے میں نمک“ کے اصول کا آئینہ دار ہو تب معاملہ گزیر نہیں ہوتا اور کاروبار اپنی مخصوص رفتار سے خوش اسلوبی کے ساتھ آگے بڑھتا رہتا ہے لیکن اگر کوئی بھی کاروباری شخص اس اصول کو توڑ کر نمک میں آٹا ڈالنے کی روش پر چلے تو ایسی آمیزش سے معاملات کا توازن برقرار نہیں رہتا۔ نتیجے کے طور پر ذائقہ تیزی سے کڑواہٹ کی جانب بڑھتے ہوئے فریٹین کے بیج تھیلوں کی شکل کو حاصل کر دیتا ہے۔ یہ دیگر ونگ کا برنس بھی کچھ اسی نوعیت کا ہے!

جھک دکھانے کے لیے آتا ہے۔ "چار دن کی چاندنی، پھر اندھیری رات" کے مصداق "چار دن کی سردی، پھر وہی گرمی" والا معاملہ ہے کراچی کے موسم سرما کا۔

بارہ نومبر کی ایک سہ پہر میں اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔ ان دنوں رات میں بلی کی ٹنگی نفاشیں اتر آتی تھیں تاہم دن میں ابھی ان کے نثر کا استعمال جاری تھا۔ میں حسب معمول اپنے کام میں مصروف تھا کہ ایک خاتون اور ایک مرد مجھ سے ملنے آگئے۔ عورت کی عمر پینتیس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد اور متناسب بدن کی مالک ایک خوش شکل عورت تھی۔ اس کے ساتھ میری عمر کا اندازہ میں نے تیس اور چالیس کے درمیان لگایا۔ وہ ایک دبلا پتلا اکبر سے جسم کا مالک شخص تھا اور اس نے بلی کی ٹنگی ڈانسی بھی رہی ہوئی تھی۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لیے کہا۔ جب وہ دونوں میری میز کی دوسری جانب رکھی کرسیوں پر براجمان ہو چکے تو میں نے سوالیہ نظر سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی فرمائیں..... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"وکیل صاحب! ان کا نام صائمہ ہے۔" ڈانسی والے مرد نے اپنی ساتھی عورت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک مصیبت میں پھنس گئی ہیں۔ انہیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

میں نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے اس شخص سے پوچھا۔ "آپ کی تعریف.....؟"

"میرا نام سلطان شاہ ہے۔" اس نے بتایا۔ "میں ان کا محلے دار ہوں۔ انسانی ہمدردی کے ناطے ان کے ساتھ آگیا ہوں۔ آپ ان کی پٹان سن لیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔"

"میں یہاں پر اپنے موکلات کی دیکھ بھری کہانیاں سننے کے لیے ہی بیٹھا ہوں۔" میں نے براہ راست صائمہ کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ بتائیں، مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ نوید کا ہے وکیل صاحب۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں اس کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔"

"پریشانی کی نوعیت کیا ہے؟" میں نے روف پیڑ پر قلم چلاتے ہوئے کہا۔ "اور اس سے بھی پہلے یہ بتائیں کہ نوید کون ہے.....؟"

"نوید میرا شوہر ہے وکیل صاحب۔" صائمہ نے بتایا۔ "اس کا پورا نام نوید باری ہے اور ہماری پریشانی یہ

ہے کہ ایک ایجنٹ نے دو سال سے ہمیں عجیب و غریب چکر میں ڈال رکھا ہے۔"

"کوئی ایجنٹ ایجنٹ؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "کوئی پراپرٹی ڈیولپر.....؟"

"نہیں وکیل صاحب۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں ویز ایجنٹ کی بات کر رہی ہوں۔"

"اوہ اچھا..... ریکروٹنگ ایجنٹ۔" میں نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

"جی جی..... دی۔" وہ جلدی سے بولی۔

"کیا چکر دے رکھا ہے اس ایجنٹ نے آپ لوگوں کو؟"

میں نے استفسار کیا۔

"بات دراصل یہ ہے جناب کہ....." صائمہ کے بجائے سلطان شاہ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔ "دو سال پہلے ایک ایجنٹ کے ذریعے نوید نے آسٹریلیا جانے کی کوشش کی تھی۔ اس سلسلے میں نوید نے اس ایجنٹ کو کچھ رقم ایڈوانس میں بھی دے دی تھی لیکن دو سال گزر جانے کے باوجود بھی اس ایجنٹ نے ابھی تک نوید کو آسٹریلیا نہیں بھجوا دیا۔ وہ ہر روز کوئی نئی کہانی بنا کر نوید کو مطمئن کر دیتا ہے۔ صائمہ صاحبہ یہ چاہتی ہیں کہ آپ قانونی چارہ جوئی کر کے انہیں ایجنٹ سے وہ رقم واپس دلادیں جو انہوں نے ایڈوانس میں اسے دے رکھی ہے۔"

"باقی باتیں بعد میں۔" میں نے قلم کو پیڑ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "پہلے مجھے یہ بتائیں کہ نوید باری کہاں ہے؟"

"وہ اس وقت اپنی دکان پر ہے۔" صائمہ نے بتایا۔ "اسے پتا نہیں کہ میں کسی دیکل کے پاس گئی ہوں۔"

"کیا آپ نے دانستہ یہ بات اپنے شوہر سے چھپائی ہے؟" میں نے نونٹے والی نظر سے صائمہ کی طرف دیکھا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "جی۔"

"اس کا کوئی خاص سبب؟"

"اگر میں یہ بات نوید کے علم میں لے آتی تو وہ مجھے آتے نہیں دیتا۔" صائمہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "وہ ایجنٹ پر بہت بھروسہ کرتا ہے اور اس کے خلاف کسی بھی قسم کی کارروائی کے حق میں نہیں ہے۔ اسے ابھی تک یہی یقین ہے کہ وہ ایجنٹ اسے نہیں نہیں ضرور بھجوا دے گا۔"

"میں اسی لیے ان کے ساتھ آپ کے پاس آیا ہوں کہ نوید ایسی کسی بھی کوشش کے خلاف ہے۔" سلطان شاہ نے اپنی پوزیشن کلیئر کرتے ہوئے کہا۔ "صائمہ بھائی نے مجھ سے درخواست کی اور میں انسانی ہمدردی کے ناطے

یہاں چلا آیا۔"

"شاہ جی! میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔" نوید نے سانس کی نظر سے سلطان شاہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس معاملے میں ایک سنگی خرابی ہے.....!"

"کیسی خرابی وکیل صاحب؟" وہ ابھرن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے سلطان شاہ سے پوچھا۔ "نوید نے آسٹریلیا جانے کے لیے اس ایجنٹ کے ساتھ کتنے میں معاملہ طے کیا تھا؟"

"تین لاکھ کی بات ہوئی تھی۔" اس نے بتایا۔ "ایک لاکھ ایڈوانس اور باقی کے دو لاکھ ویز الگ جانے پر۔"

یہ واقعہ آج سے تیس تیس سال پہلے کا ہے۔ آج کل اس نوعیت کے کام کے ریٹ بہت ہائی ہیں۔ میں نے سلطان شاہ سے دریافت کیا۔

"کیا یہ ایڈوانس والی ایک لاکھ کی رقم آپ نے ایجنٹ کو دی تھی؟"

"نہیں جناب۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"آپ نے.....؟" میں نے معنی خیز انداز میں صائمہ کی طرف دیکھا۔

وہ میرے سوال کی تہ میں اترتے ہوئے بولی۔

"میں وکیل صاحب! رقم تو خود نوید نے ایجنٹ کو دی تھی۔"

"اور آپ کے شوہر یعنی نوید باری رقم کی واپسی کر لیے ایجنٹ کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں؟" میں نے تھمہ بلی طلب انداز میں کہا۔

"جی..... ایسی ہی بات ہے۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر آپ دونوں کی یہاں آمد بے سود ہے۔" میں نے صاف کوئی کام مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا جناب؟" سلطان شاہ نے ابھرن زدہ انداز میں پوچھا۔

"یہ معاملہ دراصل نوید باری اور اس... ریکروٹنگ ایجنٹ کے بیچ ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "لہذا آپ دونوں غیر متعلقہ افراد ہیں۔ اس کہانی میں نوید کا کردار ایک مدعی ایسا ہے۔ جب تک وہ رقم کی واپسی کے لیے رضامند نہیں ہوگا، کوئی کام نہیں کر سکتا۔ نہ پولیس اور نہ کورٹ چھری.....!"

"میں نوید کو رضی کر لوں گی۔" صائمہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "آپ بس میری کہانی سن لیں اور مجھے بالکل صاف صاف بتادیں کہ کیا آپ قانونی چارہ جوئی

کر کے اس ویز ایجنٹ سے ہماری رقم واپس دلوا سکتے ہیں!"

"میں آپ کی کہانی ضرور سنوں گا اور پوری توجہ سے سنوں گا۔" میں نے صائمہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "اور اس بات کا فیصلہ کہانی کے اختتام پر کیا جائے گا کہ میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی قانونی مدد کر سکتا ہوں یا نہیں لیکن ایک بات طے ہے کہ اگر میں یہ کیس لوں گا تو آپ کو میری فیس کے علاوہ تمام دیگر عدالتی اخراجات بھی برداشت کرنا ہوں گے!"

"مجھے منظور ہے۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

میں نے اسے اپنی فیس کی رقم کے بارے میں بتایا اور کہا۔ "میں فیس ایڈوانس میں لیتا ہوں۔"

"یہ بھی منظور ہے وکیل صاحب۔" وہ پرامتداد انداز میں بولی۔

اس کے بعد صائمہ نے مجھے اس معاملے کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔ کہانی تو خاصی طویل ہے لیکن میں اس میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے واقف ہو جائیں۔ ایک امر کی وضاحت کر دوں کہ اس داستان میں سے بعض باتیں میں نے دانستہ چھپائی ہیں۔ ان کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر کیا جائے گا تاکہ کہانی میں جیس کا عنصر برقرار رہے۔

☆☆☆

نوید باری کی رہائش کراچی کے ایک علاقے "اعظم بستی" میں تھی۔ کسی زمانے میں یہ علاقہ خاصا مہماندہ ہوا کرتا تھا، اسی لیے اس محلے کے نام کے ساتھ "بستی" کا لفظ لگا ہوا ہے۔ موجودہ زمانے میں بھی اعظم بستی کوئی ماڈرن علاقہ نہیں بن گیا تاہم میں اور اب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جیسا کہ آپ کو پتا چل چکا کہ صائمہ، نوید کی بیوی تھی۔ ان کی ایک چار سال کی بیٹی بھی تھی جس کا نام فرزانہ تھا۔ ان کی شادی کو چھ سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ نوید کی محمود آباد کے مین بازار میں کپڑے کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ کام ٹھیک ٹھاک تھا لیکن انسان کی فطرت میں ناشکرے پن کی بھی کوئی کمی نہیں۔ قدرت انسان کو چاہے کتنا بھی نواز دے وہ بھری شکریاں ادا نہیں کرتا۔ اگر وہ کسی حد تک شکر ادا کرتا بھی ہے تو ساتھ ہی مزید کا خواہاں بھی ہوتا ہے۔ یہی معاملہ نوید کے ساتھ بھی تھا۔ وہ اتنا کہ لیتا تھا کہ اس کی مختصر سی فیملی کا بڑا ٹھیک ٹھاک گزارہ ہو جاتا تھا لیکن اس کے سر پر ملک سے باہر جانے کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ یہ ایک

ایسا دماغی کیزا ہے کہ جس نے بہت سے خاندانوں کو سپرد عذاب کیا ہوا ہے!

نوید کے جاننے والوں میں شاکر نامی ایک شخص تھا۔ شاکر کسی بینک میں کام کرتا تھا۔ مذکورہ بینک کی برانچ لاٹھی کے علاقے میں تھی تاہم اس کی رہائشی آخر کالونی میں تھی۔ نوید کی اکثر شاکر سے ملاقات ہوا جاتی تھی کیونکہ آخر کالونی اور اعظم ہسپتال ایک دوسرے کے پڑوسی تھے ہیں اور کچھ بتائیں چلتا، کب ایک ختم ہوا اور کب دوسرا شروع ہو گیا۔

شاکر کو بیرون ملک کی خاصی معلومات تھیں۔ ان کی جب بھی ملاقات ہوتی تو زیادہ تر اسی موضوع پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ شاکر نے نوید کو بتا دیا تھا کہ اس کا ایک جاننے والا لوگوں کو ملک سے باہر بھجوانے کا کام کرتا ہے۔ ایک روز نوید نے شاکر سے کہا۔

”یار! مجھے اس بندے سے تو ملوؤ..... وہ جو ویزا لگوا کر دیتا ہے۔“

”کیا تم بھی ملک سے باہر جانا چاہتے ہو؟“ شاکر نے پوچھا۔

”ہاں یار.....“ وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے ناشکرے پن سے بولا۔ ”یہاں کیا رکھا ہے۔ میں بھی ملک سے باہر جا کر دولت کمانا چاہتا ہوں۔“

”نوید! میں تمہیں اس بندے سے ملواتو دوں گا۔“ شاکر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس کے بارے میں چند باتیں میں تمہیں پہلے ہی بتا دیتا ہوں۔“

”کون سی باتیں؟“ نوید بہت خوش ہو گیا۔

”نمبر ایک: وہ بندہ بہت اطمینان سے کام کرتا ہے۔“ شاکر نے بتایا۔ ”اس لیے تم جلدی کی کوشش نہیں کرتا۔ اگر کام میں ویر ہو رہی ہوگی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کام پکا ہو رہا ہے۔ اگر تمہارے اندر صبر کا مادہ ہے تو اس کام میں ہاتھ ڈالو ورنہ کوئی فائدہ نہیں ہے خواہ وہ اپنا خون جلانے کا اور دوسرے کا وقت ضائع کرنے کا۔“

”میں انتظار کروں گا۔“ نوید نے جذبات سے منسوب آواز میں کہا۔ ”وہ بندہ جتنے دن بھی کہے گا، میں برداشت کروں گا۔ میرے اندر بڑا صبر ہے۔ بس، کام پکا ہونا چاہیے۔“

”ایک دم لو بلاٹ کام ہوگا۔“ شاکر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اس کی تو تم نگہری نہ کرو۔“

”تو ٹھیک ہے.....“ نوید نے اظہاری انداز میں

استفسار کیا۔ ”پھر کب ملو اور ہو مجھے اس بندے سے؟“

”تم جب کہو گے، ملوادوں گا یار، یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ شاکر بے پروائی سے بولا۔ ”ابھی تو میں تمہیں اس بندے کے بارے میں بتا رہا تھا.....“

”ہاں ہاں..... بتاؤ۔“ نوید تھوڑا سا آگے جھکتے ہوئے بولا۔

”یہ تو ہو گیا کہ وہ بندہ بہت دیکھ بھال کر پورے اطمینان کے ساتھ کام کرتا ہے۔“ شاکر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اس کے علاوہ کچھ مزید دلائل میں بھی لیتا ہے.....“

”مثنیٰ رقم؟“ شاکر کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی نوید نے سوال دار دیا۔

”یہ تو مجھے نہیں پتا۔“ شاکر سادگی سے بولا۔ ”اس بارے میں تمہیں شیر بھائی ہی بتائیں گے۔“

”شیر بھائی.....“ نوید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ کون صاحب ہیں؟“

”ارے یار! میں اسی بندے کی بات کر رہا ہوں۔“ شاکر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس کا نام شیر ہے۔ شیر افضل!“

”ٹھیک ہے۔ تم مجھے شیر افضل سے ملوادو۔“ نوید نے کہا۔ ”باقی باتیں میں خود ہی اس سے پوچھ لوں گا۔“

”ایک بات ذہن میں رکھنا نوید۔“ شاکر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں شیر افضل سے ضرور ملوادوں گا لیکن اس کے ساتھ سارے معاملات تم خود ہی طے کرو گے، خاص طور پر رقم کا لین دین۔ میں کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں گا۔“

”ٹھیک ہے!“ نوید نے اہم و بھرے لہجے میں کہا۔ ”بس، مجھے اتنا بتا دو کہ وہ بندہ توجہ ہے؟“

”ایک دم صحیح ہے۔“ شاکر نے ٹھوس الفاظ میں کہا۔ ”میں اس کے کام سے مطمئن ہوں۔ میں کئی ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنہیں شیر افضل نے ملک سے باہر بھجوا دیا ہے اور وہ وہاں سے کما کر نہیں اپنے بیوی بچوں کو بچھ رہے ہیں۔“

شاکر کی وضاحت نے نوید کو مطمئن کر دیا۔ چند روز کے بعد وہ تینوں کالوں کے نزدیک چائے کے ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے یعنی نوید، شاکر اور شیر افضل۔ شیر افضل کی شخصیت نے نوید کو بڑا ٹھیک ٹھاک متاثر کیا تھا۔ شاکر انہیں ایک دوسرے سے متعارف کرانے کے بعد کسی ضروری کام کا بہانہ کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ اب نوید اور شیر افضل ایک دوسرے کے روبرو تھے۔

شیر افضل کا پہناؤ اور رکھ رکھاؤ شاندار تھا۔ اس زمانے میں سیل فون کا کوئی وجود نہیں ہوتا تھا۔ کسی انسان کی حیثیت کو چیک کرنے کے لیے اس کی گھڑی اور لباس کو سب سے پہلے دیکھا جاتا تھا۔ شیر افضل کی گھڑی پر سنہری کیس اور سنہری چین والی ایک تھنی گھڑی موجود تھی اور اس نے جدید تراش کا ایک بیش قیمت لباس زیب تن کر رکھا تھا جس پر اس نے اعلیٰ درجے کی بریفیم بھی اچھڑائی تھی۔

گفتگو کے آغاز میں شیر افضل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”نوید صاحب! پہلے میں آپ سے چند سوالات کروں گا۔ اس کے بعد آپ کا جوبل چاہے، پوچھ لیجیے گا۔ آپ کا پاسپورٹ تو بنا ہوا ہے؟“

”جی ہاں! میں نے پچھلے سال ہی بنوایا ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی آپ کے پاسپورٹ کو چار سال تک استعمال کیا جاسکتا ہے۔“ شیر افضل سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا پھر پوچھا۔ ”آپ نے اس پاسپورٹ پر بیرون ملک کوئی سفر کیا ہے؟“

”جی نہیں!“ نوید نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”ٹریول ہسٹری بالکل نہیں ہے۔“ شیر افضل نے کہا۔ ”پاسپورٹ کورا ہے.....!“

”اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟“ نوید باری نے انہیں زرد انداز میں پوچھا۔

”اگر ویزا دینا چاہیے ہو تو فرق پڑتا ہے۔“ شیر افضل نے بتایا۔ ”ایمپلائی منٹ ویزا پر نہیں لہذا آپ کو کٹر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”میں تو ویزا کی اقسام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب۔“ نوید سادگی سے بولا۔ ”بس میری یہ خواہش ہے کہ میں پاکستان سے باہر جا کر محنت کروں اور اپنے بیوی بچوں کے لیے زیادہ سے زیادہ روزی کما سکوں۔“

”محنت مزدوری کرنا اور روزی کمانے..... کا تعلق ایمپلائی منٹ سے ہے۔“ شیر افضل نے کہا۔ ”لہذا آپ کو ایمپلائی منٹ ویزا چاہیے ہوگا یعنی دوک پر مٹ دلا دینا۔“

”دونوں ویزا میں بنیادی طور پر کیا فرق ہے؟“ نوید نے استفسار کیا۔

”ویزٹ ویزا پر آپ سیر و تفریح کے لیے کسی بھی ملک جاتے ہیں اور ویزا کی مدت ختم ہونے سے پہلے آپ کو واپس آنا ہوتا ہے یعنی آپ اس ملک میں طویل قیام نہیں کر سکتے اور یہ مدت عموماً پندرہ دن یا ایک ماہ یا تین ماہ یا چھ ماہ ہوتی ہے۔ علاوہ ان میں اس مختصر قیام کے دوران میں آپ

وہاں ملازمت بھی نہیں کر سکتے۔“ شیر افضل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جبکہ ایمپلائی منٹ ویزا پر آپ وہاں کی کسی کمپنی سے جاب کنٹریکٹ کر کے جاتے ہیں لہذا آپ وہاں قانوناً قیام بھی کر سکتے ہیں اور نوکری بھی اور یہ کنٹریکٹ عموماً ایک سال یا دو سال یا تین سال کا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ.....“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”ویزٹ ویزا کے لیے آپ کے پاسپورٹ کی ویلٹیٹیٹی کم از کم تین ماہ اور ایمپلائی منٹ ویزا کے لیے کم از کم دو سال ہونا لازمی ہے۔“

”میں تو روزگار کے سلسلے میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔“ نوید باری نے کہا۔ ”لہذا آپ مجھے ایمپلائی منٹ ویزا پر ہی بھیجیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ”ایک بات ذہن میں رہنے کہ ایمپلائی منٹ ویزا کا پروسس خاصا طویل ہے۔ اس کے لیے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ ویزٹ ویزا تو زیادہ سے زیادہ دو ماہ میں لگ جاتا ہے جبکہ ایمپلائی منٹ ویزا کے لیے کم از کم آٹھ نو ماہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔“

”میں انتظار کروں گا۔“ نوید نے اظہاری انداز میں کہا۔ ”مگر کام پکا ہونا چاہیے۔“

”میں بیکے کام ہی کرتا ہوں نوید صاحب اسی لیے نام لگتا ہے۔“ شیر افضل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ورنہ اگر لوگوں کے پیسے کھا کر بھاگتا ہو تو کوئی بھی آسرا دیا جاتا ہے۔ اب آپ یہ بتا دیں کہ کس ملک میں جانا چاہتے ہیں؟“

”آپ کہاں کہاں بھجواتے ہیں؟“ نوید نے پوچھا۔ ”میرے پاس تو ہر ملک کا کام ہے۔ آپ جہاں کہیں گے، میں پہنچا دوں گا۔“ شیر افضل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ اپنی پسند بتائیں۔“

”یہ فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔“ نوید نے کہا۔ ”بس کوئی ایسی جگہ ہو جہاں کام آسانی سے مل جائے اور تنخواہ اچھی ہو۔“

”آپ اس وقت کیا کام کر رہے ہیں۔“ شیر افضل نے پوچھا۔ ”اور ایک ماہ میں کتنا کما لیتے ہیں؟“

”محمود آباد کے مین بازار میں میری کپڑے کی دکان ہے۔“ نوید نے بتایا۔ ”اور میں تقریباً پانچ سے سات ہزار روپے ماہانہ کما لیتا ہوں۔“

”ہوں.....“ شیر افضل نے سوچ میں ڈوبے ہوئے

جہانگیر بکس

450/-	انسان اور دنیا	475/-	معظم علی	550/-	آخری معرکہ	550/-	اورنگزیب عالمگیر
300/-	پاکستان سے واپس آنا	550/-	خاک اور خون	550/-	اندھیری رات کے مسافر	300/-	اشفاق علی
450/-	آخری چٹان	599/-	قافلہ تجار	475/-	ثقافت کی تلاش	300/-	سفر و سیاحت
225/-	سوسال بعد	425/-	محمد بن قاسم	625/-	قیصر و کسریٰ	500/-	یوسف بن تاشفین
325/-	سفید جزیرہ	300/-	پورس کے ہاتھی				
475/-	شاہین						

سبق آموز کتب سلسلہ

165/-	اقوال حضرت علی المرتضیٰ	165/-	اقوال امیر کرام	195/-	حکایات گلستان سعدی	140/-	اقوال شمس سعدی	180/-	حکایات رومی	170/-	دلچسپ و عجیب حقائق	165/-	حکایات بوستان سعدی
150/-	دلچسپ و حیرت انگیز باتیں	180/-	ایمان افروز و سبق آموز	165/-	بڑے لوگوں کے روشن واقعات								



ادولفت

(جامعہ ترمذیہ)

مفتی محمد رفیع الرحمن صاحب مدظلہ کے زیر اہتمام و ادارت

جہانگیر بک ڈپو

042-35757086 022-2780128
021-32765086 051-5539609 042-37220879

لجے میں کہا پھر سوال کیا۔ "محنت والا کام کر لیں گے؟"
"بالکل کروں گا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میں محنت سے نہیں گھبراتا۔"

"پھر آپ کے لیے آسٹریلیا سب سے زیادہ مناسب رہے گا۔" شیر افضل سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "آسٹریلیا میں ڈیری فارم کا بہت زیادہ کام ہے جہاں ہر وقت لیبر کی ضرورت رہتی ہے۔"

"ڈیری فارم..... یعنی بھینسوں کا دودھ نکالنا.....؟"
نوید نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں پاکستان کے نہیں، آسٹریلیا کے ڈیری فارمر کی بات کر رہا ہوں۔" شیر افضل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"وہاں کے ڈیری فارمر میں گائے بھینس کا دودھ نکالنے کے علاوہ کئی، بھینس، چنیر اور ملائی وغیرہ کے پروڈس کے پائپس بھی لگے ہوتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہاں گائے بھینس کا دودھ بھی یہاں کی طرح ہاتھ سے نہیں نکالا جاتا بلکہ اس کام کے لیے باقاعدہ مشینوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ترقی یافتہ اور مہذب ممالک میں زیادہ محنت اور مشقت کا کام

مشینیں کرتی ہیں اور انسان ان مشینوں کو آپریٹ کرتے ہیں اور آپ کو ڈیری فارم کے جس بھی شعبے میں لگا یا جائے گا پہلے اس کام کی آپ کو ٹریننگ دی جائے گی۔"

"پھر ٹھیک ہے۔ آپ مجھے آسٹریلیا بھی بھیج دیں۔"
نوید باری اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

"میں تیار ہوں۔"

"آپ مجھے اپنے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی دے دیں۔" شیر افضل نے کہا۔ "میں آپ کا پروڈس شروع کروا دیتا ہوں۔"

نوید باری پاسپورٹ اور شناختی کارڈ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا اور ان کی فوٹو کاپی بھی کروا کر رکھی تھی۔ شیر افضل کی مطلوبہ چیزیں اس کے حوالے کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ آسٹریلیا میں مجھے ماہانہ کتنی تنخواہ مل جائے گی؟"

"آپ کے تصور سے بھی بہت زیادہ۔" شیر افضل نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

نوید باری کا دل جھل کر رہ گیا۔ وہ اضطرابی لہجے میں مستفسر ہوا۔ "پھر بھی..... کچھ بتائیں تو ہوں.....؟"

"میرے محتاط انداز سے کے مطابق آسٹریلیا کے کسی ڈیری فارم میں آپ کو ماہانہ پندرہ ڈالر فی گھنٹہ کی نوکری مل جائے گی۔" شیر افضل اسے تفصیلات سے آگاہ

کرتے ہوئے بولا۔ "مختے میں بیٹھائیں گئے آپ کو کام کرنا ہوگا یعنی فی ہفتہ چھ سو پچھتر ڈالر کمائیں گے اور اگر آپ ماہانہ آمدنی کا حساب لگا جائے تو چار ہفتوں کی کمائی دو ہزار سات سو ڈالر بنے گی۔"

"آپ مجھے پاکستانی کرنسی میں بتائیں.....!" نوید دے دے جوش کے ساتھ بولا۔

"میں نے ابھی آپ کو جو حساب بتایا ہے اس میں انیس بیس کا فرق آسکتا ہے۔" شیر افضل گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اور یہ ضروری آسٹریلیا میں ڈالر کے مطابق ہے۔ اس وقت آسٹریلیا میں ڈالر پاکستان کے ساڑھے دس روپے کے برابر چل رہا ہے۔ اگر آپ پاکستان کی آمدنی لگانا چاہتے ہیں تو دو ہزار سات سو آسٹریلیا میں ڈالر دو سو ساڑھے دس روپے ہیں۔ اس طرح یہ رقم اٹھائیس ہزار تین سو پچاس روپے بنتی ہے۔ میرے انداز سے کے مطابق آپ ستائیس ہزار سے تیس ہزار پاکستانی روپے تک بچا سکتی ہیں۔"

یہ جس زمانے کا ذکر ہے اس وقت آسٹریلیا میں ڈالر پاکستان کے ساڑھے دس روپے کے برابر اور امریکی ڈالر پاکستان کے سولہ روپے کے برابر ہوا کرتا تھا۔ آج آسٹریلیا میں ڈالر امریکی ڈالر کے برابر اور امریکی ڈالر امریکی ڈالر کے برابر ہے۔ یہ رقم اٹھائیس ہزار تین سو پچاس روپے بنتی ہے۔ میرے انداز سے کے مطابق آپ ستائیس ہزار سے تیس ہزار پاکستانی روپے تک بچا سکتی ہیں۔"

یہ جس زمانے کا ذکر ہے اس وقت آسٹریلیا میں ڈالر پاکستان کے ساڑھے دس روپے کے برابر اور امریکی ڈالر پاکستان کے سولہ روپے کے برابر ہوا کرتا تھا۔ آج آسٹریلیا میں ڈالر امریکی ڈالر کے برابر اور امریکی ڈالر امریکی ڈالر کے برابر ہے۔ یہ رقم اٹھائیس ہزار تین سو پچاس روپے بنتی ہے۔ میرے انداز سے کے مطابق آپ ستائیس ہزار سے تیس ہزار پاکستانی روپے تک بچا سکتی ہیں۔"

روپے لیتا ہوں۔“ شیر افضل نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”بس دونوں میں موڈ آف پے منٹ کا فرق ہے۔ وزٹ دینا میں، میں ایک لاکھ روپے ایڈوانس لیتا ہوں اور باقی کے دو لاکھ ویزا لے کر۔“

”اور میرے دالے کیس میں.....“ شیر افضل کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی نوید بول اٹھا۔ ”اس سلسلے میں آپ کا کیا اصول ہے؟“

”ایمپلائی منٹ ویزا کے لیے بھی ایک لاکھ روپے ایڈوانس لیتا ہوں۔ باقی کا پروسس بالکل مختلف ہے۔“ شیر افضل اپنے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے بتانے لگا۔ ”سب سے پہلے میں آسٹریلیا کے ایمپلائی منٹ ڈیپارٹمنٹ میں آپ کا کیس جمع کرواؤں گا جس کی رجسٹریشن فیس دو ہزار آسٹریلین ڈالر ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں کے ساتھ میرا خط کتابت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ آسٹریلیا کا ایمپلائی منٹ ڈیپارٹمنٹ آپ کے لیے کسی ڈیری فارم میں جاب نکال کر بھیجے گا کہ اس کے بعد اس ڈیری فارم کی طرف سے آپ کے لیے جاب آفر لیٹر آجائے گا۔ اس جاب آفر لیٹر کے ساتھ آسٹریلیا کے ورک پرمٹ ویزا کے حصول کے لیے وہاں کی امیگریشن میں درخواست دی جائے گی۔ اس تمام تر پروسس میں چار سے چھ ماہ لگ جائیں گے۔ جب آسٹریلین امیگریشن ڈیپارٹمنٹ آپ کے کیس سے مطمئن ہو جائے گا تو وہاں سے آپ کے میڈیکل چیک اپ کا لیٹر آجائے گا۔ اس دوران میں ہر مرحلے پر پیسے خرچ ہوں گے۔“ لہذا تو قوت کر کے شیر افضل نے ایک گہری سانس خارج کی بھر نوید کی عقل سے ماورا پروسس کی تفصیلات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”میڈیکل چیک اپ سب سے اہم اور نازک مرحلہ ہے۔ کسی اچھی شہرت والے اسپتال میں آپ کے مختلف ٹیسٹ کیے جائیں گے جن کی مدد سے یہ جانچا مقصود ہوگا کہ آپ میڈیکل ٹیٹل ہیں اور آپ کے اندر خدا خواست کوئی بڑی بیماری تو نہیں مل رہی۔“

”اور اگر میرے کسی ٹیسٹ میں کوئی بیماری نکل آئی تو۔۔۔؟“ نوید نے فکرمندی سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہوگا لہذا آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ شیر افضل نے بے پروائی سے کہا۔ ”اول تو آپ کے اندر کوئی ایسی بیماری ہے ہی نہیں جس سے دوسرے لوگوں کے لیے خطرہ ہو۔ وہ صرف یہ سلی کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے ملک میں طویل عرصہ گزارنے کے لیے آئے

والا شخص کسی ایسی دہائی یا متحدہ بیماری میں مبتلا نہ ہو جس سے دوسرے لوگوں کے متاثر ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جائے اور یہ فرض محال، خدا خواست اگر آپ کے اندر ایسی کسی بیماری کی نشاندہی ہو بھی گئی تو۔۔۔۔۔“ جیسے کوئی مکمل چھوڑ کر وہ تھوڑا سا آگے جھپک اپنا پھر راز دارانہ انداز میں بولا۔

”میرا نام شیر افضل ہے۔ میں کے کام نہیں کرتا۔ آپ مجھے میری مطلوبہ رقم دے رہے ہیں نا۔ آپ کے مفادات کا تحفظ کرنا میری ذمہ داری ہے۔ اگر آپ کے ٹیسٹ کی کسی رپورٹ میں کوئی گریڈ اب بھی گئی تو میں نوٹ خرچ کر کے سنبھال لوں گا۔ یہاں کے اسپتال سے آسٹریلین امیگریشن ڈیپارٹمنٹ کو جو رپورٹ ارسال کی جائے گی اس کے مطابق آپ سولہ آنے میں بیٹلی فٹ ہوں گے لہذا آپ کو پریشان ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

نوید نے ایک طویل اور اطمینان بھری سانس خارج کی۔ شیر افضل نے جالا کی سے کہا۔ ”جس روز آپ کے میڈیکل چیک اپ کا لیٹر آئے گا اس دن آپ مجھے ایک لاکھ روپے دے اور آخری ایک لاکھ آپ اس وقت دیں گے جب آپ کو ایمپلائی منٹ ویزا جاری کروایا جائے گا۔“

”میڈیکل کے بعد ویزا اٹلے میں کتنا وقت لگے گا؟“ نوید نے پوچھا۔

”ایک سے دو ماہ تک۔“ شیر افضل نے جواب دیا۔

”میڈیکل چیک اپ کی رپورٹ آسٹریلین امیگریشن ڈیپارٹمنٹ میں جائے گی۔ اس رپورٹ سے مطمئن ہونے کے بعد متعلقہ ڈیپارٹمنٹ ”ادکے“ کا لیٹر جاری کر دے گا۔ اس لیٹر کے ساتھ آپ کا پاسپورٹ یہاں کراچی میں متعلقہ جگہ پر جمع کروایا جائے گا۔ یہاں سے آپ کا پاسپورٹ اسلام آباد جائے گا اور ضروری کارروائی کے بعد آپ کو ویزا جاری کروایا جائے گا۔ بس، اس کے بعد آپ کو جہاز چکر کر آسٹریلیا روانہ ہونا ہوگا۔“

شیر افضل نے نوید باری کو اس سلسلے میں مزید کچھ باتیں سمجھائیں۔ اُن کا مقام پر اس نے دروغ گوئی سے بھی کام لیا تھا۔ نوید چونکہ اس نوعیت کے معاملات سے قطعی لاعلم تھا لہذا وہ شیر افضل کی بیان کردہ اسٹوری پر ایمان لے آیا اور اگلے روز اس نے اپنی زندگی کی جمع پونجی میں سے ایک لاکھ روپے نکال کر شیر افضل کے حوالے کر دیے۔ اب اس کی سیونگ میں چند ہزار ہی باقی بچے تھے۔ آپ خود اندازہ لگائیں، آج سے لگ بھگ بیس، پچاس سال پہلے جو شخص چھ سات ہزار روپے ماہانہ کماتا ہوا اس نے سوا، ڈیڑھ لاکھ

روپے کتنی مشکل سے کتنے عرصے میں جمع کیے ہوں گے! شیر افضل نے ایک لاکھ روپے وصول کرتے وقت اپنا ہتھ بھرے لکچہ میں کہا تھا۔ ”نوید صاحب! آپ کے پاس کم دیش چھ ماہ ہیں۔ آپ ابھی سے دوسرے لاکھ کے بندوبست میں لگ جائیں۔ آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا اور یہ چھ ماہ پر لگا کر اڑ جائیں گے۔“

”جی ٹھیک ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔“ نوید نے۔۔۔ بڑا اعتماد لکچہ میں کہا۔ ”میں ادھر ادھر سے پکڑ کر انتظام کروں گا اور اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی تو میں دکان میں موجود مال کو فروخت کر دوں گا۔ اس وقت کم از کم ڈیڑھ لاکھ کا پکڑا میری دکان میں موجود ہے۔ آپ بروکس شروع کریں۔ میں دوسرے اور تیسرے لاکھ کی ادائیگی سلسلے میں آپ کو پریشان نہیں کروں گا۔“

”یہ سودا آپ کے لیے مہنگا ثابت نہیں ہوگا نوید صاحب۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لکچہ میں بولا۔ ”میں آپ سے جو کل تین لاکھ لے رہا ہوں اس میں آپ کی کئی نوکری کے علاوہ جہاز کا ٹکٹ بھی شامل ہے۔ آپ نے بس ایک بیگ تیار کرنا ہے۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔ ان تین لاکھ کے علاوہ آپ کی جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوگا بلکہ جس روز میں آپ کو جہاز کا ٹکٹ دوں گا اسی دن ٹکٹ کے ساتھ پانچ سو آسٹریلین ڈالر بھی آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا تاکہ جب تک آپ کو تنخواہ ملے، آپ اپنا خرچ چھانکیں۔ ایک بات آپ کو بتا دوں کہ وہاں آپ کو ہفتہ وار تنخواہ ملے گی لہذا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ تین لاکھ تو آپ ایک سال کے اندر پورے کر لیں گے۔ اگر آپ آٹھ سو ڈالر بھی ماہانہ وہاں خرچ کریں تو پھر بھی لگ بھگ اکیس ہزار پاکستانی روپے یہاں اپنی منلی کو بیچ سکتے ہیں۔ ایک بات اور۔۔۔۔۔ اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے آپ کی ماہانہ آمدنی کا جو ذکر کیا ہے وہ نارمل ڈیوٹی نام کا ہے۔ اگر آپ روزانہ چند کمینے اور ٹائم کریں گے تو ماہانہ پچاس ہزار روپے تک بھی کمائیں گے۔“ شیر افضل نے نوید باری کو جس ہانس پر چڑھا دیا تھا وہاں سے سب اچھا اچھا جی دکھائی دیتا تھا۔ جب انسان کا دماغ اس بلندی پر ہو تو پھر اسے اپنے ملک کی سرزمین بہت حقیر نظر آنے لگتی ہے۔ نوید بھی اچھے بیٹھے، سوتے جاگتے آسٹریلیا ہی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس دوران میں ہر دس پندرہ دن کے بعد شیر افضل اس سے ملاقات کرتا اور ہر

ملاقات پر اسے کوئی نہ کوئی کاغذ تھا دیتا۔ یہ وہ لیٹر ہوتے تھے جو بے قول شیر افضل کے، اس کے اور مختلف آسٹریلین دفاتر کے بیچ مراسلہ نگاری کے نتیجے میں موصول ہوتے تھے۔ ان ڈاکوینٹس کی رو سے نوید کا کیس بڑے طریقے سے سلیقے سے آگے بڑھ رہا تھا لہذا نوید مطمئن تھا۔

وقت بڑی تیزی سے آگے بڑھتا رہا اور میڈیکل چیک اپ کا مرحلہ آن پہنچا۔ نوید نے دوسرا لاکھ بھی شیر افضل کے حوالے کر دیا، تاہم اس رقم کے بارے میں اس نے اپنی بیوی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ صائمہ کی معلومات کے مطابق، شیر افضل ان کے ایک لاکھ روپے کھائے بیٹھا تھا اور اس نے کچھ بھی یہی بتایا تھا لیکن جب میری نوید سے براہ راست تفصیلی بات ہوئی تو دیگر اہم باتوں کے علاوہ اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ شیر افضل کے پاس دو لاکھ روپے پھنسائے بیٹھا ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ صائمہ حسب وعدہ اپنے شوہر نوید باری کو میرے آفس تک لانے میں کامیاب ہوئی تھی۔

نوید باری کے ساتھ میری ملاقات اس کے لیے کافی سودمند رہی تھی۔ میں نے اسے دیر الائنڈ حضرات کی چال بازیوں اور مکاریوں کے بارے میں ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ شیر افضل پچھلے دو سال سے مسلسل اسے الو بنا رہا تھا۔ جب میں نے نوید کا اعتماد حاصل کر لیا تو پھر اس نے کل کر مجھے بہت سی اہم باتیں بتائیں جن کی بنا پر میں نے اس کا کیس لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

نوید باری کی فراہم کردہ معلومات کے اندر بعض ایسے نکات موجود تھے کہ جن کے اوپر کھڑے ہو کر پیشہ ورانہ مہارت کو استعمال کرتے ہوئے میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ شیر افضل کو اپنے گھیرے میں لے کر بے بس کر سکتا تھا۔ میں نے اوپر آپ کو نوید باری اور شیر افضل کے بارے میں جتنا کچھ بتایا اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا جو آگے چل کر عدالتی کارروائی کے دوران میں مختلف مواقع پر آپ کے سامنے آئے گا۔

میں نے اگلے روز سلطان شاہ کو اپنے پاس بلایا۔ سلطان شاہ، نوید باری کا بھلے دار تھا اور چند روز پہلے وہ بھی مرتد ہو چکا تھا۔ صائمہ کے ہمراہ میرے پاس آتا تھا مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی تھی کہ سلطان شاہ خدائی فوج دار تسم کا شخص تھا جو خلوص نیت

سے نوید باری کا بھلا چاہتا تھا۔

رہی عیسیٰ مسیح کے بعد میں نے اسے بتایا۔ ”شاہ جی! میں نے نوید باری کا کس پکڑ لیا ہے۔ میں تو عدالت کے اندر جو فائنٹ کروں گا سو کروں گا ہی لیکن عدالت کے باہر مجھے آپ کی مدد کی ضرورت پیش آئے گی۔ کیا آپ اس سلسلے میں ذہنی طور پر تیار ہیں؟“

”اگر میں نوید باری کے کسی کام آسکوں تو مجھے خوشی ہوگی۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ حکم کریں، آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

”صرف آپ کا خالص تعاون۔“ میں نے کہا۔

”لیکن اس سے پہلے کہ میں آپ کے دے کوئی کام لگاؤں، آپ مجھے بتائیں کہ بھاگ دوڑ کے لیے تمہارا وقت نکال سکتے ہیں؟“

”نکال لوں گا جناب۔“ وہ ساہوگی سے بولا۔

”بتائیں، کہاں سے کہاں تک رہیں لگاتا ہے؟“

”ارے نہیں یار۔۔۔۔۔ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے آپ کو کسی گھڑ دوڑ میں شرکت نہیں کرانا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ میری ہدایات پر عمل کرنے کے لیے دن میں کچھ وقت نکال سکتے ہیں؟“

”جی ضرور!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بتائیں، مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”میں نے پوچھا۔ ”آپ کی روزانہ کی مصروفیات کیا ہیں؟“

”میں پاکستان چوک میں واقع ایک چھوٹے سے پرنٹنگ پریس میں کام کرتا ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”میں پریس کے باہر کے کام دیکھتا ہوں اس لیے دن کا بیشتر حصہ شہر کی سڑکوں پر گزرتا ہے۔“

”حب تو اور بھی اچھا ہے کہ میرے بتائے ہوئے کام سے آپ کی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں میں کوئی ظلل نہیں پڑے گا۔ آپ بہ آسانی اپنے فرائض کو نبھاتے ہوئے نوید باری کے بھی کام آ سکتے ہیں۔۔۔۔۔“ میں نے لچائی تو قوت کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”آپ جانتے ہیں کہ وہ ریکورڈنگ ایجنٹ شیر افضل کوئی سیدھا سادہ نیک دل انسان نہیں ہے کہ ہم بڑے آرام سے اس کی جیب میں سے دولاکھ روپے نکلوانے میں کامیاب ہو جائیں۔“

”دولاکھ کیوں وکیل صاحب!“ سلطان شاہ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”نوید باری نے تو اس ویزا

ایجنٹ کو ایک لاکھ روپے دیے تھے۔ کیا ان دوسالوں کا ٹیکس لگا کر اس سے بیل رقم وصول کرنا ہے؟“

”زندگی ٹیکس اور نہ کسی قسم کا کوئی جرمانہ یا ہرجانہ!“ میں نے دونوں انداز میں کہا۔ ”یہ اصل زر ہے اور زمین شیر افضل سے یہی رقم نکلوانا ہے۔“

”آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نوید باری نے آسٹریلیا جانے کے لیے اس ایجنٹ کو دولاکھ روپے دے رکھے تھے؟“ وہ ابھن بڑھ لیجے میں مستغرق ہوا۔

”ایسی ہی بات ہے شاہ جی۔“ میں نے بڑی رसान سے کہا۔ ”ایک لاکھ ایڈوائس، کام شروع کرنے سے پہلے اور ایک لاکھ گنگ بھاگ چھ ماہ بعد۔ دو سال گزر جانے کے باوجود بھی نوید باری کا کام ہوا ہے اور نہ ہی اس کی دولاکھ روپے کی رقم واپس لی ہے۔“

”اوہ خدایا!۔۔۔۔۔“ وہ انفسوس بھرے انداز میں گردن جھپکتے ہوئے بولا۔ ”یہ ویزا ایجنٹ تو بہت عیار اور دھوکے باز شخص ہے۔“

”اکثر ریکورڈنگ ایجنٹس اسی قماش کے ہوتے ہیں۔“ میں نے زہر خنڈ انداز میں کہا۔ ”بہر حال، اب شیر افضل کے ساتھ قانونی چارہ جوئی کر کے اس سے نوید باری کے دولاکھ نکلوانے ہیں اور اسی سلسلے میں مجھے آپ کے مکمل تعاون کی ضرورت ہے۔ آپ مجھے بتائیں، شیر افضل کے بارے میں آپ ذاتی طور پر کیا جانتے ہیں؟“

”کچھ جی نہیں۔“ وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”میں آج تک اس بندے سے نہیں ملا۔ بس اس کا ذکر ہی سنا ہے۔“

”لیکن اب آپ کو شیر افضل کے بارے میں بہت کچھ جاننے کی کوشش کرنا ہے اور وہ بھی جلد از جلد۔“ میں نے سلطان شاہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”مگر کیسے؟“ اس کی آنکھوں میں اضافہ ہو گیا۔

”طریقہ میں بتاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”سب سے پہلے آپ نے شیر افضل کی رہائش اور اس کے بیوی بچوں کا سراغ لگنا ہے۔ نوید باری اس حوالے سے کچھ نہیں جانتا۔

آج تک شیر افضل سے اس کی ملاقاتیں مختلف جائے خانوں میں ہوتی رہی ہیں۔ ایک دوبارہ محمود آباد میں نوید کی دکان پر بھی ملنے آیا ہے، خاص طور پر شیر افضل نے دولاکھ کی رقم نوید باری کی دکان پر آ کر کرن لی ہے۔ وہ نوید کی دکان، اس کے گھر کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا ہے لیکن نوید کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔ اب آپ کو نوید کے ہاتھ مضبوط کرنا

آواز حق

ہیں یہ الفاظ دیگر، اس معاملے کو بخوبی نمٹانے کے لیے آپ نے میرے ساتھ تعاون کرتا ہے اور اسی کام کے لیے میں نے آپ کو اپنے پاس بلا یا ہے۔“

”آپ مجھے راستہ بتائیں وکیل صاحب۔“ وہ بڑے عزم سے بولا۔ ”میں آپ کی ہدایات پر عمل کر کے اس ناسک کو پورا کروں گا کہ اللہ کے فضل سے۔“

”خیر کالونی میں نوید باری کا ایک دوست رہتا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لیجے میں کہا۔ ”جو لائڈھی کے کسی بینک میں جاب کرتا ہے۔ اسی شخص نے نوید کو شیر افضل سے ملوا تھا۔“

”آپ کہیں شاہ کی بات تو نہیں کر رہے۔۔۔۔۔؟“ وہ سرسراہٹ ہوئی آواز میں مستغرق ہوا۔

”پاکل وہی۔“ میں نے تعذیبی انداز میں گردن ہلائی۔ ”مگر آپ شاہ پر تھوڑی محنت کریں تو ہمارا کام بن سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے وکیل صاحب! یہ میں کروں گا۔“ وہ پُر اعتماد لیجے میں بولا۔ ”اس کام کے لیے آپ مجھے دو دن دے دیں۔ پھر میں مکمل رپورٹ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔“

”دونہیں، آپ چار دن لے لیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لیجے میں کہا۔ ”اس دوران میں، میں اس معاملے کے دیگر قانونی پہلوؤں کو دیکھ لیتا ہوں۔ میں نے آپ کو ایک لاکھ دے دی ہے۔ باقی کام آپ کا ہے۔“

”انشاء اللہ! میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا وکیل صاحب۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

میں نے مختلف ہدایات دے کر اسے رخصت کر دیا۔ آئندہ دو روز میں سلطان شاہ نے میری مطلوبہ معلومات مجھے فراہم کر دیں جن کے مطابق، شیر افضل کو رنگی کے علاقے میں رہتا تھا۔ اس کی ایک بیوی اور دو بچے تھے۔

ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ بیٹی بڑی تھی اور اس کی شادی ہو چکی تھی۔ بیٹے کی عمر دو سال تھی اور ان کے نام علی الترتیب نازیہ اور فرحان تھے۔ شیر افضل کی بیوی شکیلہ ایک گھریلو عورت تھی اور اسے اپنے شوہر کی غیر نصابی سرگرمیوں کی خبر نہیں تھی۔ عام لوگوں کی نظر میں اور بیوی کے علم کے مطابق وہ پراپرٹی کا کام کرتا تھا۔ اس کی باقاعدہ کوئی اسٹیٹ ایجنسی بھی نہیں تھی بلکہ وہ مختلف ایجنسیوں کے لیے کمیشن پر کام کرتا تھا۔ بہت ہی کم لوگوں کو یہ بات پتا تھی کہ شیر افضل نے پراپرٹی ایجنٹ والا شتاب لگا رکھا تھا اور اس نقاب کی اوٹ

میں وہ لوگوں کو ملک سے باہر بھجوانے کا کام کرتا تھا، البتہ اگر کوئی پراپرٹی کے حوالے سے کام آجاتا تھا تو وہ اسے بھی ہینڈل کر لیتا تھا لیکن اس کا اصل وھندا یہی تھا یعنی وہ لوگوں کو ویزا دلانے کا کام کرتا تھا۔ جو افراد ملک سے باہر جانے کے حوالے سے شیر افضل سے ملنے تھے ان میں سے کوئی بھی اس کی رہائش اور فیسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ اپنے کلائس سے گھر سے دور مختلف ہسٹوں اور چائے خانوں میں ملاقاتیں کرتا تھا۔ جیسا کہ نوید باری کی کہانی سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا۔

سلطان شاہ میری توقع سے زیادہ پھر تھلا ثابت ہوا تھا۔ وہ پاکستان چوک میں واقع جس پرنٹنگ پریس کے لیے کام کرتا تھا ان کی ایک باری ادھر کو رنگی میں بھی تھی۔ سلطان شاہ نے اپنے تعلقات کو استعمال کر کے شیر افضل کے بارے میں اچھی خاصی معلومات اکٹھا کر لی تھیں۔ یہ بھی پتا چلا کہ ریکورڈنگ ایجنٹ واسلے کام میں شاہ کو بھی شیر افضل کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ وہ بندہ چونکہ لائڈھی کے کسی بینک میں جاب کرتا تھا لہذا ویزا کے حصول کے لیے جو بینک اسٹیٹ منٹ یا دیگر کسی ایسی ہی دستاویزی کی ضرورت ہوتی، وہ شیر افضل شاہ کی مدد سے بنوایا کرتا تھا۔ گویا دونوں کی فلی بھگت سے یہ کام چل رہا تھا۔ وہ دونوں اس بزنس میں کس حد تک کامیاب تھے اور انہوں نے آج تک کتنے افراد کو پاکستان سے باہر بھجوا دیا تھا۔۔۔۔۔ یہی احوال میرا تانک نہیں تھا۔ میرا مقام تو نوکس اس بات پر تھا کہ شیر افضل، میرے کلائنٹ نوید باری کے دولاکھ روپے انتم کے بیٹنا تھا۔ اس نے جس کام کے لیے میرے موکل سے یہ رقم لی تھی وہ آٹھ دس ماہ میں ہو جانا چاہیے تھا لیکن دو سال گزر جانے کے باوجود بھی نوید باری کا کام نہیں ہوا تھا۔

جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ سلطان شاہ میرے انداز سے بے زیادہ ہوشیار لگتا تھا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ شیر افضل کا گھر دیکھ لیا تھا بلکہ ایڈریس پوچھنے کے بہانے وہ شیر افضل کی بیوی شکیلہ سے دو چار باتیں بھی کر آتا تھا۔

آئندہ دو روز میں، میں نے اسے اس میں کو تیار کر لیا اور ابتدائی مرحلے پر میں نے شیر افضل کے گھر کے ایڈریس پر رجسٹرڈ ڈاک سے ایک نوٹس بھجوا دیا۔ مذکورہ نوٹس کا مضمون کچھ اس طرح تھا:

میرے موکل نوید باری نے مجھے بتایا ہے کہ دو سال پہلے تم نے اس سے دولاکھ روپے لیے تھے اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ آٹھ سے دس ماہ میں تم اسے ایسٹریلیا منٹ

سپینس ڈائجسٹ

مارچ 2018ء

سپینس ڈائجسٹ

مارچ 2018ء

سپینس ڈائجسٹ

مارچ 2018ء

وینا پر آسٹریلیا بھجوا دو گے۔ آٹھ دس ماہ تو رہے ایک طرف، اب اس معاملے کو لگ بھگ دو سال ہو گئے ہیں، اس کے باوجود بھی میرا موکل اپنے ذہن میں آسٹریلیا کے کسی ذریعہ فارم کے خواب سجائے ابھی تک محمود آباد کے مین بازار میں کپڑے کی دکان چلا رہا ہے۔ دو سال گزر جانے کے باوجود بھی تم اپنا وعدہ پورا کرنے میں ناکام رہے ہو۔ نوید باری یعنی میرے موکل نے اب یہ معاملہ میرے سپرد کر دیا ہے۔ اسے آسٹریلیا یا کسی بھی ملک نہیں جانا۔ میں، نوید باری کے وکیل کی حیثیت سے اس نوٹس کے ذریعے تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ عرصہ سات یوم کے اندر میرے دفتر آ کر اس معاملے کو نمٹا دو اور معاملے کو نمٹانے کا مطالبہ یہ ہے کہ تمہیں میرے موکل کے دولاکھ روپے واپس کرنا ہیں۔ اگر تم نے اس نوٹس کا کوئی معقول جواب نہیں دیا اور اسے ایک کاغذ کا فضول سا ٹکڑا سمجھ کر نظر انداز کر دیا تو پھر یہ معاملہ کورٹ میں چلا جائے گا۔ اس کے بعد کیا ہوگا، اس کا تم اندازہ لگا سکتے ہو۔ یہ پہلا اور آخری نوٹس ہے۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ یا تو میرے دفتر آ کر شرائط سے میرے موکل کے دولاکھ روپے واپس کرو یا پھر قاضی چارہ جوئی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس نوٹس کی تریل کے چند روز بعد ایک شخص مجھ سے ملنے دفتر آیا اور ایک لفظ میرے سامنے بچھتے ہوئے تدرے برہمی سے بولا۔ ”یہ آپ کا کارنامہ ہے؟“ مذکورہ لفظاں پر نظر پڑتے ہی میں پہچان گیا تھا۔ یہ وہی جرسٹر ڈاک والا لفظ تھا جو میں نے ویزا ایجنٹ شیر افضل کو بھیجا تھا، گویا شیر افضل اس وقت میرے سامنے موجود تھا۔ میں نے پیشور انداز میں اسے بھیننے کے لیے کہا اور لفظاں کو اٹ پٹ کر دیکھنے کے بعد اضافہ کیا۔ ”گلتا تو یہ میرے دفتر ہی کا ہے۔ کیوں؟ کیا ہوا؟“ میرے سوالات نے اسے ساگرا کر رکھ دیا۔ وہ جڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ آپ ہی ہیں نا؟“ ”جی ہاں، میں ہی ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا اور پوچھا۔ ”آپ کو؟“ ”میرا نام شیر افضل ہے۔“ وہ رکھائی سے بولا۔ ”آپ نے کسی نوید باری کے حوالے سے مجھے نوٹس بھیجا ہے جس میں دولاکھ روپے کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔“ ”تو اس میں ایسے خفا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ نے میرے موکل سے

جس کام کے لیے دولاکھ روپے لیے تھے وہ کام آپ نے کیا نہیں لہذا اصولی طور پر وہ رقم آپ نے میرے موکل کو واپس کرنا ہے اور یہ آپ.....“ لکائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر استفسار کیا۔ ”میرے موکل کے لیے آپ.....“ ”کسی نوید باری“ کے الفاظ کیوں استعمال کر رہے ہیں۔ کیا میرا موکل آپ کے لیے اجنبی ہے؟“ ”وہ میرے لیے اجنبی نہیں ہے۔“ وہ جلدی سے سنہلے ہوئے بولا۔ ”میں ابھی کل ہی اس سے ملا ہوں لیکن وہ میری کوئی بات سننے کو تیار نہیں۔ پتا نہیں، اسے کیا ہو گیا ہے۔“ ”اسے ہوش آ گیا ہے۔“ میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ”اب آپ کو اس سے کوئی بات بھی نہیں کرنا۔ میں نوید باری کا وکیل ہوں۔ آپ کو جو بھی کہنا ہے، مجھ سے کہیں۔ یہاں بھی اور..... عدالت میں بھی!“ ”آپ مجھے عدالت کی دھمکی نہ دیں۔“ وہ برا سامنے بناتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا جو اس قسم کی باتوں سے ڈر جاؤں گا۔“ ”بس تو پھر ٹھیک ہے۔“ میں نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا۔ ”اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس نوٹس کا کوئی تحریری جواب دے دیں۔ یہ صورت دیگر عدالت میں ملاقات ہوگی۔“ ”وکیل صاحب! میں یہاں آپ کو یہ سمجھانے آیا ہوں کہ میں نے نوید باری کے ساتھ کوئی دھوکا یا فراڈ نہیں کیا۔“ وہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے آپ کے موکل سے جس کام کے لیے پیسے لیے ہیں اس کے لیے کوشش کر رہا ہوں۔ میرے پاس سارے جوت موجود ہیں۔ آپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“ شیر افضل کی شخصیت متاثر کن تھی۔ وہ یہ ظاہر بڑے اعتماد کے ساتھ بات کر رہا تھا لیکن مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قلعہ کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ میرے پیسے ہوئے نوٹس نے اسے خاصا مغضب کر دیا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کے خیال میں، میں کس کا وکیل ہوں؟“ ”ظاہر ہے، نوید باری کا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کیونکہ ا“ میں نے کہا۔ ”میں واقعی نوید باری کا وکیل ہوں اسی لیے میں اس کے مفادات کے تحفظ کے لیے چارہ جوئی کر رہا ہوں لہذا آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ دولاکھ روپے کا ہر صورت میں واپس کرنا ہوں گے۔“

”شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اس سارے پروکس میں ایسے خاصے پیسے خرچ ہو چکے ہیں۔“ وہ ہوشیاری سے بولا۔ ”میرے پاس ایک ایک چیز کا ثبوت موجود ہے۔“ ”آپ یہ تمام تر ثبوت منجھال کر رکھیں۔ یہ کاغذ کے ٹکڑے ہو سکتے ہیں، عدالت میں آپ کے کسی کام آجائیں۔“ میں نے حتی انداز میں کہا۔ ”میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ آپ نے میرے موکل سے جس مقدمہ کے لیے دولاکھ روپے لیے تھے وہ مقدمہ پورا نہیں ہو سکا۔“ ”یہ ٹھیک ہے کہ آسٹریلیا والے کام میں بعض رکاوٹیں کھڑی ہو گئی تھیں۔“ وہ بتانے لگا۔ ”اس لیے وہ چیئر کلور ہو گیا لیکن اب میں اسے یورپ بھیجنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ بہت جلد اس کا کام ہو جائے گا۔“ ”میرے موکل کو یورپ، آسٹریلیا، افریقا، امریکا کہیں نہیں جانا۔“ میں نے دونوں انداز میں کہا۔ ”اسے ایشیا ہی میں رہنا ہے یعنی اپنے ملک پاکستان میں..... کراچی میں..... اس لیے آپ اس کے دولاکھ روپے واپس کر دیں۔“ ”جناب! میں نے آپ کو بتایا ہے، میں نوید باری کو آسٹریلیا بھجوانے کے سلسلے میں اچھا خاصا خرچہ کر چکا ہوں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اب اگر واقعی اسے کہیں نہیں جانا تو میں اسے بیس بیس ہزار روپے کر سکتا ہوں۔“ اس کی مکارانہ بلکہ ظالمانہ پیشکش کو سن کر میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے اسے اپنے جال میں پھانسنے کی غرض سے کہا۔ ”اس سلسلے میں، میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ میں آپ کی آفر کو نوید باری کے سامنے رکھوں گا۔ اگر وہ مان گیا تو پھر بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے!“ ”وہ آپ کا موکل ہے۔ آپ کی بات ضرور مان لے گا۔“ وہ مٹی خیر انداز میں بولا۔ ”بھئی وہ آپ کا کلایٹ ہو کر آتا تھا۔“ میں نے ایک گہری چوٹ کی۔ ”اور بلا سوچے سمجھے وہ آپ کی ہر بات مان لیا کرتا تھا۔ آپ کو دو دولاکھ روپے دینا بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے!“ ”چھوٹس وکیل صاحب! گڑے مر دے اکھاڑنے کا کیا نامہ۔“ وہ بے تکلفی سے بولا۔ ”آپ بیس بیس ہزار میں ہمارا ماضی نامہ کر دیں۔ میں آپ کو بھی خوش کر دوں گا۔“ ”میں سمجھا نہیں؟“ میں نے انہیں زندہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ”مطلب یہ کہ.....“ وہ جلدی سے وضاحت کرتے

ہوئے بولا۔ ”اگر آپ یہ سیٹل منٹ کروادیتے ہیں تو میں آپ کی خدمت شدمت بھی کر دوں گا۔ اگر نوید باری آپ کی فیس ادا کر سکتا ہے تو میں بھی کوئی ایسا گیا کر دے نہیں ہوں کہ آپ کو نظر انداز کر دوں آپ میرا اشارہ سمجھ رہے ہیں نا؟“ ”بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے اپنے انداز سے ایسا ظاہر کیا جیسے اس کی باتوں میں آ گیا ہوں۔ ”میں کل نوید باری سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔“ ”آپ نے صرف یہ بات نہیں کرنا بلکہ یہ کام کرنا ہے۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”مجھے امید ہے، وہ آپ کی تجویز کو رد نہیں کرے گا۔ آپ طریقے سیکھتے سے اسے سمجھانے کی کوشش کریں گے تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا..... انشا اللہ!“ ہم لوگوں میں کچھ چیزیں اتنی پختہ ہو گئی ہیں کہ وہ ہماری عادت بن کر رہ گئی ہیں۔ آپ ایک لحاظ سے اسے فطرتِ ثانیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان شاء اللہ، ماشاء اللہ، ہم اللہ، الحمد للہ..... بہت اچھے الفاظ ہیں۔ ان الفاظ کے تقدس میں اور وقار کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں شبت اور تعمیر مقامات پر استعمال کیا جائے لیکن عموماً دیکھتے میں بھی آتا ہے کہ ہم اچھے برے مقدمہ کی تفریق کے بغیر بے دھڑک ان مقدس الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ شیر افضل میرے موکل کے دو لاکھ پڑپ کے بیٹھا تھا اور میں بیس بیس ہزار میں اس معاملے کو سیٹل کرانے کے لیے اللہ کی رضا کا بھی ذکر کر رہا تھا..... ”اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے میں نوید باری کو آپ کی دی ہوئی آفر پر راضی کرنے کی ضرورت کوشش کروں گا۔“ میں نے شیر افضل کے اطمینان کی غرض سے کہہ دیا۔ ”لیکن ایک ضروری کام آپ کو بھی کرنا ہے اور..... اسی وقت کرنا ہے!“ ”کون سا ضروری کام وکیل صاحب؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اپنی میز پر پڑے ہوئے لفظاں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس نوٹس کا جواب چاہیے۔“ ”اب اس کی کیا ضرورت ہے!“ وہ چونکے ہوئے لہجے میں متغیر ہوا۔ ”آپ تو ہمارا قصہ کرانے جا رہے ہیں۔“ ”بے شک! میری خواہش اور کوشش تو یہی ہے کہ آپ دونوں کے درمیان راضی نامہ ہو جائے لیکن فائلوں کا پیٹ بھرتا بھی ضروری ہوتا ہے۔“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”یہ میرے دفتر کی ریکارڈ کے لیے ہے کہ میں نے آپ کو ایک نوٹس بھیجا اور آپ نے اس کا جواب دے دیا۔“ ”ٹھیک ہے، آپ کہتے ہیں۔ تو میں آپ کی بات

”مان لیتا ہوں۔“ وہ رضامندی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔
”مجھے آپ پر بھروسہ ہے لیکن مجھ میں نہیں آ رہا، جواب میں
لیکھوں.....!“

”اگر مجھ پر بھروسہ کر رہے ہیں تو پھر بچ بولیں۔“
میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”سچائی میں بڑی
طاقت اور برکت ہوتی ہے۔“

”ہوں.....!“ وہ متذبذب نظر سے مجھے جھنکے لگا۔
”کوئی پرالہم ہے؟“ میں نے اپنا یت بھرے لہجے

میں پوچھا۔
”نہیں.....!“ وہ جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے
ہوئے بولا۔ ”میں سوچ رہا ہوں کہ اس نوٹس کا جواب کیسے
لکھوں گا۔ یہ نوٹس تو انگلش میں ہے۔ میں تو اردو بہت
انگلش پڑھ اور سمجھتا ہوں لیکن اس زبان میں باقاعدہ
تحریر نہیں کر سکتا۔“

”اوہ..... تو یہ مسئلہ ہے۔“ میں نے سرسری انداز
میں کہا۔ ”یہ تو معمولی سی بات ہے جناب۔ آپ کی آسانی
کے لیے یہ کام میں کرو رہا ہوں۔ آپ بس دستخط کرو دینا۔“
”بہت شکریہ وکیل صاحب۔“ وہ مودیت بھرے
لہجے میں بولا۔ ”آپ نے تو مسئلہ حل کر دیا۔“

”یہ ٹھیک ہے شیر افضل صاحب کہ میں نوید باری کا
وکیل ہوں۔“ میں نے ضمیر سے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن
اگر آپ لوگوں کے معاملے کا اونٹ کسی کروٹ بیچنے جا رہا
ہے تو میں اس کا خیر میں اتنا سہارا تو ادا ہی سکتا ہوں۔“

”بس تو پھر ہم اللہ کریں۔“ وہ خوش ولی سے بولا۔
”اس کا خیر کار آپ کو اللہ دے گا اور آپ کا ختمناہ میں ددں گا۔“
میں نے شیر افضل کی جانب سے اپنے نوٹس کے
جواب کا ڈرافٹ تیار کر کے اس کے دستخط کروا لیے۔ دستخط
کرانے سے پہلے میں نے اس کے اطمینان کی خاطر مذکورہ
ڈرافٹ کا مضبوط پڑھ کر اسے سنا دیا تھا جو سادہ الفاظ میں
کچھ اس طرح تھا۔

وکیل صاحب! آپ کی جانب سے نوٹس موصول
ہوا۔ یہ سچ ہے کہ دو سال پہلے میں نے آپ کے موکل نوید
باری سے دو لاکھ روپے وصول کیے تھے جس کے بدلے میں
عرصہ نوامہ کے اندر میں نے نوید باری کو ورک ویزا پر
آسٹریلیا بھجوانا تھا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مقررہ مدت میں،
میں اپنا وعدہ پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس
ناکامی... کا سبب جو بھی رہا ہو بہر حال، اب پچھلے کچھ عرصے
میں نوید باری کو یورپ کے کسی ملک بھجوانے کے لیے

کوشاں تھا لیکن اچانک اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اور
آپ کے پاس جا پہنچا۔ میں بھی کوئی بد مزگی یا لڑائی بھگڑا
نہیں چاہتا۔ آسٹریلیا والے پروکس پر میرے اچھے خاصے
پیسے خرچ ہو گئے تھے۔ آپ اپنے موکل کو آفس میں
پلائیں۔ میں بھی آجاتا ہوں۔ میں اپنا نقصان کاٹ کر باقی
رہ نوید باری کے حوالے کر دوں گا۔ یہ تو اچھا ہے، ایک
وکیل کی موجودگی میں قانونی طریقے سے ہمارے لیکن دین
کا معاملہ نمٹ جائے گا۔

اس مضمون میں کوئی بھی ایسی بات نہیں تھی جس پر شیر
افضل چہیں بہ جیہیں ہوتا۔ اس نے بے چون و چرا میرے تیار
کئے ہوئے ڈرافٹ پر دستخط کر دیے۔ میں نے ہنرمندی یہ
کی تھی کہ اس ڈرافٹ میں ان دو لاکھ روپوں کا تو واضح طور
پر ذکر کر دیا تھا جو اس نے میرے موکل نوید باری سے
وصول کیے تھے لیکن اس کے اخراجات والے امانٹ کا
کہیں تذکرہ نہیں کیا تھا۔ وہ میری چال میں آ گیا اور تسلی
بھرے انداز میں اس نے دستخط کر دیے تھے بلکہ بد وقت
رخصت وہ میرا حد درجہ شکر بھی ادا کر گیا تھا۔
میری کوشش تو یہی تھی کہ نوید باری کا کم سے کم نقصان
ہو اور عدالتی کمپیوز میں پڑے بغیر ہی اس کا مسئلہ حل
ہو جائے لیکن تدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا لہذا مجبوراً انصاف
کے حصول کے لیے ہمیں عدالت کا دروازہ کھٹکنا پڑا۔

☆☆☆

آگے بڑھنے سے پہلے یہ بتانا چاہوں کہ شیر افضل کی
میرے آفس میں آمد کے دو روز بعد میں نے ان دونوں
فریقین کو تھپنے کے لیے اپنے پاس بلا لیا تھا لیکن شیر افضل نے
معتقول بات نہیں کی تھی۔ وہ خرچے کے نام پر دو لاکھ روپے
میں سے اتنی رقم کاٹنا چاہتا تھا کہ باقی نوید باری کے حصے
میں آنے والی رقم کو ”خیرات“ کا نام دیا جائے تو غلط نہیں
ہوگا لہذا ان کے بیچ معاملہ بن نہیں پایا تھا۔

شیر افضل نے جب تک نوید باری کو آسٹریلیا والے
پروکس کے چکر میں الجھا رکھا تھا تو تھوڑے تھوڑے دنوں میں
وہ اسے اپنی کارروائی کی رپورٹ پیش کرتا رہتا تھا اور بعض
کاغذات کی فوٹو کاپی بھی وہ اسے تھما رہتا تھا۔ اس کے...
بقول یہ وہ کاغذات تھے جو آسٹریلیا کے مختلف محکموں سے
اس کی خط کتابت ہوتی رہتی تھی۔ نوید باری نے وہ تمام
کاغذات میرے حوالے کر دیے تھے۔ ان میں بعض بہت
نی اہم چیزیں بھی تھیں۔

ابتدائی دو پیشیاں مختلف عدالتی کارروائیوں میں

آوازِ حق

مگر گھٹیں۔ جنوری کے وسط میں اس کیس کی باقاعدہ سماعت
کا آغاز ہوا۔ اس کیس میں شیر افضل کی حیثیت ایک ملزم
ایسی تھی جبکہ میں وکیل استغاثہ کا کردار ادا کر رہا تھا اور مجھے
اپنے موکل نوید باری کی عدالت سے انصاف دلوانا تھا۔ شیر
افضل نے اپنے ڈیفنس کے لیے ایک وکیل بھی کر لیا تھا۔
شیر افضل کا حلفیہ بیان ریکارڈ ہو چکا تھا میں جرح
کے لیے اکیڈریز باکس کے نزدیک چلا گیا۔ میں نے ملزم کی
آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوالات کا آغاز کیا۔

”آپ کے نام کے دو حصے ہیں۔“ میں نے کہا۔
”شیر اور افضل.....“ اگر میں آپ کو کسی ایک نام سے پکارتا
چاہوں تو ان میں سے کون سا حصہ استعمال کروں؟“
وہ سادگی سے بولا۔ ”آپ کو جو بھی اچھا لگے وہ
استعمال کر لیں۔“

”اتنے تو دونوں ہی ہیں۔“ میں نے بہ دستور اس کی
آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھڑے دھڑے جرح کے سلسلے
کو آگے بڑھایا۔ ”شیر جنگل کا بادشاہ کہلاتا ہے اور افضل کا
مطلب ہے فضیلت والا، اعلیٰ و ارفع۔ اس نسبت سے آپ کو
اعلیٰ اخلاق اور اقدار کا مالک ایک نفس انسان ہونا چاہیے لیکن
مجھے نہایت ہی انفس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کا
کردار اس کے برعکس ہے۔ خیر.....“ میں نے لحاظی توقف
کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔
”شیر افضل صاحب! اس وقت آپ کی عمر کتنی ہوگی؟“
”لگ بھگ ستیستیس سال۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ ”آپ کو کتنے بیٹے
کی جنگ تو یاد ہوگی؟“
”اچھی طرح یاد ہے جناب۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”اس وقت میں کم و بیش سترہ سال کا تھا۔“
میں نے اس کی رگڑائی بیٹھائی کا پروکس شروع
کرتے ہوئے بڑے دھچھے انداز میں کہا۔ ”دیری گز.....
اس کا مطلب ہے، آپ انٹرمیڈیٹ ہوئے گئے؟“

”نہیں جناب!“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے
بولا۔ ”میں کونین میں تعلیم حاصل نہیں کر سکا۔“
”میٹرک تو یقیناً آپ نے کر رکھا ہوگا؟“
”نہیں!“ اس نے ایک باہر پھر سر کو مڑی جنبش دی۔
میں ٹٹل سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

”اس کے باوجود بھی آپ نے جس کام میں ہاتھ
پاؤں اور سر ڈال رکھا ہے وہاں تو مارے کا سارا کام ہی
انگلش کا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ بہت ہی باکمال انسان

ہیں کیونکہ یہ کام آپ خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں۔“
وہ میرے طنز کو سمجھ نہیں پایا اور عام سے لہجے میں
بولا۔ ”بس جی، اللہ چاہے۔“

”آپ کا آفس کس جگہ پر ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”میرا کوئی آفس نہیں ہے۔“ وہ جز بہرہ دے ہوئے بولا۔
”پھر کام کیسے چل رہا ہے؟“ میں نے قدرے سخت لہجے
میں استفسار کیا۔ ”آپ اپنے کلائس کو کیسے ڈیل کرتے ہیں؟“
”میں اپنے کلائس سے مختلف ہفتوں میں ملاقات
کرتا ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”ساری بات چیت وہیں پر
ہوتی ہے۔“

”ملک سے باہر جانے والے افراد کی آپ تک
رسائی کس طرح ہوتی ہے۔“ میں نے سوال کیا۔ ”کیا اس
سلسلے میں سچ کا کوئی آڈی آپ کی مارکیٹنگ کرتا ہے؟“
”نہیں!“ وہ فطری انداز میں بولا۔

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”پھر؟“
”دراصل، میں نے بہت سے لوگوں کو بیرون ملک
بھجوا دیا ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میری ایک
ساکھ بنی ہوئی ہے۔ ایک سے دو اور دو سے تین، اسی طرح
میرے کام کی شہرت آگے بڑھتی ہے اور مجھے کلائس ملتے
رہتے ہیں۔“

”آپ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ نے جن
لوگوں کو بیرون ملک بھجوا دیا ہے وہی لوگ آپ کی پہلنی
کرتے ہیں۔“ میں نے اسے اچھی طرح باعزتہ ہوئے
کہا۔ ”وہ کسی نہ کسی کو آپ کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ وہ لوگ
ملک سے باہر جانے کے خواہش مند افراد کو بتاتے ہیں کہ اگر
انہوں نے بھی دولت کماتا ہے تو وہ آپ سے رابطہ کریں۔
آپ اس شعبے میں بدھٹولی رکھتے ہیں۔“

”جی، بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔“ وہ خوش ہوتے
ہوئے بولا۔ ”میرا کام ہی دراصل میرا تعارف ہے۔“
”ماشاء اللہ! اس سلسلے میں آپ کی تعارف کے محتاج
نہیں ہیں۔“ میں نے اسے کھجے پر چڑھاتے ہوئے کہا
پھر عدالت میں موجود اپنے موکل کی جانب اشارہ کرتے
ہوئے پوچھا۔ ”کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟“

”جی، بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ وہ شکایتی نظر
سے نوید باری کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اسی کی مہربانی
سے تو آج میں ملزموں والے کنبہ میں کھڑا ہوں۔ کسی
نے سچ کہا ہے..... بھلائی کا کوئی زمانہ ہی نہیں رہا۔ جس پر
احسان کر دے وہی ڈکارتا ہے۔“

اقوال زریں

ہمارے کوئی بھی رشتہ بدن پر پڑتا ہوا لباس نہیں ہوتا کہ جسے اتار کر چھینک دیا جائے اور دوسرا بدل لیا جائے۔ ہمارے زندگی چاہتے ہو تو موت پر تکیہ نہ رکھو۔

☆ تاکامی کا میانی کا زینہ ہے کیونکہ ستارے اندھیرے میں جھپکتے ہیں۔

☆ انہیں بھری ہوئی ہوں تو وہ ملے کا ڈھیر ہیں مگر جب باہم بڑ کر عمارت بن جائیں تو طاقت کا قلعہ ہیں جس میں تو میں پناہ لے سکتی ہیں۔

☆ بلند مقام ہمیشہ اپنا طرف بلند کرنے سے ملتا ہے۔ نہ کہ نعرے اور جھنڈے بلند کرنے سے۔

معلومات

☆ سب سے زیادہ اخبارات امریکا میں شائع ہوتے ہیں۔

☆ دنیا کا سب سے بڑا ہاکی اسٹیڈیم نیشنل اسٹیڈیم لاہور (پاکستان) ہے۔

☆ بدترین قحط 1959ء تا 1961ء کے دوران چین میں پڑا جس سے دو کروڑ پچانوے ہزار افراد قحطی اجل بن گئے۔

جانب "تیار کر رکھا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر بیچ نہیں سکتا تھا۔ میرے سینے سوال نے شیر افضل کو حذر و وجہ ہراساں کر دیا تھا۔ اس نے امداد طلب نظر سے اپنے وکیل کی جانب دیکھا۔ وکیل صفائی حق فیس ادا کرتے ہوئے کراری آواز میں گویا ہوا۔

"مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!" اس نے بیچ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "وکیل استغاثہ غیر ضروری باتوں میں الجھا کر میرے موکل کو کنفیوژ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں ایسے حربوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔"

بیچ نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ "آپ اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہیں گے؟"

"جناب عالی!" میں نے نڈلدار کرگلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "میری باتیں نہ تو غیر ضروری ہیں اور نہ ہی غیر منطقی۔ یہ انتہائی ضروری، منطقی اور اس کیس سے متعلقہ ہیں۔ اگر ڈیفنس کو کسٹریج مجھے میری جرح مکمل کرنے دیں تو میں معزز عدالت کے سامنے یہ ثابت کر دوں گا کہ میں نے جو کہا وہ سچ ہے اور بیچ کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

رتے ہوئے تیر لکھ میں کہا۔ "تم نے پچھلے دو سال میں میرے موکل کو آسٹریلیا بھیجوانے کے سلسلے میں آسٹریلیا کے ایک ڈیپارٹمنٹ منٹس سے جو بھی خط کتابت کی ہے اس کی ایک کاپی فائل تمہارے پاس ہے جبکہ تم نے ان پیپرز کی جو نوکریاں میرے موکل کی سلی کے لیے اسے فراہم کی ہیں وہ سب میری فائلوں میں موجود ہیں۔ کیا تمہیں اس میں کوئی شک ہے؟"

"شک کی کوئی گنجائش نہیں۔" وہ تھوک نچلتے ہوئے بولا۔ "یہ فوٹو کاپیاں میں نے ہی اپنے کلائنٹ کو دی تھیں۔" "یہ تمام تر خط کتابت انگریزی زبان میں کی گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "تھوڑی دیر پہلے تم نے معزز عدالت کے سامنے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ تمہاری تعلیم مڈل سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ پھر تم انگریزی میں کس طرح مراسلہ نگاری کر لیتے ہو؟"

"اس کام کے لیے میں اپنے بڑے کچھ دوستوں کی مدد لیتا ہوں۔" وہ اپنی پوزیشن کلیئر کرتے ہوئے بولا۔ "جیسے کہ شاکر جیسے بڑے کچھ دوست؟" میں نے سنجیدگی سے استفسار کیا۔

"ہاں..... کبھی کبھار شاکر بھی اس حوالے سے میری مدد دیتا ہے۔" اس نے گول مول جواب دیا۔

"کبھی کبھار پرفیکٹ کرتے ہوئے بتاؤ....." میں نے شاطرانہ رنگ اینجٹ کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہوئے کہا۔ "میری فائلوں کے اندر نوید باری کے کیس کے حوالے سے جتنے بھی کاغذات رکھے ہیں کیا ان کی تیاری میں بھی شاکر نے تمہاری مدد کی تھی؟"

"جی مدد کی تھی۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاطر بہت ہی قابل بندہ ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنز یہ لہجہ میں کہا۔ "اتنا قابل کہ آسٹریلیا کے بعض ڈیپارٹمنٹ اس سے مدد کی درخواست کرتے نظر آتے ہیں..... ہیں نا؟"

میرے اس سوال پر شیر افضل بہت زیادہ زوریں لگایا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ میرا مقصد اسے ہراساں کرنا تھا اور میں اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میرا دوسرا مقصد اسے جعل ساز ثابت کرنا تھا اور یہ مقصد آئندہ چند منٹ میں پورا ہونے والا تھا۔ تیسرا اور آخری مقصد اسے جھوٹا اور فراڈی ثابت کرنا تھا۔ مقصد آئندہ کسی پیشی پر لاڑی پورا ہو جاتا تھا۔ میں نے مکار شخص کو قابو کرنے کے لیے ایسا زبردست "جرح

"آپ کی معلومات صد فیصد درست ہیں۔" وہ سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "شاکر کے نوید باری سے اچھے مراسم ہیں اور شاکر ہی نے نوید کو پہلی بار مجھ سے ملوایا تھا۔" "اگر شاکر نے میرے موکل کو آپ سے ملوایا تھا تو شاکر کے اس عمل کو دوستانہ نہیں کہا جاسکتا۔" میں نے تلخ لہجہ میں کہا۔ "یہ تو سراسر دشمنی ہے اور آپ کہہ رہے ہو، ان دونوں کے بیچ اچھے مراسم ہیں.....؟"

"اب آپ جو بھی سمجھ لیں....." وہ بے پروائی سے بولا۔ "میں آپ کو روک تو نہیں سکتا۔" "میں جو سمجھ رہا ہوں اس کا تمہیں بھی یہ بخوبی علم ہے۔" میں نے شیر افضل کے لیے اپنے لہجے میں موجود احترام کو خراج کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بتائیں، آپ نے آج تک شاکر کے جاننے والے کتنے افراد کو بیرون ملک بھیجا ہے جو وہ آپ کی راز کھنگالت کرنا پھر رہا ہے۔ کوئی بھی جواب دینے سے پہلے اس بات کو ذہن میں رکھنا کہ میں تمہاری بات کی تصدیق کے لیے ان افراد کے لواحقین کو عدالت میں بلا کر ان کی گواہی بھی دلواؤں گا.....!"

اس کے چہرے پر پہلی مرتبہ مجھے پریشانی نظر آئی۔ اس نے ایک لمحہ سوچا پھر فیصلہ کن لہجہ میں بولا۔ "میں نے شاکر کے کسی عزیز یا دوست کو ملک سے باہر نہیں بھیجا۔" یہ بیچ اس نے مجھ سے اپنی جان چھڑانے کے لیے بولا لیکن میں اتنی آسانی سے اس کی جان کہاں چھوڑنے والا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاکر تمہارا بزنس پارٹنر ہے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ بد کے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں اکیلے ہی یہ کام کرتا ہوں۔" "پھر شاکر کس خوشی میں تمہارے لیے مرے گھیرتا ہے۔" میں نے جیسے ہوئے لہجہ میں پوچھا۔ "کیا اس خدمت کے لیے تم شاکر کو کوئی کمیشن وغیرہ دیتے ہو؟"

"نہیں۔" اس نے ایک مرتبہ بھرتی میں گردن ہلائی۔ "شاکر کبھی کبھار دوستی میں کسی کلائنٹ کو فیر کر دیتا ہے۔" "گو یا شاکر سے تمہاری دوستی ہے؟"

"کہہ سکتے ہیں!" اس نے گول مول جواب دیا۔ "میں نے قدرے سخت لہجہ میں کہا۔ "کہہ سکتے ہیں وغیرہ عدالت میں نہیں چلتا۔ دونوں الفاظ میں جواب دو۔ شاکر تمہارا دوست ہے یا نہیں؟"

"جی..... شاکر میرا دوست ہے۔" اس نے تسلیم کر لیا۔ "میں نے میری پر رچی اپنی فائلوں کی جانب اشارہ

"غالبا آپ میرے موکل پر اپنے کسی احسان کا ذکر کر رہے ہیں....." میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ بالکل ٹھیک سمجھ وکیل صاحب۔" وہ شکوہ بھرے انداز میں بولا۔ "مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ آپ جیسا تجربہ کار وکیل بھی اس احسان فراموش شخص کی باتوں میں آگیا اور مجھ پر مقدمہ دائر کر دیا.....!"

"میرے موکل پر آپ کے احسانات اور میری نا سنجیدگی پر ہم بعد میں بات کریں گے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "کیا آپ نے میرے موکل کے کسی دوست یا رشتے دار کو بیرون ملک بھیجا تھا؟"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے سوال کیا۔ "پھر میرے موکل کو آپ کے پاس کس نے بھیجا تھا؟"

وہ حذب و انداز میں وکیل صفائی کی طرف دیکھنے لگا۔ وکیل صفائی فوراً اپنے موکل کی مدد کو لپکا۔ وہ قدرے تیز آواز میں بولا۔

"تم ججکیشن یور آئر۔ یہ کوئی اصول نہیں کہ کوئی کسی کے توسط ہی سے میرے موکل تک پہنچے۔ بعض لوگ اپنی ضرورت کے تحت ڈائریکٹ رابطہ بھی کر سکتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ نوید باری بیرون ملک جا کر روزی کمانا چاہتا تھا اور وہ اس سلسلے میں میرے موکل سے ملتا تھا۔"

"میرے فائل دوست!" میں نے وکیل صفائی کے اعتراض کے جواب میں کہا۔ "میں نے جس اصول کے تحت ملزم سے سوال کیا تھا وہ ملزم ہی کا واضح کردہ ہے اور تھوڑی دیر پہلے ملزم نے معزز عدالت کے سامنے اپنا یہ اصول بیان کیا تھا اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرا موکل ڈائریکٹ ملزم یعنی آپ کے موکل سے نہیں ملتا تھا....."

"پھر.....!" وکیل صفائی کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ "ان کی ملاقات کس کے توسط سے ہوئی تھی؟"

"شاکر کے توسط سے۔" میں نے وکیل مخالف کے سوال کا جواب دیا پھر ایکوز باکس کے اندر کھڑے شیر افضل سے استفسار کیا۔ "میں غلط تو نہیں کہہ رہا جناب؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ انکار نہ کر سکا۔

"کیا یہ درست ہے کہ شاکر نامی یہ شخص اختر کالونی کا رہائشی ہے۔" میں نے تصدیق طلب نظر سے شیر افضل کی طرف دیکھا۔ "اور یہ بندہ لاٹھی میں داغ کی ٹینک میں کام کرتا ہے؟"

جنگ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے مجھ سے کہا۔
 ”پلیز پریسڈ!“
 ”میرے سوال کا جواب دو!“ میں دوبارہ شیر افضل کی جانب متوجہ ہو گیا۔
 وہ بولکھا ہٹ آئیر انداز میں بولا۔ ”کون سا سوال؟“
 ”تمہارے دوست شاکر کی قابلیت کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا اس حوالے سے تم کیا کہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
 وہ جڑبڑھوتے ہوئے بولا۔ ”میں مانتا ہوں کہ شاکر ایک قابل انسان ہے۔“
 ”اتفاقاً قابل کہ آسٹریلیا کے مختلف اہم سرکاری اداروں میں اس کی بہت مانگ ہے؟“ میں نے زہریلے لہجے میں استفسار کیا۔
 وہ اپنی پیشانی پر نمودار ہونے والے پسینے کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کی بات کو سمجھ نہیں پایا۔ آپ بار بار آسٹریلیا کے اداروں کا ذکر کیوں کر رہے ہیں؟“
 ”وہ اس لیے کہ تم نے میرے کلائنٹ نوید باری کے آسٹریلیین ورک ویزا کے لیے دہاں مختلف اداروں سے خط کتابت کی گئی جس کا ثبوت میری فائلوں کے اندر موجود ہے۔“ میں نے شیر افضل کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”اور تم نے تھوڑی دیر پہلے اس امر کا اقرار کیا ہے کہ اس کام میں گاہے بگاہے شاکر نے تمہاری مدد کی ہے!“
 ”یہ ٹھیک ہے، شاکر باری کسی شخص نے میرے موکل کی علمی معاونت کی ہوگی۔“ وکیل صفائی نے شیر افضل کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آپ شاکر کا آسٹریلیا کے مختلف اداروں سے جو تعلق جوڑتا چاہ رہے ہیں اس سے آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟“
 ”میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں میرے فاضل دوست.....“ میں نے وکیل صفائی کی جانب دیکھتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”کہ آپ کا موکل ایک دعوے باز شخص ہے۔ وہ میرے موکل کے دلائل کو رد دے کھائے بیٹھا ہے اور اس فراڈ پرزس میں شاکر آپ کے موکل کا پانتر ہے۔“
 ”تو آپ معزز عدالت کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شاکر اور شیر افضل مختلف آسٹریلیین ڈیپارٹمنٹس کے ساتھ مل کر یہ مذموم کام کر رہے ہیں؟“ وکیل صفائی نے استہزاء سے انداز میں کہا۔ ”دیری فنی.....!“
 ”یہ ویری فنی ہے یا ہنی ہے، میں اسے ڈٹکے کی چوٹ پر ثابت کر سکتا ہوں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور

دیتے ہوئے کہا۔ ”ہاتھ نکلن کو آرسی کیا ہے، پڑھے لکھے کوفاری کیا ہے!“
 میری بات پر تپانیں، وکیل صفائی کی سمجھ میں آئی کہ نہیں، وہ بڑے جوش سے پوچھ بیٹھا۔ ”آپ یہ کس طرح ثابت کریں گے کہ میرا موکل اور اس کا دوست شاکر کسی آسٹریلیین ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ ملے ہوئے ہیں؟“
 ”حضور! میری کیا مجال کہ میں کچھ ثابت کروں.....“ میں نے وکیل صفائی کے چنگی لی۔
 ”لیکن ابھی تو آپ نے ثابت کرنے کا دعویٰ کیا ہے؟“ وہ ابھن زدہ انداز میں بولا۔
 ”حضرت! آپ نے یہ تو سن رکھا ہوگا..... دعویٰ جھوٹا، قبضہ سچا!“ میں نے سوالیہ نظر سے وکیل مخالف کی جانب دیکھا۔
 ”جی جن رکھا ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”تو اب آپ بے فرما رہے ہیں کیا آپ نے جھوٹا دعویٰ کیا تھا؟“
 ”نہیں!“ میں نے قطعی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تو یہ عرض کر رہا ہوں کہ اس وقت عدالت میں میرا دعویٰ اور آپ کے موکل کا قبضہ یعنی دونوں چیزیں موجود ہیں۔ میں اپنے دعوے کو آپ کے موکل کے قبضے کی مدد سے اس طرح ثابت کر دکھاؤں گا کہ میرا دعویٰ سچا اور آپ کے موکل کا قبضہ جھوٹا ہو جائے گا.....!“
 وکیل استعفاء نے بے بسی سے سر جھٹکا اور جج کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جناب عالی! میرے فاضل دوست اپنی نیچے دار باتوں سے عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ انہیں ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی تاکید جائے۔“
 جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”بگ صاحب! عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ آپ نے جو معاہدہ پیش کیا ہے اس کا حل کیا ہے؟“
 ”یور آئز!“ میں نے ردے سخن جج کی سمت پھیرتے ہوئے نہایت ہی ذمہ داری کے ساتھ کہنا شروع کیا۔
 ”میرا شیر افضل معزز عدالت کے رد برد اس بات کا اقرار کر چکا ہے کہ آسٹریلیا کے مختلف اداروں سے خط کتابت کے سلسلے میں اس نے اپنے دوست شاکر سے مدد لی تھی کیونکہ مذموم خود نہ تو انگریزی کی ڈرافٹنگ کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی ایسی شخصیت یا ایسی طرح کے کسی ادارے کی طرف سے بھیجے جانے والے کسی ڈاکو منٹ کو پوری طرح سمجھ سکتا ہے.....“ میں نے لمبائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

اولیٰ حق

”جناب عالی! آسٹریلیا کی آفیشل لیکنونگ انکس ہی تادم آسٹریلیین انکس، امریکن انکس اور برطانوی انکس سے قدرے مختلف ہے اور ہمارے ہاں پاکستان میں جو آفیشل ڈرافٹنگ کی جاتی ہے اسے آپ امریکن اور برطانوی انکس کا ملو یا کہہ سکتے ہیں اور ہماری مقامی انکس، آسٹریلیین انکس کے مقابلے میں سب دیکھے، گرامر اور الفاظ کے چناؤ، ان کی نشست و برخاست کے اعتبار سے کافی مختلف ہے۔ مطلب، اگر ایک ہی مضمون کو مقامی اور آسٹریلیین انکس میں ڈرافٹ کیا جائے تو اس میں انہیں نہیں بلکہ پندرہ بیس کا فرق واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ.....“
 میں نے ایک بار پھر مختصر سا توقف کر کے فاتحانہ انداز میں وکیل صفائی کی جانب دیکھا پھر دوبارہ کرسی انصاف پر ارجحان شخص سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔
 ”جناب عالی! میں معزز عدالت کے علم میں ٹھوس ثبوت کے ساتھ یہ حقیقت لانا چاہتا ہوں کہ ملزم شیر افضل ایک فراڈ اور جعل ساز شخص ہے اور دعوہ کا..... دہی کے اس کاروبار میں شاکر بھی پوری طرح اس کے ساتھ شامل ہے۔“ پھر میں نے اپنی فائلوں میں سے وہ تمام کاغذات جو مختلف مواقع پر دیز انجینٹ شیر افضل نے میرے موکل کو بے وقوف بنانے کے لیے فراہم کیے تھے..... وہ نکال کر جج کے سامنے رکھ دیے اور نہایت ہی پر اعتماد انداز میں کہا۔
 ”یہ ہر میری بات کا ٹھوس ثبوت۔ ان کاغذات میں پاکستان سے آسٹریلیا جانے والے اور آسٹریلیا سے پاکستان آنے والے تمام لیٹرز شامل ہیں۔ یہ میرا سلسلہ نگاری آسٹریلیا کے مختلف ذمہ دار اداروں اور ملزم کے بیچ ہوئی تھی یہ الفاظ دیگر آسٹریلیا اور شاکر کے درمیان کیونکہ ملزم تو اس معیار کی انکس لکھتا، پڑھتا اور لکھتا جانتا ہی نہیں۔ یہ کارنامہ سراسر شاکر کے کھاتے میں لکھا جائے گا۔ ان ڈاکو منٹس کو دیکھ کر عدالت فوراً سے پیشتر اس نتیجے پر پہنچ جائے گی کہ پاکستان سے آسٹریلیا جانے والی کوئی ویزا ایپلی کیشن ہو یا آسٹریلیا سے پاکستان آنے والا کوئی سرکاری آفیشل لیٹر..... سب کچھ ایک ہی فرس میں تیار کیا گیا ہے، یہ سب ایک ہی فنی، ایک ہی کاتب کی تحریر ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر آسٹریلیین لیٹر مقامی انکس میں یعنی ایک دم پاکستانی انداز میں تحریر کیا گیا ہے اس پر تھوڑی دیر پہلے میں نے عرض کیا تھا کہ ملزم کے دوست شاکر کی قابلیت کا شہرہ چار دانگ پھیلا ہوا ہے، آسٹریلیا کے مختلف سرکاری ادارے انہی حضرت

سے اپنی تمام اہم ڈرافٹنگ کرواتے ہیں۔“
 میرے بات کرنے کے دوران میں جج نے ان تمام کاغذات کا جائزہ لیا تھا جو میں نے اپنی فائل میں سے نکال کر اس کی میز پر رکھے تھے۔ جج نے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر ہنسے ہوئے لہجے میں بولا۔
 ”بگ صاحب! آپ کا تجزیہ بالکل درست ہے۔ ان تمام لیٹرز کا ڈکٹیشن ایک جیسا ہے۔ لگتا ہے، ان سب کو ایک ہی سانسے میں تیار کیا گیا ہے۔“
 ”اور وہ سانسہ..... شاکر!“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”جو اپنے کمال فن سے کراچی میں بیٹھ کر آسٹریلیا کے مختلف سرکاری اداروں کا ہاتھ بٹا رہا ہے۔ یہ ”عبرت“ ملزم شیر افضل کا دوست اور بزنس پانتر ہے۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ اس آئندہ ججی پر شاکر کو عدالت میں حاضر کرنے کا بندوبست کرایا جائے۔ میں اس ”نادر روزگار“ شخص کا دیدار کرنا چاہتا ہوں۔“
 اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔
 جج نے وکیل صفائی کو ہدایت کی کہ اگلی ججی پر وہ ملزم کے دوست شاکر کو عدالت میں پیش کرے۔ اس کے ساتھ ہی جج نے مختلف عدالتی عملے کے ذمے یہ کام لگا دیا کہ وہ کسی ماہر لسانیات کی مدد سے ان کاغذات کی جانچ پڑتال کرائیں تاکہ اس بات کا حتمی ثبوت ہاتھ لگ جائے کہ ملزم نے اپنے دوست شاکر کے توسط سے جعلی دستاویزات تیار کروا کر میرے موکل نوید باری کو بے وقوف بنایا تھا اور اس کی سادگی و مصوبیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دولاکھ روپے ہتھیالے تھے۔ جج میرے اٹھائے ہوئے نکتے کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔
 ہم عدالت سے باہر آئے تو نوید باری نے مجھ سے کہا۔ ”وکیل صاحب! آپ نے تو کمال کر دیا۔“
 ”یہ تو ابتداء ہے نوید صاحب۔“ میں نے اس کے ساتھ براؤڈے سے گزرتے ہوئے کہا۔ ”آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!“
 ”شیر افضل تو آپ کے سامنے بیگم بی بی بنا کھڑا تھا۔“ وہ پرمسرت آواز میں بولا۔ ”اس سے تو بولہ بھی نہیں جارہا تھا۔ وکیل صفائی بار بار اسے سہارا دے رہا تھا۔“
 ”انسان وکیل اسی لیے تو کرتا ہے کہ وہ اسے سنبھالا دے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”کیا میں نے آپ کو سہارا نہیں دے رکھا؟“
 ”بے شک دے رکھا ہے۔“ وہ بڑے توانا لہجے میں

بولاً۔ ”مجھے یقین ہو چلا ہے کہ آپ مجھے میرا حق دلوا کر ہی رہیں گے۔“

”حق حاصل کرنے کے لیے آواز بلند کرنا پڑتی ہے نوید صاحب!“ میں نے پارکنگ لٹ کارخ کرتے ہوئے کہا۔ ”جو“ آواز حق“ کہلاتی ہے۔ آپ نے میرے توسط سے اس عدالت کے پلٹ فارم پر یہ آواز بلند کر دی ہے۔ آگے اللہ سب ٹھیک کر دے گا اور جہاں تک شیر افضل کے بیگی ملی بننے کا معاملہ ہے تو.....“ لٹائی تو قنف کے کرے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”ابھی تو آپ متاثر دیکھتے تھے جاہیں۔ بہت جلد وہ آپ کو ایک مرلے جوہر کے روپ میں نظر آئے گا۔ شیر افضل جیسے فراڈ لوگ صرف انہی افراد کو دبا سکتے ہیں جو ان کے گم سے واقف نہیں ہوتے۔ آپ جیسے معصوم اور سادہ لوح بیرون ملک جا کر زیادہ سے زیادہ کمانے کے لالچ میں اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی ایسے لوگوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔“ مجھے اپنی حماقت پر سخت افسوس اور ندامت ہے وکیل صاحب۔“ وہ پشیمانی بھرے انداز میں بولا۔ ”آپ نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔“

”صرف افسوس، ندامت اور شرمندگی سے کچھ نہیں ہوتا نوید صاحب۔“ میں نے صاف گولی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”انسان کو اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنا چاہیے۔ یہ اچھی بات ہے کہ ایک ہی تجربے نے آپ کی آنکھیں کھول دی ہیں۔“

”آپ نے شاکر کو بہت زیادہ اچھالا ہے۔“ وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

”ابھی تو میں نے شخص شاکر کا تعارف پیش کیا ہے نوید صاحب!“ میں نے پارکنگ لٹ کے نزدیک رکتے ہوئے کہا۔ ”آپ دیکھیے گا، اگلی پیشی پر میں عملاً اسے دشمن باکس میں کس طرح اچھا لے ہوں۔ شاکر کو بھی اور شیر افضل کے وکیل کو بھی۔ میرے پاس شاکر اور شیر افضل کو دیر کرنے کا اتنا زیادہ سامان موجود ہے کہ مخالف پارٹی کے کسی بھی فرد کی سوچ وہاں تک نہیں پہنچ سکتی لیکن.....“ میں نے اس کے چہرے کی جانب انہی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے۔ کوئی پریشانی ہے کیا؟“ میں شاکر کی وجہ سے ٹھوڑا الجھا ہوا ہوں“ وہ متذبذب انداز میں بولا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”آپ کی الجھن

کی نوعیت کیا ہے؟“

”میری پریشانی کا سبب یہ ہے وکیل صاحب کہ شاکر سے آج تک میرے اچھے مراسم رہے ہیں۔“ وہ خائے لگے منہ انداز میں بولا۔ ”وہ کیا سوچے گا کہ میں اس کے خلاف کھڑا ہو گیا ہوں۔“

”تو جبراً ایک کام کرتے ہیں.....“ میں نے غصہ سے ہونے لہجے میں کہا اور خاموش نظر سے نوید باری کو کھنکھنے لگا۔ وہ سر ہلاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”کون سا کام وکیل صاحب؟“ ”ہم اس کیس کو واپس لے لیتے ہیں۔“ میں نے اس کا رد عمل جاننے کے لیے کہا۔ ”آپ اپنے دولا کو بھول جائیں۔ اس طرح آپ کے اور شاکر کے تعلقات کا بھرم قائم و دائم رہے گا۔ اللہ اللہ، خیر صلاً.....!“

”میں اپنے پسپوں کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ یہ تو میری زندگی بھر کی جمع پونجی ہے؟“ وہ ہلکے ہونے انداز میں بولا۔ ”تعلقات کی سلامتی کے لیے ایسی قربانیاں تو دینا پڑتی ہیں!“ میں نے سنجیدہ چیمبر چھڑا کر عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”میرے مراسم شاکر سے ہیں، شیر افضل سے نہیں وکیل صاحب۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اور میں نے دو لاکھ روپے شیر افضل کو دیے ہیں۔ میں اپنے پیسے نہیں چھوڑ سکتا۔ شیر افضل نے مجھے دھوکا دیا ہے۔“

”یہ آپ کی غلط فہمی ہے کہ آپ شاکر اور شیر افضل کو الگ الگ سمجھ رہے ہیں۔“ میں نے اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”یہ دونوں ایک ہی شخص کے چہرے ہیں اور دونوں کو بیرون ملک بھجوانے والے فراڈ برنس میں یہ ایک دوسرے کے پارٹنر ہیں۔ شاکر اور شیر افضل کا فرائض ہو گا تو آپ کی ڈوبی ہوئی رقم باز یاب ہو سکے گی۔ آپ شاکر سے اپنے مراسم کو بچانے کے لیے سلطان شاہ کا شکر یہ ادا کریں جس کے تعاون سے میں اس کیس کو سیدھا کرنے میں کامیاب ہوا ہوں اور.....“ میں چند سیکنڈ کے لیے جھما پھر اپنی بات کو پورا کرتے ہوئے مزید کہا۔

”..... اور آپ کو اپنی دانف کا بھی بے حد شکر گزار ہونا چاہیے جس نے شیر افضل کے خلاف آواز حق بلند کرنے کی شروعات کی۔ اگر اس روز صائمہ، سلطان شاہ کے ساتھ میرے دفتر نہ آتی اور مجھے صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد مجھ سے قانونی جارہ جوتی کی درخواست نہ کرتی تو آپ ابھی تک شیر افضل کے پکڑی میں جھپٹے ہوئے اور میں ممکن تھا، آپ اپنی دکان کا سامان مال فروخت کر کے تیسرا

آواز حق

طرف دیکھا۔

”میں بینک سے فرسٹ ہاف کی چھٹی لے کر آیا ہوں اور یہاں سے فارغ ہونے کے بعد مجھے سیدھا چائے ڈیوٹی پر جانا ہے۔“ وہ منت بھرے لہجے میں بولا۔ ”سٹی کو رٹ اور لائننگی کے بیچ جتنی مسافت ہے اس کا آپ کو اچھی طرح علم ہے لہذا آپ کو مجھ سے جو کچھ پوچھنا ہے، جلدی پوچھ کر مجھے فارغ کر دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔“

”ٹھیک ہے، عدالت آپ پر یہ مہربانی ضرور کرے گی۔“ میں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا پھر میں براہ راست سوالات پر آ گیا اور پوچھا۔ ”شاکر صاحب! میری معلومات کے مطابق آپ کی رہائش اختر کالونی میں ہے اور اس کیس میں متاثرہ شخص یعنی میرے موکل نوید باری سے آپ کے دیرینہ مراسم ہیں اور آپ ہی نے نوید کو طرزم شیر افضل سے ملوایا تھا؟“

”آپ کی ساری باتیں درست ہیں۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

”آپ طرزم کو کب سے جانتے ہیں؟“ میں نے سوال کیا۔ اس نے جواب دیا۔ ”کم و بیش تین سال سے۔“

”تین سال.....!“ میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر صفائی کے گواہ سے پوچھا۔ ”یعنی جب آپ نے طرزم کو نوید باری سے ملوایا اس سے ایک سال پہلے آپ کی طرزم سے شائستگی ہوئی تھی؟“

”جی بالکل!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”اس شائستگی کا سبب کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”جیسا کہ آپ کو پتا ہے، میں ایک بینک میں کام کرتا ہوں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”شیر افضل

ہمارے بینک میں اکاؤنٹ کھلوانے آیا تھا۔“

”کیا آپ کا بینک فراڈ ویزا انکسٹن کا ایسے ہی بغیر کسی ویری فیکیشن کے اکاؤنٹ کھول دیتا ہے؟“ میں نے چپچپے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے وکیل صاحب.....“

”پھر کیسی بات ہے؟“ میں نے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔

”شیر افضل نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ اسٹیٹ کی خرید و فروخت کا کام کرتا ہے یعنی وہ ایک پراپرٹی اینجینٹ ہے اور اس سلسلے میں اس نے بینک کو ضروری ثبوت بھی مہیا کیے تھے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو مجھے بہت بعد میں پتا چلا کہ شیر افضل ویزا وغیرہ کا کام بھی کرتا ہے۔“

”شیر افضل کے ہاتھ پر رکھ چکے ہوتے.....!“ ”ٹھیک ہے وکیل صاحب!“ وہ ہتھیار چھینک کر اب ہوتے ہوئے بولا۔ ”اب میں کچھ نہیں بولوں گا۔ جو سچی کہنا چاہوں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

”اسی میں آپ کی بھلائی اور آپ کی ڈوبی ہوئی روٹم کی بازیابی کا امکان ہے۔“ میں نے کہا۔ ”روشن

میری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ میرا شکر یہ ادا کر رخصت ہو گیا۔ میں اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

میں اگلی پیشی پر توقع تو یہی کر رہا تھا کہ شاکر حاضر نہیں کیونکہ میں نے گزشتہ پیشی پر اپنے سوالات سے شیر کو اس بری طرح اپنے جال میں پھنسا لیا تھا کہ اگر شاکر ہی کے لیے عدالت کے کرے میں قدم رکھتا تو پھر اس بچت کا کوئی امکان نہیں تھا لیکن میرے اندازے کے خلاف وہ عدالت پہنچ گیا تھا۔ میں نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا تاہم میری ٹوٹی ہوئی نگاہ نے اس کے سر پر کسی ایسے تاثر کا جگر نہیں کیا جس سے پتا چلتا کہ وہ جان باحساس ہوا ہے۔

شاکر کی عمر کچھ تیس سال ہوگی۔ وہ پست قامت بلے بلی جسم کے مالک ایک مشکل پہلی کا شخص تھا۔ شاکر خامی سخت مند موٹھیں رکھ پھوڑی تھیں بلکہ ان موٹھوں کے لیے ”پال رکھی تھیں“ کے الفاظ زیادہ موزوں اور سب سے۔ ایک بات بلا سائلہ کہوں گا کہ یہ رنگ ساز شاکر کے چہرے پر بھلی لگی تھیں۔

عدالت کی کارروائی کا آغاز ہوا تو میں جرح کے لیے باکس کے نزدیک چلا گیا پھر شاکر کے چہرے پر نگاہ ڈال کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان بریکارڈ کر لیا ہے جس کا سبب یہ ہے کہ آپ اخلاقی اور قانونی طور پر میرے سوال کو درست جواب دینے کے پابند ہیں۔ آپ میری مدد کر رہے ہیں نا؟“

”اچھی طرح سمجھ رہا ہوں وکیل صاحب۔“ وہ بڑے سے بولا۔ ”اور مجھے اپنی اخلاقی و قانونی حیثیت کا بھی خیال اندازہ ہے۔ آپ مجھ سے جو بھی پوچھیں گے میں اس کو کھرا اور سچا جواب دوں گا لیکن میری آپ سے ایک بات ہے۔“

”کیسی درخواست؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی

ماہنامہ سوسٹی لائٹ

مارچ 2018ء کے

شمارے کی درجہ اول

فقہ شکر

سازش اور سود خوری کے دائرے سے نکل کے عالمی پس منظر میں چاہونے والے قتلوں کی ہوش کر بادستان..... **زویا اعجاز** کے قلم سے

انگاہی

دشمنوں کے ٹکٹے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن کا امتحان..... محبت اور جنگ کی نصف میں آگے بڑھتی **ظاہر جاوید مغل** کے ادگار سلسلے کی ایک اور کڑی **آوارہ گرد**

چلچلیاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسر پکار نو جوان کی سرگزشت..... **عبدالرب بھٹی** کی سلسلے دار کہانی

سورق کے انگ

زمین و جانکاد کے اسیر جوسز کے سترق قرار پائے..... سرورق کے خونی رنگ میں ڈوبی کہانی رشتے ناتے انتہائی نازک ہوتے ہیں.....

لوٹنے ہیں تو صرف کرجیاں رہ جاتی ہیں جو صرف زخمی کرتی ہیں..... سرورق کی نزاکت میں لپٹی کہانی

جینی نکتہ جینی

مارچ 2018ء

”یور آفر اہم شاکر کی گواہی کو چند لحظات کے لیے طرف رکھ کر بات کرتے ہیں۔“ میں نے نہایت ہی بے ہوشی کے ساتھ شروع کیا۔ ”پچھلی پٹی پر معزز نے ملزم کی میرے موکل کو فراہم کی گئی مختلف ملازمت کی فوٹو کاپیوں کو کسی ماہر لسانیات کے پاس لے کر دیا۔“ کہنے کے لیے بھیجا تھا اور اس فیٹ کی رپورٹ کے موقف کی تصدیق کرتی ہے یعنی ملزم نے جن ملازمت کو آسٹریلیا کے مختلف ڈیپارٹمنٹس سے آئے ہیں ظاہر کیا، اس اہم اور چونکا دینے والی رپورٹ کے مطابق، وہ تمام کے تمام ڈیپارٹمنٹس یہاں پاکستان میں اسی نے تیار کیے ہیں جو پاکستان میں بیٹھ کر آسٹریلیا کے ڈیپارٹمنٹس سے خط کتابت کا ڈراما اچھ کر رہا تھا۔ نوعیت کی انگلیش ڈرافٹنگ ملزم کے بس کا کام نہیں۔ ملزم اس مقدمہ کے لیے شاکر کی مدد لی یا کسی ایسی دہائی، کی..... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بچے کی بات یہ کہ ملزم نے جعل سازی کی ہے۔ جو کہ ایک سنگین نوعیت کا ہے..... میں نے نکالی تو قف کر کے ایک گہری سانس لی۔ ”اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ ملزم نے فلاں امن فلاں کے توسط سے جعلی ملازمت تیار کر کے میرے سادہ دل اور معصوم موکل پر دھوکا دیا۔“ میں نے اس تنازع کو عدالت تک لانے کا مقصد بھی یہ ہے کہ میرے موکل کو انصاف فراہم کیا جائے۔ اسی سلسلے کے حصول کے لیے میں نے اپنے دفتر میں بھی جعلی کی بھی لیکن ملزم نے وہاں شرافت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اب یہ حالت مجبوری میرے موکل کو عدالت کے دروازے پر دستک دینا پڑی۔ اگر عدالت مجھے چھوٹ کی بات دے تو میں اس کیس کے ملزم سے چند ایسے ٹیکنیکل سوالات کرنا چاہتا ہوں جس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی اٹک ہو جائے گا۔ میرے یہ سوالات ملزم کی دھوکا دہی ثابت میں آخری تیل بھی ثابت ہوں گے۔“

”پریٹن گر انڈیا“ جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ میں اکیڈمی باکس کی جانب بڑھ گیا اور ملزم کے لیے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے استفسار کیا۔ ”کیا براہ راست ہو کہ تم نے جعلی دستاویزات کی جعلیاں دکھلا کر ملزم سے دھوکا دیا ہے؟“

”آج کل کے یور آفر۔“ وکیل صفائی نے آواز پر ہی

کہا۔ ”لیکن ابھی جو آپ نے میری عدالت میں ملزم سے اعلان لالچ کیا ہے اگر بعد میں آپ کا یہ بیان غلط ثابت ہوا تو آپ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔“

”میں نے معزز عدالت کے سامنے کسی قسم کی غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ”اس لیے مجھے اپنے رب پر پورا بھروسہ ہے کہ مجھ پر کوئی آفت یا مصیبت نہیں آئے گی..... ان شاء اللہ!“

میں نے شاکر کو فارغ کر دیا۔ جب شاکر عدالت کے کمرے سے نکل گیا تو میں اکیڈمی باکس کے نزدیک آ گیا، پھر شیر افضل کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”تمہارا بزنس پارٹنر تو تمہیں ہری جمنڈی دکھا گیا ہے۔ اب تم کیا کر گئے؟“

”آپ نے اس سے جس قسم کے سوالات کیے ہیں اس پر گواہ کا بدگمان لازمی تھا۔“ شیر افضل نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”آپ نے میری ذات کے حوالے سے بہت زیادہ غلط بیانی سے کام لیا ہے۔“ بات کے اختتام پر وہ ناگوار کی سے مجھے دیکھنے لگا۔

”میں نے کیا غلط بیانی کی ہے؟“ میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں بتاتا ہوں۔“ وکیل صفائی نے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے کہا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”جناب عالی میرے موکل نے یہ ضرور تسلیم کیا ہے کہ شاکر کا نام اس شخص سے اس کی دوستی ہے لیکن اس نے کسی بھی مرحلے پر یہ نہیں کہا کہ شاکر اس کا بزنس پارٹنر ہے یا یہ کہ وہ میرے موکل کے لیے مرنے کو تیار ہے یا میرا موکل شاکر کو کسی قسم کا کیشن دیتا ہے۔ میرے موکل نے یہ اقرار کیا ہے کہ انگلیش میں عدم بھارت کے باعث وہ شاکر سے مدد سے لیا کرتا تھا تاہم اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی کہ وہ شاکر کے تعاون سے جعلی دستاویزات تیار کرتا تھا۔ یہ تمام تر باتیں جو میرے فاضل دوست نے صفائی کے گواہ شاکر کو بتائی ہیں یا وکیل موصوف نے گواہ سے جس قسم کے سوالات کیے ہیں، وہ سب وکیل استغاثہ کے اپنے ذہن کی پیدوار ہے اور ان فضول باتوں کا حقیقت سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔“

وکیل صفائی اپنے موکل کے موقف کی وضاحت کر چکا تو جج نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جیک صاحب! پورٹرن۔“

جیک کو چونکہ اس سے کوئی شکایت نہیں تھی اس لیے میں نے اس کے سائڈ بزنس پر کوئی توجہ نہیں دی۔

”اور جیسے ہی آپ کو پتا چلا کہ ملزم ویزا دلوانے کا منافع بخش سائڈ بزنس کرتا ہے تو آپ فوراً اس کے پارٹنر بن گئے تاکہ خوب دولت کمائیں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہی بات ہے نا؟“

”بالکل نہیں۔“ وہ پوری قطعیت سے گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”میں بھی شیر افضل کا پارٹنر نہیں رہا اور نہ ہی آئندہ میرا ایسا کوئی ارادہ ہے۔“

شاکر کے جواب نے مجھے سمیت حاضرین عدالت کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ جج بھی آنکھیں سکڑ کر صفائی کے گواہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سب سے بری حالت وکیل صفائی اور ملزم شیر افضل کی تھی۔ ان کا تو یہ معاملہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ شاکر ڈیفنس کا وکیل تھا لیکن اس کے جواب کی پن نے ڈیفنس ہی کے غبارے کی ساری ہوا نکال دی تھی۔ اس کا بیان ہمارے حق میں جاتا تھا یا نہیں البتہ ملزم کے خلاف ضرور جاتا تھا۔

”لیکن پچھلی پٹی پر ملزم عدالت کے روبرو اس بات کا اقرار کر چکا ہے کہ آپ اس ”ویزا بزنس“ میں اس کے پارٹنر ہیں۔ وہ تمام تر جعلی کاغذات آپ ہی کی مدد سے تیار کر داتا ہے۔“ میں نے شاکر کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا پھر اسے ساری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

وہ حیرت اور الجھن کے طے پہلے تاثرات کے ساتھ میری طرف دیکھتا رہا۔ وہ بیچ میں کچھ نہیں بولا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”اگر شیر افضل نے ایسا کچھ کہا ہے تو سراسر جھوٹ بولا ہے۔ میں اس کے کسی قول و فعل کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ مجھے مگر اپنی قبر میں جانا ہے۔ ہاں، میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے ہی نوید باری کو شیر افضل سے ملوایا تھا نوید کو ملک سے باہر جانے کا جوتن پڑھا ہوا تھا اور میرے علم میں یہ بات تھی کہ شیر افضل اس قسم کے کام کرتا ہے۔“ اگر شیر افضل نے نوید باری کے دولاکھ روپے ہتھیار لیے ہیں اور اس کا کام نہیں کیا تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے نوید پر واضح کر دیا تھا کہ میں نہیں ایک ایجنٹ سے ملوایا تھا تو یہاں لیکن پیسے کا لیکن دین تم اپنی ڈس داری پر کرنا۔ نوید اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہے۔ آپ اس سے میری بات کی تصدیق کر سکتے ہیں!“

”جیسی تصدیق کی ضرورت نہیں۔ عدالت کو ان معاملات کی خبر ہے۔“ میں نے رمان بھرے انداز میں

مارچ 2018ء

330

سپینس ڈائجسٹ

اعتراض جڑوایا۔ ”میرے فاضل دوست“ جعلی دستاویزات“ اور ”تھیلے“ کے الفاظ استعمال کر کے میرے موکل کی اسلٹ کر رہے ہیں جبکہ میرے موکل نے واضح الفاظ میں عدالت کو یہ باور کر رکھا ہے کہ اس نے یہ دولاکھ روپے نوید باری کو آسٹریلیا بھجوانے کی مد میں لیے تھے لیکن نوید کی بد قسمتی کہ کام ہو نہیں سکا۔“

”میں نے آپ کی بات محل سے سن لی میرے فاضل دوست۔“ میں نے وکیل صفائی کی جانب اٹکی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اب اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کے موکل سے وہ مثبوت سواالات کر لوں جس کی اجازت معزز عدالت آپ کے سامنے مجھے دے چکی ہے؟“

میرا انداز ایسا سنگا دینے والا تھا کہ وکیل صفائی بیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ بڑی بددلی سے اس نے کہا۔ ”جی ضرور۔۔۔۔۔“

میں نے اس کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ یہ بول آپ کے میں نے آپ کے موکل کی جو اسلٹ کی ہے، اپنی بات کے اختتام پر میں آپ کے موکل کی عزت افزائی کر کے یہ قرض مع سود اتار دوں گا۔“

وہ معاندانہ نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ ”تم نے میرے موکل سے جس کام کے لیے دولاکھ روپے بطور سے تحفے وادجو تمہاری لاکھ کوشش کے بھی ہو نہیں سکا۔“ میں نے ایکوز ڈاکس میں کھڑے ملزم شیر افضل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا اخلاقیات اس امر کا تقاضا نہیں کرتیں کہ اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے بے حد معذرت کے ساتھ تم یہ دولاکھ روپے میرے موکل کو واپس کرو؟“

”اجی مقصد کے لیے آپ نے اپنے آفس میں ایک میننگ رکھی تھی۔“ وہ اپنی عرق آلود پیشانی کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کے موکل کو کچھ رقم دینا چاہتا تھا لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس بندے نے میری بات نہیں مانی لہذا ہمارے بیچ تفریق نہیں ہو سکا تھا۔“

”ہاں۔ میں یہ بات جانتا ہوں اور مجھے وہ سب بھی معلوم ہے جس کی بنا پر تم دونوں کے درمیان سیٹل منٹ نہیں ہو سکا تھا۔“ میں نے تیز نظر سے شیر افضل کو گھورا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم میرے موکل کو بیس ہزار روپے پر ٹر خا کر اس کے ایک لاکھ اسی ہزار روپے ہضم کرنا چاہتے تھے جبکہ میرے موکل کا موقف اور میری تجویز یہ تھی کہ تم بیس ہزار روپے رکھ کر باقی کے ایک لاکھ اسی ہزار روپے

میرے موکل کو واپس کرو مگر تم اس کے لیے راضی نہیں ہوئے تھے۔“

”میں گھانے کے اس سووے کے نیچے کیوں راضی ہو جاتا؟“ وہ برا سامنا بناتے ہوئے بولا۔

”تمہارا اس میں کیا نقصان ہو رہا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کو کچھ اندازہ نہیں کہ اس کیس پر میرا کتنا خرچ ہو چکا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”درک ویز اکا پر دس کوئی بیچوں کا ٹھیل نہیں!“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ واقعی بچوں کا کھیل نہیں بلکہ یہ تم جیسے گھاگ اور خاطر کا کھیل ہی ہے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اور جہاں تک آسٹریلیا کی ایپلائی منٹ ویزا کے پر دس کی بات ہے تو میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ بچنے دو سال میں اس کام پر تم نے کتنا خرچ کیا ہوگا۔ میں تو بیس ہزار روکڑ کر تمہیں مالالاما کرنا چاہتا تھا مگر میری بات جہاں تک سمجھ میں نہیں آئی۔“

وہ بڑے جوش سے بولا۔ ”اگر آپ اس کام سے اتنی ہی زیادہ واقفیت رکھتے ہیں تو بتائیں، میں نے کتنے پیسے خرچ کیے ہوں گے؟“

اس کا اندازہ پہنچ کرنے والا تھا۔ میں نے اسے ”ویل کم“ کہتے ہوئے سسکی خیز لہجے میں بتایا۔ ”زیادہ سے زیادہ ایک ہزار روپے سکہ پاکستان رائج الوقت!“

وہ اس طرح اچھلا جیسے کسی نے اسے گیارہ ہزار دولت کا کرنٹ لگا کر جھٹکا دیا ہو۔ اس کے ساتھ اس نے سرسراہٹ بولی آواز میں کہا۔

”آسٹریلیا کے ایپلائی منٹ ڈیپارٹمنٹ میں صرف رجسٹریشن فیس ہی دو ہزار آسٹریلین ڈالرز ہے جو پاکستان کی کرنسی کے مطابق لگ بھگ اکیس ہزار روپے بنتے ہیں۔ یہ تو صرف ایک معمولی سا خرچہ ہے۔ اس کے علاوہ دس جگہ پر کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے۔“

”تم ایک ڈیڑھ کروڑ تو میں آگے بات کرتا ہوں!“ میں نے غصے خیز انداز میں کہا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ اس کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔

”آسٹریلین درک ویزا کے لیے وہاں کے ایپلائی منٹ ڈیپارٹمنٹ کی رجسٹریشن فیس دو ہزار نہیں بلکہ دس ڈالرز ہے لہذا پاکستانی کرنسی میں یہ رقم اکیس ہزار روپے نہیں، دو ہزار ایک سو روپے بنتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب تو ایک ڈیڑھ کروڑ کرنے کا مطلب تمہاری سمجھ میں آ گیا ہوگا؟“

آواز حق

وہ میرے بیان کر وہ کہتے پر توجہ دے بغیر بولا۔

اور یہ جو آپ نے میرے تمام تر اخراجات کا ماؤنٹ منٹ ایک ہزار روپے بتایا ہے، کیا یہ کوئی مذاق ہے؟“

”کیا ہمارے بیچ میں بھی مذاق کا کوئی تعلق یا رشتہ رہا ہے؟“ اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا میں نے اس سے پوچھا۔

”نہیں!“ بے ساختہ اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”بس۔۔۔۔۔ تو سمجھ لیں کہ میں نے آپ سے کوئی مذاق نہیں کیا بلکہ ایک حقیقت بیان کی ہے۔“ میں نے گھبراہٹ میں کہا۔ ”اور اس ایک ہزار کی رقم میں ایسا کوئی بھی خرچہ شامل نہیں جس کا بلا واسطہ یا بلا واسطہ میرے موکل کے آسٹریلیا جانے سے کوئی تعلق ہو۔“

وکیل صفائی کا پیروں سے ضبط کے داس کو دوپٹے کھڑا تھا۔ میرے تازہ ترین انکشاف پر اس کے مہر کا پیانا ٹھنک ٹھنکا، استغیاب یہ مگر خاصی تیز آواز میں اس نے براہ راست مجھ سے استفسار کیا۔

”پھر یہ ایک ہزار روپے کس چیز کا شاخسانہ ہے؟“

”آپ نے بہت ہی موزوں لفظ استعمال کیا ہے میرے فاضل دوست۔۔۔۔۔ شاخسانہ“ میں نے وکیل صفائی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ نہ تو کوئی افسانہ ہے اور نہ ہی آشیانہ بلکہ یہ سراسر شاخسانہ ہے ان اخراجات کا جو پچھلے دو سال میں آپ کے موکل اور اس کیس کے ملزم نے

میرے موکل اور اس کیس کے ملزم نے اخراجات کی تفصیل سمجھ اس طرح ہے۔۔۔۔۔ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر صبر سے ہوئے لہجے میں اپنی بات کی تکمیل کر دی۔

”کسی انگلش جاننے والے شخص سے ڈرافٹنگ کرانے کا معاوضہ، کسی ٹائپسٹ اینڈ ٹیلیگرافسٹ پر ایڈمنسٹریٹو اور مختلف چائے خانوں میں میرے موکل کی خاطر تواضع پر اٹھنے والی رقم۔۔۔۔۔ آپ کے موکل نے پچھلے دو سال سے اس کے سوا اور کیا ہی کیا ہے میرے فاضل دوست؟“

”تو۔۔۔۔۔ آپ معزز عدالت کو یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ گزشتہ دو برس میں میرے موکل نے آپ کے وکیل کو آسٹریلیا بھجوانے کے سلسلے میں کچھ نہیں کیا؟“

”بالکل ٹھیک کہا۔۔۔۔۔ آئی ٹی منٹ ا“ میں نے ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ اپنے اس دعوے کو سچا ثابت کر سکتے ہیں؟“ وکیل صفائی نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔

”ہنڈ ریڈ اینڈ ون پرسنٹ ا“ میں نے پورے تین سے کہا۔

”کرکس ثابت۔۔۔۔۔“ وہ شہ دلانے والے انداز میں بولا۔ ”ڈراپتو تھیلے کے آپ نے پچھلے دو تین ماہ میں کون سا ٹکنر بیٹ مینج کر لیا ہے۔۔۔۔۔!“

”کل اس کے کہ میں اپنی جرح کے سلسلے کو مزید آگے بڑھاتا، عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

بیچ نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت درخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔ ”وی کورٹ از ایڈ جرنل ا“ آئندہ پیشی سے پہلے میں نے اپنے موکل نوید باری کو دفتر بلایا اور اس کے ذمے ایک اہم کام لگانے کے بعد پوچھا۔

”کیا آپ یہ کام کر سکتے ہیں؟“

”آپ بے فکر ہو جائیں وکیل صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ”میں اس سلسلے میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔“

”آپ نے اگلی پیشی کی تاریخ نوٹ کر لی ہے نا؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی بالکل نوٹ کر لی ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اور ڈیٹنیشن بھی کر لی ہے۔“

”میں نے جو کام آپ کے سپرد کیا ہے اسے آئندہ پیشی سے ایک دو روز پہلے کرنا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بہت ضروری ہے۔“

”ہو جائے گا۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

میں نے چند ہدایات دینے کے بعد نوید باری کو رخصت کر دیا۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور ایکوز ڈاکس میں ویزا اینڈ شیر افضل کھڑا تھا۔ دوسرے اہم افراد بھی کمرائے عدالت میں موجود تھے۔ پچھلی پیشی پر میری بات مہل نہیں ہو سکی تھی۔ عدالت کی کارروائی کا آغاز ہوا تو میں نے روئے سخن بیچ کی جانب کرتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی اگر شیش پیشی پر وقت کی کمی کے باعث میری بات ادھوری رہ گئی تھی۔ میں جرح کے سلسلے کو وہیں سے شروع کروں گا جہاں سے رابطہ منقطع ہوا تھا۔ میرے فاضل دوست نے باوجود میرے کندھوں پر لا ور رکھا ہے۔ میں آج کی کارروائی میں یہ بوجھ ملزم کی مدد سے اپنے کندھوں سے اتار بیچوں گا اس طرح میرے فاضل دوست کا مطالبہ بھی پورا ہو جائے گا اور میرے موکل کے

لے انصاف کا حصول بھی آخری اور تین مرتبے میں داخل ہو جائے گا۔" لچائی توقف کر کے میں نے وکیل صفائی کی جانب دیکھا اور شرارت بھرے لہجے میں پوچھا۔
 "میرے فاضل دوست! آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟"
 وکیل صفائی نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔
 میں طنز شیر افضل کی جانب متوجہ ہو گیا اور اس سے پوچھا۔ "کیا تم اس بات سے اتفاق کرتے ہو کہ تم نے میرے موکل سے دو لاکھ روپے لے رکھے ہیں؟"
 "نہیں، میں انکار نہیں کر سکتا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اور یہ بات میں نے آپ کے نوٹس کے جواب میں بھی لکھی تھی، مطلب یہ کہ میں نے نوید باری سے دو لاکھ روپے لینے کا اقرار کیا تھا۔"
 "مذکورہ جوابی نوٹس میں تو تم نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ..... مقررہ مدت میں، میں اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکا..... تو اس صورت میں تمہیں میرے موکل کے دو لاکھ روپے واپس نہیں کر دینا چاہیے؟"
 "آپ جس نوٹس کے جواب کی بات کر رہے ہیں، وہ وہ میں نے نہیں، آپ نے ذرا فٹ کیا تھا۔" وہ قدرے ہلکی بھر سے انداز میں بولا۔
 "وہ اس لیے کہ تم انگلیں لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس جوابی نوٹس کا مضمون پڑھ کر تمہیں سنایا اور سمجھایا تھا۔ مطمئن ہونے کے بعد ہی تم نے اس پر دستخط کیے تھے۔ مذکورہ لیٹر اس وقت بھی میری ایک فائل میں موجود ہے۔ اگر تم میری بات کو جھٹلاؤ گے تو میں بطور ثبوت اسے عدالت میں پیش کر دوں گا۔"
 "م..... میں آپ کی بات کو جھٹلا نہیں رہا۔" وہ تھوک نکلتے ہوئے بولا۔ "میں تو آپ کو یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آسٹریلیا والے مشن میں ناکامی کے بعد میں نوید باری کو یورپ کے کسی ملک بھجوانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ اللہ کا بندہ اس معاملے کو عدالت میں لے آیا ہے۔"
 "وہ اس لیے کہ اس اللہ کے بندے کی آنکھوں پر تم نے اپنی چالاک کی جو پٹنی باندھ کر اس سے دو لاکھ روپے پورے لیے تھے، وہ پٹنی ایک نیک حل تھی اور میرے موکل کو سب کچھ واضح نظر آنے لگا۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "کیا آسٹریلیا کے محاذ پر تمہیں ہمیشہ منہ کی کھانا پڑتی ہے یا....." میں بھی رخ بھی نہیں ہنسی ہوئی ہے؟"
 "یہ پہلا کیس ہے جس میں مڑبڑ ہوئی۔" وہ اپنی

صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ "ورنہ نوید باری سے پہلے ان کبھی نہیں ہوا۔"
 شیر افضل غیر محسوس انداز میں دھیرے دھیرے، میرے بچھائے ہوئے جال میں پھنستا چلا جا رہا تھا۔ میں نے سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔
 "یعنی تم یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہو کہ نوید باری سے پہلے تم کافی لوگوں کو آسٹریلیا کے ویزا دلوا چکے ہو؟"
 "جی بالکل۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میرا یہی مطلب تھا۔"
 "میرے موکل سے پہلے تم نے کتنے افراد کو آسٹریلیا بھجوا دیا ہے؟" میں نے جرح کے سلسلے میں تیزی لاتے ہوئے کہا۔
 "بہت سے لوگوں کو....." اس نے گول مول جواب دیا۔
 میں نے جیسے ہی لہجے میں استفسار کیا۔ "اسی نوعیت کے جعلی ڈاکومنٹس پر تم نے لوگوں کو آسٹریلیا بھجواتے ہو میرے موکل کے کس میں فالوں کا پیٹ بھر رہے ہیں؟"
 "آپ کی نظر میں یہ ڈاکومنٹس جعلی ہوں گے۔" وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولا۔ "لیکن میں اپنے کام سے مطمئن ہوں۔"
 "تمہارے اطمینان سے بات نہیں بنے گی، یہاں پر معزز عدالت کو مطمئن کرنے کا مسئلہ ہے اور عدالت کے اطمینان کے لیے ٹھوس ثبوت چاہیے ہوتے ہیں۔" میں نے کڑے تیوروں سے شیر افضل کو گھورا۔ "اگر تم نے لاتعداد افراد کو آسٹریلیا بھجوا دیے تو معزز عدالت کو صرف پانچ خوش نصیب افراد کے نام بتاؤ جو تمہارے توسط سے آسٹریلیا جاسکے ہیں۔ فرضی نام لگواتے ہوئے ایک بات ذہن میں رکھنا کہ میں چور کو اس کے گھر تک پہنچا کرتا ہوں۔ تم جن افراد کے نام دو گے، میں ان کے لواحقین کو گواہی کے لیے عدالت بھی بلواسکتا ہوں!"
 شیر افضل، شیر تھا اور نہ افضل۔ اس کی شخصیت اور لہجے دار باتوں کا سارا جاوہار جی حیثیت کا حامل تھا۔ اندر سے چونکہ وہ بالکل خالی تھا چنانچہ وہ میری دھمکی کے دباؤ میں آ گیا اور گھبراہٹ ہوئی آواز میں بولا۔
 "اس وقت مجھے کسی کام یا نوٹس آ رہا....."
 "تم جس دھندے سے لگے ہوئے ہو وہ میرا غیر قانونی ہے۔" میں نے تانا بھونکا کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "اسے جینیٹل زبان میں جیومن ٹریفکنگ HUMAN TRAFFICKING یعنی انسانوں

اسے گینگ کہا جاتا ہے جس کی بڑی کڑی سزا ہے!"
 "میں تمام کام ڈاکومنٹس پر کرتا ہوں۔" وہ خود کو جاننے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "میرا کام غیر قانونی نہیں ہے۔"
 "ٹھیک ہے، اب ہم تمہارے ڈاکومنٹس کی صحت کا سٹ مارٹم کرتے ہیں۔" میں نے حد درجہ کڑے لہجے میں کہا۔ "اس کے ساتھ ہی آسٹریلیا کے قوانین اور وہاں کے طریقوں کی بھی بات ہوگی۔ تم تیار ہو؟"
 آخری جملہ میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا گر کر گر گیا۔ اس کی آنکھوں میں موجود تھرات سے جھلکتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت اکیڈمی ڈاکس میں سے نکل کر کمرائے عدالت کے دروازے کی سمت دوڑ لگا دے گا۔ گویا لوہا گرم چمکا تھا۔ اب مجھے دو چار کاری چوٹیں لگنا تھیں۔
 "جی..... میں تیار ہوں۔" وہ تھوک نکل کر خیف سی آواز میں بولا۔
 "کیا تم جانتے ہو، پاکستان میں بھی اور سیز ایملانی ڈاکومنٹس موجود ہے۔" میں نے کہا۔ "جو بیرون ملک کرکام کرنے کے خواہش مند پاکستانی افراد کے لیے ان کی طبیعت اور فنی قابلیت کے مطابق پوری دنیا میں جاب سرچ کرتا ہے اور انہیں ورک ویزا کی سہولیات مہیا کرتا ہے؟"
 "جی..... میں جانتا ہوں۔" وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔
 "مجھے تمہارا اس ڈاکومنٹس میں جانے کا اتفاق ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔
 "نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "میں نے کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"
 "تم نے ضرورت اس لیے محسوس نہیں کی کیونکہ تم تو مہاراست آسٹریلیا ورک ویزا ڈاکومنٹس کے ساتھ شلک ہو؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
 وہ کچھ نہیں بولا۔ میں نے پوچھا۔
 "آئی ایل او کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"
 "یہ کیا ہوتا ہے؟" وہ ابھن آمیز حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔
 "آئی ایل او کا مطلب ہے..... انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس ادارے کا نام سننا ہے؟"
 "نہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"میں نے بتا دیا ہے اور وہ بھی بغیر فیس وصول کیے....." میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اب اسے یاد رکھنا۔ تمہارے بہت کام آئے گا کیونکہ اس فیس سے منہنے کے بعد تم نے کوئی شرط نہ کام کر کے رزق حلال تو کماتا نہیں ہے۔ آجاکر تمہارے پاس یہی ایک کام ہے..... میرے گھر اور مال بنانا..... اگر دوبارہ کہیں پچھن گئے تو میری فراہم کردہ معلومات تمہارے کام آئیں گی....." لچائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
 "آئی ایل او دنیا بھر کے ممالک کے ورک ویزا ڈاکومنٹس کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس کے بنائے ہوئے قواعد و ضوابط ہر ملک کے مختلف ڈاکومنٹس کو ماننا پڑتے ہیں۔ آئی ایل او نے ایک "لیبر ایگری منٹ" نامی ڈاکومنٹ تیار کر رکھا ہے جو دنیا کے دیگر ممالک کی طرح آسٹریلیا ورک ویزا ایورو کے پاس بھی موجود ہے۔ جب بھی آسٹریلیا ورک ویزا ڈاکومنٹس ملازمت کے خواہش مند کسی شخص کے ساتھ خط کتابت شروع کرتا ہے تو پہلے ہی مرطبہ پر فارم کے ساتھ اس لیبر ایگری منٹ کی ایک کاپی بھی متعلقہ شخص کو بھیجی جاتی ہے۔ تم نے میرے موکل کے کیس کے سلسلے میں جو کاغذات کا پلندا جمع کیا ہے اس میں مجھے مذکورہ "لیبر ایگری منٹ" کی کاپی کہیں نظر نہیں آئی۔ اس غیر حاضری کی وضاحت کرو گے؟"
 "ان لوگوں نے جو کچھ بھیجا وہ میرے پاس موجود ہے۔" وہ بے بسی سے بولا۔ "اگر وہ لیبر ایگری منٹ کی کاپی بھیجنا بھول گئے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے!"
 "تمہارا کوئی قصور نہیں!" میں نے زہر میں بچھے ہوئے الفاظ میں کہا۔ "یہ آسٹریلیا ورک ویزا ایورو کی بھول ہے۔ انہوں نے آئی ایل او کے تیار کردہ "لیبر ایگری منٹ" کی کاپی تمہیں نہیں بھیجی۔ اس غلطی پر تو ممکن ہے آئی ایل او آسٹریلیا ورک ویزا ڈاکومنٹس کو معاف کر دے لیکن آسٹریلیا ورک ویزا ڈاکومنٹس کی ایک سنگین غلطی کو کبھی درگزر نہیں کر سکتی۔ ورک ویزا ڈاکومنٹس کا یہ تصور گردن زدنی ہے۔"
 "کون سا قصور؟" بے ساختہ اس کے منہ سے لکھا۔
 "مجی جو..... وہ..... آپ کے ساتھ..... پاکستانی اسٹائل کی..... انگلیں میں خط کتابت کر رہے ہیں۔" میں نے ٹھہر ٹھہر کر اس کی طبیعت صاف کرتے ہوئے کہا۔ "عدالت کے حکم پر تمہارے فراہم کردہ کاغذات کا جرسائی ٹیسٹ ہوا

ہے اس کا نتیجہ میرا ہر تہارے خلاف جاتا ہے۔“
 ”پہلے پانی.....“ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان
 پھیرتے ہوئے بولا۔ ”میں شدید پیاس محسوس کر رہا ہوں۔“
 مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی وقت محسوس نہیں
 ہوئی کہ شیر افضل اندر سے بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ ان
 لمحات میں وہ ”نہ پائے رفق، نہ جانے ماندن“ ایسی کیفیت
 سے دو چار دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اپنی جرح کو اخلاقی
 مرحلے میں داخل کرتے ہوئے پیکار کرنے والے انداز میں
 مزمل سے کہا۔

”تمہارے خشک حلق کو تر کرنے کا بندوبست کیا
 جائے گا لیکن پانی سے نہیں بلکہ دودھ سے اور وہ بھی
 آسٹریلیاں ریڈ کاؤڈ (سرخ گائے) کے دودھ سے۔“
 وہ خوفزدہ نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔

میں نے جارحانہ انداز میں استفسار کیا۔ ”تم نے
 میرے سوکھل کو آسٹریلیا کے کسی ڈیری فارم میں ملازمت
 دلوانے کی بات کی تھی نا؟“
 ”جی.....“ وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

”تمہارے فراہم کردہ کاغذات میں آسٹریلیا کے
 کسی ڈیری فارم کا نام دیکھنے کو نہیں ملتا۔“ میں نے سخت لہجے
 میں کہا۔ ”آسٹریلیا میں کم و بیش چھ ہزار چار سو ڈیری فارم
 ہیں جن میں لگ بھگ تینتالیس ہزار ملازمین کام کر رہے
 ہیں۔ کیا تم معزز عدالت کو بتاؤ گے کہ میرے سوکھل کو تم کس
 ڈیری فارم میں جاب دلوا رہے تھے؟“
 ”اس وقت مجھے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا.....“ وہ عجیب
 سے لہجے میں بولا۔

”جیل جا کر تمہاری یادداشت واپس آ ہی جائے
 گی لیکن میں یہاں بھی تمہیں یاد دلانے کی کوشش کرتا
 ہوں۔“ میں نے گرتی ہوئی دیوار کو ایک اور دھکا دیتے
 ہوئے کہا۔ ”آسٹریلیا کے چھ بڑے حصوں میں ڈیری
 فارم قائم ہیں۔ تم میرے سوکھل کو جس ڈیری فارم میں
 ملازمت دلوا رہے تھے اس علاقے کا نام بتا دو؟“

شیر افضل کے پاس میرے اس سوال کا کوئی جواب
 نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔
 ”تمہیں اس لیے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا کیونکہ تمہارا سارا جیل
 جھوٹ اور جھوٹا دہی پر مبنی ہے۔ وہ حقیقت تم آسٹریلیا کے
 بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے
 آسٹریلیا کے ان چھ علاقوں کا ذکر کیا ہے۔ وکٹوریہ، ساؤتھ
 آسٹریلیا، نیو ساؤتھ ویلز، کوئینزلینڈ، تسمانیا اور ویسٹرن

آسٹریلیا۔ اب تم سے آخری سوال.....“ میں نے ڈراہٹ
 انداز میں بات اسوری چھوڑ کر فاتحانہ انداز میں وکیل صاحب
 کی طرف دیکھا پھر مزمل شیر افضل سے استفسار کیا۔
 ”آسٹریلیا کے دارالحکومت کا نام کیا ہے؟“
 ”سڈنی!“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔
 میں نے کہا۔ ”اگر تم ایمانداری سے کام کر رہے
 ہو تو میرے اس سوال کا بالکل درست جواب دیجئے۔“
 وہ اپنے جواب کی غیر محسوس دیوار کو پست کر رہے تھے۔
 بولا۔ ”پرچھ.....!“

”تم ایک دھوکے باز..... ہی نہیں بلکہ ایک تالان
 ایجنٹ بھی ہو۔“ میں نے کہا۔
 ”سیلیورن۔“ وہ سرخ روئی کی کوشش میں مصروف رہا۔
 ”بالکل غلط!“ میں نے ناپسندیدہ نظر سے اسے گھورا۔
 وہ زچ ہوتے ہوئے شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

”پھر آپ ہی بتادیں!“
 میں نے بتایا۔ ”کینیبرا۔“
 ”اوہ.....“ وہ مکاری سے بولا۔ ”میں یہ بتانے آیا
 والا تھا۔“

”یہ بتانے کا موقع تو جاتا رہا۔“ میں نے معنی بخیز
 انداز میں کہا۔ ”اب تم وہ بتا دو.....!“
 ”وہ کیا؟“ وہ حیرت بھرے لہجے میں متغیر ہوا۔
 ”کہ..... تم میرے سوکھل کے دو لاکھ کب واپس
 کر رہے ہو؟“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
 ”آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ اس پروس.....“ وہ

اپنی بات پوری نہ کر سکا۔
 ”عدالت کو یہ خوبی اندازہ ہو چکا ہے کہ تم دھوکا دہی
 کے اس مذموم کاروبار کو کس طرح جھوٹ اور جعل سازی کی
 مدد سے چلا رہے ہو۔“ جج نے گونا گونا نظر سے مزمل کی جانب
 دیکھتے ہوئے کہا۔ ”عدالتی کارروائی میں متعدد مقامات پر
 تمہاری غلط بیانیوں کا راز فاش ہو چکا ہے۔ اگر باقی کی
 زندگی جیل کی سنگٹاؤں و دیواروں کے پیچھے گزارنے کا ارادہ
 نہیں رکھتے تو یہ ڈراما بازی بند کرو اور بیگ صاحب کے
 سوال کا سیدھا جواب دو۔“

جج کے ریمارکس نے کھلے عام یہ بتا دیا تھا کہ عدالت
 نے میرے سوکھل کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ جج کی
 بات نے شیر افضل کی رہی سہی ہمت کی لٹیا بھی ڈوبی۔ وہ
 یکا یک صدیوں کا بیمار نظر آنے لگا۔ وہ جج کو مخاطب کرتے
 ہوئے ملبغیانہ انداز میں بولا۔

”سرا میری مالی پوزیشن ایسی نہیں ہے کہ میں ایک
 مہشت دولا کھ دوں اور ادا کر سکوں۔“
 شیر افضل کے جواب نے یہ تو ثابت کر دیا کہ اس نے
 دولا کھ روپے واپس کرنے کا ارادہ کر لیا ہے، گویا وہ اپنے
 ہجوم کا اقرار کر چکا تھا۔ جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”تم نے جس طرح دو قسطوں میں نوید باری سے دو
 لاکھ روپے وصول کیے تھے، اسی طرح دو قسطوں میں عرصہ
 سات یوم کے اندر یہ رقم اس کے حق دار کو واپس کر دو۔“
 ”سرا مجھے بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے
 کہ میں اس وقت بہت مجبور دولا جا رہا ہوں۔“ شیر افضل
 روئی صورت بنا کر بولا۔ ”میں پچھلے کچھ عرصے سے مالی
 بحران کا شکار ہوں۔ اگر عدالت اس رقم کی واپسی کے لیے
 پانچ ہزار روپے ماہانہ کی قسط باندھ دے تو میں بے حد شکر
 گزار ہوں گا۔“

”ہرگز نہیں!“ میں نے شیر افضل کی جانب دیکھتے
 ہوئے قطعی لہجے میں کہا۔ ”دولا کھ کی یہ رقم تم ایک مہشت ہی
 ادا کرو گے اور وہ بھی ایک دو روز میں۔ ادا کاری کر کے تم
 عدالت کی ہمدردی حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ خوشکر کہ تم سے
 اصل زری واپس لیا جا رہا ہے ورنہ اگر اس کے اندر تمام تر
 اس کیس کے عدالتی اخراجات کو بھی شامل کر لیا جائے اور
 لگے ہاتھوں اس رقم پر دو سال کا مارک اپ بھی ایڈ کر دیا
 جائے تو تخمینہ تین لاکھ تک جا پہنچے گا۔ میں جانتا ہوں کہ تم آج
 کا سورج غروب ہونے سے پہلے یہ آسانی میرے سوکھل کو
 دولا کھ روپے ادا کر سکتے کی پوزیشن میں ہو۔“

”بیگ صاحب!“ جج نے چونک کر میری جانب
 دیکھا اور پوچھا۔ ”آپ کس طرح اتنے دتوں کے ساتھ یہ
 بات کہہ رہے ہیں؟“

”جناب عالی! میرے پاس اپنی بات کو سچا ثابت
 کرنے کا ٹھوس ثبوت موجود ہے۔“ میں نے گھیر انداز
 میں کہا۔

”کیا آپ وہ خوش ثبوت عدالت کے ظلم میں لائیں
 گے؟“ جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔
 ”جی ضرور.....“ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی فائل
 میں سے ایک کاغذ نکال کر جج کی جانب بڑھاتے ہوئے
 کہا۔ ”یہ رہا وہ خوش ثبوت۔“

”اوہ.....!“ جج نے مذکورہ کاغذ پر نگاہ ڈالتے ہوئے
 کہا۔ ”یہ تو بیگ اسٹیٹ منٹ ہے جس کا کوڈنگ سسٹمز چار
 لاکھ تیرہ ہزار چھ سو چار روپے ہے۔“

میں نے نوید باری سے کہہ کر شاگرد کے تعاون سے
 مزمل شیر افضل کی بیگ اسٹیٹ منٹ نکلوئی تھی۔ اس زمانے
 میں آج کی طرح کمپیوٹرائزڈ بیگ اسٹیٹ منٹ نہیں ہوا
 کرتی تھی۔ اس وقت اسٹیٹ منٹ میں بہت سا کام ونڈ
 میڈ بھی ہوا کرتا تھا۔

”میں نے اپنے ذرائع سے یہ بیگ اسٹیٹ منٹ
 نکلوائی ہے۔“ میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”معزز عدالت! اپنے ذرائع استعمال کر کے متعلقہ بیگ سے
 اس اسٹیٹ منٹ کی ویری فیکیشن کروا سکتی ہے۔ اس
 دستاویز میں ظاہر ہونے والا تینتالیس ایک روز پہلے کا ہے یعنی
 مزمل کی فائل پوزیشن ایسی ہے کہ آئندہ دو مہینے گھٹنے کے
 اندر اگر یہ چاہے تو میرے سوکھل کو یکدمشت پے منٹ
 کر سکتا ہے۔“

جج نے مزمل کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ”پے
 منٹ کی ادائیگی کے لیے دو دن کی مہلت کافی ہے؟“
 جج اگر حکم دیتا کہ ابھی اور اسی وقت نوید باری کو فائل
 پے منٹ کر دو تو بھی شیر افضل کے پاس انکار کی گنجائش نہیں بچی
 تھی۔ جج کے سوال کے جواب میں مزمل نے مرئی سی آواز
 میں کہا۔

”جی..... شک ہے.....“

☆☆☆

نوید باری کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس کی ڈوبی
 ہوئی دولا کھ کی رقم قانونی چارہ جوئی کے مجبوری اثرات سے
 باز باہ ہو گئی تھی۔ میں نے اپنی جرح کی رسیوں کی مدد سے
 شیر افضل کو کمرائے عدالت میں اس طرح باندھ دیا تھا کہ وہ
 مل نہیں سکتا تھا، اس کے پاس کوئی بھی راہ فرار اور کوئی بھی
 جائے پناہ نہیں بچی تھی۔ اگر وہ احمق میری بات مان لیتا تو
 یقیناً فائدے میں رہتا۔ میں اسے عدالت کے باہر اپنے
 آفس میں بیٹھ کر روپے دلوا رہا تھا۔ وہ اگر ایک لاکھ اسی
 ہزار روپے میرے سوکھل کو واپس کرنے کے لیے راضی
 ہو جاتا تو یہ معاملہ اسی روز میرے آفس ہی میں منٹ جاتا
 لیکن شیر افضل کو توقع نہیں تھی کہ میں اسے عدالت میں اس
 بری طرح بے بس دولا جا کر کے رکھ دوں گا۔

انسان کی توقعات بعض اوقات اس کا کھانا کر کے
 رکھ دیتی ہیں اور اگر انسان برائی کی راہ پر گامزن ہو تو بھر
 قدرت کے فیصلے اس کا ستیاس نہیں بلکہ سواستیا ناس مار
 دیتے ہیں۔ شیر افضل کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔
 یہ ظاہر ہے کہ جس بدخیز و خوبی اپنے قطعی انجام کو پہنچ گیا



خلش

نعمان اسحاق

غلط فیصلے ہمیشہ غلط نتائج کو جنم دیتے ہیں... اور یہ غلطی بغیر کسی تغریق کیے کسی سے بھی ہو سکتی ہے جیسے کہ اس کی ماں... جو اس کی سرمدیلی بھی تھی، جانے کیوں اپنے دل پر لگے ہوئے زخم کی قیس کو جان نہ سکی اور نہ ہی اپنی بیٹی کے دل میں چھپی خلش کو سمجھ سکی کیونکہ... وہ غلطی پر تھی اور یہی بات وقت نے بھی سچ ثابت کر دی۔

زندگی کے بھائے درد کو جینے والی ایک حسرت کی دلدور کھانا

”صغیر ہرگز غیر ذمے دار نہیں۔ یہ تو اس کی بیوی کی طبیعت خراب تھی۔ اسے اسپتال لے جانا تھا اس لیے چھٹی کر لی اور تم کہنے اور چکر کاٹو گی... بیٹہ جاؤ۔ تھک جاؤ گی چندا۔“ رقیہ ساتھ کرسی پر بیٹھی تھیں اور اب محبت سے بیٹی کو بھی ساتھ دانی کرسی پر بیٹھنے کا کہہ رہی تھیں۔

”ہونہ... مجھے نہیں پتا۔ میرا آج کا پروگرام تو خراب ہو گیا نا۔ ادھر کالج میں میری سہیلیاں انتظار کر رہی ہوں گی۔“ وہ ہنوز منہ پھلائے کھڑی تھی۔

گھر کی خوبہ روٹی دیدنی تھی۔ ایک نظر جو پڑتی تو مزہ کر دوسری بار دیکھنے کا دل کرتا۔ سیاہ آٹنی گیٹ، سفید روغن سے نہائی دیواریں اور دیواروں سے جمائی پڑے ٹکڑے عمارت جس کے لان میں عائنہ سے بیٹھی سے ادھر ادھر پھر کاٹ رہی تھی۔ مٹھیاں بیچنے منہ پھلائے وہ دنیا بھر سے ناراض لگتی۔

”اُمی! آپ ایسے غیر ذمے دار ملازم رکھتی کیوں ہیں۔“ وہ بیزار سے لہجے میں ماں سے کہہ رہی تھی۔

سے دور، بہت دور ہو جانا چاہیے اور پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ اس روز عدالت میں میری وہ گواہی اس تبدیلی کی شروعات تھی۔ وہ دن اور آج کا دن، میں نہ بھی شیر افضل سے ملا اور نہ ہی اس سے کوئی واسطہ رکھا۔ وہ اپنے کسی کام سے بینک میں آتا بھی تھا تو میں اس کے لیے ابھی بن جاتا تھا۔ پھر کوشش کر کے میں نے اپنا تبادلہ دوسری برانچ میں کر دیا۔ میں شیر افضل سے دور تو ہو گیا تھا لیکن میرے اندر سکون کا فقدان تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اطمینان قلب کے لیے کیا کروں۔ پھر کل بیٹھے بیٹھے میرے ذہن میں آیا مجھے اپنا پورا راز کسی سے شیئر کرنا چاہیے۔ مجھے آپ سے زیادہ معقول شخص اور کوئی دکھائی نہیں دیتا تو آپ کے پاس آ گیا۔“

”آپ نے بہت اچھا کیا۔“ اس کی بات مکمل ہوئی تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اندرا کا غبار دھونے سے سن پا کا ہو جاتا ہے۔ اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟“

”بہت پرسکون اور مطمئن۔“ اس نے جواب دیا۔

”گڈ...“ میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔ ”مبارک ہو، آپ کا مسئلہ حل ہو گیا۔“

”مسئلہ تو حل ہو گیا...“ وہ قدرے الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ”لیکن ایک سوال کا جواب نہیں مل رہا...“

”کون سا سوال؟“ میں پوچھنے پر تیار نہ رہا۔

”وہ آواز کیا چیز تھی؟“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جس نے سینڈ کے ہزاروں حصے میں میری دنیا بدل ڈالی؟“

”آپ اس آواز کی حقیقت جاننا چاہتے ہیں؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”ضرور... اسی لیے تو آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔“ وہ عقیدت بھرے لہجے میں بولا۔

”وہ آواز حق تھی۔“ میں نے پرسوج انداز میں کہا۔

”جب حق کسی انسان کو بدلنا چاہتا ہے تو وہ اس کے اندر اسی طور کو جنم دیتا ہے، پھر وہ بندہ حق شناس ہو جاتا ہے۔“

”اب میرا مسئلہ مکمل طور پر حل ہو گیا ہے۔“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”حق آپ کا بھلا کرے...!“

میں نے شاکر کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور جتنی خاموشی سے وہ آیا تھا ویسے ہی چپ چاپ رخصت ہو گیا۔

(تحریر: حسام بٹ)

تھا۔ نوید باری کو اس کی رقم واپس مل گئی تھی اور اس نے کبھی بھی ملک سے باہر جا کر روزی مکتا سے توبہ کر لی تھی۔ میں بھی مطمئن ہو کر اپنے روزمرہ کے پیشہ وارانہ کاموں میں مصروف ہو گیا تھا لیکن لگ بھگ آٹھ ماہ کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس کیس کو فائنل ٹیچ لگا دیا۔

ایک شام میں حسب معمول اپنے آفس میں موجود تھا کہ شاکر مجھ سے ملے آ گیا۔ وہی شاکر جس کے نوید باری کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے اور جو لائڈنگ کے کسی بینک میں کام کرتا تھا اور اسی شاکر کی گواہی نے شیر افضل اور وکیل صفائی کے منہ پر طمانچہ رسید کر دیا تھا۔

”رہی ملک سلیک کے بعد وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔“

”وکیل صاحب! میں آپ کے پاس اپنے ایک ذاتی کام سے آیا ہوں۔“

”جی فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ میں نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

”کافی دنوں سے میرے دل و دماغ پر ایک بوجھ ہے۔“ وہ قدرے آگے کو جھٹتے ہوئے بولا۔ ”آپ اسے میرے نمبر کی تلاش بھی کر سکتے ہیں۔“

”میں جتنی کوشش ہوں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”آپ جو بھی کہنا چاہتے ہیں، بے دھڑک کہہ ڈالیں۔“

”اس روز عدالت میں، میں نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ خاموشی نظر سے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”حقیقت یہ ہے کہ میں کافی عرصے تک شیر افضل کے ساتھ کام کرتا رہا تھا۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ دیانتداری سے کام کر رہا ہے لہذا مختلف نوعیت کی ڈرافٹنگ میں، میں اس کی مدد کر دیا کرتا تھا جس کے عوض وہ مجھے کچھ رقم بھی دے دیا کرتا تھا لیکن نوید باری کے کیس نے شیر افضل کے جھوٹ کی قلعی کھول کر اس کی دھوکا دہی کو میری نگاہ میں آشکار کر دیا۔ جب شیر افضل کا گناہ ثابت کر دیا میرے سامنے کھلا تو اسی لمحے میرے اندر ایک آواز ابھری...“

”تمہاری حق توقت کر کے اس نے ایک بھر جھری لی پھر اپنا بت مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اس آواز میں بڑی توانائی، بڑی تحریک تھی۔ کوئی میرے اندر بول رہا تھا اور مجھے تعین کر رہا تھا کہ مجھے فوراً سے جیٹر دلی، دماغی، جسمانی اور روحانی طور پر شیر افضل

در اصل آج اس کے کالج میں میوزیکل شو تھا۔ ملک کا سب سے بڑا گلوکار گانے کے لیے آ رہا تھا اور اسے کالج چھوڑنے کی ذمہ داری ڈرائیور مندر کی تھی۔ ارادہ تو تو قیر صاحب کا تھا کہ وہ بیٹی کو کالج ڈراپ کروں گے مگر فیکلٹی میں کلائنٹ کی غیر متوقع آمد کی وجہ سے انہیں جلدی لگنا پڑا اور یوں عائشہ جیسے گھر میں قید ہو کر رہ گئی۔ کالج جانے کا کوئی وسیلہ بنا نظر نہ آتا تھا۔

”میں خود گاڑی ڈرائیو کر کے چلی جاتی ہوں۔“

اسے یکدم خیال آیا۔

”نہیں.....“ رقیہ نے نقلی طور پر منع کیا۔

”کیا ملے ہوا تھا کہ کالج سے فراغت سے پہلے تم ڈرائیو نہیں کرو گی اور تمہیں ڈرائیو کرنا آتا بھی کہاں ہے۔ پھر کہیں گاڑی کھرا دو گی۔“

”ادہ امی! اب اسکی بری ڈرائیو بھی نہیں ہوں۔ کچھ نہیں ہوتا۔ اب کیا ضرورت کے تحت بھی ڈرائیو نہ کروں۔ میرا کالج جانا ہے ضروری ہے۔ آپ جانتی ہیں میرا پسینہ بدہ منکر آ رہا ہے۔“ وہ ماں کو قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

گھر رقیہ کا سفر فی میں ہوتا رہا۔

تجلی ملازم کی بیرونی میں ایک ٹوکا لان کی طرف آتا دکھائی دیا۔

بال کا، جیٹا۔ چہرے پر جوانی کے دھنک رنگ لیے، بال سلیپے سے جہازے۔

”السلام علیکم خالہ!“ رقیہ کے سامنے اس نے سر جھکایا۔

”وعلیکم السلام!“ رقیہ نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

”کیسے ہو چتا؟“ انہوں نے اسے ہنسنے کا اشارہ کیا تو یاسر کرسی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

یاسر کو کچھ کہنے بھر کو عائشہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”سنو تم ڈرائیو کر لیتے ہوتا۔ مجھے پلیر کالج چھوڑ دو۔ ڈرائیو چھٹی پر ہے اور میرا کالج جانا بہت ضروری ہے۔“ وہ بھی یاسر کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

”عائشہ.....!“ رقیہ کے لیے میں تنبیہ تھی۔“ اسے آرام سے سانس تو لینے دو۔ چائے تو پی لے۔“

”ادہ امی! وہ چائے پی کر آیا ہے۔ یاسر تم چائے تو نہیں پیے گئے؟“ وہ اب یاسر سے مخاطب تھی۔

”وہ نہیں۔“ بانیجہ۔ پر تو میری ساری لک خراب ہو جائے گی۔ تم پلیر کچھ تکلیف اٹھا لو۔ مجھے گاڑی میں ڈراپ کر دو۔“ واپسی پر اپنی بانیجہ نے لے لیا تو پھر چلیں۔“ اس نے چابی یاسر کی طرف بڑھا دی۔ یاسر نے مسکرا کر چابی تھام لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”خالہ! یہ ای نے پیسے بھجوائے ہیں!“ اس نے شرٹ کی سامنے والی جیب سے پیسے نکال کر رقیہ کی طرف بڑھائے۔

”ادہ یہ خدیجہ بھی حد کرتی ہے۔ یہ معمولی سی تو رقم تھی۔ اب اس کی واپسی کی کیا تک تھی۔ اب تم سے نلانی تو ناراض ہو گی۔ بہنوں میں اتنے چھوٹے موٹے حساب کیا اچھے لگتے ہیں۔“ خفگی سے کہتے ہوئے انہوں نے رقم تھام لی۔

”چلو عائشہ کو چھوڑ آؤ۔ واپسی پر کب شپ لگاتے ہیں۔“ رقیہ نے کہا تو یاسر اور عائشہ روانہ ہو گئے۔

”تم آج معمول سے زیادہ ونڈم لگ رہے ہو۔“ جب گاڑی میں گیسٹ پارکر رہی تھی تب عائشہ نے کہا تھا۔

”لے بھر کو یاسر کا دل اچھل پھل ہو گیا۔ زمانہ تیز نہ تھا مگر عائشہ ماڈرن لڑکی تھی۔“

”تعریف کے لیے شکر یہ۔ تمہاری پڑھائی کسی جا رہی ہے۔“

گاڑی میں روڈ پر آ گئی تھی۔

”پڑھائی.....“ عائشہ طویل سانس لے کر رہ گئی۔

”اب تمہیں کیا باتوں۔ پڑھائی کے نام پر کیا وبال پال لیا، کبھی سوچتی ہوں۔“

”میں ایسے نہیں سوچتا۔ تم خوش قسمت ہو کہ شہر کے سب سے اچھے میڈیکل کالج سے ڈگری لے رہی ہو۔ ڈاکٹر صاحب۔“

”ڈاکٹر صاحب.....“ عائشہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ٹھہر گئی۔ اپنے لیے استعمال ہونے والے یہ لفظ ہمیشہ اسے مسکرائے پر مجبور کر دیتے۔ حالانکہ ابھی تو وہ میڈیکل اسٹوڈنٹ تھی۔ ڈاکٹر بننے کی منزل ابھی دور تھی۔

”آج تیار ہو کر جانے کی کوئی خاص وجہ۔ کیا کوئی تقریب ہے؟“

”ہاں۔ میوزیکل شو ہے۔ کیوں تا تم بھی میوزیکل شو میں شرکت کرو۔ اپنے ساتھ ایک مہمان لے جانے کی اجازت ہے۔“

”میں نہیں، نہیں.....“

”ادہ، وہ نہ مت کرو۔“

اور آدھے گھنٹے بعد وہ میوزیکل شو میں انجم کا حصہ تھے اور عائشہ کی کیٹیگ عائشہ کے کان میں جیسے کہہ رہی تھی۔

”تمہارا کزن تو کافی ونڈم ہے۔“

”آخر کون کس کا ہے۔“

”صرف کون ہی ہے یا پھر کوئی اور رشتہ بھی ہے؟“

”اور رشتہ مطلب؟ کیا کوئی اور رشتہ بھی ہو سکتا ہے؟“ عائشہ نے بھر کو چوٹی۔

”ہاں بھئی۔ دوست، منگیترا یا پھر.....“ سیملی نے لے بھر کو شوخ وقفہ لیا۔

”یا پھر پر کیا!“

عائشہ کا دل لے بھر کو دھڑکنا بھول گیا۔ اس نے پلٹ کر یاسر کی طرف دیکھا جو سامنے آنچ پر گاتے گلوکار کو انہماک سے سن رہا تھا۔ یاسر کس قدر ونڈم ہے۔ جیسے دیو مالائی داستان کا یونانی پوتا۔ اس کا پہلے دھیان کیوں نہ گیا۔

”کیا تم نے شو انجوائے کیا؟“ واپسی پر عائشہ پوچھ رہی تھی۔

”ہاں، بہت خوبصورت شو تھا۔“

اس کے بعد وہ اسے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ سوچتی رہ گئی اور پھر ان کے درمیان نیلی ٹوک سلسلہ قائم ہو گیا۔

دو مہینے بعد کی بات ہے۔

جب وہ دونوں ایک ریستورنٹ کی میز پر آئے سامنے بیٹھے تھے اور اس ملاقات سے دونوں کے گھر والے ناواقف تھے۔

”میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ مجھ سے شادی کرو گی؟“

یاسر عائشہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہا تھا۔

عائشہ سمٹ سی گئی۔ شرم کی لالی اس کے چہرے پر کچھ ایسے پھیل گئی کہ یاسر حیران رہ گیا۔

کیا وہ خود اعتماد لڑکی بھی شرماسکتی ہے؟

خاموشی کا وقفہ بڑھنے لگا۔

اور اس خاموشی کو عائشہ کی ہاں نے توڑا۔

”ہاں.....“ یہ شخص ہاں نہ بھی، ایک جلتے رنگ تھا جو بیج اٹھا۔

ایک روشنی تھی جو ہر شے کو پُر نور کر گئی۔

عائشہ اچھٹے سے اسے دیکھنے لگی۔

”اگر تم نے آئندہ یہ سوال پوچھا تو میں تم سے خفا ہو جاؤں گی۔“ اس کی نگاہیں مینار پر جم گئیں۔ مینار جو آسمان کی دستوں کو چھوتا تھا۔ جو قیام پاکستان کی نشانی تھا۔

”اسی پارک میں کبھی مسلمان اکٹھے ہوئے تھے اور انہوں نے ایک عزم کیا تھا۔ خود سے ایک وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی بھلا کے لیے ایک الگ ملک حاصل کریں گے.....“

عائشہ کی آنکھیں مینار کی اونچائی پر تھیں۔

”آج ہم بھی اسی جگہ وعدہ کرتے ہیں کہ کبھی ایک دوسرے کو نہ چھوڑیں گے۔ میرے ساتھ الفاظ دہراؤ۔“

ہاتھوں میں ہاتھ دے، محبت کو زندگی کا عنوان دیے وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔

”میں وعدہ کرتی ہوں۔“ عائشہ کہتی۔

”میں بھی وعدہ کرتا ہوں۔“ یاسر دہراتا۔

”میں تم سے زندگی کی آخری سانس تک محبت کروں گی۔“

”میں بھی تم سے زندگی کی آخری سانس تک محبت کروں گا۔“

”ہر دکھ کھائے بانوں کی۔“

”ہر دکھ کھائے بانوں گا۔“

”کبھی تمہارا ہاتھ نہ چھوڑوں گی۔“

”کبھی تمہارا ہاتھ نہ چھوڑوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے عائشہ کے ہاتھ پر اپنی گرفت اور مضبوطی۔

وہ دونوں مینار کے ستون کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے تھے اور ایک دوسرے کو سنبھالتے۔ نفاضیں دھنک بکھیر رہی تھی۔ دھنک رنگ ان کا احاطہ کیے جاتے۔

☆☆☆

ہر انسان کو زندگی میں کسی نہ کسی کام میں غیر معمولی دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ کام جسے کرنا اچھا لگتا ہے تو یاسر کو بھی ایسے ہی ایک کام میں بے حد دلچسپی تھی اور وہ تھا کھانا بنانا۔

وہ اوسط درجے کا طالب علم تھا۔ بی اے کر لیا تھا۔ آگے پڑھنے کا ارادہ نہ تھا بلکہ وہ اب اپنا کاروبار کرنا چاہتا تھا۔ ایک اچھا سا ہوٹل بنانا چاہتا تھا جہاں وہ اپنے ہاتھوں سے کھانا بنائے۔ لوگ اس کا بنا کھانا کھا لیں اور دنیا بھر کے ڈانکے بھول جائیں۔

وہ واقعی اتنا اچھا لگتا تھا۔ بریانی یا جو بھی ڈش بناتا تو گھر والے انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔

”تجھے کو کبکر زمانہ شوق لگ گیا؟“ والد صاحب اکثر کہتے۔ وہ مسکراتا۔ ”ابو! یہ تو ایک فن ہے اور فن میں صنف

کی کوئی قید نہیں۔ میں اپنا ہونٹ کھولوں گا۔ میرے ہونٹ کے چپے طول و عرض میں ہوں گے۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ والد صاحب دل ہی دل میں کہتے اور پوچھتے۔ ”مگر بیٹا! ہونٹ کھولنے کے لیے بہت سارے پیسے چاہئیں۔ تیرے باپ کی کریانے کی دکان سے اتنا پیسہ کہاں لگے گا۔“

”ابو! اللہ مسبب الاسباب ہے۔“ وہ مسکرا کر کہتا۔ اللہ اس کی قسمت کھولے گا۔ اس کا نصیب چمکے گا، اسے پہنچے۔“

بسم اللہ کر کے والد صاحب نے کپٹی سے آئے پیسے بیٹے کے ہاتھ پر رکھے اور اس نے ایک ڈھابا کھول لیا مگر اس کا ارادہ آہستہ آہستہ اس کام کو بڑھانے کا تھا۔ منزل دوسری گمران شاہ اللہ ایک دن آئے گا کہ اس کا ہونٹ شہر کی مرکزی شاہراہ کے کنارے ہوگا اور شہر بھر میں مشہور ہوگا۔ ابھی تو لگے بندھے گائیک تھے۔ سلسلہ چل رہا تھا مگر آمدنی کم تھی لیکن اس خود پریشان تھا اور اچھے مستقبل کی بے انتہا امیدیں۔

اور دوسری طرف..... دوسری طرف عاتشہ ایم بی بی ایس کر رہی تھی۔ میرٹ نہ بنا۔ والد صاحب کے پاس اس نے پیسے تھے کہ انہوں نے بیٹی کی خواہش کو مقدم جانا اور آج وہ سال سوم کی طالبہ تھی۔ وہ بڑے بھائی تھے۔ بڑا کاروبار کے سلسلے میں یورپ سیٹل تھا۔ دوسرا انجینئر تھا۔ صوبائی دارالحکومت کے بجائے اسے مرکزی دارالحکومت میں اچھی جاب فی، چنانچہ وہ بھی گھر سے دور رہتا۔

یاسر اور عاتشہ جو خالہ زاد تھے اور ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے تھے۔ یہ کہاں جانتے تھے کہ تمام خواب تعبیر کو نہیں پہنچتے۔

کل عاتشہ کی سالگرہ تھی اور وہ ان لوگوں میں سے ہرگز نہیں تھی جو اپنی سالگرہ بھول جاتے ہیں اپنی سالگرہ کا دن اسے ہمیشہ یاد رہتا۔ وہ رات گیارہ بجے سوئی تو اسے یاد تھا کہ جب وہ اٹھے گی تو بائیس سال کی ہوگی۔

ابھی آنکھوں میں جی نیندھی کہ اس کا دروازہ بجایا گیا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ اس وقت اس کے دروازے پر کون دستک دے سکتا ہے؟ وہ اٹھی اور دروازہ کھولا۔

سر پر ٹوپی سجائے، ہاتھ میں غبارے لیے یاسر کھڑا تھا۔ ”سالگرہ مبارک ہو۔“ یاسر اسے پورے بارہ بجے دس کرنے آیا تھا۔

”تھیک یو سوچ یاسر! آئی ریٹلی.....“ تو یو کے

الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ پیچھے رقیہ دونوں ہاتھ سینے پر جمائے کھڑی تھیں۔

”اچھا جلدی لاؤ رنج میں آؤ اور کیک کاٹو۔ تمہیں بروقت دس کرنے کے پھر میں خالہ کی نیند میں غفل ڈالا۔“

رقیہ کا چہرہ بے تاثر تھا اور یوں ان دونوں نے جو اپنے تعلقات و احساسات تک گھر والوں سے مخفی رکھے تھے، اب مخفی نہ رہے۔

عاتشہ نیچے آئی اور کیک کاٹا۔ یاسر ہی تالیاں بجاتا رہا۔ رقیہ ساری کارروائی دیکھتی رہیں۔ عاتشہ نے کیک کاٹ کر کھلانے کے لیے ماں کے منہ کی طرف بڑھایا۔

”مجھے بھی کھلاؤ۔“ یاسر کہہ رہا تھا۔ یوں تو وہ پہلے بھی ایک ہی پلیٹ میں کھاتے رہے تھے مگر یوں ماں کے سامنے اسے بے وقار شرم آئی۔

”امی کیا سوچتی ہوں گی۔“

اور یاسر بھی تو یہی جانتا تھا کہ وہ سوچیں اس لیے اس نے رات کے اس پہر آنے کی پروا نہ کی۔

عاتشہ نے کیک یاسر کی طرف بڑھایا۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما اور کیک کھالیا۔ وہ کچھ دیر کھڑا بائیں کرتا رہا۔

”خالہ! معذرت کہ آپ کو تنگ کیا مگر میں عیشو کو کچھ انوکھے انداز میں دس کرنا چاہتا تھا۔“

”عیشو.....“ تو کب تک تم بھی رکھا جا چکا ہے۔ وہ کہاں سوئی رہی تھیں۔

یاسر اودامی کلمات کہتا چلا گیا۔ رقیہ صوفے پر خاموش بیٹھی رہیں۔

”یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے؟“ آخر کار انہوں نے پوچھ لیا۔

عاتشہ کا دل زوروں سے دھڑکنے لگا۔ یاسر کا طریقہ غلط تھا۔ انہیں پہلے والدین کو بتادینا چاہیے تھا پھر یوں دس کرنا تو اور بات تھی۔

”چند ماہ سے.....“ اس کی آواز مدہم تھی۔

”تھیک.....“ رقیہ دھیمے سے سر ہلانے لگیں جیسے کچھ سوچ رہی ہوں۔ چند لمحوں میں ہی گزر گئے۔

”تھیک ہے بیٹا تم سو جاؤ، صبح بات کرتے ہیں۔“ اس تمام وقت میں رقیہ کے ہونٹ ہلکی بار مسکرائے مگر عاتشہ کو یہ مسکراہٹ پراسرار لگی۔

رقیہ اس کا گال چھو چھاتی ہوئی چلی گئیں اور وہ اپنے کمرے کی طرف چلی آئی۔

”امی کا بھانجا ہے۔“ انہیں کیا اعتراض ہوگا۔ اچھا خوب صورت لڑکا ہے۔ تھوڑا غریب ہے مگر کوشش تو کر رہا ہے۔ وہ وقت بھی آجائے گا جب شہر کی مرکزی شاہراہ کے کنارے اس کا ہونٹ ہوگا۔“ وہ خود سے باتیں کرتی ہوئی۔

اس بات سے بے خبر کہ کل ماں سے ہونے والی باتیں کیسے اس کی کاپیاں دیں گی۔

☆☆☆

”تم جانتی ہونا تمہاری ماں یونیورسٹی سے گریجویٹ ہے۔“ ناشتے کی میز پر دونوں ماں بیٹی آئے سامنے بیٹھی تھیں۔ تو قیصر آؤں چلے گئے تھے۔ یوں تو اس نے بھی کالج جانا تھا مگر رقیہ نے روک لیا۔

”امی امیری سہیلیوں نے پارٹی ارینج کی ہوگی۔“

”میری باتیں زیادہ ضروری ہیں۔ اگر پھر بھی ضروری سمجھو تو یٹ کالج چلی جانا۔“

”جی.....“ اس نے یک لفظی جواب دیا۔

”ہمارے زمانے میں تعلیم عام نہ تھی اور میں خاندان کی واحد لڑکی تھی جو پڑھنے کے لیے یونیورسٹی گئی تھی۔“ رقیہ بتا رہی تھیں۔ ”شروع میں تو سب نے میرے پڑھنے کو برا جانا مگر تعلیم اپنی افادیت منوالیتی ہے۔ میں نے بھی سب کو گردیدہ کر لیا۔“ وہ لمبے بھر کو کہیں۔

”یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم پہلے سے جانتی ہو مگر اب تمہیں ایک اور بات بتانی ہوں جو میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ یونیورسٹی میں، میں نے بھی محبت کی تھی۔“ عاتشہ حیرت سے ماں کو دیکھنے لگی۔

”شاہد میرا کلاس فیلو تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے اور پسند محبت میں بدل گئی اور ہم نے تمام زندگی ایک ساتھ نبھانے کے عہد کیے اور پھر.....“ وہ لمبے بھر کو خاموش ہو گئیں۔

”پھر دگرگی مل ہوئی، راولپنڈی ختم ہوئے اور تمہارے ابو کا میرے لیے رشتہ آیا۔ تمہاری دادی نے مجھے کسی تقریب میں دیکھا اور اپنے بیٹے کے لیے پسند کر لیا۔ وہ ایک انڈسٹریلٹ کی بیٹی تھیں اور تو قیصر ایک انڈسٹریلٹ کا بیٹا۔ بہت امیر کیرئیر تھی۔ ان کا رشتہ ہماری لوئر ملڈ کلاس ٹیٹی میں آتا کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ سب خوش تھے۔ مجھے جو پہلے ہی خوش قسمت سمجھا جاتا تھا اب تو جیسے خوش قسمت ترین سمجھا جانے لگا۔ ہاں میں خوش قسمت ترین تھی.....“ وہ رک گئیں اور گہری نظروں سے بیٹی کو دیکھتی رہیں۔ عاتشہ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔

”شاہد بہت غریب تھا۔ رہنے کے لیے گھر بھی نہ تھا۔ چھ بہن بھائی تھے۔ کرائے کے گھر میں رہتے تھے۔ میں نے خوب سوچا۔ تمہارے کام لیا اور تمہارے ابو کے لیے ماں کبہ دی۔ شروع میں اپنا آپ چھوٹا لگا۔ بے وفا ہونا چھوٹی بات نہیں تھی مگر کرائے کے گھر میں زندگی گزارنا آسان نہیں ہوتا اور آج سوچتی ہوں تو خود کو مطمئن پاتی ہوں۔ اگر میں تو قیصر کے لیے ماں نہ ہوتی اور شاہد کا ہاتھ تھا مٹی تو شاید میرے کانوں کے جھمکوں میں میرے نہ دمک رہے ہوتے۔ اور شاہد تم بھی ڈاکٹر بن رہی ہوتیں۔“ رقیہ کا ایک ہاتھ اپنے کان کے تھمکے پر تھا۔ وہ اسے اپنی کہانی سن رہی تھیں۔ ہوا سا کچھ مگر عاتشہ کو اپنا وجود آندگی کی زد میں محسوس ہو رہا تھا۔

”یاسر اچھا لڑکا ہے۔ میرا بھانجا ہے۔ اس نسبت سے مجھے عزیز بھی ہے مگر اتنا عزیز نہیں کہ میں اپنی بیٹی اس سے بیاہ دوں۔ وہ مٹی کے کتھر پڑھا ہے میں بریائی بیٹے والا میری بیٹی کو اور میرے نو سوں کو کیا مستقبل دے گا۔“ رقیہ کے الفاظ تلخ تھے اور کمر بھی۔

عاتشہ خاموش بیٹھی رہی۔ کتنے ہی لمبے خاموش گزر گئے اور جب کہا تو اتنا ہی کہا۔

”کیا زندگی میں پیسا ہی سب کچھ ہوتا ہے؟“

”نہیں پیسا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔“ رقیہ مسکراتے ہوئے بیٹی کو جواب دے رہی تھیں۔ ”مگر چند محبت بھی سب کچھ نہیں ہوتی۔ محبت کے بغیر گزارہ آسان ہے، پیسوں کے بغیر گزارہ مشکل۔ اور اپنے لیے آسانیاں ڈھونڈنی چاہئیں۔ محبت کا کیا ہے۔ صرف ایک دفعہ نہیں ہوتی۔ اگر صرف ایک دفعہ ہوتی تو میں اور تمہارے ابو اتنی خوب صورت زندگی کیسے گزارتے۔“

عاتشہ چپ چاپ ماں کو دیکھنے لگی۔ اسے اندازہ بھی نہ ہوا کہ اس کی آنکھیں جھپک رہی ہیں۔

”جس موٹر پر تم کھڑی ہو، وہاں سے واپس لوٹ آؤ۔ تمہارے مقدر میں پھولوں کے راستے ہیں۔ کانٹوں کا سفر اس کے لیے منتخب مت کرو۔“ اب وہ بیٹی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے اس کا ہاتھ سہارا رہی تھیں۔

”اب کالج جانا ہو تو صفر سے کہہ دو، وہ چھوڑ آئے گا۔ تمہاری دوستوں نے پارٹی ارینج کی ہوگی۔“ رقیہ اس کا گال چھو چھاتی ہوئی اٹھ گئیں اور وہ وہیں ناشتے کی میز پر بیٹھی رہ گئی۔

کالج جانا، برتھ ڈے پارٹی..... کچھ بھی یاد نہ رہا۔ یاد

رہا تو بس یہ کہ پھولوں پر سے راستے مقدر میں ہوں تو اپنے لیے کانٹوں کا سفر منتخب نہیں کرنا چاہیے۔

☆☆☆

سلمان اس کا کلاس فیلو تھا۔ شہر کی مرکزی شاہراہ پر اس کے والد کا بہت بڑا اور بہت مشہور اسپتال تھا۔ لوگ دور دراز کے شہروں سے وہاں علاج کے لیے آتے۔

ایک دن سلمان نے اس سے کہا۔ ”میرے والدین آپ کے گھر آنا چاہتے ہیں۔“

”کیوں؟“

”آپ کے والدین سے میرے لیے آپ کو مانگنے۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”آپ کو اعتراض تو نہیں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”نہیں، مجھے اعتراض ہے۔“ اسے کہنا چاہیے تھا اور شاید وہ کہنا چاہتی تھی مگر کہ نہ پائی۔

اور سلمان کے ابو کا اسی شاہراہ پر تو اسپتال ہے جہاں یا سارا پتا ہوئی کھانا چاہتا تھا۔

سلمان کا رشتہ آیا۔ چھ بیٹیوں کے اندر رشتہ طے بھی ہو گیا۔

فائل ایئر کے امتحانات کے بعد ابھی رزلٹ نہیں آیا تھا۔ ابھی اپنے ناموں کے ساتھ ڈاکٹر لگانے میں وقت تھا کہ وہ دونوں شادی کے حسین بندھن میں بندھ گئے۔

شادی پر اس نے سرخ فرائی پہنی۔ سلمان کے سیاہ کوٹ سے جھانکتی نائی کا رنگ بھی سرخ تھا اور کاج میں اس کے پھول کا بھی۔

سرخ نو بیا ہوتا جوڑے نے ایجاب و قبول کے مراحل طے کیے اور عائشہ دعاؤں کے سائے میں پھولوں سے بھی لمبی سی گاڑی میں بیٹھ کر ایک عظیم الشان گھر سے دوسرے اس سے بھی زیادہ عظیم الشان گھر میں چلی آئی۔

اور یا سرنکی کے کٹڑ پر کھڑا اپنے ڈھابے پر بریانی بیچتا رہا۔ آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرتا رہا۔

سچ کہتے ہیں کہ انسان کو اپنی اوقات دیکھ کر کام کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ محبت کرنے سے پہلے بھی دیکھ لے کہ اس کی جیب اس محبت کی محفل ہے کہ نہیں۔

میں وعدہ کرتی ہوں۔

تم سے زندگی کی آخری سانس تک محبت کروں گی۔

ہر وہ کھٹکا کھٹکا بانوں کی۔

بھی تمہارا ہاتھ نہ چھوڑوں گی۔

☆☆☆

اور پھر نئی زندگی شروع ہوئی وہ اور سلمان۔ اس کی خوبصورتی کے بارے میں اگر کوئی دورائے نہ تھی تو نیکی معاملہ سلمان کا تھا۔

وہ دیو مالائی داستان کا یونانی ریو تاحموس ہوتا۔ بالکل یا سرن جیسا اور وہ سکتے میں آجاتی کہ وہ ہر وقت سلمان کا یا سرن کے ساتھ موازنہ کیوں کرتی رہتی ہے۔

اس دن کا آغاز معمول کی طرح ہوا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو واش روم سے شادری کی آواز آرہی تھی۔

”یہ کیا کر رہی ہے؟“ قبل اس کے کہ وہ واش روم جا پڑا، سلمان نے پوچھ لیا۔ اس کا دل اچھل کر قلع میں اٹک گیا۔

یا سرن۔۔۔۔۔

”یا سرن چھو ساڑ کا ہے۔“ ہانے گھر کا سودا سلف لانا ہے۔

”کیا صبح اٹھانے کی ذمہ داری اسی کی ہے۔“ پہلے

بھی ایک رات میں نے نوٹ کیا اور کل رات بھی تم باہر اس کا نام لے رہی تھیں۔

”جی، جی، صبح مجھے اٹھانا ہے۔“ وہ سن من بھر کے قدم اٹھاتی واش روم میں چلی آئی۔

واش روم کا قفل کھولا۔ سامنے آئیے میں نکس دیکھا۔ وہاں وہ نہ تھی، یا سرن تھا اور اس سے کہہ رہا تھا۔

”یوں مت کرو عائشہ۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔“

”میں شرمندہ ہوں۔“ وہ یا سرن سے کہہ رہی تھی۔

”پارک میں مینار کے پاس تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ کبھی میرا ہاتھ نہ چھوڑو گی۔“ وہ فاکے تمام سلسلے میرے نام

کر دی۔ ”وہ اسے یاد دلانا چاہ رہا تھا۔

”میں وعدے کے لیے معذرت چاہتی ہوں۔“

وعدہ خلافی اور معذرت۔ یا سرن نے جیتنی سے اسے نکلتا رہا۔ کیا صرف اتنی سی بات تھی کہ وعدہ خلافی اور معذرت کے الفاظ تلائی کر دیں۔

”کیوں، آخر کیوں؟“ وہ مرو تھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”مستقبل۔۔۔۔۔ میں اچھا مستقبل چاہتی ہوں۔“

”میں تمہیں اچھا مستقبل دوں گا۔ آسائشوں بھری زندگی دوں گا۔“

”میں۔۔۔۔۔ لفظوں کے محل رہائش کے قابل نہیں ہوتے۔“ آئیے میں نکس وعدہ لگایا۔ اب اس کا اپنا گھر تھا اور اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

اس نے غل پورا کھول دیا۔ پانی پوری رفتار سے بہنے لگا۔ وہ

دیوار کا سا ہار لے کر کھڑی ہوئی اور تھکھارے لگی۔

”بس کر دو اب۔“ میرے خواب و خیال پر جب تم قابض ہو۔ اب بس کر دو۔ میرے خواب و خیال میری ملکیت ٹھہراؤ۔ مزید ان میں سے آؤ۔“ روئے ہوئے وہ خود سے نہیں یا سرن سے کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

آج کی محفل خاص تھی اور اس خاص میں وہ دونوں مہمان خصوصی تھے۔ رات بجی بجی تھی۔ سیاہ رات میں سیاہ لباس میں ملیوں حسن کی ملکہ تھی اور اس کا شوہر، جیون بھر کا ساتھی حسن کا دیوتا۔

کندھے سے کندھا ملائے وہ اس کے بالکل سامنے بیٹھے تھے۔ آج پر مشہور گلوکارہ اپنی آواز کا فن چکا رہی تھی۔

عائشہ نے نظریں دوڑا کر چاروں طرف دیکھا۔

یہ محفل خاص اس کے لیے سچائی تھی اور کیا رنگ تھے اس محفل کے۔ پھولوں کی آرائش سے لے کر نشست گاہوں تک۔ طعام کے اہتمام سے موسیقی کے سروں تک۔۔۔۔۔ سب کچھ بے مثال تھا۔

اور اس کا سربا، سیاہ لباس، بالوں میں اس کے خوش رنگ پھول اور ہاتھ کے بریلیف میں دکھائی دیا۔ سب کچھ مکمل۔

گلوکارہ نے گانا ختم کیا۔ تالیاں نہیں۔ سلمان کے دوستوں نے شور مچا دیا کہ اب وہ گائے۔ سلمان فن موسیقی کا دلدادہ تھا۔ صرف سنا ہی نہیں گانا بھی اس کا مشغلہ تھا۔ اس لیے تو اکثر گاتا رہتا۔

دوستوں نے فرمائش کی تو وہ مسکراتا ہوا اس پر آگیا۔

”میں یہ گانا اپنی محبوب اپنی شریک حیات کے نام کرتا ہوں۔ جو میری زندگی میں بہار لے کر آئی۔ جس نے میری زندگی مکمل کی۔“ تالیاں گونج اٹھیں اور سب عائشہ کی قسمت پر رشک کرنے لگے۔

مگر عائشہ کے گلے میں آنسوؤں کا گولا اٹھا اور حلق میں ایک گیت اور اسے پتا بھی نہ چلا کہ وہ چھوٹ چھوٹ کر رونے لگی۔

گیتنا تھا ہوا سلمان خاموش ہو گیا۔ محفل لمحے بھر کو رک گئی۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

محفل کی سب سے معزز عورت یوں اچانک اس طرح چھوٹ چھوٹ کر رونے لگی تھی۔ کیا ہوا تھا آخر؟

سلمان تیزی سے اس کے پاس آیا۔ وہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ سلمان اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

”سویت ہارٹ! کیا ہوا؟ سب ٹھیک تو ہے؟“ وہ

سپینس ڈائجسٹ مارچ 2018ء

حسین چہرہ

سکرٹری نے اپنے پاس کے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ ”جناب ایک خاتون آپ سے ملاقات کرنے آئی ہیں۔“

”کیا وہ خوبصورت ہے؟“ پاس نے اشتیاق سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ سکرٹری نے جواب دیا۔ ”انتہائی خوبصورت اور دلکش۔“

”اچھا! اسے امیر بیچ دو۔“ پاس نے کہا اور جلدی جلدی اپنے بال سنوارنے لگا۔

جب وہ عورت ملاقات کر کے چلی گئی تو پاس نے اپنے سکرٹری کو طلب کیا۔ ”تم جتنی ہو۔“ پاس نے غصے سے کہا۔ ”اس بد صورت عورت میں تمہیں حسن کیسے نظر آیا؟“

”میں معذرت خواہ ہوں سر۔“ سکرٹری نے لجاجت سے کہا۔ ”اس نے نام نہیں بتایا تھا، میں سمجھا شاید وہ آپ کی بیوی ہے۔“

”وہ میری بیوی ہی تھی۔ اب، جاؤ دفع ہو جاؤ۔“ پاس دھاڑا۔

مرسلہ: حسین ریاض۔۔۔۔۔ سرگودھا

نری سے پوچھ رہا تھا۔

”میرے سر میں درد ہے۔“ وہ روئے جاتی اور سلمان اسے اچھینے سے دیکھ جاتا۔

☆☆☆

آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے اٹھیلیاں کرتے پھرتے تھے۔ نیچے زمین کا موسم خوشگوار تھا اور شاید وہ اراضی زمین کا ٹکڑا نہیں تھی۔ خوش رنگ اور خوش گلو۔ عائشہ نے کھوم کر ہر طرف کا جائزہ لیا۔ یہ ایک بارغ تھا۔ پھولوں بھرے پودے۔ پھولوں سے لدے درخت۔ ہوا کے جھونکے اور معطر فضا۔ کیا یہ جنت تھی؟

جنت نہیں تو جنت کیسی ضرور تھی۔

اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی درخت سے کچھ توڑ کر کھائے اور یہی خواہش لیے وہ اپنے لیے پھل منتخب کرنے لگی۔

پہلے درخت پر سرخ اسٹرابیری تھی۔ وہ اتنی سرخ تھیں کہ سرخ رنگ پسندیدہ ٹھہرے۔ درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے سانس اندر اتاری۔ قبل اس کے کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اسٹرابیری توڑتی، دل میں خیال آیا کہ کچھ اور کھایا جائے۔ چنانچہ وہ اسٹرابیری کھانے کی خواہش پر قابو پاتے

سپینس ڈائجسٹ مارچ 2018ء

ہوئے آگے بڑھی۔

اگلے درخت پر آڑو سجے تھے مگر کچھ سوچ کر اور آگے بڑھ گئی۔

اگلے درخت پر سرخ انار سے اور اس سے اگلے درخت پر پیلے آم۔ دونوں پھل اپنی خوبوں میں بے مثال تھے مگر اس نے وہ بھی تو ذکر نہ کیا۔

اگلا درخت عام درختوں جیسا ہی تھا مگر اس پر لگے پھل عجیب تھے۔ اس نے پہلے ایسا درخت نہیں دیکھا

تھا۔ اس درخت پر کرنی ٹوٹ گئے تھے۔ سرخ، ٹیلے اور برے۔ وہ حیران ہوئی۔ کیا درختوں پر بھی پیسے لگتے ہیں؟

اور وہ لوہی جو اسٹریٹری، آڑو، انار اور آم کھانے کے لیے نہ رکھی، پیسے دیکھ کر اس کا دل دھکنے لگا اور اس نے

درخت سے پیسے توڑ لیے۔ اتنے سارے پیسے کہ سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ وہ زمین پر گرے اور وہ انہیں اٹھانی۔ جب

وہ زمین پر گرے ہوئے ٹوٹ اٹھانی تو پہلے سے ہاتھ میں جو نوٹ گر جاتے۔ تھی ہی وہی درجہ یہ سلسلہ چلتا رہا۔

بات نہیں تک محدود ہوئی تو بھی خیر تھا مگر یہ کیا..... اب، ہلکی ٹوٹ کھا رہی تھی۔

سبز ٹوٹ منہ میں ڈالا، اسے چبایا اور گل گئی۔ نیلا ٹوٹ منہ میں ڈالا اور اب وہ اسے چبا رہی تھی۔

کیا ان ٹوٹوں کا ذائقہ اسٹریٹری، آڑو، انار اور آم سے بہتر تھا؟

اور پھر جب اچانک عاتش کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو نیم اندر سے کمرے میں لپٹے پایا۔

زیر پا در کالپ کمرے کے باحل کو خوبانک بنا رہا تھا۔ اس کا شور ہر اس کے پہلو میں اس کی طرف رخ کیے لینا

تھا اور وہ سیدھی لینی اندر سے چھت کو کھینچنے لگی۔ یہ کیا خواب تھا؟ اور اس نے پھل کھانے کے بجائے

کرنی ٹوٹ کھانے کو کیوں ترجیح دی؟ دماغ کچھ سوچنے بجھنے کی صلاحیت سے مشغول رہا جاتا تو اس کی آن میں آنکھوں

میں جھلک آنسو چھٹنے لگے۔ کیا وہ چکا تھا، کیا ہو رہا تھا، اور کیا ہونے والا تھا۔

وہ مسلمان کے قریب ہوئی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

مسلمان اس کا شور تھا۔ اس کا انتخاب۔ وہ بہت اچھا اور خیال رکھنے والا تھا۔ پھر کیوں وہ بے چین دے لگ گئی اور یہ کیسے خواب و خیال اس کو ڈستے رہتے تھے۔

ایک عہد و قاتی تو اس نے نہ بھنایا تھا۔ کیا وہ زندگی کا

سب سے اہم فیصلہ کرتے ہوئے تھوڑی سی غرض نہ دکھا سکتی تھی۔ آنکھیں بند کر کے اس نے سونے کی کوشش کی مگر یاسر کا سکرنا چہرہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

وہ اچھ بیٹھی اور رونے لگی۔ مسلمان کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے بیوی کو پیٹھے ہوئے اور روتے ہوئے پایا۔ ”کیا ہوا

عاتش؟“ وہ پریشان ہونے لگا۔ ”میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔“ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

اور مسلمان عاتش کو کھینچنے لگا۔ اگر پیٹ میں درد تھا تو اس کے دونوں ہاتھ سینے پر دل والی جگہ پر کیوں تھے تھے؟

☆☆☆☆

ناشتے کی میز پر اب صرف وہ میاں بیوی بیٹھے تھے۔ والد صاحب اسپتال روانہ ہو چکے تھے۔ والدہ صاحبہ اپنے

کمرے کی طرف۔ یوں تو وہ دونوں اب ہاؤس جاب کر رہے تھے اور انہیں بھی اسپتال کی طرف روانہ ہو جانا چاہیے تھا مگر کہہ

سن کر مسلمان نے اپنی اور عاتش کی پچھلی منظور کرائی تھی۔ ”کمرے میں نہیں۔“ اس نے چائے کے دو کپ

تھاے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ عاتش نے بھی اس کی تقلید کی۔ کمرے میں آکر عاتش بیڈ پر بیٹھ گئی۔ مسلمان کرسی کھینچ

کر اس کے سامنے بیٹھا گھونٹ گھونٹ چائے پینے لگا۔ ”تم مجھے فرسٹ ایئر سے اچھی لگتے تھے۔ تم تھی ہی

اتنی اچھی.....“ مسلمان کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ ”ہر انسان خوشگوار زندگی چاہتا ہے۔ تمہیں دیکھتا تو

احساس ہوتا کہ ہاں تم ہی وہ عورت ہو جس کے ساتھ میں ساری زندگی گزار سکتا ہوں۔ اسی لیے تو تمہارے ہاں رشتہ

بھیجا۔“ چائے ختم ہو گئی۔ مسلمان نے کپ ایک طرف رکھ دیا۔ عاتش چپ چاپ سر جھکا کر بیٹھ رہی تھی۔

”جب زندگی ایک ساتھ گزارنی ہے تو دکھ کدھ بانٹنے چاہئیں۔“ مسلمان نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور نرمی سے دبانے

لگا۔ ”کیا تم میری بات سے اتفاق کرتی ہو؟“ عاتش کو ثابت میں سر ہلانے میں بھی دقت ہوئی۔

”میں بھی ڈاکٹر ہوں اور تم بھی..... جب میں نے جان لیا کہ تمہارے سر میں درد ہوتا ہے، نہ پیٹ میں تو اب

چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ عاتش نے مراٹھا کر سلمان کو دیکھا اور نگر کر اسے دیکھتی رہی۔

”تو وہ دکھ جو تمہیں ادھ مو کیے دیتا ہے مجھ سے بانٹ لو۔ میں اچھا نمکسار ساتھی ہوں۔ تمہارے زخموں پر مرہم رکھوں گا۔“ وہ ہاتھ دبا تے ہوئے نرمی سے کہہ رہا

تھا۔ ”اور اگر ایسی بات ہے جو شوہر سے نہ کہی جاسکے تو دوست سے کہو۔ میں تمہارا اچھا دوست بھی ہوں۔“ عاتش کی نگاہیں مسلمان کے چہرے سے نہ ہٹتی تھیں۔

جانے وہ کیا تلاش کر رہی تھی اور پھر ان آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے اور وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اس کا شور نہ کتنا اچھا تھا۔ ہر دکھ بانٹنے کے لیے تیار اور وہ خود..... شاید وہ مسلمان کے قابل بھی نہ تھی۔

”مجھ سے غلط فیصلہ ہو گیا.....“ روتے ہوئے وہ بتانے لگی۔ مسلمان نرم تاثرات لیے اسے دیکھتا رہا۔

”میں اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ اہی کہتی تھیں محبت کے بغیر گزارا ہو جاتا ہے۔ بیویوں

کے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ اس لیے میں نے تمہارے لیے ہاں کہہ دی مگر اب.....“ وہ روتی رہی اور بتاتی رہی۔

”میرا محبت کے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ یہ دولت و آسائشیں اس کا فہم البدل نہیں۔ میں تم میں اسے ڈھونڈتی

ہوں۔ مجھے وہ ہر دقت یاد آتا ہے۔“ ہاتھ پر گرفت ڈھیلی ہوئی اور مسلمان نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

اگلے لمبے اس کے دل میں آیا کہ عاتش کو چٹنا سے پکڑے اور کھینچا ہوا کمرے سے باہر کھینچ دے اور کپ اس

کے کہ وہ ایسا ہی کرتا اس نے خود پر قابو پا لیا۔ وہ برا آدمی نہیں تھا۔ برا خیال آتا برے ہونے کی نشانی نہیں۔ برے ہونے کی

نشانی یہ ہے کہ آپ اس خیال پر عمل بھی کر سکیں۔ وہ اٹھا اور عاتش کے پہلو میں جا بیٹھا اور اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔

”محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ وہ انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔“ وہ عاتش کا سر تھپک رہا تھا۔ عاتش ہلک

ہلک کر رو رہی تھی۔ ”مگر محبت سے بھی ایک طاقت ور چیز اور ہے۔ اور وہ ہے نکاح۔ وہ بندھن جس میں تم اور میں بندے ہیں۔“ وہ

آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ ”اسے بھولنے کی کوشش کرو اور مجھے یاد رکھنے کا طریقہ ڈھونڈو۔ اب کچھ بھی نہیں لوٹا جاسکتا کہ تمہارا

نکاح مجھ سے ہو چکا ہے۔ محبت پس پشت چلی گئی ہے۔“ ”میں اسے بھولنے کی کوشش کرتی ہوں مگر.....“ وہ

روتی رہی اور کہتی رہی۔ عاتش نے جاری نہ کی۔ ”کوشش جاری رکھو۔“ مسلمان اس کا سر تھپک رہا تھا،

عاتش دے جاری نہ کی۔ ”میں تمہارے ہر دکھ کا ازالہ کروں گا۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

☆☆☆☆

خوبصورت باتیں

☆ انسان کی نرمی کو اس کی کمزوری نہ سمجھو کیونکہ پانی سے نرم کوئی چیز نہیں لیکن اس کی طاقت بھی چٹانوں کو زبردہ زبردہ کر دیتی ہے۔

☆ ماں، باپ، استاد اور سکالوں کی اہمیت اپنی جگہ مگر سبق وہی یاد رہتا ہے جو دقت اور لوگ سکھاتے ہیں۔

☆ تعلیم کی کمی کو تربیت اچھی طرح ڈھانپ لیتی ہے لیکن تربیت کی کمی کو تعلیم بھی پورا نہیں کر سکتی۔

☆ کسی کی پہچان علم سے نہیں بلکہ ادب سے ہوتی ہے کیونکہ علم تو انہیں کے پاس بھی تھا لیکن وہ ادب سے محروم تھا۔

☆ اپنی عمر اور پیسے پر کبھی اعتبار نہ کرنا کیونکہ جو چیز گنتی میں آجائے وہ لازمی ختم ہونے والی ہے۔

مرسلہ: عبدالجبار رومی انصاری قصور

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ قول بے عمل اور علم بے اخلاص ناقابل قبول ہے۔

☆ جو عالم زاہد نہ ہو، وہ اپنے زمانے والوں پر عذاب ہے۔

☆ مصیبتوں کو چھپاؤ کہ اس سے قرب حاصل ہوتا ہے۔

☆ زیادہ ہنسومت..... کہنی غفلت کا اثر ہے اور اس سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ خوف اور امید کے درمیان زندگی گزارو۔

☆ مومن جس قدر بوڑھا ہوتا ہے، اس کا ایمان اتنا طاقت ور ہوتا ہے۔

☆ وہ شخص کتابت نصیب ہے جس کے دل میں جانداروں کے لیے رحم نہیں ہے۔

☆ وہ رزق جس کی فراخی پر شکر نہ ہو اور معاش کی تنگی جس پر صبر نہ ہو، فتنہ بن جاتی ہے۔

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

کتنے دنوں بعد وہ بیکے آئی۔ وہ اداس اداس انداز۔ وہ کھوئی کھوئی کیفیت۔ تو بیاہتا لڑکیاں اس طرح تو نہیں ہوتیں۔ تنہائی میں رقیہ نے اس سے پوچھا تو وہ رونے لگی۔ "امی غلط ہو گیا..... سب کچھ غلط ہے۔ یہ میرا....." اس نے ہاتھ میں پینا بریڈ سلپٹ اتار بیٹھا۔

"یہ میرا میرے کسی کام کا نہیں۔ وہ آسانکس مجھے ڈنکا دیں۔ آپ نے غلط شور مچا دیا تھا مجھے۔ میں برباد ہو گئی۔" وہ روتے ہوئے چیخنے لگی اور رقیہ اسے بچکانے لگیں۔ "شرع میں ایسے ہی لگتا ہے مگر آہستہ آہستہ جہنم یہ فیصلہ صحیح لگے گا۔"

"امی بس کر دیں....." اس کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ وہ انکی اور اس کمرے کی طرف چلی آئی جو شادی سے پہلے اس کے لیے مخصوص تھا اور اب بھی وہی ہے اس کے لیے مختص تھا۔ کمرے میں آکر اس نے کدڑی لگا لی۔ رقیہ کے دل میں تو ایسا اس کے پیچھے چلی آئیں مگر رک نہیں۔ "انہی نہیں مجھے کی۔ کچھ وقت لگے گا تو خود ہی سب بچھ آ جائے گا۔" وہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔ اور عاتشہ بیڈ کے کنارے بیٹھی روتی رہی، روتی رہی۔ روتے روتے تھک گئی۔

"میں تمہیں منہ دکھائی میں بھول دوں گا۔" نہر کنارے یاسر نے اس سے کہا تھا۔ "صرف بھول.....!" وہ چلتے چلتے رک گئی۔ "اپنے ہاتھ کی بنی چائے بھی پاؤں گا۔" یاسر نے اضافہ کیا۔

"بس.....!" "اور کیا تمہیں میری محبت نہیں چاہیے۔ سو نے چاہی اور میرے جواہرات چاہیں۔" یہ کہہ کر یاسر ہنسنے لگا۔ "اب ایسا بھی نہیں۔" اس نے تردید کی تھی۔ مگر حقیقت کیا تھی۔ اس نے ہیرے جواہرات منتخب کر لیے اور محبت چھوڑ دی۔

یہ نہیں تھا کہ سلمان اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ وہ محبت کرتا تھا۔ بے حساب کرتا تھا مگر یہ مسئلہ تھا کہ نہ یہ وہ محبت تھی اور نہ ہی وہ یاسر تھا۔ آنسو بہہ بہہ کر خشک ہو گئے پھر اس پر نہ جانے کیا کیفیت طاری ہوئی۔ وہ قد آدم آجیے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ لٹو سے چہرہ صاف کیا۔ چکوں پر سکارا لگانے لگی۔ آنکھوں میں نمی اتری تو مسکارا پھیل گیا۔ وہ منہ دکھائی اور وہ بارہ سے خود کو تیار کرنے لگی۔

آنکھیں سجائیں۔ گالوں پر لالی لگائی۔ ہونٹ رنگے۔ گلے میں چین لاکٹ تھا مگر ایک اور سیٹ پہن لیا اور پھر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔ کوئی تیز دھار چیز..... شوکی قسمت سا نڈ نیل پر چھری دھری تھی۔ اس نے چھری اٹھائی اور انگوٹھے کی پور سے اس کی دھار چپک کر نے لگی۔

وہ سر جائے تو کیا دنیا رک جائے گی؟ نہیں۔ نہ تو بچھرا سے مر جانا چاہیے۔ تیز دھار چھری سے انگوٹھے کی پور پر کٹ لگ گیا اور وہ اس کٹ سے خون ٹپکا دیتی رہی۔ ☆☆☆☆

خدیجہ بھتیجی تھی کہ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات رشتے بھی اس چپک کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے بہن رقیہ سے ایک فاصلہ رکھا اور اولاد کو بھی یہ بات یاد رکھانی رہیں۔ یہ نہ تھا کہ ملنا ملنا نہ تھا۔ محبت نہ تھی۔ سب کچھ تھا مگر بھریجی ایک فاصلہ تھا اور یہ بات یاسر کے ذہن میں بھی تھی۔ ماں نے ہمیشہ اسے سمجھا یا تھا مگر جب عاتشہ نے خود سے ہاتھ بڑھایا تو وہ کیہ مگر بھول گیا۔

وہ ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کرتے۔ مگر دالوں سے چھپ کر بارکوں اور نہر کنارے ملتے۔ کبھی کسی بھول میں جا کر چائے پیتے تو کسی کھانا کھاتے اور تہہ دید و فاکرتے۔ مگر یہ سب باتوں اور ملاقاتوں تک محدود رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن عاتشہ نے اس سے کہا۔

"سوری یاسر! میں مزید تم سے نہیں ملوں گی۔" "اس دل کو چین نہ آئے گا۔" یاسر نے ہنس کر جواب دیا۔ وہ سمجھا عاتشہ افق کر رہی ہے۔ "میرے لیے سلمان کا رشتہ آیا ہے۔ وہ میرا کلاس فیلو ہے۔ اچھا لڑکا ہے۔ ویل سیٹل ہو چکی ہے۔ امی ابو ہاں کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے بھی مناسب لگ رہا ہے۔" یاسر کے لبوں پر مسکراہٹ سننے لگی۔

"مگر کیوں؟" وہ ہنسنے لگا۔ "اچھا مستقبل!" "میں بھی تمہیں اچھا مستقبل دوں گا۔" "لفظوں کے شے رہا ہنس کے قابل نہیں ہوتے۔" "لفظوں کے کل....." وہ ششدر رہ گیا۔ "تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔ وفا کے تمام سلسلے میرے نام کر چکی ہو۔" "وہ غفلت کے لیے معذرت۔" یہ عاتشہ کیا کہہ

رہی تھی؟ اور اس کا لہجہ ساٹ کیوں تھا؟ عاتشہ فیصلہ سا کر چلی گئی۔ وہ باور کرتا رہ گیا کہ ایک دن اس کا بھول بھی مرکزی شاہراہ کے کنارے ہو گا مگر..... اور اس مگر پر تمام باتیں رک گئیں۔ لیکن یاسر نے ہار نہ مانی۔ عاتشہ سے ملنے اس کے گھر چلا گیا۔

پہلی ملاقات پر عاتشہ نے آدھی ادھوری ملاقات کی۔ چند فقروں کے بعد اٹھ کر چلی گئی۔ دوسری دفعہ وہ ملنے ہی نہ آئی۔ وہ رقیہ سے بار بار کہتا رہا عاتشہ کو بلائیں مگر انہوں نے دودھ کہا کہ وہ مصروف ہے۔ اور تیسری دفعہ کہا طبیعت خراب ہے اس لیے سوئی ہوئی ہے۔

اور چوتھی دفعہ تو اسے گیٹ سے اندر ہی نہ آنے دیا گیا۔ انٹرکام پر رقیہ نے کہہ دیا۔ "بیٹا! امیری طبیعت خراب ہے۔ در نہ تم بہن تھی اور تم پر امت، مالتو تو بار بار ہمارے گھر سے چکر مت لگاؤ۔" رقیہ برا لگتا ہے۔

دوست ان الفاظ پر یقین ہی نہ آیا۔ اس نے بہن نہ باری۔ فون کرنا رہا مگر یاد وہ تڑا ز مد فون اٹھائی۔ "یہ جو وہ باور دیا عاتشہ نے اٹھایا تو کیا کیا کہی وہ۔" "کیا! ہاتھ دھو کر کمرے سے پیچھے پڑ گئے ہو۔ مجھے برا لگتا ہے۔" وہ ششدر رہ گیا اور انکھ سے آنسو نکلنے لگے۔ "کیا؟" "ہاں! عاتشہ نے اسے برا ساں کر رہا تھا۔ دل دور ہے۔ تو بھراؤ تو ماں سے پاس جا پہنچا۔ روتے ہوئے دل کھول کر کہہ دینے سامنے رہ گیا۔

ماں نے آنسو بہہ پھرے۔ گور میں سر رکھا۔ مانتا چھو۔ وہ کہنے لگی۔ "ابو! دس کے پونچھ..... بھول جا بیٹا۔" وہ آنسو بہتا پونچھ لیں رہا؟ اور عاتشہ کی شادی تھی وہ اس دن کجا بیانی بیچتا رہا اور آنسو پونچھتا رہا۔

کیا ہوا تھا؟ کیا ہوا تھا؟ پونچھ وقت گزرتا گیا۔ نرم دیے ہوئے نہ رہے۔ یہ ایک عام سادہ تھا۔ وہ اپنے ڈھابے پر کھڑا بیانی بچ رہا تھا کہ ایک گاڑی اس کے ڈھابے کے سامنے رکی۔ وہ لمبے بھر میں گاڑی کو پہچان گیا۔ گاڑی سے عاتشہ اتری۔ وہ خود ڈرائیو کر کے آئی تھی۔ یاسر نے ہی تو ڈرائیو تک بہتر کرنے میں اس کی مدد کی تھی۔ اور وہ عاتشہ جو اپنے کمرے میں خود کشی کرنے کا سوچ رہی تھی، اب یاسر کے سامنے کھڑی تھی۔

سیراز نش

میں نے زندگی میں سات بار اپنے نفس کو تیر سمجھا اور اسے سیراز نش دی۔

1- سب سے پہلے اس وقت جب میں نے عظمت و اقتدار کے لیے امارت اور ریاست کا لباس پہنا اور بھجور دیسے کسی افراد کی لاچاری اور احتیاج سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

2- دوسری بار اس وقت جب میں نے اپنے نقصان دوستوں کے سامنے بہانے تراش کر اپنی صفائی پیش کی اور انہیں اپنی مکاری اور عیاری سے گمراہ کرنے کی کوشش کر۔

3- تیسری بار اس ساعت جب آسمان اور دھواں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا تو میں نے پہل کے مقابلے میں آسمان کو ترجیح دی۔

4- چوتھی بار اس وقت جب میں نے کسی گناہ کا جواب کیا اور یہ کہہ کر خود کو تسلی دینے کی نہ آخر دوسرے نے تو اسی طرح گناہ کرتے ہیں۔

5- پانچویں بار اس لمحے جب میرے دل نے اپنی گزشتہ خوف کی بات اس کیفیت کو یاد دلایا کہ جو مجھ پر حال کی اور دھوکے کی کہ اس طرح میں تو نہیں اور ستم کے پہلے میں جب واسطہ امت کا سب سے بڑا مظاہرہ کر رہا تھا۔

6- چھٹی بار اس لمحے مجھے اپنا نفس اپنے محسوس ہوا اور میں نے اسے سیراز نش کی۔ جب میں نے اپنے کپڑے پہنے اور اوپر اٹھا لیے تاکہ میرا دامن زندگی کے کچھڑے سے آزاد نہ ہونے پائے۔

7- ساتویں بار اس وقت جب میں مناجات پڑھنے کے لیے کھڑا ہوا اور اسے اپنی مدد و ثنا اور فضیلت سمجھا۔

سوال جواب

0 سردار: "(دوست سے)" "عورتوں کو شادی کے بعد بیگم کیوں کہتے ہیں؟" دوست: "شادی کے بعد عورتوں کا سارا غم مردوں کو منتقل ہو جاتا ہے اس لیے انہیں 'بے غم' کہتے ہیں۔"

محمد امین انجم، ارزاں پور قصور

ہوا کیس چل رہی تھیں۔ اندر آتش دان کے پاس زدوبلی اور نانی ایک ہی مثال اور بے ٹیشی ہاتھ سینک رہی تھیں۔ کالج کی پڑھائی سے فارغ ہونے کے بعد چھٹیاں گزارنے وہ نانی کے پاس چلی آئی تھی۔ نانی کی باتیں اسے ہمیشہ انہی گلنیں اور آج نانی نے اسے اپنی زندگی کی کہانی سنائی تو وہ ششدر رہ گئی۔

”یوں تو اپنے بچوں کو اپنی جوانی کی کج ادائیگیوں کے بارے میں نہیں بتانا چاہیے مگر میں نے اس لیے بتایا کہ تم اس قصے سے کچھ سیکھ پاؤ۔“ عائشہ کی آواز میں لرزش تھی۔ اس عمر میں رعشے کا مرض اس کے چہرے اور ہاتھوں کے ساتھ ساتھ آواز میں بھی لرزش لے آیا تھا۔

”تمہارے نانا بہت عظیم انسان تھے۔ انہوں نے ہمیشہ میرا خیال رکھا۔ جب انہیں میں نے اپنی محبت کے بارے میں بتایا تو کوئی عام مرد ہوتا تو اسی وقت مجھے گھر سے نکال دیتا مگر تمہارے نانا نے مجھے سنبھالا۔ میرے ٹولے ہوئے وجود کو سینا اور یہ انہی کی محبت تو تھی کہ مجھے ان سے محبت ہونے میں وقت نہ لگا۔ اور ہم نے بہت خوبصورت زندگی گزار لی۔“ عائشہ رک گئی اور زدوبلی نانی کا جبریں بھرا چہرہ دیکھتی رہی۔

”اور وہ صاحب.....“ زدوبلی نے سوال کیا۔ عائشہ نے ایک طویل سانس بھری۔

”اللہ نے یاسر کو بخت لگا دیا۔ اس کا مرکزی شاہراہ پر ہمارے اسپتال سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر شہر کا سب سے مشہور ہوٹل ہے۔ اب یہاں آئی ہو تو کزنز کے ساتھ وہاں سے کھانا کھا آنا۔ پورا شہر اس ریٹورنٹ کے کھانوں کا گردیدہ ہے۔“ عائشہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی اور زدوبلی نانی کے مزید بولنے کا انتظار کرنے لگی۔

”زندگی اچھی گزر گئی گردل میں ایک خلش رہ گئی کہ میں محبت نہ کرتی اور اگر محبت کی تو بے وفائی نہ کرتی۔ جو انسان کے نصیب میں ہو وہ مل کر رہتا ہے۔ آج یاسر کا بھی تو شہر کا سب سے مشہور ہوٹل ہے۔ خاندان کی ایک تقریب میں اس کی بیوی سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے گلے کے لاکٹ میں ہیرا دوک رہا تھا۔ زندگی کے فیصلے کرتے ہوئے شخص ظاہری اسباب نہیں دیکھنے چاہئیں۔ دل کی بات بھی سن لینی چاہیے۔“ اور کاش بزرگوں کی سماعت کے ساتھ ساتھ نگاہ میں بھی گہرائی اور جوہر شناسی کی بصیرت ہو تو بچوں کو اپنی اذیتوں سے نگرنا پڑے۔“

وہ خوب سخی سنواری تھی مگر اتنی تیار ہونے کے بعد بھی وہ اجڑی لگ رہی تھی۔

یاسر کا ڈنٹر پے دوپٹے کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اس کے مقابل آن کھڑی ہوئی۔

”یاسر! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ عائشہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

یاسر ہاتھ میں بچے لیے اسے دیکھتا رہا۔ ڈھابے میں کام کرنے والا بیڑا اور گاڑی کے چیمکونیاں اور اشارے کرتے لگے۔

”اگر میں طلاق لے لوں تو کیا تم مجھ سے شادی کر لو گے؟“ یہ عائشہ کا سوال تھا۔

ہوا رک گئی۔ سورج بجھ گیا۔ اندھیرا چھانے لگا مگر یاسر ہوش میں آیا اور خود کو حواسوں میں لاتے ہوئے بولا۔

”یہ زندگی ہے کوئی کھیل تماشا نہیں۔ تم طلاق پانٹتے ہو جاؤ یا پھر بیوہ۔ میں تم سے بھی شادی نہیں کروں گا۔ چلی جاؤ یہاں سے۔ بھرے بازار میں تماشا مت لگاؤ۔“

”میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ یاسر نے مڑ کر ایک نظر گاڑا تو دیکھا۔ اب تو لوگ دکان کے باہر رک کر یہ منظر دیکھنے لگے تھے۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ یاسر نے اس سے گاڑی کی چابی لی۔ اپنے اسسٹنٹ سے دکان سنبھالنے کا کہا اور اسے لے کر چل پڑا۔ گاڑی عائشہ کے سیکے کے دروازے پر روکی اور اسے لیے اندر چلا آیا۔ رقیہ اپنے بالوں کے لیے کوئی بیوٹی فپ استعمال کر رہی تھیں۔ عائشہ کو یاسر کے ساتھ آتے دیکھ کر کبک رہ گئیں۔

”اپنی شادی شدہ بیٹی کو سنبھالیں۔ میری دکان پر آگئی تھی۔ لوگوں کو بغیر ٹکٹ کے فلم دکھا دی۔“ وہ زیادہ دیر نہ رکھا۔ عائشہ روٹی کر لاتی رہ گئی مگر وہ چلا گیا۔

یہ نہیں تھا کہ اسے عائشہ سے محبت نہ تھی۔ اس کا دل بھی دیکھنے لگا تھا اور کی بار بار اس نے بھی سوچا۔ ہاں تمام لے عائشہ کا ہاتھ مگر یہ زندگی بھی اور وہ یاسر تھا۔ جب وہ اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا تھا اور اسے ہراساں کیا کرتا تھا۔ وہ..... کوئی بہت پرانی بات نہ تھی کہ وہ بچوں کا ہوتا۔

اس رات وہ غدیجے سے کہہ رہا تھا۔

”امی! کوئی مناسب سی لڑکی دیکھ کر میری شادی کر دیں۔ مزید تاخیر مت کریں۔“

☆☆☆

سردیوں کا موسم تھا۔ ٹھنڈا اور خشک۔ ماہر سرد



امانت

شاہ زین رضوان

معاشرہ چاہے مشرقی ہو یا مغربی... ماں کے احساسات و جذبات اور ممتا کی چاشنی قدرت نے یکساں رکھی ہے۔ وہ بھی ایک ایسی ماں تھی جس کی گود حالات نہ بھرنے کے باوجود خالی رکھی... مقدر کے چکر اسے ہی کہتے ہیں کہ جسٹجو اپنے مطلوبہ ہدف تک لا کر بھی اسے نظروں سے اوجھل کر دیتی ہے... لیکن اس کا شک جب یقین میں ڈھلا تو وہ بھی مجسم حقیقت بن کر اس کے پاس آگئی۔

محبت کے رشتوں میں گندمی مٹا کی تڑپ اور لگن کی روداد

اس سے پہلے مجھے زندگی میں صرف ایک مرتبہ سوال کرنا پڑا تھا اور اس مرتبہ بھی صورت حال کچھ زیادہ مختلف نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں ایک امید و نیم کی کیفیت میں اس کے جواب کا انتظار کر رہی تھی... بالآخر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے سکوت توڑا۔ ”کیتریں؟“ وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”یہاں آنے سے پہلے تم کتنی جگہ کوشش کر چکی ہو؟“ ”دو جگہ۔“ میں نے جواب دیا۔

سال سے مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ملتی تھی۔ اس سے پہلے مجھے لیٹر بکس اسکیم کے تحت سال میں ایک مرتبہ اس کا خط مل جاتا تھا۔ یہ اسکیم جیل میں قید ماؤں، ان کے بچوں اور انہیں گود لینے والوں کی مدد کے لیے شروع کی گئی تھی لیکن پھر بعض وجوہات کی بنا پر یہ اسکیم ختم کر دی گئی۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ اگر یہ بچے اپنے ماضی سے جڑ سے روکے رہیں تو ان کے مستقبل پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔

یہ غلط فہمی سر دوسرے ذریعے آتے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ڈیشن فیئرے کو الڑبھتہ کے بارے میں لکھتے ہوئے پریشانی کا سامنا تھا۔ اس کے باوجود میں الڑبھتہ کو خط لکھتی رہی۔ میں نے اس سے معذرت کرنے کے بجائے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ اسے بتایا کہ میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں لیکن میرے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا اور یہ کہ میں ہر روز اسے یاد کرتی ہوں اور کبھی نہیں بھول سکتی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ڈیشن نے میرے خط... الڑبھتہ تک نہیں پہنچائے اور نہ ہی میرے بارے میں اس کے قریب پہنچ کر میں نے ارد گرد کا بخور

چاڑھ لیا کہ کہیں کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا۔ میں نے سڑک کے پار ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا کہ کسی کو میری موجودگی پر شک نہ ہو، زیادہ تر والدین کاروں میں آ رہے ہوتے البتہ صرف ایک عورت سیاہ رنگ کے کتے کے ساتھ پیڈل آتی ہوئی دکھائی دی۔ پھر وہاں ایک ڈبل ڈیکر بس آ کر رک لی لیکن الڑبھتہ اس میں سوار نہیں ہوئی۔ ممکن ہے کہ وہ اسکول میں ہو یا کوئی کیل مشابہا یا نیٹ بال کھیلنے کے لیے رک گئی ہو۔

بچے اسکول کے مرکزی دروازے سے باہر آ رہے تھے اور فوراً ہی وہ علاقہ نیوی بلیو یونیفارم سے بھر گیا۔ تین لڑکیاں میری طرف آئی دکھائی دیں۔ ان کے بال سیاہ اور وزن غیر معمولی طور پر زیادہ تھا۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا لیکن ان میں الڑبھتہ نظر نہیں آئی۔ اس کے بعد میں مزید پانچ منٹ وہاں کھڑی انتظار کرتی رہی لیکن الڑبھتہ کا کہیں پتا نہیں تھا۔ مایوس ہو کر میں گھر کی طرف چل دی۔

میں سڑک پار کرنے ہی والی تھی کہ ایک سلیٹی رنگ کی کار میرے پاس آ کر رک لی۔ اس میں سے ایک عورت اتری اور مجھے اپنا کارڈ دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیٹھرین روڈز؟“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ڈی سی جون آرنلڈ۔ کیا میں تمہیں گھر تک

چھوڑ دوں؟“

”نہیں شکریہ۔ میں پیڈل چلی جاؤں گی۔“

”پیڈل جاؤ کیٹھرین۔“ وہ سہمکراتے ہوئے بولی۔

اس نے کچھ اس انداز سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکی اور اس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گئی اور اس نے کار کا رخ میرے گھر کی جانب موڑ دیا۔ میں نے اس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اسے میرے گھر کا پتا کیسے معلوم ہوا یا یہ کہ وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ میں نے زندگی میں یہی سیکھا تھا کہ بلا ضرورت نہیں بولنا چاہیے۔ راستے میں یونہی میں نے گردن کھاکر دائیں جانب دیکھا تو اس کی شکل جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اسے جانتی ہوں! ایک بار میں نے اسے الڑبھتہ کے اسکول میں دیکھا تھا وہ بچوں کو آگ سے بچنے کی احتیاط کے بارے میں بتا رہی تھی۔

جب ہم ونڈر میسر کے علاقے میں پہنچے تو وہ اپنی گاڑی لائبریری سے متصل کار پارکنگ میں لے گئی اور بولی۔ ”میں تمہیں دروازے کے سامنے نہیں اتار دوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ لوگ تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر باتیں بنائیں۔“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے ایسا کیوں کہا لیکن یہ سوچنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”اب میں جا سکتی ہوں؟“

”ہاں۔“ اس نے کہا۔

میں نے جھک کر اپنا ہانڈ بگ اٹھا یا اور دروازہ کھولنے ہی والی تھی کہ وہ بولی۔

”تمہیں معلوم ہے کہ تم اسکول نہیں جا سکتیں؟“

میں اس کا منہ دیکھنے لگی۔ ”تم مجھ سے وعدہ کرو کہ دوبارہ وہاں نہیں جاؤ گی۔“ اس کا لہجہ نرم لیکن پیغام واضح تھا۔ ”تم جانتی ہو کہ بچی کو گود لینے وقت یہ شرط بھی عائد کر دی گئی تھی۔“

میں دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ”میں کوئی مشکل کھڑی کرنا نہیں چاہتی۔ صرف یہ جاننا چاہ رہی تھی کہ وہ خیریت سے ہے۔“

”ہاں وہ بالکل ٹھیک ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”تم اسے جانتی ہو؟“

”بہت زیادہ تو نہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ کون ہے۔“

”وہ کیسی ہے؟“

”اس کے ساتھ کچھ مسائل تھے لیکن اب وہ ٹھیک ہے۔“

”کیسے مسائل؟“ میں پوچھنے لگی۔

اس نے کندھے اچکا دیے۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ اسے اس سے زیادہ بتانے کا اختیار نہیں۔

”کیا وہ اس سے پیار کرتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کم از کم تم اتنا تو بتا سکتی ہو۔“

”ہاں اسے بہت محبت ملتی ہے۔“

”شکریہ۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے بتانے کا

شکریہ۔“

”تم یہ سمجھ لو کہ اگلی بار میں معتقد لوگوں کو رپورٹ کرنے پر مجبور ہو جاؤں گی اگر تم نے الڑبھتہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔“

میں نے منہ ہاتھ سے ڈھکیا۔ ”اس کا مطلب ہے

کہ آج کی ملاقات ریکارڈ نہیں ہوگی؟“

”نہیں لیکن تمہیں وہاں دیکھ لیا گیا ہے۔“

”وہ کون ہے؟“

”ایک عورت نے تمہیں وہاں انتظار کرتے دیکھا۔ وہ تمہیں پہچان گئی اور سوچنے لگی کہ تم وہاں کیوں کھڑی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تم سے پوچھوں، اس سے پہلے کہ کوئی اور تمہاری شکایت کر دے حالانکہ یہ میرا کام نہیں ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔“ یہ کہہ کر میں گاڑی سے اتر گئی۔

اگلے روز مجھے ایک جگہ انٹرویو کے لیے جانا تھا۔ یہ

ایک فلاحی تنظیم تھی اور اسے ایک خیر شخص نے قائم کیا تھا۔ وہ

ان لوگوں کو اچھا اور کام دینا چاہتا تھا جو پسندیدہ ملازم

نہیں سمجھے جاتے۔ اگر میں یہ ملازمت حاصل کرنے میں

کامیاب ہو جاتی تو مجھے ایک نوجوان لڑکے اور ایک عورت

کے ساتھ کام کرنا پڑتا۔ لڑکا نشیات کا عادی تھا اور وہ عورت

دوسرے جوری کے الزام میں جیل جا چکی تھی۔

میں ان لوگوں کے ساتھ کام کرنے کے بارے میں

خوفزدہ تھی۔ نہ جانے وہ کیسے لوگ ہوں گے۔ جیل میں میرا

واسطہ جن عورتوں سے پڑا وہ بہت ہمدرد، حوصلہ بڑھانے

والی اور دوسروں کے دکھ درد بانٹنے والی تھیں۔ کہتے ہیں کہ

جیل کی پہلی رات بہت بری ہوتی ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ

جیل جانے کا خوف اس سے کہیں زیادہ برا ہوتا ہے۔ جب

مجھے سزا سنائی گئی تو میں نے بہت سکون محسوس کیا۔ مقدمہ ختم

ہو چکا تھا اور رہائی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے اس سزا کو

اپنی تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ اس روز میں نے الڑبھتہ

کے ساتھ ایک مٹن گراز اور سے سینے سے پٹن کر خوب پیار

کر لیا۔ پھر وہ چلی گئی۔ سہ ہوتا ہی تھا۔ میں جانتی تھی

کہ یہی ہوتا ہے۔

میں اپنی بیٹی، اپنے گھر، اپنی آزادی اور اچھے مستقبل کے امکانات سے محروم ہوئی۔ مجھے بارہ سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا لیکن دس سال بعد مجھے جیل پر رہائی مل گئی۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں اسے دوبارہ کوئی مار دیتی اور ایک بار پھر جیل چلی جاتی کیونکہ سزا یافتہ کے لقب کے ساتھ جینا مجھے گوارا نہیں تھا۔

توقع کے برعکس میری ملازمت بہتر ثابت ہوئی۔ انہوں نے مجھے ایک درمیانی فراہم کی جس میں گرم چیکٹ، جوتے، ادنیٰ ہیٹ، ٹوٹی اور دو جوڑی دستانے شامل تھے۔ فیکس اور انشورنس کی قسط کٹ جانے کے بعد مجھے ہفتے کے ایک سو ستر پونڈ مل جاتے تھے۔ میں نے پہلی تنخواہ میں موبائل سمیت ضرورت کی کئی چیزیں خرید لیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب مجھے کسی بہتر جگہ رہائش اختیار کر لینی چاہیے۔

ایک دن جب میں کام سے واپس آئی تو میں نے اس بوڑھی عورت کو دروازے پر کھڑے دیکھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اندر جانے لگی۔ میں نے اسے پکارا لیکن وہ نہیں رکی البتہ دوسری بار آواز دینے پر رک گئی۔ میں تیزی سے چلتی ہوئی اس کے پاس گئی اور آہستہ سے کہا۔

”مجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“

”میں کسی سے نہیں ڈرتی۔“ اس نے جواب دیا۔

”پھر کیوں مجھ سے بھاگ رہی ہیں؟“

”میں اپنے کام سے کام رہتی ہوں۔“

”ہاں بات تمہارا پڑوسی بھی کہتا ہے۔ کیا تم دونوں

ایک ہی طرح سوچتے ہو؟“

اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولی۔ ”میں کل یہاں

سے جا رہی ہوں۔ مجھے ایک بہتر جگہ مل گئی ہے۔“

”یہ خوشی کی بات ہے۔“ میں نے کہا۔

”جانے سے پہلے ایک مشورہ دینا چاہتی ہوں۔ اس

کے دروازے پر کبھی دستک مت دینا۔ وہ مہمانوں کا آنا

پسند نہیں کرتا۔“

”مشورے کا شکریہ۔“ میں نے جنتے ہوئے کہا اور

دو پر چلی گئی۔

میں صبح سواسات بچے گھر سے نکلتی ہوں کیونکہ

سازھے سرت بچے انہیں مجھے پوسٹ آفس کے پاس سے

اپنی گاڑی میں بیٹھاتا ہے۔ اس روز جب میں نیچے آئی تو

میں نے دیکھ کہ اس کے فلیٹ کا دروازہ پوری طرح بند نہیں

تھا۔ اس وقت میرے کانوں میں بوڑھی عورت کے الفاظ گونجنے لگے۔ ”وہ مہمانوں کا آپنا نہیں کرتا۔“ مجھے تجسس ہوا کہ اندر جھانک کر دیکھنا چاہیے۔ میں نے دروازے کو ہلکے سے دھکا دیا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اس کا فلیٹ میرے مقابلے میں بڑا تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک کھانے کی میز رکھی ہوئی تھی اور وہ دونوں بازوؤں پر سر رکھے سو رہا تھا۔ فضا میں الکھول کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ شراب کی ایک خالی بوتل اس کی کہنی کے نیچے دلی ہوئی ہے۔ اس کے سامنے کار کی چابیاں اور پچاس پونڈ کے نوٹوں کی دس گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں دسے قدموں اس میز تک گئی۔ میری نظریں اس رقم پر جمی ہوئی تھیں۔

دس منٹ بعد میں ایلن کے ساتھ اس کے فرک میں بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ ایلن اسٹیزنگ ویل پر اگلیاں مار رہا تھا۔ جب بھی ساندرو کو آنے میں دیر ہوتی، وہ اسی طرح کی حرکتوں سے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتا۔ میں نے اس کا دھیان ہٹانے کے لیے کہا۔ ”کیا میں جب شیٹ دیکھ سکتی ہوں؟“

وہ نیچے کی جانب جھکا اور اپنی سیٹ کے نیچے سے ایک رول کیا ہوا پرنٹ آؤٹ نکال کر مجھے بکڑا دیا۔ جب میں وہ کاغذ دیکھ رہی تھی، وہ مجھے کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آج ہم سینٹ میری چرچ کی گھاس کاٹیں گے۔ اس کے بعد ٹروٹ بیک برج کی سڑک پر صفائی کریں گے۔“

ٹروٹ بیک برج کا نام سننے ہی میں چونک گئی۔ انزبجہ کا اسکول وہیں واقع تھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ آج زیادہ کام نہیں ہے۔“

میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”کبھی انزبجہ اخبار تو دینا۔“ میں نے بھی ایلن یا ساندرو سے انزبجہ کے بارے میں بات نہیں کی تھی۔ اس لیے انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ میری ایک بیٹی بھی ہے۔ وہ اس علاقے میں رہتے تھے۔ انہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ میں نے اپنے شوہر جو لین پر گولی چلائی تھی لیکن وہ اس وقت اتنے چھوٹے تھے کہ انہیں کیس کی دیگر تفصیلات کا علم نہیں ہوگا۔

ایلن نے اس سڑک پر ٹرک کھڑا کر دیا جو اسکول کی طرف جاری تھی۔ میں سڑک کے کنارے کے ساتھ ساتھ صفائی کر رہی تھی۔ ابھی تیسرا ایک بھرا تھا کہ میں نے کھنٹی کی آواز سنی۔ یہ چلنے کا اشارہ تھا لیکن ایلن ڈرنک لینے بیٹروں پر گیا ہوا تھا۔ میں اپنا سامان سینٹ لگی۔ نیچے میرے پاس سے گزر رہے تھے۔ میری نظر ایک موٹی لڑکی پر گئی جو سڑک کے دوسری جانب چل رہی تھی۔ میں اس وقت خوفزدہ ہوئی جب ایک لڑکا اس کے عقب میں آیا اور اس نے آدھا سب کاٹھا اس کے سر پر دے مارا۔ میں نے دیکھا کہ اس لڑکی کے گال سرخ ہو گئے اور اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

”ہائے انزبجہ۔“ لڑکا چلایا اور میں اپنی جگہ پر محمد ہو گئی۔

لڑکی نے اس کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اس نے سڑک پار کی اور بالکل میرے سامنے آ گئی۔ ساندرو نے میری طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ ”یہ وہی ہے۔“

”کون؟“

”تمہاری بیٹی۔“ اس نے کہا۔ گویا وہ اس کے بارے میں جانتی تھی۔

لڑکی ٹھوڑا سا آگے بڑھ کر بس کا دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ یہ جانے کے بعد کہ یہی میری بیٹی انزبجہ ہے، مجھے اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ میں اس کی جانب دو قدم بڑھی۔ اس نے مجھے سڑک دیکھا تو مجھے لگا جیسے وہ نہیں جانتی کہ میں اس کے قریب آؤں، مگر وہ مجھے نہیں جانتی تھی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے یہی ظاہر ہوا رہا تھا پھر مجھے اس رور کی بات یاد آ گئی۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی مجھے یہاں دیکھ لے اور معاملہ مزید خراب ہو جائے۔ میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور میں واپس ٹرک پر آ گئی۔ گھر واپس آتے ہوئے راستے میں ساندرو نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔

ایکے دوسرے کے باہر فلیٹ پاچھ کے ساتھ ایک تیرہ فی فٹ کی دیوار تھی۔ میں نے ساندرو

ایلن کو خدا حافظ کہا۔ ایلن عجبی شیشے میں کچھ دیکھ رہا تھا۔ ساندرو آہستہ سے بولی۔ ”میرا خیال تھا کہ تم اس سے بات کرو گی۔“

”تمہارا خیال غلط تھا۔“ میں نے کہا۔ میں عمارت میں داخل ہوئی۔ دو آدمی نیا دروازہ لگا رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“ ان میں سے ایک بولا۔ ”کسی نے دروازے کے ساتھ دروازہ لگایا ہے۔ اس سے صرف تانے کو نہیں بلکہ چوکھٹ کو بھی لگا دیا ہے۔ اب نیا دروازہ لگا کر پڑ رہا ہے۔“

”یہ کس کی حرکت ہے؟“

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”پتا نہیں لیکن کبھی منزل پر پہنچنے والا کتا شور مچا رہا ہے۔“ میں بیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگی تو کسی کے چلانے کی آواز سنی کہ مجھے تشویش ہوئی۔ میرا بوڑھی دھوکا کر رہا تھا کہ اس کی رقم غائب ہے جو غلط نہیں تھا۔ عمارت کا نقشہ کچھ اس طرح بنا ہوا تھا کہ مجھے اوپر جانے کے لیے اس کے دروازے کے آگے سے گزرنا پڑتا۔ کمرے کے باہر کڑی کے کمرے بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اسے ہاتھ دیکھا۔ اس کے فلیٹ کا دروازہ بھی زبردستی کھولا گیا تھا اور اوپر کا قبضہ غائب ہونے کی وجہ سے وہ تیس درہنے کے لیے پڑ چھوٹی رہا تھا۔ میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی پر آئی۔ فلیٹ کا دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگائی۔ سیکینڈ بعد ہی مجھے سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آہٹ ملی دی پھر دروازے پر دستک ہوئی لیکن میں خاموش ٹھہر رہی۔

”میں جانتا ہوں کہ تم اندر موجود ہو۔“ اس نے زیر جبین میں کہا۔ ”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

میں نے آہستگی سے کینٹ کا دروازہ کھول کر ایک ری ٹائی جو چمچ اور بیڑیاں کاٹنے کے کام آتی تھی کچر دروازہ کھول دیا۔ اس نے ہیلو کہنے کی بجائے ذمت گوارا نہیں کی۔

”تم صبح کتنے جگے جاتی ہو؟“

”سو سات۔“

”آج بھی اسی وقت گئی تھیں؟“

”ہاں۔“

”کیا تم نے کسی کو میرے دروازے کے قریب دیکھا تھا؟“

”نہیں۔“

اس نے ایک لمحہ توقف کیا پھر واپس جانے کے لیے

مڑنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”کیا میں کچھ پوچھ سکتی ہوں؟“ اس کا انحصار سوال کی نوعیت پر ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”آج میں نے یہاں بہت گزر دیکھی۔ صرف عمارت ہی نہیں بلکہ تمہارے دروازے کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ ان حالات میں کیا یہاں رہنا محفوظ ہے؟“

”میں نہیں سمجھتا کہ کوئی تمہیں پریشان کرے گا۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

اس رات میں ٹھیک طرح نہ سو سکی۔ ذرا سے کھٹکے پر آنکھ کھل جاتی۔ میں نے رات کو ہی اپنے سفری بیگ میں ضرورت کی سب چیزیں رکھ لی تھیں۔ البتہ ٹوٹے برش، ٹوٹے پیسٹ اور بستر کے سرہانے رکھی ہوئی تصویر رہنے دی جس سے ظاہر ہو کہ میرا دل اس کے آگے بڑھ رہا ہے کیونکہ آج نہیں تو کل میرے فلیٹ کی تلاشی ہوئی تھی۔

میں نے ایلن کو ایک پیغام کے ذریعے اپنی بیماری سے مطلع کیا اور بتایا کہ جب کام پر واپس آنا ہوا تو اسے اطلاع کر دوں گی۔

پہلے آئی تو وہ لائٹری کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ ”آج جلدی اٹھنا پڑ گیا۔ مجھے کپڑے دھونے تھے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ گئی۔ وہ بولا۔ ”میں سوئے جا رہا ہوں۔ تم سے شام کو ملاقات ہوگی۔“

مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے نہ دیکھ رہا ہو۔ اس لیے گیٹ ہاؤس کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگی اور ایک لمبا چمک کاٹ کر اس جگہ آئی جہاں اس کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے بیگ سے اس کی چابیاں نکالیں اور کار میں سوار ہوئی۔ دس منٹ بعد میں نے بڑی احتیاط سے اپنی گاڑی ایک مینی بس اور کار کے درمیان کھڑی کی۔ وہ جگہ انزبجہ کے اسکول سے صرف سو گز کے فاصلے پر تھی، اب مجھے اس کا انتظار کرنا تھا۔

”انزبجہ۔ تم انزبجہ ہی ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”کیا میں تم سے بات کر سکتی ہوں؟“

”کس سلسلے میں؟“

”کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم کار میں بیٹھ جاؤ؟“ میں نے تجویز پیش کی۔

اس نے لمبے بھر کے لیے سوچا پھر بولی۔ ”تم کون ہو؟“

میں نے فوری طور پر اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ اس کی ماں ہوں۔ "میں کیتھرین روڈز ہوں۔"

اس نے ایسا کوئی تاثر نہیں دیا کہ میرا نام سن کر وہ کیا محسوس کر رہی ہے۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ کیتھرین روڈز کون ہے۔

"تم جانتی ہو کہ میں کون ہوں؟" میں نے اسے آزمانے کے لیے پوچھا۔ "کیا تم نے اس سے پہلے میرا نام سنا ہے؟"

اس نے سر ہلایا لیکن اس کا چہرہ اب بھی جذبات سے عاری تھا پھر اس نے روٹا شروع کر دیا۔ "غم آگئیں؟"

"ہاں۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

میں نے کارموڑے کی طرف بڑھادی۔ میں نے کسی منزل کا تعین نہیں کیا تھا لیکن الزبتھ نے کہا کہ میں کار چلائی رہوں۔ دراصل مجھے امید نہیں تھی کہ وہ کار میں بیٹھے گی بلکہ میرا خیال تھا کہ وہ میرا نام سنتے ہی چل دے گی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ بولی کہ میں اسے اسکول سے دور لے جاؤں۔

"اگر میں وہ نہ ہوں جو میں نے بتایا ہے تو؟"

"اور کون مجھ سے بات کرنا چاہے گا؟" اس نے کہا۔

"اس کے علاوہ تم میرا نام بھی جانتی ہو۔"

"مجھے خوشی ہے کہ اس نے تمہارا نام نہیں بدلا۔ میرا مطلب تمہاری موجودگی ہے۔"

"وہ بدلتا چاہ رہی گی۔" اس نے جواب دیا۔ "وہ میرا نام بار بار رکھتا ہے جیسی کہ ڈیڈی نے منع کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے نہیں دکھ ہوگا۔"

"تم کس نام کو ترجیح دیتی؟"

"مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"تمہاری مٹی اور ڈیڈی کیسے ہیں؟"

"ڈیڈی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تھے جب میں آٹھ برس کی تھی۔"

"مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔" میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "کیا تم اس سے نفرت کرتی ہو؟"

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "مما یہ نہیں جانتی۔ ڈیڈی ان کی کسی دوست کے ساتھ چلے گئے تھے جس کا ماما کو بہت افسوس تھا۔ اسی لیے انہوں نے مجھے ڈیڈی سے ملنے سے منع کر دیا۔"

"وہ کہاں رہتے ہیں؟"

"مجھے معلوم نہیں۔"

"وہ تم سے رابطے میں نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

مجھے یہ سن کر غصہ آ گیا۔ میں صرف اس وجہ سے اسے کسی کو دوسرے پر تیار ہونے کی بجائے کہ ان کے ایک ٹیلی بل جانے کی لیکن اسے باپ سے دور رکھنا معاہدے کا حصہ نہیں تھا۔ میں نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "تمہیں میرے خط ملتے تھے؟"

"نہیں۔"

"تم سوچتی ہو... گی کہ میں نے بھی تمہیں چھوڑ دیا۔"

"ہاں۔"

آگے چل کر مجھے ایک کافی ہاؤس کا پورے نظر آیا۔ میں نے عمارت کے سامنے گاڑی کھڑی کی اور بولی۔ "میں کافی پینا چاہتی ہوں۔ تمہیں کچھ چاہیے؟"

"نہیں۔" وہ اپنی ٹیگٹیجی رہی۔

"کیا تم اندر نہیں آؤ گی؟"

"میں نہیں انتظار کروں گی۔"

میں لیڈیز روم میں مٹی اور سبک پر کھڑے ہو کر منہ دھونے لگی۔ میں نے آئینے میں اپنا کس دیکھا۔ یہ تم کیا کر رہی ہو کیتھرین؟ تمہیں احساس ہے کہ تم نے اسے کتنا برا کر لیا ہے؟"

میں گھر سے نکلے وقت میرا خیال تھا کہ اگر میں اس سے بات کرنے میں کامیاب ہوئی تو یہی کافی ہوگا۔ میں صرف یہ چاہتی تھی کہ وہ محفوظ اور خوش رہے پھر میں یہ جگہ چھوڑ دوں گی جب تک وہ اٹھارہ برس کی نہیں ہو جاتی۔ میں کسی دوسری جگہ رہ کر بھی اس سے قانون کے مطابق سوشل سروس کے ذریعے رابطہ کر سکتی تھی۔ مجھے یہ امید نہیں تھی کہ وہ میرے ساتھ آنے پر تیار ہو جائے گی۔

میں نے کاؤنٹر پر جا کر کافی، چاکلیٹ اور سوپ لیا اور کار کی طرف چل دی۔ میں نے ٹرے اپنے اوپر اس کے درمیان رکھی تو وہ بولی۔ "میرے باپ کے بارے میں بتاؤ جو میرا حقیقی باپ تھا۔ میں نے سنا ہے کہ تم نے اسے قتل کر دیا تھا۔"

"وہ غیر ارادی قتل تھا۔" میں نے کہا۔

"کسی کو شاکٹ سن سے مار دینا غیر ارادی قتل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اسے حادثاتی کہا جاسکتا ہے۔"

"یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر میں فخر کر سکوں۔"

"پھر تم نے اسے قتل کیوں کیا؟"

"اس لیے کہ اس کے ہاتھ بہت چلے گئے تھے۔"

شراب پی کر تو وہ بالکل آگے سے باہر ہو جاتا تھا۔

"بس یہی ایک وجہ تھی؟"

"یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی بلکہ اس کا رویہ دن بہ دن خراب ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا کاروبار بہت اچھا چل رہا تھا۔ وہ مقامی کونسل کا چیئرمین بھی منتخب ہو گیا تھا لیکن بارہ سال قبل اسے کاروبار میں نقصان ہونا شروع ہو گیا۔ وہ یہ ناکامی برداشت نہ کر سکا اور اس نے بے تحاشا شراب پینی شروع کر دی۔ وہ اپنا غصہ مجھ پر اتارتا تھا۔ اس نے مجھے مارنا شروع کر دیا اور جب میں اسے شراب پینے سے روکتی تو وہ اور زیادہ تشدد برقرار آتا۔ کبھی کبھی میں سوچتی کہ اس سے شادی کر کے غلطی کی کیونکہ لوگوں نے مجھے پہلے ہی اس کے بارے میں بتا دیا تھا پھر میں نے وہی کیا جو بہت سی عورتیں ان حالات میں کرتی ہیں۔ میں نے لوگوں سے چھپانا شروع کر دیا۔ ان پر یہی ظاہر کرتی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ میں اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

"وہ ہمیشہ گھر میں شاکٹ گھن رکھتا تھا۔" میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ایک دن وہ نشے میں دھت گھر آیا اور اپنی لینڈ روور لے جا کر باغ میں تمہارے ویڈی ہاؤس سے ٹکرا دی۔ شکر ہے کہ تم اس کے اندر نہیں جا کر قریب ہی موجود تھیں۔ تم نے جلاٹا شروع کیا تو اس نے تمہیں مارا جب میں اس پر چلائی تو اس نے اپنی گن نکال لی۔ اس وقت تک میں تمہیں اپنی گود میں لے چکی تھی اور وہ ہم دونوں کو نشانے پر لیے ہوئے تھا۔ میں نے گھٹنوں کے بل جھک کر اس سے التجائی کہ میں گولی مارے لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے ٹریگر دبا دیا لیکن گولی نہیں چلی۔ اس لمحے میں محسوس کیا کہ اگر اس وقت وہ ہمیں نہ مار سکا تو بعد میں ضرور ایسا کرے گا۔"

"وہ کار میں سے فالٹو کارٹوس لینے گیا تو میں نے اس کی جیکٹ سے دو کارٹوس نکال کر گن کو ڈکری۔ نشے میں ہونے کی وجہ سے اسے ان کا خیال نہیں آیا۔ وہ پیسے ہی واپس آیا یا میں نے اسے گولی مار دی۔"

"میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ تم نے اس پر گن تانی تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اسے گولی مارنا چاہتی تھیں۔"

"ہاں مجھے اپنے دفاع میں گولی چلائی پڑی۔"

"لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوا تھا؟"

"نہیں جیسا کہ میں نے کہا وہ یا میں، میرے وکیل نے ذاتی دفاع کا ٹکٹ اٹھا یا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں اسے مرتے ہوئے دیکھتی رہی اور میں نے ایسپوٹس کو نہیں بلایا۔"

جب تک مجھے اس کے مرنے کا یقین نہیں ہو گیا۔ اسی لیے مجھے بارہ سال کی سزا ہوئی۔"

"میری ممانعت تھی کہ تم باغی ہو گئی تھیں۔ تم نے غصے میں آ کر اسے گولی مار دی اور مجھے تباہ چھوڑ دیا کیونکہ تم ذہنی طور پر اس قابل نہیں تھیں کہ ایک سال کی ذمہ داری سنبھال سکو۔"

"اب تمہیں حقیقت معلوم ہو گئی۔" میں نے کہا۔

"اب یہ تم پر ہے کہ اس پر یقین کرو یا نہیں۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔"

الزبتھ سسکرائی اور کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اس کی توجہ کسی اور جانب ہو گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بے چینی دیکھی۔

"کیا تم کسی مشکل میں ہو؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

"تھوڑی بہت۔" میں نے جواب دیا۔ "تمہیں اپنے ساتھ لاکر میں نے بیرونی شراکتہ کی خلاف ورزی کی ہے۔"

"اوہ۔" وہ پریشان ہوتے ہوئے بولی۔

"اور یہ کار بھی چوری کی ہے اور شاید اس وجہ سے مجھے دوبارہ جیل جانا پڑے۔" وہ اپنا ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔

"بے خبر سے کے لیے؟"

"نہیں۔ شاید دو مہینے کے لیے۔"

میں نے مرکز دیکھا۔ مین پولیس والے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ "جہاں تم جا رہی ہو۔" وہ جلدی سے بولی۔

"کیا میں تمہیں خط لکھ سکتی ہوں یا ملے آ سکتی ہوں؟"

"ضرور۔ مجھے خوشی ہو گی۔"

اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ پولیس والے اب چند گز کے فاصلے پر رہ گئے تھے۔ الزبتھ میرے گالوں کا بوسہ لیتے ہوئے بولی۔ "تم نے میرے لیے جو کیا۔ اس پر میں تمہاری شکر گزار ہوں۔"

"یہ میری خوش نصیبی ہے۔"

"کیتھرین روڈز۔" ایک پولیس آفیسر نے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں آ رہی ہوں۔"

"اپنا بیگ مت بھول جانا۔" میں نے اسے بیگ پکڑاتے ہوئے کہا تو وہ کچھ حیران ہوئی۔

"اس کی تہ میں کچھ ہے۔" میں نے سر کوئی میں کہا۔

"اس میں کچھ رقم ہے بلکہ کافی زیادہ۔ میرے واپس آنے تک اسے حفاظت سے رکھنا۔"

اب مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ میں نے چوری کی رقم امانت کے طور پر محفوظ ہاتھوں میں منتقل کر دی تھی۔



✽ مہتاب اور یس..... راولپنڈی
اس ایک پل میں یہاں ایک عمر بیت گئی
تری نگاہ کرم ہے کہ سڑکی ایام

✽ کمال انور..... کراچی
غارت گری کے بعد بھی روشن تھیں بستیاں
ہارے ہوئے تھے لوگ مگر حوصلے میں تھے
آندھی ہوا کے لئے گئی جس کو ابھی ابھی
منزل کے سب نشاں اسی راستے میں تھے

✽ صلاح الدین..... ٹنڈوالہار
میرے ہونٹوں پہ نہیں تیرے لبے
یہ تو ہیں عرشِ نبوت کے حلقے

✽ نور علی..... چنڈ واہان خان
سارے شہر کو غم سے ڈھکی ہوئی تھی
وقت کا ہاتھ ہلاتا ہوا تھا جس نے جس کو پار
جاگتی گلیوں میں زرد زائید ناچار
جس نے نہ ہر دم ڈرتے تھے، ان نے آخر وار

✽ ہادیہ ایمان، ناہا ایمان..... غور، مہاس
پہرہ کسے اسے چاندنی کے ہاتھوں میں
میں اپنے گھر کے اندھیروں میں اوت آؤں گی

✽ داؤد اشفاق..... جگر شاہ مقیم
موتوں پہلو میں پالا اور ہم کچھ بھی نہیں
تم نے دیکھا اک نظر اور دل تمہارا ہو گیا

✽ ماہین فاطمہ..... جگر شاہ مقیم
میرے پختہ ارادے خود مری تقدیر بدلیں گے
میری قسمت نہیں محتاج ہاتھوں کی کٹیروں کی

✽ ماہین باہر، فضل عباس..... گلستانہ درو کھاریاں
بہت سے لوگ دل کو اس طرح محفوظ رکھتے ہیں
کوئی بارش ہو یہ کاغذ ذرا بھی غم نہیں ہوتا
چھڑتے وقت کوئی بدگمانی دل میں ابھی جاتی ہے
اسے بھی غم نہیں ہوتا، مجھے بھی غم نہیں ہوتا

✽ ملا اکبر جرم..... جگر شاہ مقیم
برس رفتا ہے ہمیں رفتا میں دوسرا حسن
گدائے عشق ہے، کاسے میں اک نظر بھی نہیں

✽ اشفاق شاہین..... لاہور
صبا نے پھر دو زنداں پہ آکے دکی دستک
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ ٹھہرائے

✽ عبدالجبار روی انصاری..... قصور
کتے میں سب چراغ تھے، تارے تھے دم بخود
میں اس کے اختیار میں، وہ میرے بس میں تھی

✽ محمد صفر معاویہ..... ضلع خانیوال
اب کے بھی ہے جی ہوئی آنکھوں کے سائے
خوابوں کی ایک دھند جو پچھلے برس میں تھی

✽ مرہم نہ بن سکے گی بھی معذرت تیری
دل توڑنے سے پہلے تجھے سوچنا تو تھا

✽ باہر عباس..... گلستانہ درو کھاریاں
میں اداسیاں نہ جاسکوں بھی جسم و جاں کے فرار پر
دوہائے ملیں مری آنکھوں میں مجھے اکی سخت سزا دے

✽ محمد علی..... حیدر آباد
روح بدلنے میں اُسے دیر ہی کیا گنتی ہے
جس کسی کو بھی زمانے کی ہوا گنتی ہے

✽ چنانزبیب احمد..... لاڑکانہ
لوٹ آتے ہیں سرشام پرندے گھر کو
اور پرچائیں بھی دیوار سے جاگتی ہے

✽ سعد شکر، تو نے خواب سے چونکا دیا مجھے
سعد شکر، ہو رہا ہے ترا الفتاں کم
تخلیق فن کردوں گا بعنوان ارتقاء
جس ہاتھ میں قلم ہے اسی ہاتھ کی قسم

✽ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی
آپ کہتے ہیں تو تسلیم کیے لیتے ہیں
ورنہ حالات سنبھل جائیں گے ممکن تو نہیں

✽ طلحہ اکمال..... کراچی
فی میں ڈوب کے ٹھنڈی ہوا میں آئی تو ہیں
برس بھی جائیں گی آخر، گھٹائیں چھائی تو ہیں
اب اس کے بعد مجھے فکر کیا کہ ہوگا کیا
وہ آنکھیں آج برے غم پہ ڈھائی تو ہیں

✽ شرمین عباسی..... فیصل آباد
کل کوکل پر رکھوں جب کل آئے گا دیکھا جائے گا
آج کی رات بہت بھاری ہے، آج کی رات نہیں رہ جاؤ

✽ محمد رشید سیال..... روہڑی
کب تک یوں پردے پردے میں حسنِ محبت کو چھلاتا
موت کا دن بھی ششکار کا دن ہے، چھپنے والا سانسے آؤ

✽ تیرا کیا جائے گا میرا ہو کے اے جانِ ادا
چند لکھوں کے لیے ہم کو خوشی مل جائے گی
✽ عصمت علی..... سرگودھا

✽ رحمتا اور بان جانا جاہلوں کا حسن ہے
کیے دل تیرے مجھونے پر بگڑنا چھوڑ دے
✽ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی

✽ ریکو تو کہتے چین سے اس کس دیرِ مطلقین!
ہیں ارض پاک کو آدھا کیے ہوئے

✽ الیس سجاد..... ضلع اوکاڑہ
بزم سے اٹھ جائیں جب ہم گریباں چاک لوگ
کس کے گھر جائیں گی شہر عشق کی رسوائیاں

✽ نور العین..... اسلام آباد
ہم اپنی قوتِ تخلیق کو اکسانے آئے ہیں
منیر ارتقاء میں بجلیاں دوڑانے آئے ہیں

✽ فیصل خان..... بہاولپور
جو گردش میں رہیں گے اور بھی خالی نہیں ہوں گے
ہم ایسے جامِ بزمِ دہر میں چمکانے آئے ہیں

✽ کس کی تحویل میں تھے کس کے حوالے ہوئے لوگ
چشمِ گریہ میں رہے دل سے نکالے ہوئے لوگ
کب سے راہوں میں تری گرد بنے بیٹھے ہیں
تجھ سے ملنے کے لیے دقت کو نالے ہوئے لوگ

✽ مدحت..... کراچی
دنیا بھی تو ہاتھ پاؤں سے باہر کا سفر ہے
منزل بھی رستوں کے حوالے نہیں کرتا

✽ رحیلہ شفق..... سندھی ہوئی، نیو کراچی
جس آگ سے روشن ہوا احساس کا آئین
اس آگ کو آنکھوں کے حوالے نہیں کرتا

✽ زین خان آفریدی..... حیدر آباد
ہمارے عالمِ فرقت میں تنہائی نہیں ہوتی
تصور کی ملاقاتوں میں رسوائی نہیں ہوتی

✽ زین خان آفریدی..... حیدر آباد
جدائی صرف فاصلوں کا ہی تو نام نہیں
کچھ لوگ تو صدیوں سے ہاتھ قہارے جدا بیٹھے ہوتے ہیں

✽ اوشا راہی..... ملکی سندھ
لذتِ وصل سے بھی بڑھ کے مزہ آئے گا
اپنی تنہائی سے دل اپنا لگا کر دیکھو

✽ تبسم بانو..... سیالکوٹ
رات آئی ہے بلاؤں سے رہائی دے گی
اب نہ دیوار نہ زنجیر دکھائی دے گی

✽ چلی ہیبر..... سیالکوٹ
تجھ کا سا جو ہے اس کو قیمت جانو
دینا پھر کوئی صورت نہ بھائی دے گی



حبس زدہ

منظبر سلیم ہاشمی

زندگی جب زندان کا منظر نامہ بن جائے تو سانس لینے میں گھٹن کا احساس انسان کی ہمت ختم کر دیتا ہے... وہ بھی ایک ایسے ہی ماحول میں زندہ رہنے پر مجبور تھی جہاں اس کی جان کا دشمن کوئی غیر نہیں بلکہ اس کا اپنا سگنا باپ تھا... ایسے میں جو گھر اس کی پناہ گاہ تھا وہی اس کی مقتل گاہ بن گیا۔

ایک بھڑول باپ کی شقی التلی... ایک لرزہ خیز واردات

ایڈ کو اپنے پاس زدو لکی جینی کو بوشن سے واپس لانے کا کام ملا تھا۔ وہ نہ صرف اپنے کام کا ماہر تھا بلکہ بوشن کے دے میں بھی تفصیل سے آگاہ تھا۔ ویسے بھی تمام کارندوں کو وہ سب سے زیادہ قابل اعتماد تھا۔ پازرس نے تمام تفصیلات دو بار سے زیادہ دہرائیں، حالانکہ... ایڈ کو یہ سب پہلی مرتبہ ہی ذہن نشین ہو گیا تھا۔ اس نے پازرس کی لاف و گزاف میں دل دینے کی بالکل کوشش نہ کی اور اپنی بیئر کی چھوٹی چھوٹی چکیاں لیتا رہا۔

✽ زوہیب احمد ملک... گلستان جوہر، کراچی
شربت درد میں ہونٹوں پہ دعا کا ہوتا
ثابت اس سے بھی تو ہوتا ہے خدا کا ہوتا
✽ عامر علی... شاہ فیصل کالونی، کراچی
وعدہ تو ہے شب کا، مگر اب دن نہ گئے گا
جیراں ہوں کہ یہ آج کی شب جانے کب آئے
✽ کہکشاں... پشاور
کل مجھ پر الزام تھا سارا، آج تو فتنے ہے رنگ تہمارا
کل تم مجھ سے شرمائے تھے، آج آئینے سے شرماء
✽ فاطمہ کنول... منڈی بہاؤ الدین
بہت قریب نہ آؤ، کہ دور سے بھی ہم
وہ آج آئی کہ مرجھا گئے دلوں کے چمن
✽ عذرا وقار... خانیوال
اے ستارہ نشیں! چمن پنا
مانگتے ہیں شربت وحدت ہم
✽ نعمان راحیل... لاہور
مدت کے بعد اذن تقسیم ملا ہمیں
وہ بھی کچھ ایسا تلخ کہ آنسو نکل پڑے
✽ فیض احمد... میانوالی
کچھ درگزر کا کھیل، کچھ ایثار کا کمال
دور نہ وہ کون ہے جو کسی سے نباہ لے
✽ جمعہ خان... پشاور
تم اتنی دور سے چل کر برے قریب آئے
تو اب قریب ہی بیٹھو، تمھیں مجھے دے دو
✽ فرید احمد... فیصل آباد
اک میں فضا کے دل میں انھی
یا تیر نکل گیا سماں سے
✽ جاوید اختر رانا... پاکپتن شریف
تیرے بجز میں تو ہوں ملکاتہ تیرے قرب میں آنکھیں ملتی ہیں
تجھے کھوتا ایک قیامت تھا تیرا ملنا اور غدا ہوا

✽ سعدیہ خورشید... ملتان
سب سے مشکل ہے اذیت یہ گوارا کرنا
دل سے اترے ہوئے لوگوں میں گمراہ کرنا
✽ محمد عمیر... کراچی
شام کی دھند میں آتا ہے بہت یاد ہمیں
اُس کا چہرہ تھا کھنی شب میں ستارے جیسا
✽ جنید احمد ملک... گلستان جوہر، کراچی
کوئی بھی لمحہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا
وہ شخص ایسا مگیا پھر نظر نہیں آیا
✽ مہر النساء... ساہیوال
کمرے میں میرے غم کے سوا اور کچھ نہیں
کھڑکی سے جھانکتی ہے کسے بار بار دھند
✽ ذیشان انصاری... جہلم
اٹھ کر چلا گیا کوئی وقفے کے درمیاں
پردہ اٹھا تو سارا تماشا بدل گیا
✽ احمد علی... رحیم یار خان
جودل کے سمندر سے ابھرتا ہے یقین ہے
جو ذہن کے ساحل سے گزرتا ہے گماں ہے
✽ بشارت علی... چنیوٹ
درد کا احساس مجھ کو درد سے پہلے بھی ہے
چوٹ وہ سہلا رہا ہوں جو ابھی کھائی نہیں
✽ زاہد علی... کوئٹہ
پت جھڑ میں ڈالیوں پہ جو گزری گزرمی
چھیلی ہوئی زمین کی جھولی تو بھر گئی
✽ ناہید یوسف... اسلام آباد
دھوڑتا ہوا ہمیں بھی تو ستارہ کوئی
گھر سے نکلیں تو نکل آئے گا رستہ کوئی
✽ حسان احمد... لاہور
تجھے نہیں ہے ابھی فرصت کرم نہ سہی
تجھے نہیں ہیں مرے ہاتھ کبھی دعا کرتے

محفلِ شاعرانہ

نام: _____
پتا: _____



”امید تو نہیں ہے کہ کوئی گزربز ہوگی..... لیکن اگر بوجی جائے تو تم پولیس والوں سے واقفیت رکھتے ہو..... امید ہے کہ سب بہ آسانی سنبھال لو گے۔ وہاں کے کئی کوچے تمہارے جانے پہچانے ہیں..... فرار کے وقت تم کسی اندر کی گلی میں بھی بچھنے سے رہے..... مجھے پوری توقع ہے کہ تم اسے کھن کے بال کی طرح نکال کر لے آؤ گے.....“

ایڈ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بیڑ کا ایک اور گھنٹ بھرتے ہوئے اس نے سوچا کہ زلو کا حکم کون ٹال سکتا ہے؟ اگر اسے اس کام کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا تو وہ انکار تو کر ہی نہیں سکتا تھا۔ پائرس کی موجودگی البتہ اس کے لیے ذہنی اذیت کا سبب بن رہی تھی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ زلو کو آخر ایک جج کا آدمی لانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ یہ سب کام اسے براورہ راست بھی تو بتا سکتا تھا۔

البتہ اسے زلو پر اعتماد تھا، اس وجہ سے وہ پائرس کی باتیں اچھی طرح ذہن نشین کرتا جا رہا تھا۔

”کیا تم کل نکل سکتے ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے ایک لفظی جواب پر اکتفا کیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اگلے دن وہ اپنی گاڑی میں پوری تیاری کے ساتھ بوسن کی جانب رواں دواں تھا۔ ساتھ والی نشست پر اس کا بیگ پڑا تھا جس میں ضرورت کے مطابق کپڑے تھے۔

اپنی ناقص ایم ایم کی اسمتھ ایڈر وین گن اس نے ڈیش بورڈ کے خفیہ خانے میں دو فاصل میگزینز کے ساتھ چھپا رکھی تھی۔ وہ جیسے کا دن تھا اور اپنی منزل تک پہنچنے میں اسے چار گھنٹے کا وقت درکار تھا۔

ابھی سب احوال کی آمد کا موسم شروع نہیں ہوا تھا، ٹریفک کا دباؤ کم ہونے کے باوجود اس نے اپنی شیورلے کی رفتار ستر سے زیادہ نہیں ہونے دی تھی۔ میا جیوسٹس کی پہاڑیوں سے گزرتے ہوئے اس نے اپنے موبائل فون سے ایک پرانا نمبر ملایا۔

”کون بول رہا ہے؟“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد فون اٹھانے والے نے پوچھا تو اس کا لہجہ مشرق وسطیٰ کے رہائشی ہونے کا غماز تھا۔

”کرٹ..... میں ایڈ..... بمصرف تو نہیں ہو؟“

”او خدا یا..... تم..... تم کہاں سے بول رہے ہو؟“

”مشرق برقع کے آس پاس ہوں.....“ وہ مزک کنارے لگے ساکن بورڈ کو پڑھتے ہوئے بولا۔

”یہ تو کمال ہی ہو گیا۔ کیا تم میرے پاس روکے؟ میں

نے آج ایک دعوت کا اہتمام کیا ہوا ہے..... سب پرانے لوگ جمع ہوں گے..... تمہاری آمد تو پارٹی کو چار چاند لگا دے گی..... تم آ رہے ہو نا؟“ کرٹ بولتے بولتے بے یقینی سے پوچھ بیٹھا۔

”کوشش کروں گا.....“ ایڈ کے لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔

”رات تو میرے گھر پر ہی گزار دو گے نا؟“

”ہاں..... لیکن ساری رات نہیں..... مجھے پارٹی ادھوری چھوڑ کر ایک خاص کام کے لیے جانا پڑے گا.....“

شاید پھر شب سہری کے لیے کسی ہوٹل کو ٹھکانا بناؤں گا.....“

”جائز ہوں کیا رسہ ہے گا؟ تمہاری جنگ کرا دوں وہاں پر؟“

”اوہ نہیں..... تمہارا شکریہ کرٹ لیکن میں چاہوں گا کہ اس بار میں اپنا انتظام خود کروں..... ہاں البتہ بروٹین کے پاس کسی ہوٹل کا چتا جتا دو تو مجھے انتخاب کرنے میں آسانی ہوگی۔“

”فیڈن ہوٹل بہترین رہے گا..... لیکن مجھ سے مل کر جانا.....“ یہ کہہ کر وہ ایڈ کو پتا سمجھانے لگا لیکن اس نے بات کاٹ دی۔

”مجھے یاد ہے ایڈر میں تمہارا..... اتنا عرصہ نہیں ہوا کہ میں سب بھول جاؤں.....“

”تم بس شام کو جلدی آ جانا، اگر تمہارا کام اس میں حائل نہ ہو تو.....“ غروب آفتاب کے بعد سے ہی پارٹی شروع ہو جائے گی..... اور بہت دیر تک چلے گی..... تم جلدی آ جا گے تو ہمیں باتیں کرنے کا وقت مل جائے گا..... بہت وقت بیت گیا ایڈر میرے بچے..... بہت وقت.....“

”میں پہنچ جاؤں گا.....“ اس سے پہلے کہ کرٹ مزید جذباتی ہوتا ایڈ نے ہائی بھرے میں ہی عافیت چھپی۔

زولو نے اپنی بیٹی کا نام ہی ایسا رکھا تھا جو کہ آئینل مجھے مار دالی کیفیت پیدا کرتا تھا۔ ایذا نام سن کر ہی ایڈ کا دھول مٹی اور سیرک اپ میں لٹھری حسین یاد آ جاتی تھی۔ بچپن سے اب تک وہ ایذا اسے کئی بار مل چکا تھا..... حتیٰ کہ اس کو اسکول پہنچانے اور واپس لانے کے فرائض بھی انجام دیا کرتا تھا۔

”مشکل ہی ہے کہ اس کو یہ بات یاد ہو.....“ اس نے سوچا۔ وہ کم سنی سے ہی ایک بدلتی ہوئی شہر کی جانی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر غمزے کرتا اور غلیظ گانیاں بکنا اس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔

اب وہ تیس برس کی ہو چکی تھی اور اتنی نادان تھی کہ

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

گلے لگالیا۔

”یہ بالکل اصلی ہے۔ میرے بارسلونا والے دوست کا قہقہہ ہے۔۔۔۔۔ وہ بھی تمہاری طرح خوش لباسی کے خط میں مبتلا ہے۔۔۔۔۔“ طویل عرصے بعد ملاقات کے تعلقات سے گزرنے کے بعد کرٹ اسے اپنے اسٹڈی روم میں لے آیا تھا اور گلاس پکڑا چکا تھا۔

”تم جس سلسلے میں آئے ہو۔۔۔۔۔ کیا آج رات ہی وہ کام سرانجام دیتا ہے؟“ اس نے ایڈ سے پوچھا۔

”ایک اور گلاس کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔۔۔۔۔ ایڈ نے نفی میں سر ہلایا۔“ کوشش کروں گا کہ کل تک کام، انجام بخیر ہو جائے۔۔۔۔۔“

”پھر واپس یو یارک؟“

”ارادہ تو آوارگی واپسی کا ہے۔۔۔۔۔“

”جب میرے ساتھ تھو ضرور کرنا۔ ہم ساحل پر جا سگے۔۔۔۔۔ اور وہاں تمہارے پسندیدہ گائے کے گوشت کے پسندے ضرور کھا سگے۔“

”اف۔۔۔۔۔ کیا دور یا دور لایا؟ میں تو بھول بھال ہی گیا ہوں کہ ان کا ذائقہ کیا ہوتا تھا۔۔۔۔۔ یقیناً چلیں گے۔“

”ہاں اور اصلی والے یہ چلیں گے۔ ان کی شہرت دیکھ کر یہاں بہت سے فحل اپنی دکائیں سجا کر بیٹھ گئے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن اصلی والے تو کمال کے ذائقہ دار ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ گوشت کے اندر تک سمندری نمک کی لذت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔۔۔۔۔“

مزید مہیاہوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ اسٹڈی روم کے دروازے کے باہر سے آنے والی ان کی آوازیں ایڈ بخوبی سن سکتا تھا۔ بروز رکان نیوٹالے اس کے قدموں میں ادھر رہا تھا۔

”تمہارے سنے شام کو کیسے ہیں؟“

کمرے میں چھائی خاموشی کو ختم کرنے کا اس سے کوئی بہتر طریقہ نہ ملتا تو اس نے یہی سوال دار کیا۔

”بے وقوف۔۔۔۔۔ کم عقل۔۔۔۔۔ چنانچہ کہاں سے منشا خواہ کر آ جاتے ہیں۔ تمہارے زمانے کے مقابلے میں تو یہ پھرے کا ڈھیر تھے ہیں ایڈ روڈ۔۔۔۔۔ اسارت فونز کے اتنے شوقین ہیں کہ میں ان کو بارگ والے جیسے میں ہی روک رہا ہوں۔۔۔۔۔

ہمیشہ خدشہ ہی لگا رہتا ہے کہ اگر ان کو آواز چھوڑ دیا تو کسی نرک کے نیچے نہ آ جائیں۔۔۔۔۔“ کرٹ نے بھروسہ نکالنا شروع کر دی تھی۔

”پھر بھی۔۔۔۔۔ کوئی تو قابل ہوگا۔۔۔۔۔“

”تم ہمیشہ میری آنکھوں کے تارے رہے ہو۔۔۔۔۔ تم جانتے ہو کہ میرے پسندیدہ طالب علم تھے۔ میرا بھیکنا تارا۔۔۔۔۔ میری امید۔۔۔۔۔ تمہیں غلطی کی بہت اعلیٰ پہچان تھی لیکن ساتھ میں تمہیں حقیقی دنیا کے چلن سے جو آگاہی تھی وہ صدیوں میں ہی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔۔۔۔۔ میرے بچے ایڈ روڈ تمہارے زمانے میں انجینیئریت والوں کی کیس تھی۔

سب ہی جوان لوگ انقلاب لانے کے خواہش مند تھے۔۔۔۔۔ ایک پرائمن انقلاب۔ یہ بس تمہاری عقل ہی تھی کہ تم نے خوابوں میں رہنے کے بجائے ساست کو عملی طور پر اپنی زندگی میں شامل کر لیا۔۔۔۔۔“ کرٹ کی آنکھیں مشروب کے نشے سے سرخ ہو رہی تھیں اور وہ کتاب زندگی کی پرانی یادوں کے باب تیزی سے پلٹتا جا رہا تھا۔

دوسرے دور کے آغاز پر کرٹ نے اس کے ہاتھ میں جو تھمایا تھا۔ ایڈ ابھی تک اسی گلاس سے مختصر چمکیاں لے رہا تھا۔

”آہ۔۔۔۔۔ یہ دنیا کسی ظالم دورندے کے مانند ہے جو اپنے خونخوار بیٹوں میں انسان کو جکڑ لیتی ہے۔ محبت اور خلوص والے جذبات کو ملیا میٹ کر کے ہی اسے چین آتا ہے۔۔۔۔۔ ہم کسی بقصد کے تحت اس دنیا میں وجود پذیر ہوئے ہیں۔۔۔۔۔“

کرٹ غالباً بچنے والا تھا لیکن عین موقع پر سنبھل گیا۔

”تم۔۔۔۔۔ میرے بچے تم۔۔۔۔۔ ہمیشہ سے ہی یہ بات سمجھتے تھے۔ انیس سال کی عمر میں ہی تم اس بات سے واقف تھے کہ یہ کائناتوں کا بستر ہے۔۔۔۔۔“

”تم نے دنیا کو بدلنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟“ کرٹ نے اپنا گلاس ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”حالانکہ تم تو جانتے بھی تھے کہ اس دنیا کو کیسے بدلا جاسکتا ہے۔۔۔۔۔“

”کس نے کہا میں نے کوشش نہیں کی؟“ ایڈ کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ تھی۔

”پھر تم کامیاب کیوں نہیں ہوئے؟ کیا پیسا کمانے کی چاہ اتنی بڑی تھی کہ دنیا میں اس لانے کا خواب اس کے سامنے ماند پڑ گیا؟ یا پھر تم نے اپنی کوئی نئی دنیا بنانا پسند کی؟“

”نہیں پروفیسر۔۔۔۔۔ ایسا کچھ نہیں۔ میں بس یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس دنیا کا نظام کیسے چلتا ہے؟“ ایڈ نے پرسوج لہجے میں جواب دیا۔

پروفیسر کرٹ کی باتوں نے اس کے دل و دماغ میں بھونچال مچا دیا۔ اگر دیکھا تھا۔ اتنے دنوں کے بے لگلی کی وجہ سے سمجھ آئی تھی۔۔۔۔۔ اس ظالم دنیا میں نازل زندگی کی طرف

واپس کا ارادہ جواب تک دماغ کے بند رینجوں میں قید تھا وہ سب کچھ تو ذکر باہر آ گیا تھا۔

کرٹ کے دماغ پر غبار طاری ہو گیا تھا۔ لیونگ روم میں جاری پارٹی میں شامل ہونے کے بعد وہ ضرورت سے زیادہ چمک رہا تھا۔ مہمان اپنی سیٹوں میں مگن تھے۔ ایک جانب چند جوڑے تیز موسیقی پر رقص میں مصروف تھے۔ کرٹ نے جب ایڈ کو لوگوں سے متعارف کرانا شروع کیا تو اس نے اجازت لینے میں ہی عافیت سمجھی۔ کرٹ بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا۔

یہ دیکھو۔۔۔۔۔ یہ ایڈ روڈ۔۔۔۔۔ میرا دوست تارا۔۔۔۔۔ یہ میری آخری امید تھا۔ اب یو یارک میں کسی سائے کا اندر رہتا ہے۔۔۔۔۔ دیکھو میری اس ناکامی کو۔۔۔۔۔ اس نے سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔“

ایڈ اسی راستے سے واپس ہوا جہاں سے وہ داخل ہوا تھا۔ کھلی ہوا میں گہرے سانس لیتے ہوئے وہ اپنی کاری جانب چل پڑا۔ پروفیسر کرٹ کے الفاظ اس کے ذہن پر کسی ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔

☆☆☆

ایڈ اپنے ہوٹل میں صبح چھ بجے تک سو جا رہا۔ بھرپور نیند کے بعد اس نے کرس ہینڈ کی فون کو بغور دیکھا جو پائرس نے اسے روانہ ہونے سے قبل دی تھی۔ وہ گھسے ہوئے مضبوط بدن کا مالک تھا جس پر جا بجا ٹیٹو گدے ہوئے تھے۔ یہ وہ شخص تھا جس کی پناہ میں آکر لیزا خام خیالی کا شکار ہو گئی تھی کہ وہ اب محفوظ ہو گئی ہے۔

ہمیشہ خود کو ساؤتھ بوسٹن کے ایک مینگ سے متعلق بتاتا تھا، حقیقت میں وہ سڑک چھاپ موالی سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ بڑے جرائم پیشہ لوگوں کی گاڑیاں ڈرائیو کرتا یا کبھی کبھار بوزھوں، بچوں سے مار پیٹ کر کے اپنی بد معاشی کا بھرم قائم رکھتا تھا۔

”تم نے شاید۔۔۔۔۔ کافی عرصے سے اسے نہ دیکھا ہو۔۔۔۔۔ اور اس لوفر کے ارد گرد جانے لگتی آواز وہ عورتیں منڈلا رہی ہوں گی، اس لیے یہ بھی لیتے جاؤ۔۔۔۔۔“ پائرس نے لیزا کی ایک تازہ فونو گراف دیتے ہوئے کہا تھا۔

بلیک اینڈ وائٹ ہونے کے باوجود ایڈ کو وہ اس میں کافی دلچسپی محسوس ہوئی۔ ہوا کے جھوکوں سے لہراتے بالوں کے ساتھ وہ ایک جانب دیکھ رہی تھی جیسے کسی کی بات کو بہت غور سے سن رہی ہو۔۔۔۔۔

بروسٹن کی ایک مٹی کا ایڈ ریس بھی اس کو لکھ کر دیا گیا تھا

جس پر یہ پیغام درج تھا۔۔۔۔۔

”لاڈلا ہر شے کی رات، رات گئے تک شہر میں موج مستی کرتا ہے لیکن واپس اپنے اگلے کے مکان پر ہی لوٹتا ہے۔“

روٹ نانن پر اپنی شیوی دوڑاتے ہوئے ایڈ اپنی منزل کے قریب پہنچ گیا۔ بروکلین کی گلیوں میں داخلے کے بعد اس نے گاڑی کی رفتار بڑی دھم کر دی تھی۔ مینی ہتھروں سے کئی عمارتیں اس وقت سناں دیر انوں کا منظر پیش کر رہی تھیں۔

اپنے مطلوبہ مکان والی گلی میں گاڑی پارک کر کے وہ پیدل ہی اس کی جانب چل پڑا۔ سو سال پہلے کسی کی اصلیل کی آرائش کر کے مکان کی صورت حاصل کرنے والی وہ عمارت اپنے ارد گرد سے بڑا مختلف تاثر پیش کر رہی تھی۔ سامنے کا حصہ اگرچہ چھوٹا تھا لیکن نیم دائرے کی شکل والے ڈرائیوے میں دو گاڑیاں ٹھہرانے کی گنجائش موجود تھی۔ ایک

سری نرک کی نمبر پلیٹ دیکھ کر ایڈ کو یاد آیا کہ یہ لیزا کی ملکیت ہے۔۔۔۔۔ شاید اس کے باپ نے ایک سال قبل ساؤتھ کے خٹے میں اسے دیا تھا۔ دوسری کار کو کوئی یورپی اسپورٹس کپڑی کی تھی۔۔۔۔۔ جو کہ ساتھ دالے لان کی کھاس کو روک دیتے ہوئے پارک کی گئی تھی۔

ایڈ نے مطلوبہ دروازے پر پہنچ کر ایک گہری سانس لی اور تیزی سے وینک وے ڈالی۔ تقریباً فوراً ہی ایک چینی۔۔۔۔۔ شکل والے شخص نے دروازہ کھولا اور اس کی جھری میں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کون۔۔۔۔۔“ الفاظ ابھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ ایڈ کی زوردار نگر سے دروازہ اس کے منہ پر لگا اور وہ کچھ بولنے کی حسرت لیے بری طرح کراہ اٹھا۔

ایڈ کی خود کار دشمنی کی طرح متحرک تھا۔۔۔۔۔ اس نے پھرتی کے ساتھ دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس دوران اس نے نہایت تیزی کے ساتھ ہولسر سے گن نکال کر اسے ہاتھ میں لے لی تھی۔ خوش قسمتی سے مضبوط لکڑی کا دروازہ اس شخص کے عین منہ پر لگا تھا جس کو پکڑ کر وہ ہرا ہوا جا رہا تھا۔

اندروخل ہو کر ایڈ نے سب سے پہلا کام دروازہ بند کرنے کا کیا اور اس کے بعد اس چینی نقوش والے شخص پر اپنی گن تان لی۔ شدید جھٹ کے باوجود بھی وہ آگاہی تک اپنے حواسوں میں تھا۔ اس نے تڑپتے شخص کے پاس بھی ایک عدد پستول موجود تھا لیکن فی الحال وہ اپنے چہرے کے بارے میں زیادہ فکر مند تھا، اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی پڑ رہی تھیں جبکہ ہاتھوں سے اپنے منہ کو سہارا تھا۔ وہ گہرے سانس لے

رہا تھا لیکن ابھی بولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ایڈ نے اپنی گن سے اشارہ کیا اور وہ سمجھنے کے انداز میں تابعداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹخنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اب بھی اس کے منہ سے خون رس رہا تھا۔

ایڈ فوراً ہی اس کے پیچھے پہنچا اور پوری قوت سے گھما کر ایک لات اس کی کٹٹی پر رسید کر دی۔ اور وہ چوٹ کھا کر اپنے بھاری وجود کے ساتھ زمین بوس ہو گیا۔ ایڈ نے اس کی لمبی بے ہوشی کا اندازہ لگانے کے ساتھ ہی اس کا ربو اور نکل لیا، ایک جھٹکے سے اس کا جیہر کھول کر چھری چھڑک لیا، فرش پر پھینکیں اور ربو اور کوسا تھ پڑے ایک آرائشی پودے والے کمرے میں ڈال دیا۔

مکان ایک سیدھی لائن میں بنا ہوا تھا جس میں ایک کے بعد ایک کمراتھاری صورت میں موجود تھا۔ ایڈ نے تیزی سے لیونگ روم، طعام گاہ اور باورچی خانے کو پار کیا۔ دروازے کھلے ہونے کے باعث اسے رک کر دیکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اگلا دروازہ منقل تھا اور دیگر کے مقابلے میں مختصر بھی تھا۔ ایڈ نے دھکا مارنے سے قبل گن کو مضبوطی سے اپنے دوسرے ہاتھ میں منقل کیا اور دوڑ کر ایک زوردار ٹکڑا کر دی۔

ایڈ اور چوبی دروازہ بیک وقت کمرے کے فرش پر آن کرے تھے۔

کمرے میں تاریکی چھائی ہوئی تھی لیکن..... ٹپنے ہوئے دروازے سے آنے والی روشنی ایڈ کے لیے کافی تھی۔ ایک سایہ سا تیزی سے اس کی جانب آیا لیکن اس نے قابل دید پھرتی سے اپنے بدن کو بخش دی اور ایک جانب ہو گیا۔ اس نے آنے والے کو کتنی سے پکڑا اور تیزی سے اس کے جسم کو دائیں جانب دھکیلا اور ابداری میں لے آیا۔

ہیمینڈ نے گالیاں دینے کی کوشش کی لیکن بازو مروڑنے پر وہ چلا کر رہ گیا۔ روشنی میں ایڈ نے جائزہ لیا تو اس کی بلند قاتلی اور ڈیل ڈول سے متاثر ہوئے بنانہ رہ سکا۔ قدیم طرز کے بنوائے گئے ٹیڈ پوری طرح سے عیاں تھے کیونکہ ہیمینڈ کے بدن پر اس وقت صرف ایک زیر جامہ تھا۔ ایڈ نے دھکا دے کر اسے نالوں والے خوبصورت فرش پر گر دیا۔

پائرس نے آمد سے قبل اس کو زولو کی ہدایات اچھی طرح ذہن نشین کرادی تھیں..... اور ایڈ کو بہتر پینے کے دوران کہی گئی وہ ساری باتیں از بر تھیں۔

”اس کی پیمینٹی لگا دینا..... اور اگر ضروری سمجھو تو بے شک جان سے مارو..... لیکن اس کی مار لگانا از حد ضروری ہے..... کوشش کرنا کہ یہ مار ایڈز کے سامنے لگاؤ۔ اس احمق کو

بھی پتا چلنا چاہیے کہ وہ کس گندھے کے ساتھ بھاگی ہے جو مار پڑنے پر بری طرح رینگنے لگا ہے۔“

ایڈ نے گن اس پر تانتے ہوئے ایڈز کو اندر سے کمرے میں آواز دی۔ وہ بستر کی چادر میں لپٹی فوراً باہر نکل آئی۔ کسی بجلی ہوئی شہزادی کے بجائے وہ اس وقت شدید خوفزدہ لڑکی لگ رہی تھی۔ ایڈ نے ہیمینڈ کو کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ ایڈ سے قد میں کوئی دو تین انچ اوپر ہی تھا اور وزن میں کوئی بچاس پونڈ زیادہ۔

ایڈ نے گن سے میگزین باہر کھینچ لیا، جیسر میں موجود اکلوتی گولی بھی ماہر انداز سے باہر نکالی اور گن سمیت سب کچھ کچن کا ڈنپر پر رکھ دیا۔ اب وہ ہیمینڈ کے سامنے کھڑا چیخ کر رہا تھا۔

”آ جاؤ۔“

”ماں.....“ ہیمینڈ ایک غلیظ گالی دیتے ہوئے اس کی جانب تیزی سے بڑھا۔

اس کی رفتار طوفانی تھی اور اس وقت وہ کسی انسان سے ٹکراتا تو شاید اس کی جان جانے کا سبب بن سکتا تھا۔ ایڈ نے سانس روک لی۔

اس نے ہیمینڈ کو اپنے قریب آنے کا موقع دیا اور اسے اپنے سر پر ہاتھ مارنے تک رکھا رہا۔ جیسے ہی اس کا ہاتھ بلند ہوا ایڈ پھرتی سے ایک جانب ہوا اور اس کے اپنی دائیں ٹانگ پر گھومتے ہوئے ایک لینٹ راڈنڈ ہارس ٹک ہیمینڈ کی پسلیوں میں جڑ دی۔ اسٹیل کے تنے کی ضرب خوفناک تھی اور ایسی آواز آئی جیسے برف کے ٹکڑے کو توڑ دیا گیا ہو۔

ایڈ اچھل کر ایک جانب ہو گیا..... وہ چاہتا تھا کہ ہیمینڈ محسوس کرے کہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ ہیمینڈ نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن فوراً ہی گھٹنے کے بل ڈھسے سا گیا۔ وہ ایڈ کو حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے جھننے کی کوشش کر رہا ہو کہ وہ اتنے کم وقت میں اتنا زیادہ خطرناک کیسے ہو گیا؟ تکلیف کی شدت سے اس کے چہرے کا زادیہ پر لکھ تھیل ہو رہا تھا۔

”کھڑے ہو لو کے..... ذرا اپنی جوانی کا جوش ادھر بھی تو دکھاؤ.....“ ایڈ ابھی تک اپنی جگہ پر دیر سے دھیرے اچھل رہا تھا..... ایڈزایہ سب نہ سمجھ سکی..... وہ دیکھ چکی تھی کہ ہیمینڈ بری طرح زخمی ہو چکا ہے۔

”بے غیرت انسان.....“ وہ ایڈ سے مخاطب ہوئی۔ ”اسے چھوڑ دو..... جلتی ہوں میں تمہارے ساتھ..... کیا یہ کافی نہیں ہوگا؟“

ہیمینڈ کے حواس کسی قدر قابو میں آچکے تھے۔ اپنے

دائیں پہلو کو ہاتے ہوئے وہ ایک بار پھر ایڈ کی جانب بڑھا۔ ایڈ نے اس بار دونوں کے درمیان فاصلہ کم کیا..... ہیمینڈ نے فوراً اپنا چہرہ بچانے کے لیے ہاتھ اوپر کیے..... لیکن یہی ایڈ کی چال تھی۔ اس نے فوراً اس کے مضروب پہلو پر ہاتھ رکھ دیا اور تیزی سے دھانے لگا۔

ہیمینڈ کی فلک شگاف چیخیں نکل گئیں۔ اس نے ایڈ کا گلہ پکڑنے کی کوشش کی لیکن بے تماشاً دروکی کیفیت نے اس کی ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا۔

ایڈ نے ابھی تک دباؤ ڈالا ہوا تھا..... اس نے ایک باؤڈ پکڑ کر مروڑ دیا اور ٹوٹی ہوئی کاپی کھینچا دے دیا۔ دروکی شدت سے ہیمینڈ کا چہرہ سرخ سے جاسنی ہو گیا تھا اور آنکھیں اٹل کر باہر آ گئیں۔ ایڈز نے اس کی یہ حالت دیکھ کر اندر کی جانب دوڑنا شروع کر دیا۔

درویدہ لگے ہوں سے ایڈ نے دیکھ لیا تھا کہ وہ تیزی سے کمرے کی اندرونی جانب پھینکی تھی چنانچہ اس نے ہیمینڈ سے نشتے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ایک طوفانی مکا اس کی آنکھ پر جڑ دیا۔ بے ہوش ہو کر ہیمینڈ کی پوری کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

ایڈ تیزی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ایڈز اس وقت ایک چھوٹے کیلبر کی ہینڈ گن میں گولیاں ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ گالیاں بکتے ہوئے اس کے ہاتھ بھی بری طرح سے کانپ رہے تھے۔ ایڈ نے اس کے ہاتھ تھامے اور مروڑ کر آرام سے گن چھین لی۔ وہ کراہی اور اس کے کندھے ڈھلک گئے جیسے شکست خوردہ ہوئی ہو۔

یہ ایڈ کو بے وقوف بنانے کی کوشش تھی جس میں وہ کامیاب رہی۔ ایڈ کا چہرہ اس کی پہنچ میں تھا، اس لیے جیسے ہی وہ ڈھیلا پڑا اس نے فوراً اپنے لیے ناخنوں سے آویڑ ڈالا۔ خراشیں اٹتی گہری تھیں کہ ان سے خون رسنے لگا لیکن وہ ابھی تک چلتا ہے ہوئے اس کا منہ دھننے کی کوشش میں بھی نہیں..... ساتھ ساتھ وہ ہڈیانی انداز میں قہقہے بھی لگ رہی تھی۔ ایڈ کی برداشت سے باہر ہو گیا تو اس نے ایک مکا اس کے چہرے پر بھی جڑ دیا وہ لڑھکتی ہوئی الماری کے سامنے قائلین پر گر گئی۔

ایڈ چند لمحوں تک اس کے سینے کے نشیب و فراز پر نگاہ جتا کر دیکھتا رہا جہاں مدھم سانس رواں تھیں۔

جب اطمینان ہو گیا کہ وہ اس بار کوئی کمر نہیں کر رہی تو وہ تیزی سے جھکا اور ہینڈ گن کو اٹھاتے ہوئے خواب گاہ کا جائزہ لینے لگا۔ جس اور دیگر نشانات موجود تھیں لیکن ہیر و مین کی عدم موجودگی پر اس نے ایک اطمینان بھرا سانس لیا۔ زولو کو شک

تھا کہ وہ ہیر و مین کا نشانہ کرنے لگی ہے۔ اس کی باتیں زوردار تھیں لیکن انکشاف کے داغوں سے صاف تھیں۔

ایڈ نے احتیاط سے ایڈز کو اپنی گود میں لیا اور اچھی طرح اس کی کٹٹی کو دیکھا۔ اس کے سوبے ہوئے چہرے پر ہاتھ رکھا۔ چوٹ کے نشان کے ساتھ ایک پلاک سا ٹک بھی ابھرا آیا تھا۔ وہ زخمی ہے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

”اچھا..... نہیں..... کیا؟“ وہ بے ربط سا بولنے لگی۔ ”آرام سے..... آرام سے..... جانتی رہو..... شیک ہے؟ زیادہ دیر بے ہوش رہیں تو طبیعت خراب ہو جائے گی۔

بہتر ہوگا کہ اب تم اٹھ جاؤ اور میرے ساتھ رہو..... ہمیں برف کی ضرورت ہے..... کیا تم کھڑی ہو سکتی ہو؟“ ایڈ نے پچکارنے کے انداز میں حکم دیا۔

وہ اسے سہارا دے کر کچن تک لے آیا..... ایڈز اسے قدیم ابھی تک لرز رہے تھے لیکن ایڈ کو اطمینان تھا کہ وہ اس کی توقع سے زیادہ تیزی سے خود کو سنبھال رہی تھی۔

ہیمینڈ ابھی تک اسی حالت میں زمین جاٹ رہا تھا جس میں ایڈ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ ایڈ نے پلاسٹک کی ایک پٹیلی میں برف ڈال لی۔

”اپنی چیزیں ٹائٹ سمیٹ لو..... تمہیں ابھی گھر بھی جانا ہے۔“

”اچھا.....“

ایڈ نے اسے موقع دیا کہ وہ اپنی ضروری چیزیں سمیٹ لے..... اس دوران اس نے مکان کا جائزہ لیتا شروع کر دیا۔ یہ مکان ہیمینڈ کے اٹکل خزان و ڈکل کی ملکیت تھا..... چونکہ علاقے کا مشہور غنڈہ تھا۔ فران کی بہن، کرس ہیمینڈ کی ماں تھی..... اسی وجہ سے وہ کبھی ایک کار، ٹیڈ والی باڈی اور اس گھر کا مالک بن بٹھا تھا۔

مکان کی زیر بنائش نہایت عمدہ انداز میں کی گئی تھی..... لگتا ہی نہیں تھا کہ اس میں ہیمینڈ جیسا کوئی غنڈہ، موالی بھی رہتا ہوگا۔ انیسویں صدی کی خوبصورت تصاویر سے ایک ایک دیوار مزین تھی۔ شطرنج کی بساط کی طرح سفید و سیاہ ٹائلز فرش کی خوبصورتی کو بڑھاتے تھیں..... جبکہ گولوں میں بے آرائشی پودوں کا سبزہ آنکھوں کو ایک خوشگوار تزاوٹ بخشتا تھا۔ بڑی بڑی کھڑکیاں باہر کے خوبصورت مناظر کو قابل دید بنا رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا اس مکان کی تزئین و آرائش کے لیے کسی پیشہ ور کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔

ایڈز ایک چست چٹلون اور سیاہ رنگ کی بڑی شرٹ پہن کر باہر لگا۔ چہرے کی مطابقت سے بڑے دھوپ کے

جس نے چہرے کا زخم بڑی حد تک چھپا دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑے سائز کا لیڈر بیگ تھا جس میں چند جوڑے کپڑے بہ آسانی آسکتے تھے۔

”ہاں..... کیا یہ سب تمہاری ضرورت کے لیے کافی ہوگا؟“

”میرے پاس بس یہی کچھ ہی ہے.....“ اس نے کہنے پر ہنسا اور بے ہوش کی جانب دیکھنے لگی جو کابھی کھٹی آواز میں کہہ رہا تھا۔

”جینگ کہاں ہے؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

تقارر در تقارر کمروں کی راہداری سے گزرتے ہوئے اسے اچانک خیال آیا تھا لیکن ایڈ نے اسے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ الیزا کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا، جب اس نے جینگ کو دروازے کے پاس اوندھا لیا دیکھا۔

”کیا تم نے اسے قتل کر دیا؟“

”نہیں.....“

الیزا کی آنکھوں میں بے یقینی تھی لیکن وہ اس کے پیچھے مکان سے نکل کر چپے سے چلتی ڈرائیو سے نکل پھرتی۔

”میرے ٹرک کا کیا ہوگا؟“

”مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ تمہیں ایک نیا لے دے گا..... یا پھر کسی کو بھیج دے گا کہ یہاں سے آکر لے جائے.....“

”لغت ہو..... میں خود ڈرائیو کروں گی..... اور تمہارے پیچھے پیچھے آ جاؤں گی۔“ اس کا پرانا اکٹھڑ مزاج واپس آ رہا تھا۔

”بھول جاؤ.....“

”نہیں..... ایسا مت کرو..... میں تمہیں شاید جانتی ہوں..... نام کیا تھا تمہارا؟“

”ایڈ.....“

”ایڈ..... جج..... دیکھو ایڈ..... ڈیڑی اکثر تمہارا ڈر کرتے رہتے ہیں۔ تم ان کے نزدیک بہترین ہو..... ہر چیز میں..... پلیز مجھے اپنے پیچھے آنے دو..... میں اب کہاں جاسکتی ہوں؟ اس تماشے کے بعد اگر میں یہاں واپس لوٹی تو ریسنڈر کے گھر والے میری جان لے لیں گے..... سمجھے؟ میں تمہارے پیچھے آؤں گی..... اس طرح میری گاڑی کم از کم ایک ایسے مکان کے سامنے سے نہیں ملے گی جہاں تم ایک آدمی کو قتل کر چکے اور دوسرے کو مرنے کی حد تک مار کے بے ہوش چھوڑ آئے ہو.....“

”میرا نہیں خیال وہ آدمی مر چکا ہے.....“

”مجھے تو وہ کوئی مردہ ہی لگ رہا تھا..... ایڈ.....“

ایڈ نے ارد گرد دیکھا اور پھر پلٹ کر الیزا کو دیکھا۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہی تھی..... وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ”تم اپنے باپ کو جانتی ہو.....“

”ہاں..... بڑے اچھے طریقے سے جانتی ہوں.....“

”وہ تم سے پہلے ہی مارا ہے.....“

”ہاں..... یہی جانتی ہوں.....“

”تم نے ایک ایسی حرکت مزید کی تو وہ مجھے تمہیں مارنے کا بھی حکم دے سکتا ہے.....“

”تم نے پہلے ہی مجھے مارا ہے.....“

”مارنا مطلب جان سے مارنا..... سمجھیں؟“

”ہاں..... سمجھ گئی.....“

”تم نے مجھ سے جان چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کی تو میں تمہیں قتل کروں گا..... سمجھ گئی؟“

”ہاں سمجھ گئی ایڈ.....“

”ابھی طرح؟“

”ہاں.....“ وہ اس کے قریب آگئی لیکن ایڈ نے اپنی جگہ سے جھٹک نہ کی۔

”مجھے ذرا برابر بھی فرق نہیں پڑے گا..... تم یہ بات جانتی ہو؟“ ایڈ نے اس بار ہاتھ کیسی لے کہا تھا۔

”پچھے تمہارا دل کرنے ویسے کرو.....“ وہ اس کے کندھے سے لگ کر بھونکنے لگی۔

”میرے پیچھے پیچھے آنا.....“ ایڈ نے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا اور اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

الیزا کے شاور لینے کے دوران ایڈ کی پائرس سے طویل بحث ہوئی..... کم از کم اسے تو وہ بہت طویل لگی۔ ایڈ چاہتا تھا کہ الیزا کی باز پائی کے بعد اب کوئی بھی اسے آکر وہاں سے لے جائے۔ وہ ہائی کا اختتام ہفتا پنی مرضی سے اپنی پسند کے لوگوں کے ساتھ گھر لانا چاہتا تھا..... کچھ ذاتی معاملات مثلاً نا چاہتا تھا۔

واپسی کی خواہش سر پر چڑھنے لگی تھی۔

میں آئیس سالہ ایک لڑکی کو وہ اپنے ساتھ ہر جگہ گھسیٹے کے حق میں بالکل بھی نہیں تھا۔

”یہاں تو اس وقت کوئی اور بھی دستیاب نہیں ہے.....“

پائرس نے فوری طور پر انکار کر دیا۔

نوبہر کا آغاز ہو چکا تھا اور سولہ ایکشن سر پر آن پہنچے تھے۔

”وراصل.....“ پائرس ہچکچایا..... ”میں تمہاری بھی یہاں پر اشد ضرورت ہے..... تمہیں کتنا وقت لگ جائے گا یہ

اپنا..... ذاتی کام“ ختم کرنے میں.....؟“

”شاید پورا دو ایک ایڈ لگ جائے..... لیکن اگر اتنی ہی میری ضرورت ہے تو میں کل سہ پہر واپسی کے لیے روانہ ہو سکتا ہوں.....“

فون پر خاموشی سی چھا گئی..... ابیا محسوس ہوا جیسے کوئی ریسیور پر رکھ رکھ کر آواز کو دبانے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایڈ کو شدید الجھن ہونے لگی تھی کہ اسی وقت پائرس لائن پر واپس آ گیا۔

”ہاں..... زولو صاحب اپنی بیٹی کے حوالے سے بہت پریشان ہیں..... وہ اس کو فوراً اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتے ہیں..... ایڈ..... تمہارا یہ “ذاتی کام“ واقعی کوئی اہم نوعیت کا ہونا چاہیے.....“

”میں ابھی اس کو بس پر بٹھا کر واپس بھیج سکتا ہوں۔ اگر اتنی ہی بے چینی ہے تو..... وہ چار گھنٹے میں تم تک پہنچ جائے گی..... پھر تم اس کو بس اسٹاپ سے پک کر سکتے ہو.....“

”ایڈ..... پلیز..... تم تو مجھ دار ہو..... مگر وہ راستے میں کسی بھی اسٹاپ پر اتر گئی تو؟ اور اگر وہ یہاں نہیں پہنچتی تو تم کس مندر سے زولو کا سامنا کرو گے؟ اگر تمہیں واقعی کوئی بہت ضروری کام ہے تو اس کو فورا در لڑکی کو لے کر فوراً واپسی کی راہ لو..... اسے تمہارے ساتھ ہی واپس آتا ہے ہر حال میں.....“

”اور اس کا ٹرک؟“

ایک بار پھر لائن پر خاموشی چھا گئی.....

”سٹریڈ زولو چاہتے ہیں کہ جیسے تم مناسب سمجھو ایسے ہی اس ٹرک سے نجات حاصل کر لو..... چاہے اپنے کسی آدمی کی مدد سے واپس لے آؤ یا وہیں کی کوچ دو..... اس کام کی بھی تمہیں علیحدہ سے قیمت مل جائے گی..... لیکن لڑکی کو ہر حال میں اتوار تک یہاں پہنچ جانا چاہیے.....“ پائرس نے یہ کہہ کر لائن کاٹ دی۔

ایڈ نے غصے میں اپنا فون ایک جانب پھینک دیا..... ”قیمت مل جائے گی.....“ پائرس کے الفاظ نے اس کی روح تک کو سلگا دیا تھا..... ایک وقت تھا جب زولو خود ایڈ کو حکم جاری کیا کرتا تھا۔ اب اس کے جوتے اس کے ساتھ زر خرید غلاموں والا سلوک کر رہے تھے۔ غصے میں آکر اس نے اپنی شرٹ اتار کر ایک جانب پھینک دی اور تیزی سے ہٹش اپ لگانے کے بعد اس نے اپنے غصے کی آگ کو کسی قدر سرد ہوتا محسوس کیا۔

وہ سخت کسرت کے بعد تیزی سے سانس لے رہا تھا جب الیزا صرف ایک تلوے میں اپنی مسلسل خانے سے باہر نکلی۔

سنگھار میز کے آئینے پر لگی اپنی تصویر دیکھ کر وہ چونک سی گئی۔ ایڈ نے خود کو ذہنی طور پر اس حوالے سے کسی بھی قسم کے سوال کے لیے تیار کر لیا لیکن وہ کچھ بھی نہ بولی۔ تصویر واپس لگاتے ہوئے وہ ہر سوچ انداز میں اس ہر اپنی خردلی انگلیاں پھیرتی رہی پھر تیزی سے ایڈ کے پاس آگئی۔

اب وہ انگلیاں ایڈ کے سینے پر پھیر رہی تھی مگر اس کی جانب دیکھنے سے گریز کر رہی تھی پھر اس کا ہاتھ اس کے پیٹ تک پہنچ گیا لیکن ایڈ نے پیچھے ہٹنے کی بالکل کوشش نہ کی۔

”ایک بوڑھے آدمی کے حساب سے تو بہت سخت ہے تمہارا جسم.....“

”اتنا بھی بوڑھا نہیں ہوں.....“

”ہمم..... تو ہم کب روانہ ہوں گے؟“

”مجھے کچھ کام ہے..... مجھے آج کسی سے ملنا ہے..... کچھ دوسرے کاموں کو کل پورا کرتا ہے..... اس کے بعد ہم واپس جاسکتے ہیں.....“

”مجھے یہ زخموں کے نشان اچھے لگ رہے ہیں.....“ وہ سرگوشی میں بولی اور اس کے سینے پر یسوں کی بارش کر دی۔ وہ چند لمحوں کا کھڑا رہا پھر حرکت میں آیا تو وہ دونوں بستر پر تھکے..... اور جذبات کے سیل رواں میں دونوں ڈوبنے ابھرنے لگے۔

شاور لینے ہوئے ایڈ نے دروازہ بند کرنے کی زحمت نہ کی..... وہ ابھی تک خشک میں تھا کہ الیزا اسے خبل دے کر کہیں رفو چکر نہ ہو جائے۔ وہ باہر آیا تو الیزا اس کی ہی ایک شرٹ پہنے اپنے حسن کی جلوہ نمائی میں مصروف عمل تھی..... وہ بستر پر لیٹا تو وہ اس کے گرد پلٹ سی گئی۔

”میں اپنے باپ کے ساتھ نہیں رہ سکتی.....“

”یہ میرا مسئلہ تو نہیں ہے.....“

”میں پھر بھاگ جاؤں گی..... اور اس وقت تک بھاگتی رہوں گی جب تک میرا باپ میرے پیچھے آتا بند نہیں کر دیتا..... یا تم اگر میری جان نہیں لے لیتے..... تب تو یہ تمہارا مسئلہ ہوگا نا؟“

ایڈ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں روشنیوں کا راج تھا۔

”تم گھر چھوڑ کر بھاگو یا نہ بھاگو..... وہ شاید جلد ہی تمہیں مراد دے گا.....“ وہ اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لپیٹے ہوئے بولا۔

وہ بنا آواز کے رونے لگی۔

”میں جانتی ہوں.....“ اس نے سسکی بھری۔

”ایڈ.....؟“

”ہاں بولو.....“

”کیا اس نے میری ماں کو بھی قتل کروا دیا تھا؟“

”ہاں.....“

وہ یہ بات جانتی تھی پر کبھی کسی دوسرے کے منہ سے نہیں سنی تھی وہ بڑبڑ کر رہ گئی اور کھڑکی کی جانب دیکھنے لگی۔

”کیا تم میری ماں کو جانتے تھے؟“

”ہاں.....“

”کیسی کتنی تھی وہ؟“

”بہت اچھی طرح تو نہیں جانتا..... میں خود اس وقت اپنے لڑکپن میں تھا..... تم سے بھی چھوٹا..... میں بروکلین میں ہوتا تھا لیکن ہم دونوں میں اکثر جاتے تھے..... میں اکثر اوقات ویٹر ہوتا تھا اور میز پر رکھنے شروع نہیں کی نہ آنے وینا میری ذیولٹی ہوتی تھی..... وہاں زولو بھی آیا کرتا تھا..... تمہاری ماں اس کے مقابلے میں بلند قامت تھی..... اونچا بولنے والی..... بخدا بہت خوبصورت تھی..... ہر لڑکھیز.....“

”تم نے میرے باپ کے پاس کیسے کام شروع کیا؟ اور بروکلین کیوں چھوڑ دیا؟“

”میرے ایک اکل وہاں ہوتے تھے..... انہوں نے خرچہ دیا کہ میں کانج جاسکوں..... چار سال وہاں گزارے..... پھر چند سال فون میں..... جب واپس آیا تو سب کچھ زولو چلا رہا تھا..... اس نے مجھے کام کی پیشکش کی جو میں نے قبول کر لی.....“

”کیا تم اسے پسند کرتے ہو؟“

”ہمم..... ہم دوست ہیں..... یہ کہتے ہوئے ایڈ نے نظریں چرائیں..... دونوں بڑی دیر تک ہم آغوش رہے اور ایک دوسرے کے بدن سے گرمی چراتے رہے۔

☆☆☆

ایڈ اور کرٹ کی ملاقات ساحل پر ہوئی جہاں انہوں نے سینٹ سینڈروچ کھائے۔ ایڈ بھول چکا تھا کہ وہ کتنے لذیذ تھے اور وہ کتنے شوق سے کھا رہا تھا۔ بروڈر ساحل پر آنے والے پچیسویں کو اڑتا رہا اور وہاں سے فراغت پتی تو ایڈ کے گرد اٹھیلیاں شروع کر دیتا۔ ایک جانب ایڈ بھی غسل آفتابی سے لطف اندوز ہوتی تھی۔

”تمہارے ذہن پر کوئی بوجھ ہے..... عام دنوں کی نسبت، پہلے سے کہیں زیادہ بوجھ.....“ پروفیسر کرٹ نے سوال کیا۔

”بس کام کا ہی بوجھ ہے اور کیا؟“

”نہیں..... کچھ اور ہی مسئلہ ہے..... نہ بتانا چاہتا ہوں اور بات ہے.....“

”مجھے افسوس ہے.....“

”اپنا افسوس اپنے پاس رکھو.....“ کرٹ سیاہ پڑتے ہوئے بولا۔ ”کیا تمہیں معلوم بھی ہے کہ تم کتابداری کئے ہو؟“

”ویسا ہی تو ہوں.....“

”کاش ایسا ہوتا..... اب تو تم اس روشنی کا سایہ معلوم پڑتے ہو جو کبھی ان گیلیوں کو روشن کرنے کے لیے تمہاری صورت میں نکلا کرتی تھی..... اب تو تمہیں دیکھ کر میں خود ڈر جاتا ہوں..... بسا اوقات ایسا لگتا ہے کہ تم کسی ٹوئل بھی کر سکتے ہو.....“ کرٹ اپنی بات یہ خود ہی نہیں پڑا۔

”جو کام تمہیں خود تمہارے قابل نہ چھوڑے اس کو کرنے کا کیا فائدہ؟ چھوڑ دو یہ سب کچھ ایڈ ورو..... کچھ نہیں رکھا اس سیاست میں..... تو جوان لوگوں کو تو یہ پچھڑے رکھ دینی ہے.....“ وہ ہمیشہ کی طرح اس کا پورا نام لے کر مخاطب تھا۔

”میں جانتا ہوں..... اور شاید تمہارے کہنے سے قبل ہی اس بارے میں سوچ رہا تھا.....“

”آہ..... یعنی کہ تم اپنی اس زندگی سے واقعی ناخوش ہو..... میرے بچے جب بھی واپسی ہوگی تم مجھے کھلی ہانہوں کے ساتھ خود کو خوش آمدید کہتے پاؤ گے.....“

”ہاں میں واقعی ان خطوط پہ سوچ رہا ہوں..... اور اپنی کچھ ذمے داریاں پوری کرتے ہی میری واپسی کا سفر شروع ہو جائے گا.....“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے..... میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں..... واپسی کا راستہ بھی اہل نہیں ہوتا..... تو ذرا سنبھل کر میرے بچے..... ویلے تم واپس آ کر میرے ساتھ کیمبرج میں پڑھانے کا کام بھی کر سکتے ہو.....“

”تمہارا بہت شکریہ کرٹ..... ہر بات کے لیے خاص طور پر میری سوچ کو ایک راہ پر ڈالنے کے لیے.....“ وہ سرخی ہوتے سمندر کی وسعت میں نگاہوں کو مگرتے ہوئے بولا۔

”اوہ میرے بچے..... یہی تو میرا کام ہے کہ کسی بھٹکے ہوئے کو راہ دکھا دوں.....“ کرٹ ہنسا تاکہ ماحول کی تنہیدگی کچھ کم ہو سکے۔ ایڈ کا شائبہ جھپٹتے ہوئے وہ خود بھی ریت اور سمندر کی اٹھیلیاں دیکھنے میں مگن ہو گیا تھا۔

☆☆☆

”تمہاری عمر بے کتنی آخر؟“

”اتنا لیس سال.....“

”اوہ.....“

”میں جانتا ہوں تم نے زیادہ کا اندازہ لگایا ہوگا..... صحیح کہہ رہا ہوں نا.....؟“

”تقریباً ساٹھ.....“

وہ اس بات پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ وہ بھی ساتھ میں ہنسنے لگی۔

وہ اس کو اپنے ساتھ ہی ہر جگہ لے کر گھوم رہا تھا۔ پرانے پب میں اسے پہلی ملا تو دونوں نے مل کر بیئر پی اور ایک دوسرے کو اپنے قہقہے سنائے۔ وہ بھی ایڈ کو کچھ کر بے حد حیران تھا لیکن محض آدھے گھنٹے میں وہ ایسے باتیں کر رہے تھے جیسے پچھلے دس سال سے اسٹے ہی وقت گزار رہے ہوں۔ ایڈ ا خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ کر اپنا سینڈروچ کھاتی رہی..... وہ اسے میں ہی بے حد خوش تھی۔

ایڈ کچھ پرانے دوستوں کو تلاش کرنے میں ناکام رہا۔ کیٹی اوہارا..... فلاڈیلفیا میں موسیقی کی استاد بن چکی تھی اور سولین..... لاس اینجلس میں اپنی لاء فیرم کھول چکا تھا۔ ایڈ ا حیران تھی کہ وہ بڑھاپا آدھی دو گھنٹے تک ایڈ سے باتیں کرنے کے باوجود مزید پرنصر تھا لیکن ایڈ نے معذرت کی اور اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ وہ اب بھی اس کا بازو پکڑ کر روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ایڈ کوئی مہمان خصوصی ہو..... جو بھی اس سے ملتا اس کے پاس سے ہٹا کر اندر کرتا۔ جب سولین کے بڑے مکان سے وہ ایڈ کے ساتھ باہر نکلا تو بلی کی کیندیگی اس کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔

”انکل تو بڑی زوردار پارٹی کرتے ہیں..... لگتا ہے تمہاری ان کے ساتھ بڑی گہری دوستی ہے.....“

”ہاں..... بڑا اچھا وقت ساتھ گزارا ہے ہم نے..... لیکن یہ میرے دوست کے والد تھے.....“

”پان لگ رہا تھا..... لیکن پھر بھی تم نے ان کے ساتھ کافی وقت گزار لیا.....“

”چلو اب واپسی کا وقت آ گیا..... اگر ہم زیادہ دیر ایسے سڑکوں پر گھومتے رہے تو ہیڈ میڈ یاس کے چیلوں کی نظر میں آ جائیں گے..... وہ یقیناً تمہاری تلاش میں نکل چکے ہوں گے.....“

”ہم یہاں کرنے... کیا آئے تھے؟ کیا صرف تمہارے کانج کے پرانے دوستوں سے ملاقات کرنے؟“

”ہاں..... کیا تم نے بھی کانج جانے کے بارے میں سوچا؟“

”نہیں..... ہاں..... لیکن ڈیڈی..... میرا مطلب زولو کہتا ہے کہ یہ بڑی بکواس ہے.....“

”ہاں ہے تو صحیح لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تمہیں کانج میں اپنے لوگ نہیں ملتے.....“ وہ اپنی شیڈی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

”ہم.....“ وہ سر ہلاتے ہوئے اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی۔

”کیا تم واقعی جانتا چاہتی ہو؟“

”ہاں.....“

”وہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟“

”نہیں..... بس اب چلو.....“ وہ اس لہجے میں بولی تو ایڈ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”ان دونوں نے ستر میل کا فاصلہ ایک گھنٹے میں ہی طے کر لیا تھا اور اب جنوب کی جانب سفر کر رہے تھے۔

پائرس کا فون آیا تو ایڈ کے ماتھے پر تپوریاں نمودار ہو گئیں۔ اس نے خاموشی سے اس کی ہدایات سنیں اور ہوں ہاں میں ہی جواب دیتا رہا۔ ٹارشیوں کے درخت تیزی سے پیچھے گزرتے جا رہے تھے۔

”کیا کام ہو جائے گا؟“ پائرس نے پوچھا۔

”ہاں.....“ ایڈ نے مختصر جواب دے کر فون بند کر دیا تھا۔

ایڈ اس کے کپکپاتے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

”ہم جلد ہی کسی سسٹن سڑک پر مڑ جائیں گے نا؟“

اس کے انداز میں زمانے بھر کا رو رہا ہوا تھا۔

ایڈ کو ایسا لگتا جیسے کسی نے خبر اس کے سینے میں گھونپ دیا ہو..... اپنی تو جگہ گاڑی چلانے پر مرکوز کرتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ اس تکلیف سے آزاد ہوا۔

چھدرے درختوں کے بعد اب جنگل گھنا ہوا رہا تھا.....

”ہاں بس تھوڑی دیر میں.....“ اس نے اپنے لہجے کو سچا رکھنے کی کوشش کی لیکن لڑش پر قابو پانا آسان نہ تھا۔ وہ جواب نہیں دینا چاہتا تھا لیکن اس کے ہٹا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

زولو نے بیٹی کی نادانیوں کو مستقل ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ایڈ ا کی سسکائیاں بلند ہوتی جا رہی تھیں..... اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ پر قابو پانا آسان نہیں تھا۔ دل کڑا کر کے اس نے گاڑی کے خفیہ خانے کو کھولا..... مگن پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس کے ذہن میں بس کرٹ کے الفاظ چکرارے تھے.....

”واپسی کے سفر میں آخری کام کبھی بھی سہل نہیں ہوتے.....“

وقت بادشاہ اور کائنات کی برشے اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمر رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر پونٹوں پر پتسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھٹاؤ ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پیٹے کو دوہونڈ پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہو جائے اس کے لڑکھڑاہے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لہجے کا اسیر تھا ... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی اس کے باوجود اس کی داستان حیات میں چاہے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج ... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

قسط نمبر: 12

وقت

حسام بٹ

نوت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب

تھا۔ ایک ایسے پر عزم بازی گر کی بازی گری

..... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک

در با طویل داستان



اس کا نام اسد علی رکھا جائے۔ "علی" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی کج بادشاہت میں پایا۔ علی سلطان نکلیس (اسرکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو مکمل چیر تک محدود کر دیا تھا۔ اس کی اپنی بیوی اور بیٹے اعلیٰ بنے۔ وقت رخصت پر رانا اپنی انگوٹھی علی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ علی سلطان نے اپنی اور علی کی بکھریلے لیے ایک دلچسپ ملازمت مقرر ہوئی تھی اور انھیں سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھاتے تھے۔ وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد یا برادر کو کرتا تھا۔ اسے اعلیٰ کہا جاتا تھا۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں بیکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی چلے پڑے جو کہ جوان ہوئے تھے۔ اس نے جب بھی اپنے محسن درباری اعلیٰ سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس پر بددعاؤں سے نہایت ہی خوب صورتی سے بے کبر کراسے ڈال دیا تھا۔ "میرے بچے! انتظار کرو۔ وقت آنے پر تمہیں سب بتا دوں گا۔" یہ علی علی کے محسن کو ہوا دینی جی تھا جیسے کہ طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہا تھا۔ اس کا تعلق اس اضطراری کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سڑکی روئی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔ کانچ میں قدم رکھتے ہی اس نے نکلیس کے علاقے "مکھن" میں واقع "سرکلی" نامی ایک اسلور پر جزدیجی ملازمت کر لی تھی۔ بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکلو میٹر میں بیٹھ کر ڈری حاصل کر لی تو نئے ہنگامے اس کے عقاب میں لگ گئے۔ ایک روز دو مسکین لڑکے تحقیق کی نیت سے "سرکلی" میں آئے۔ "میں تمہیں کھانے کے بعد وہ دیکھتی تھی کہ ساتھ موجود دیگر بچے کھانا کھاتے دیکھ کر کہنے لگے۔ "پلیس نے کھانے کی بنا دینی کو بھی شامل پیش کر لیا۔ علی کا دامن صاف تھا۔ پلیس کے سوالات کے جواب میں اس نے انھیں مطمئن کر دیا۔ بعد ازاں ان دونوں مسکین روکیت کو بھی (ایری ڈو) سے گرفتار کر لیا گیا۔ علی کا کانچ لیک جیکسن (نکلیس) میں تھا جیکسن علی سلطان کی رہائش بے غمی (نکلیس) میں تھی۔ ایک بول میں رہتا تھا اور لیک جیکسن کے اسکرین ٹورٹس میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ "وہی لاؤنچ" نامی ایک ریستورنٹ میں اس کا زیادہ دل لگتا تھا کیونکہ وہاں ایک سپا فوئی وڈیئو شاردو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس دل میں تب بھی جس نے علی کے رول پر دیکھ دی تو اس کی زندگی میں بہار تر آئی۔ ایک رات وہی لاؤنچ میں جب لیو ہارڈو نامی ایک مسکین غنڈے اور اس کے حواریوں نے شاردو سے پرتیزی کی کوشش کی تو علی جج میں کود پڑا۔ اس بار باری کر ایک امیر و کبیرا پیش لیڈی ڈیٹیلیا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا ڈزیننگ کارڈ علی کو دیا کہ یہ کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی۔ "مجھے بہادر لوگ بہت پسند ہیں۔ زندگی میں جب میری ضرورت محسوس کر تو رابطہ کر لیا۔" اس واقعے کے بعد گائیو ہارڈو سے علی کی دشمنی کا قاعدہ آغا ہو گیا تھا۔ آئے والے دنوں میں علی اور لیو ہارڈو کے فٹنڈوں میں گاہے بگاہے لڑائی ہو رہی تھی۔ لیو ہارڈو نے اپنی تربیت کا پلہ لینے کے لیے شاردو کو ٹرنگٹ کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ وہی لاؤنچ والے کو شاردو کو روانے کی بنا پر علی نے شاردو کی ریستورنٹ والی جانب چھڑا کر اسے اعلیٰ سلطان کی خدمت کے لیے مقرر کر دیا تھا۔ ایک روز جب شاردو اپنے اسلور سے گزری فریڈ نے کئی کیو لیاؤنڈ سے اسے انکوار کیا۔ علی نے شاردو کی تلاش میں ہمت نہ ہاری اور شاردو کو ڈھونڈ رہا تھا۔ ایک فریڈ رات لیو ہارڈو کا ایک قریبی ساتھی چیلو اس کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں کے بیچ خوش مسرکہ ہو کر چیلو، شاردو اور لیو ہارڈو کے حوالے سے زبان کھولنے کو تیار نہیں ہوئے۔ علی نے پیش کے عالم میں مار مار کر چیلو کو مارا۔ چیلو نے اسے مارا۔ لیو ہارڈو نے اعلیٰ اور اس کے قریب وجہ اس میں گردش کر رہی تھی۔ پلیس قتل کی تلاش میں تھی۔ لیک جیکسن میں حریف تمام خطرناک ڈپٹ ہو سکتا تھا لہذا علی نے اعلیٰ سلطان کو مصورت حال سے آگاہ کیا اور اپنی سرخ ہڈی سے اس پر ہتھیار لگا کر لیک جیکسن سے پھرتی ہوئی آیا۔ پھر سرخ ہڈی سے اس پر ہتھیار لگا کر لیک جیکسن سے پھرتی ہوئی آیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے فرائض کو نبھانے کی کوشش کی۔ اس کی سبب اس نے ڈیٹیلیا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ رابطہ ہونے پر ڈیٹیلیا نے علی کی کھانسنے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر کھینے تک باہر کی دنیائے کت کر اس کے ساتھ نکلے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ راضی ہونے پر ان بہتر مھنوں میں ہر بل علی پر چرتوں کا ایک نیا دور ہوتا رہا۔ ڈیٹیلیا بہت ادنیٰ چنگ کی مالک ایک پراسرار لیدی تھی۔ اس نے اپنا اثر و سوج استعمال کر کے علی کو چیلو مرڈر کیس سے اس طرح نکال لیا جیسے محسن سے بال۔ علاوہ ازیں ڈیٹیلیا نے نفوس بیوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیو ہارڈو، شاردو کو انوار کے کیو کا شہر ہونا ہے کیا ہے جہاں وہ شاردو کو سمیت فروغی کے جنم میں جو کھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیٹیلیا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر کھینے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کرے تو وہ شاردو کو جگ سلامت واپس لے آئے گی۔ شاردو کے حصول کی خاطر علی ڈیٹیلیا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔ پریسٹن ہارڈو نے اس کے لیے ڈیٹیلیا کی خدمت میں گزرنے والے وہ مہم ہوش باہر کھینے بڑے رنگین، رنگین، مردانہ پروردار و طاقتور تھے۔ ڈیٹیلیا کی شخصیت کسی سنے سے کم نہ تھی۔ اس پر مستزاد، ڈیٹیلیا نے اپنے ہی اسکا دو پراسرار شخصیات رنی آئزک بارڈو لاؤنڈ یا اعلیٰ نام سے علی کی ملاقات بھی کر دی۔ تب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد یہودیوں کی ایک سیکٹر اور بہت طاقتور سماجی "مسٹر اینڈ بوز" سے تعلق رکھتے تھے جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ یہ لوگ خود کو کئی خدا سمجھتے تھے۔ ان میں علی کے ہم عمر ایک ایسے جوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔ انھیں ملک حاکم علی وہی جوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ ڈیٹیلیا کی آزمائش میں علی ان کی شرکاء پر مہم کر رہے ہوئے "اسکل اینڈ بوز" کی رویت حاصل کرنے پر بے ادبی کا ہر کدے لیکن علی نے ڈیٹیلیا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیٹیلیا سے بے غمی اپنے اگلے کے پاس آ گیا۔ یہاں حالات کی ایک نئی گروت اس کی راہ دکھ رہی تھی۔ اعلیٰ نے لہجہ کی خوشگوار ملاقات میں علی کو اس کی زندگی کے دیگر بڑا دوسرے راز سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیو یارک (امریکا) مقرر کیا گیا تھا۔ مرزا عامر بیگ، علی سلطان کے والد، ایک ملازم تھے۔ اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔ علی سلطان نے ایک گامین کی حیثیت سے انھیں برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس طبقے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں تیم ایک ایک خاتون برداشت کر رہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے اچانک کراچی سے یہ دم آنا بند ہو گئی تھی جس سے مرزا عامر نے

بھی تھکا ہذا کیا کہ وہ خاتون کی سمیت میں گرفتار ہو گئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کوئی انکوار کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامر بیگ مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔ مرزا عامر بیگ نے علی کو کچھ ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کر سکتا تھا۔ اس صورت حال میں علی کا دل علی الامان پر گہرا تھا کہ وہ عورت اس کی ماں ہے۔ علی نے حتی الامکان سرعت سے تیار کی اور پوسٹن سے کراچی آ گیا۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی بے جا ہمنوں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ انٹرپورٹ سے ایک عیسائی چکر لگا رہے ہوئے کی جانب روانہ ہو تو کسی ڈرائیور نے اسے ویرانے میں جا کر لوٹنے کی کوشش کی مگر علی نے اسے کام نہ دیا۔ علی کی دوستی تنظیم کی تو جوان سے ہو گئی۔ تنظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتہ لگا لیا اور انھیں گھر لے آیا۔ علی کی ملاقات اپنی ماں سے ہو گئی۔ علی کو اپنی ماں کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا اور وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ علی ماں کے ہٹلے پر رہنے لگا وہیں اسے اطلاع ملی کہ اعلیٰ علی سلطان کا دل کے دورے کے سبب انتقال ہو گیا ہے۔ علی نے ماں کو اس کے ساتھ لے جانے کے لیے ڈوٹ دیا۔ اس کے حصول کے لیے کوشش شروع کر دی۔ علی کو ایک رات خواب میں ڈیٹیلیا نظر آئی۔ اس نے علی کو کچھ دی کہ وہ کہیں بھی چلا جائے اسے پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ کچھ ماہیں مقررہ افراد نے حملہ کر کے علی کی والدہ کو قتل کر دیا۔ علی نے جیہ کر لیا کہ وہ ماں کے قتل کو کفر و داریک پہنچانے کا علی نے تمام حقیقت بتا کر کوئی بتا دی۔ وہ علی کی اچھی دوست اور مرزا امین کی بیٹی تھی، علی کو اس کی رہائش کے چارہ ایک لافانہ ملاش میں ایک پیغام تھا جسے پڑھ کر اس کا دماغ بھگ سے اڑ گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

خط کی تحریر کے آغاز میں میری ماں کو ایک غلط گالی دی گئی تھی۔ اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر نہایت ہی عاسیانہ زبان میں بہت کچھ کہا گیا تھا۔ تحریر کے ایک ایک لفظ سے تیز اب چلتا تھا۔

"تمہارا باپ میرا مجرم تھا۔ اس کیلئے نے مجھے دس کروڑ روپے کا نقصان پہنچایا تھا۔ آج سے بائیس سال پہلے دس کروڑ بہت بڑی رقم ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے مجرم کو کتے کی موت مار دی پھر تمہاری ماں کو میں نے گندنی نالی کا کیزا بننے پر مجبور کر دیا۔ یہ بوڑھی بیٹی تو سوچو ہے کھا کر عمرہ کرنے چلی تھی۔ میں نے اس کی زندگی کا چراغ بھی گل کر دیا۔ تمہاری ماں کو فٹ کے گھاٹ اتارنا میرے لیے کسی بھی مشکل نہیں تھا لیکن مجھے تمہاری واپسی کا انتظار تھا۔ میں نہیں جانتا تھا، اس غصیت عورت نے تمہیں کہاں بھیج دیا تھا۔ اب پتا چلا ہے کہ تم جہد میں جیسے بیٹھے تھے۔ اچھا ہوا، تم آگئے۔ اس خندا کو پڑھنے کے بعد میری تلاش میں نکلو گے لیکن مجھے کچھ نہیں بچ سکو گے۔ مجھ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے تم کا پتہ جاؤ گے، ہانپ جاؤ گے اور تمہاری زبان باہر نکل آئے گی۔ میں تمہیں ماروں گا نہیں، تڑپاؤں گا، دوڑاؤں گا، سکاؤں گا اور تمہارے ہاتھ پاؤں تو ڈرگا پانچ بنا دوں گا پھر تم کسی فٹ پاتھ پر بیٹھے بھیک مانگتے دکھائی دو گے۔ تب میرا انتقام پورا ہو جائے گا۔"

میں یہ وقت تمام اس تحریر کو ایک بار ہی پڑھ سکا۔ ایک ایسے وقت پر جبکہ میں اپنی ماں کے گم کی سیل میں اپنے دیرینہ دشمن کو نظر انداز کر کے واپس امریکا جانے کا ارادہ کر چکا تھا، اس بدخصلت دشمن نے بڑے کٹلے الفاظ میں

مجھے لگا رہا تھا۔ اس وقت میرے دماغ میں بارودی دھماکے ہو رہے تھے۔

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا پھر آنکھیں بند کر کے جسم کو ڈھیرا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میں گہری اور ہموار سانس لینے لگا۔ سانس کا انسان کی سوچ کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ انسانی دماغ کو بنیادی طور پر دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اول آکسیجن، دوم گلوکوز اور یہ دونوں خون کے ذریعے دماغ تک پہنچتی ہیں۔ میں بھی طویل اور گہری سانسوں کے ذریعے اپنے دماغ کی تواضع کرنے لگا۔ دھیرے دھیرے میری حالت میں بہتری نمودار ہونے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری سوچ کا جہاز اتر پانٹ سے باہر نکل آیا ہو۔ چند لمحے پہلے میری کھوپڑی کے اندر اٹنے والا آتش فشاں رفتہ رفتہ سرد ہونے لگا تھا۔

چنگیز خان کا نام میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ ماں نے عظیم کے ہاتھ میرے لیے نئے کور دالی جو ڈری ایجوکیشن تھی اس میں چنگیز خان کا تفصیلی ذکر موجود تھا۔ یہ شخص میرے باپ کی موت اور میری ماں کی بربادی کا فوہ دار تھا اور اس تحریر کے توسط سے چنگیز خان نے میری ماں کو قتل کروانے کا اعتراف بھی کر لیا تھا اور مجھے جہر تک انجام تک پہنچانے کی دھمکی بھی دی تھی۔ میں تو اس کی فرمائش پر چنگیز خان کو ذہن سے نکال چکا تھا لیکن یہ بذات نفس کھل کر سامنے آ گیا تھا تو اب ماں کی خواہش سے صرف نگاہ کرتے ہوئے اس ختم شیطان سے دو، دو ہاتھ کرنا اور اسے جنم دہاں کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

نبلی دازی میں رقم ماں کی داستان کے مطابق، میری

پیدائش سے پہلے میرے والدین کراچی میں رہتے تھے۔ میرے والد کا اپنا بزنس تھا۔ وہ طوائف کی زیورات کی میکانگ کا کام کرتے تھے۔ ان کا چھوٹا سا کارخانہ صدر کے علاقے میں تھا۔ چنگیز خان بنیادی طور پر ایک ستار تھا لیکن اس پیشے کی آڑ میں وہ بہت سے مذموم وعدے بھی جاری رکھے ہوئے تھے جن میں سونے کی اسٹنگ، منیات کی ترسل، بلیک مار کیٹنگ اور اسی نوعیت کے دوسرے کام بھی شامل تھے۔ نیلی ڈائری سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق چنگیز خان کی رہائش ناگھ ناظم آباد میں تھی۔

کسی معاملے پر والد صاحب کی چنگیز خان سے چپقلش ہوئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تنازع بڑھتا رہا اور چنگیز خان نے بڑے واضح الفاظ میں والد صاحب سے کہا کہ اسے ہٹ چلا ہے، والد صاحب اس کے دشمنوں سے مل گئے ہیں۔ چنگیز خان جس قماش کا شخص تھا اس کے پیش نظر اس کی دوستی شرفاء سے بھی اور نہ ہی دشمنی نیک افراد سے۔ ایک بے بنیاد شک کی بنا پر وہ خواہاں والد صاحب کا دشمن بن گیا تھا۔ اس نے بعض جرائم پیشہ افراد کے ذریعے والد صاحب کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دی تھیں لیکن والد صاحب نے اس کی بکواس کی پروا نہیں کی اور اپنی ذکر پر کا مزن رہے۔

جیسا کہ میں نے بتایا، چنگیز خان سونے کی اسٹنگ میں بھی ملوث تھا۔ اس سلسلے میں اسے ایک طاقتور سیاسی شخصیت کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ مارکیٹ میں یہ خبر بھی گرم تھی کہ مذکورہ سیاسی شخص سونے کی اسٹنگ میں چنگیز خان کا بزنس پارٹنر بھی ہے۔ حالات میں اس وقت ایک سنگین موڑ آیا جب ہانگ کانگ کی بندرگاہ پر چنگیز خان کی سونے کی ایک ہماری کمپ کی بڑی گئی۔ اس سونے کی قیمت لگ بھگ دس کروڑ روپے بنتی تھی۔ اسمگل شدہ سونے کی یہ کمپ ضبط کر لی گئی۔ چنگیز خان کو ہماری مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

والد صاحب کا اس معاملے میں کوئی ہاتھ نہیں تھا لیکن چنگیز خان نے سارا الزام انہی کے سر پر ڈال دیا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ والد صاحب اس کے دشمنوں کے آلہ کار بن گئے تھے اور ان کی خبری پر چنگیز خان کا مال ہانگ کانگ میں پکڑا گیا تھا۔ اس آتش گیر خط میں چنگیز خان نے اپنے اسی دس کروڑ کے نقصان کا ذکر کیا تھا اور اس ہی تحریر کے ذریعے اس نے میرے والدین کے گل کا اقبال بھی کر لیا تھا۔

میں نے ”جی تحریر“ کے الفاظ اس لیے استعمال کیے ہیں کہ اس پر کچھ طور ثبوت نہیں پیش کیا جاسکتا

تھا۔ اس مضمون سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ یہ ساری باتیں چنگیز خان ہی نے کہیں ہیں۔ علاوہ ان میں کوریئرسوں کا وہ لفافہ بھی ایک دم یوگس تھا۔ مطلب یہ کہ مذکورہ لیٹر باقاعدہ کسی کوریئرسوں سے مجھ تک نہیں پہنچا تھا۔ ایک معروف کوریئرسوں کا پرنسپل مخصوص لفافہ ضرور اس مقصد کے لیے استعمال کیا گیا تھا لیکن اس انویلیپ پر نوٹورینک آئی ڈی کا کوئی اسٹیکر چسپاں کیا گیا تھا اور نہ ہی پینٹ کا باقاعدہ کوئی اندراج تھا۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کوریئرسوں کا کسی طرح لفافہ حاصل کر کے اسے میرے نام اور ایڈریس پر دتی ڈیلیور کروایا گیا تھا۔ لفافے کے پیچھے چنگیز خان کا نام اور ایڈریس لکھا ہوا تھا جس کے بارے میں میرا اعزازہ بھی تھا کہ وہ فرضی ایڈریس ہوگا۔ میں نے لفافہ الٹ پلٹ کراچی طرح چیک کر لیا۔ اس پر ایسی کوئی چیز موجود نہیں تھی جس کی بنا پر یا جس کی مدد سے میں مذکورہ کوریئرس کئی کی ہیلپ لائن پر کال کر کے اس پینٹ کے حوالے سے کسی قسم کی معلومات حاصل کر سکتا۔

ان لمحات میں میرا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں خط کے ان مندرجات پر غور کرنے لگا جو سراسر میری ذات سے متعلق تھے۔ خط پیچیدہ والا میرے اصل نام اسماعیل سے واقف تھا۔ اسے ماں کے بچنے کا پوسٹل ایڈریس معلوم تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ میں جدہ سے آیا ہوں اور سلمیٰ حیدر کا بیٹا ہوں۔ ان تین پوائنٹس کو ذہن میں رکھ کر میں خط لکھنے والے کو اپنے ارد گرد کے لوگوں میں فریس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

عظیم اور اس کی فیملی کو معلوم تھا کہ میں سلمیٰ اور حیدر علی کا بیٹا اسماعیل ہوں مگر میں جدہ نہیں، بلکہ امریکا سے آیا ہوں۔ وہ لوگ نہ تو چنگیز خان کے بارے میں کچھ جانتے تھے اور نہ ہی ماں کے بچنے کے پوسٹل ایڈریس سے واقف تھے۔ دس کروڑ روپے والے سونے کی کہانی کا میں نے بھی ان سے ذکر نہیں کیا تھا۔ ان لوگوں پر شک کرنا خارج از امکان تھا۔

دوسرا نمبر بیٹا کا تھا۔ میری زبانی بیٹا کو میری حقیقت تو معلوم ہو چکی تھی اور وہ ماں کے بچنے کے پوسٹل ایڈریس سے بھی بہ خوبی آگاہ تھی لیکن وہ ناظم آباد کے کسی رہائشی چنگیز خان سے ہرگز ہرگز واقف نہیں تھی اور نہ ہی وہ ہانگ کانگ میں پکڑے جانے والے چنگیز خان کے دس کروڑ مالیت کے سونے کے بارے میں کچھ جانتی تھی۔ جب باخمی میں یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت بیٹا محض دو سال کی ایک نئی

سی بچی تھی اور جرمنی کے شہر فریکفرٹ میں ہوا کرتی تھی۔ اس تناظر میں بیٹا کا نام شک زدہ افراد کی موجودہ فہرست سے نکل جاتا تھا۔

اب باری تھی نادر شاہ کی۔ نادر شاہ میرے اصل نام سے بھی واقف تھا اور اسے بھی علم تھا کہ میں سلمیٰ حیدر کا بیٹا ہوں اور جدہ سے آیا ہوں۔ نادر شاہ چونکہ ماں کے بچنے کی فروخت میں پوری طرح موجود تھا بلکہ یہ کام اسی کے ہاتھ سے ہو رہا تھا لہذا اس کے پوسٹل ایڈریس اس سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ علاوہ ان میں وہ ایک طویل عرصے سے ماں کے ساتھ جڑا ہوا تھا چنانچہ وہ ماں کے دشمن چنگیز خان کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس امر کے بھی روشن امکانات تھے کہ وہ دس کروڑ کے سونے والی اسٹوری سے بھی لاعلم نہیں ہوگا۔

میری نقیشتی سوچ نادر شاہ کے نام پر آ کر رک گئی۔ یہ شخص ڈسے دن سے میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ عظیم نے بھی اس پر اپنے شک کا اظہار کیا تھا۔ ماں کے تمام زمانی معاملات کلی طور پر نادر شاہ کے ہاتھ میں تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ماں کا بھتیخری تھا۔ میرے ذہن نے کچھ کر کہا۔ یا تو یہ شخص ماں کا قاتل ہے اور یہ لیٹر اسی نے میرے نام ڈیلیور کر لیا ہے تاکہ میں گھبراہٹ میں فوراً پاکستان سے چلا جاؤں اور یہ ماں کے مال پر عیاشی کے لیے آزاد ہو جائے۔ یا پھر یہ چنگیز خان کے ساتھ ملا ہوا ہے اور جدہ سے میری آمد کی اطلاع اسی نے چنگیز خان تک پہنچائی ہے۔ اس صورت میں خط والی تحریر چنگیز خان کی طرف سے ہو جاتی تھی۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ کوریئرسوں سے مجھ تک پہنچی تھی یا کوریئرسوں کی آڑ میں مجھ تک دتی پہنچائی گئی تھی۔

نادر شاہ کوڑ پ کرنے کے لیے بلیک جھپٹے میں، میرے ذہن میں ایک آئینہ یا آگیا۔ غلطی کی زبان میں اسے ”آدم“ کہا جاتا ہے۔ ایک فوری فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں شانت ہو گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں اپنے آئینہ یا گولی جامہ پہنانے میں مصروف ہو گیا۔

میں نے اسی نائپ کا ایک سادہ کاغذ لیا جیسے کاغذ پر میرے لیے وہ زہریلا خط لکھا تھا پھر مذکورہ ونڈرائٹنگ کی کم دیش کا پی کرتے ہوئے میں نے لکھنا شروع کیا۔

”میں تمہاری ماں کی عظمت کو سلام پیش کرتا ہوں۔ تمہارا باپ حیدر علی میرا بہت اچھا دوست تھا۔ اس نیک دل انسان کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ میں اپنے دوست کی موت کو اب تک نہیں بھول پایا ہوں اور اب تو کسی شقی

وقت

القلب ورنہ نے تمہاری عظیم ماں کی بھی جان لے لی۔ وہ پاکیزہ عورت چند روز بعد عمرے کی سعادت حاصل کرنے والی تھی لیکن شاید اللہ کو یہ منظور نہ تھا۔ بیٹا! میں تمہارے دکھ درد میں برابر کا شریک ہوں۔ تم جب تک پاکستان میں ہو، میں تمہاری ہر نوعیت کی مدد کے لیے تیار ہوں۔ تمہارے کسی بھی چھوٹے بڑے کام آ کر مجھے بہ حد خوشی ہوگی۔ کوئی بھی ضرورت ہو، کسی تکلف سے کام نہیں لینا۔ تمہارا اکل، چنگیز خان۔“

میں نے اصل کاغذ کو اپنے پاس محفوظ کر لیا اور اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے اس خط کو کوریٹر والے لفافے کے اندر رکھا اور اپنے سیل فون پر نادر شاہ کے نمبر پر کال کرنے لگا۔ دوسری گھنٹی پر اس نے کال ریسیو کر لی۔

”ہیلو بیٹا..... خیریت؟“ اس کی ہماری بھرم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اگلے کیا آپ ابھی میرے پاس آ سکتے ہیں؟“

”کیا ہوا..... تم شیک تو ہو؟“ اس نے پوچھا۔ ”یہاں آ جاؤ، پھر بتاتا ہوں۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔ ”آپ سے ایک بہت ضروری معاملہ ڈسکس کرنا ہے۔“

”او۔ کے.....“ وہ تلی آ میز لہجے میں بولا۔ ”میں پندرہ بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“

”فکر یہ اگلے۔“ کہتے ہوئے میں نے لائن کاٹ دی۔ اگلی کال میں نے عظیم کو کی۔ رابطہ ہونے پر اس نے مجھ سے استفسار کیا۔ اس کے انداز میں توشیح پائی جاتی تھی۔

”برو اسمر کا رو کیا ہے؟“ ”فراسفر ہونے کے لیے پر تول رہا ہے۔“ میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔

چنگیز خان کے دہشت ناک اور دہشت انگیز ”خط“ کو پڑھ کر میرے دل و دماغ پر جس اذیت نے حملہ کیا تھا، اب میں اس کے اثرات سے مکمل طور پر باہر آ گیا تھا۔ میرے اس جواب پر عظیم نے انھیں زدہ لہجے میں کہا۔

”برو..... میں سمجھا ہوں!“

”ارے یار..... تم جھکے ہوئے گھر پہنچے ہو اور میں تمہیں پھر ایک ہم پر روانہ کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے...

سرری انداز میں کہا۔ ”اس طرح میرے سر کا درد تمہارے سر میں خراش فر ہو جائے گا۔“

”برو دائم درو سر کی بات کر رہے ہو، تمہارے لیے تو

حرام و حلال جانوروں کی پیدائش

یہ بھی کم حیران کن بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جن جانوروں کو ہمارے کھانے کے لیے حلال قرار دیا ہے۔ مثلاً گائے، بکری، مرغی، مچھلی وغیرہ ان کی پیدائش میں از حد برکت بھی رکھ دی ہے۔ روزانہ لاکھوں کی تعداد میں ذبح ہو رہے ہیں مگر ان کی تسلیں ہیں کہ ختم ہی نہیں ہونے کو آتیں۔ جبکہ وہ جاندار جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے ذبح نہ ہونے کے باوجود ان کی تسلیں ختم ہو رہی ہیں اور ان کی تسلیوں کے تحفظ کی فکر و اس گمراہ ہے۔

☆☆☆

سطح زمین پر پھاڑوں کا کردار

زمین کی سطح پر بلند بالا پہاڑوں نے زمین کی محوری گردش میں ایک نیا متوازن قائم کیا ہوا ہے۔ (ٹھیک اسی طرح جس طرح ہم اپنی گاڑی کے پہیوں میں چھوٹے چھوٹے لوہے کے کڑے چسپاں کر کے بیہوشی کی محوری گردش کو Balance رکھتے ہیں) بصورت دیگر اگر یہ پہاڑ نہ ہوں تو زمین کا محور جغرافیائی اعتبار سے کسی ایک جہت میں قائم نہ رہے بلکہ بدلتا رہے۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو بلاستون بنایا تم ان کو دیکھ رہے ہو اور زمین پر پہاڑ ڈال رکھے ہیں کہ وہ تم کو لے کر ڈاؤن اوڈل نہ ہونے لگے اور اس پر ہر قسم کے جانور پھیلنا رکھے ہیں اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس زمین میں ہر طرح کے عمدہ اقسام اگائے۔“ (سورۃ لقمان 31: آیت 10)

سعید الطغر صدیقی کی کتاب

”ادارے آب و گل“ سے اقتباس

”جھوٹے.....“ وہ بے تکلفی سے بولی۔ ”اگر تم شارو کے ساتھ مصروف ہو تو مجھے بچ کر نے کی کوشش نہ کرتے۔“ جب میں تمہارے ساتھ مصروف ہوتا ہوں تو شارو کوچ کر کے کوشش بھی نہیں کرتا۔“ میں نے مٹنی خیر لہجے میں کہا۔ ”کیا میں نے بھی ایسا کیا؟“

”تم بہت بد معاشر ہو۔“ وہ ایک خاص انداز سے بولی۔ ”بد معاشر کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔“ اس کا ایک خاص سبب ہے۔“ میں نے کہا۔ وہ ہنسنے ہوئے لہجے میں مستنفر ہوئی۔ ”کیا؟“ ”تمہیں دیکھ کر خواہ مخواہ بد معاشر کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ول چل اٹھتا ہے اور میں مجبور ہو جاتا ہوں.....“

وہ ابھمن زدہ لہجے میں بولی۔ ”مجھ میں ایسی کیا خاص بات ہے؟“

”بتاؤں گا..... جب ہم لائک ڈرائیو پر جایں گے۔“

”نال رہے ہو.....؟“

”نہیں..... مستنفر کر رہا ہوں۔“

”اوکے۔“ میں ٹھیک دس منٹ کے بعد تمہیں ریڈی ملوں گی۔“ اس نے معتدل انداز میں کہا۔ ”پھر جب تم اشارہ دو گے تو میں گھر سے نکل آؤں گی۔“

”جب میں تمہیں فون کروں تو تم اپنی ریڈ کلفس پر سوار ہو کر مزہ لیو اور پھر آ جانا۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہیں دہلیں پر جاؤں کروں گا۔ تم ہماری گاڑی میں جاؤں گے اور ڈرائیو کر دو گی..... اوکے؟“

”اوکے۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے فون رکھا تو جشید نے اطلاع دی کہ شاہ جی آئے ہیں۔ میں نے جشید سے کہا کہ وہ شاہ جی کو ڈرائنگ روم میں بٹھائے، میں وہیں آ رہا ہوں۔ ٹھیک پانچ منٹ کے بعد میں اور تار شاہ ڈرائنگ روم میں آئے سانسے پیٹھے تھے۔ میں کوڈیز سروس والا وہ لفافہ بھی اپنے ساتھ لایا تھا جس کی بارودی تحریر نے مجھے اس اقدام پر مجبور کیا تھا تاہم میں نے لفافے کے اندر والے پر سے کوڈیل دیا تھا۔

میرے ہاتھ میں اس لفافے کو دیکھ کر تار شاہ نے کوئی خاص تاثر نہیں دیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یا تو وہ اس لفافے کی حقیقت سے واقف نہیں تھا اور یا پھر وہ سب کچھ جانتا تھا اور اس معاملے میں اندر باہر سے بہت کچھ تھا اسی لیے اس کے چہرے سے کچھ بھی جھلک نہیں رہا تھا۔

رکی ٹلیک سلیک کے بعد اس نے پوچھا۔ ”بیٹا!

گھر کی لوکیشن اور نمبر وغیرہ لوٹ کر تا ہے جہاں تار شاہ جائے گا۔ اس کے بعد تمہارا کام ختم ہو جائے گا۔ تم اپنے گھر چلے جانا۔ باقی باتیں ہم مکمل کریں گے۔“ ”سمجھ گیا۔“ اس نے کہا۔ ”میں تمہارے گھر کے قریب پہنچ کر تمہیں اطلاع دے کر رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ہمارے بیچ سیلوار رابطہ ختم ہوا تو میں نے بیٹا کے نمبر پر کال کی۔ اس نے فوراً میری کال ریسیو کر لی اور خاصی توانا آواز میں بولی۔

”ہیلو! کیا ہو رہا ہے؟“

”اپنی دوست کا انتظار۔“ میں نے شرارت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

وہ خوشی سے مستنفر ہوئی۔ ”کون سی دوست؟“

”جو اس وقت قریب ہے۔“ میں نے ذمہ داری انداز میں کہا۔

”کس کے قریب.....؟ وہ چپکی۔“ تمہارے یا تمہارے دل کے؟“

”جو بھی سمجھ لو.....“ میں نے گول مول جواب دیا۔

”بھئی! میں تم سے چند گز کے فاصلے پر موجود ہوں۔“ وہ نمبرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اور شارو مجھ سے بھی کم فاصلے پر تمہارے دل میں بیٹھی ہے.....“

”تو تمہاری بھئی جس اتنی سی ہے۔“ میں نے جیسے لہجے میں کہا۔ ”میں نے کہا، جو بھی سمجھ لو اور..... تم نے یہ سمجھ لیا؟“

”تو کیا میں نے غلط سمجھا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”جیسا میں نے سمجھا، کیا دینا نہیں ہے؟“

”ہرگز نہیں!“ میں نے پوری قطعیت سے کہا۔ ”اگر اس وقت مجھے شارو کی یاد آ رہی ہوتی تو میں اسے کال کرتا۔ تمہیں فون کیا ہے تو اس کا بھی مطلب ہے کہ تم یاد آ رہی ہو اور..... میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

”اوکے.....“ وہ خوشگوار انداز میں بولی۔ ”میں آ رہی ہوں۔“

”آنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بس، اسٹینڈ بائی رہو۔ میں فری ہو کر تمہیں کال کرتا ہوں پھر ہم لائک ڈرائیو پر چلیں گے۔“

”آئیڈیا اچھا ہے۔“ وہ سٹائی انداز میں بولی پھر جیسے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”تم کس سے فری ہونے کے بعد مجھے کال کر دو گے۔ اس وقت کس کے ساتھ ہو؟“

”شارو کے ساتھ۔“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

میری جان بھی حاضر ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”تم حکم کرو، مسئلہ کیا ہے؟“

”مسئلہ یہ ہے کہ آدھے گھنٹے کے اندر تم میرے پاس آ جاؤ۔“ میں نے بتایا۔ ”تمہیں ایک آدمی کے تعاقب میں روانہ کرنا ہے۔“

”کون آدمی؟“ اس نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ”اور ایسی کیا ایمری کسی آن پڑی ہے جو کسی بندے کے تعاقب کی ضرورت پیش آ رہی ہے.....؟“

”اس آدمی کا نام ہے..... تار شاہ!“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”ایک خاص حوالے سے مجھے اس پر شک ہوا ہے۔ اس معاملے کی تفصیل میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال یہ جان لو کہ شاہ جی پندرہ بیس منٹ میں میرے پاس پہنچ رہا ہے۔ میں اسے اس وقت تک اپنے گھر میں روکے رکھوں گا جب تک تم یہاں نہیں پہنچ جاتے۔ تمہیں گھر کے اندر نہیں آنا بلکہ باہر گلی میں یا کسی بھی ایسی جگہ پر رک کر انتظار کرنا ہے جہاں تار شاہ کی نظر نہ پڑے۔ جب تار شاہ مجھ سے ملاقات کرے گا تو تم محدود فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کر دو گے۔ تم نے اس کا گھر تو دیکھا ہو ہے نا؟“

”ہاں، دیکھا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”صرف ایک فیصد امکان اس بات کا ہے کہ میرے گھر سے نکل کر وہ اپنے گھر جائے۔“ میں نے کہا۔ ”باقی ننانوے فیصد میرا اندازہ ہے کہ وہ تار شاہ ناظم آباد کا رخ کرے گا۔“

”اوکے.....“ وہ معتدل انداز میں بولا۔ ”مجھے کیا کرنا ہے؟“

”تم بڑے محتاط انداز میں میری گلی ہی سے اس کے پیچھے لگ جاؤ گے۔“ میں نے کہا۔ ”اسے کسی بھی صورت اپنے تعاقب کا شک نہیں ہونا چاہیے۔ اگر وہ اپنے گھر جاتا ہے تو تم دس، پندرہ منٹ تک اس کے گھر کے نزدیک رک کر انتظار کر دو گے۔ میں ممکن ہے کہ وہ گھر کا چکر لگا کر واپس آئے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو تم نے پھر اس کے تعاقب میں لگ جانا ہے اور اگر وہ پندرہ منٹ تک گھر سے باہر نہیں نکلتا تو پھر تم واپس اپنے گھر چلے جانا.....“

”کافی وقت کر کے میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”ان کیس، اگر میرے انداز سے کے مطابق، وہ یہاں سے نکل کر سیدھا تار شاہ ناظم آباد جاتا ہے تو تم نے اس

خیریت تو ہے نا۔ تم نے اچانک مجھے کیوں بلا لیا، سب ٹھیک تو چل رہا ہے نا؟“

”پریشانی والی کوئی بات نہیں اٹکل۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بس، آپ سے تھوڑی معلومات حاصل کرنا نہیں۔“

”کیسی معلومات؟“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”آپ ماں کے بچے خیر خواہ ہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا شروع کیا۔ ”اس لیے آپ میرے والد صاحب کے تھمس دودستوں سے بھی اچھی طرح واقف ہوں گے؟“

”تمہارے باپ کا حلقہ احباب زیادہ وسیع نہیں تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”بس چند افراد ہی سے اس کی میل ملاقات تھی۔“

”کیا آپ والد صاحب کے کسی ایسے دوست کو جانتے ہیں جس پر انہوں نے بہت سے احسانات کیے ہوں۔“ میں نے پوچھا۔ ”اور وہ شخص اصرار کراچی کے علاقے نارتھ ٹائم آباد میں رہتا ہو؟“

اس کے چہرے پر انہیں کے تاثرات پیدا ہوئے۔ میرے سوال کا سیدھا جواب دینے کے بجائے اتنا اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔

”بیٹا مسئلہ کیا ہے..... مجھے کل کر بتاؤ؟“

”مسئلہ کوئی نہیں ہے اٹکل۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

”میں ایک ایسے شخص کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں جو نارتھ ٹائم میں رہتا ہے اور والد صاحب سے دوستی کا دم بھرتا ہے۔ اس کا نام چنگیز خان ہے.....!“

آخری جملہ میں نے بڑے ڈرامائی انداز میں ادا کیا تھا۔ وہ اچھل پڑا اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”چنگیز خان..... یہ شخص تمہارے باپ کا دوست کیسے ہو سکتا ہے.....؟“

میں بڑی احتیاط اور سنجیدگی کے ساتھ نادر شاہ کے جذبات سے کھیل رہا تھا۔ اس کے بے اختیار اچھلنے پر میں نے تھوڑا آگے کوچھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا آپ کسی چنگیز خان کو جانتے ہیں؟“

اس نے بڑی ہوشیاری سے میرے ہاتھ میں موجود لفافے کی طرف دیکھا اور اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہاں، جانتا ہوں مگر وہ تو تمہارے باپ کا دشمن ہے۔ کیا سسلی بہن نے انہیں چنگیز خان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“

”ماں نے کسی شخص کا نام لیے بغیر مجھے اپنی چٹائی تجھی۔“ میں نے کہا۔ ”شاید اس کا سبب یہ ہو کہ وہ میرے جذبات کو بھڑکانا نہیں چاہتی تھیں۔ اگر وہ اپنے دشمنوں کے نام مجھے بتا دیتیں تو اس بات کا امکان تھا کہ میں غصے سے بے قابو ہو کر انتقام لینے اٹھ کھڑا ہوتا اور ماں مجھے خون خرابے سے بچانا چاہتی تھیں اسی لیے انہوں نے خاموشی سے ہمیشہ کے لیے پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن.....“

میں نے اپنے لہجے میں مصنوعی دکھ بھرتے ہوئے لگائی توقف کیا تاکہ نادر شاہ کو ایسا محسوس ہو کہ ماں کی موت نے مجھے بے حد کمزور کر دیا ہے پھر اضافہ کرتے ہوئے میں نے صرف اتنا کہا۔

”لیکن مالک کو یہ منظور نہیں تھا.....“

”سسلی بہن بہت ہی سمجھ دار اور بردبار خاتون تھیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ تمہاری حفاظت اور سلامتی کی خاطر ہی انہوں نے انہیں چنگیز خان کے نام سے بہت دور رکھا ہوگا لیکن سسلی بہن اب اس دنیا میں باقی نہیں رہیں اور تم بھی یہاں سے جانے والے ہو لہذا انہیں چنگیز خان کے بارے میں بتانے میں، میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا.....“ اس نے ذرا دیر کو رک کر میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”چنگیز خان بہت ہی خطرناک قسم کا انسان ہے۔ اسی نے تمہارے باپ کو قتل کر لیا تھا۔“

اب میرے اچھلنے کی باری تھی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اٹکل؟“ میں نے اضطرابی لہجے میں سوال کیا۔ ”اگر چنگیز خان میرے والد صاحب کا دشمن ہے تو پھر یہ خط.....!“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ سرسراتی ہوئی آواز میں مستغرق ہوا۔ ”خط..... کیا مطلب؟“

”آپ خود دیکھ لیں۔“ میں نے کوریئر مین کی دالا لفافہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے فوراً میرے ہاتھ سے وہ لفافہ لے لیا پھر کھول کر اس کے اندر موجود جگر پر کوڑھنے لگا۔ میں نے اپنی عقابلی نگاہ اس کے چہرے پر گاڑ دی۔

پرچہ پر نظر پڑتے ہی اس کے دیدے پھٹ گئے۔ اسی لمحے میرے کل فون کی سیٹیج فون دھیرے سے بجی۔ میں نے چیک کیا۔ وہ عظیم کا ایس ایم ایس تھا۔

”برو! میں کچل گیا ہوں۔“

”اوکے۔“ میں نے رپلائی کیا۔ ”جیسے ہی نادر شاہ

جانے کے لیے اٹھے گا، میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں پوری طرح تیار بیٹھا ہوں۔“ اس نے کہا۔

میری نظر اس دوران میں مسلسل نادر شاہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ وہ انہیں آئینہ حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ یہ تحریر ایسی بھی طویل نہیں تھی کہ اسے پڑھنے میں زیادہ وقت لگتا۔ میرے اندازے کے مطابق، وہ اس خط کو بار بار پڑھ رہا تھا۔ میں نے مداخلت ضروری جانی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”اٹکل! آپ نے چنگیز خان کا خط پڑھ لیا؟“

اس کی سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”یہ کیسے ہو گیا؟“

یہ میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔ یا تو اس نے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ خط کی تحریر نے اس کی سماعت معطل کر دی تھی اور یا پھر اس نے میری بات کو سنی، ان سنی کر دیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت وہ ناقابل یقین صورت حال سے دوچار تھا۔ میں پوچھنے پر تیار نہ تھا۔

”کیا کیسے ہو گیا تھا جی.....؟“

وہ قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مم..... میرا مطلب ہے..... کہ چنگیز خان انہیں ایسا خط کیوں لکھے گا..... اس کے اندر یہ تبدیلی کیسے آئی.....؟“

”جی تو.....“ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنز بے انداز میں کہا۔ ”میری بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آپ نے بتایا ہے کہ یہ شخص ہمارے لیے ایک خطرناک دشمن کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ میرا ہمدرد بن کر مجھے خط لکھ رہا ہے۔ یہ کیا معما ہے شاہ جی؟“

”میری سمجھ میں کچھ کچھ آ رہا ہے.....“ وہ بڑے شاطرانہ انداز میں بات کو بناتے ہوئے بولا۔

”مجھے بھی سمجھا نہیں اٹکل۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”میں تو چنگیز خان سے ملاقات کے بارے میں سوچ رہا تھا اسی لیے آپ کو بلا رہا تھا تاکہ اس کے بارے میں آپ سے معلومات حاصل کر سکوں۔ مجھے تو یہ شخص خاصا بھلا لگا ہے۔“

”ہرگز نہیں!“ وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”تم اس شیطان سے ملنے کے بارے میں بھی بھول کر بھی نہیں سوچتا۔ میں اس کی چال کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ یہ غیبت نہیں ٹرپ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کی سازش کے حال میں قدم رکھنے کی غلطی نہیں کرنا چاہی..... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

سورسی

گا ہک۔ ”سردار صاحب دو انڈے دے دیجیے۔“

سردار۔ ”سوری میں مرغی نہیں، دکاندار ہوں۔“

☆☆☆☆☆

جلدیں

سردار ہوئی جہاز میں جھٹلا کر رہا تھا کہ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھوں گا۔ سب سمجھا سمجھا کر تھک گئے کہ آپ کی سیٹ آگے ہے۔

ایک آدمی اٹھا اور سردار کے کان میں کچھ کہا۔ سردار ہماک کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

لوگوں نے حیران ہو کر اس آدمی سے پوچھا۔ ”آپ نے ایسا کیا کہا کہ سردار غور مان گیا؟“

آدمی بولا۔ ”میں نے بس اتنا کہا ہے کہ آگے والے جلدی پہنچ جائیں گے۔“

☆☆☆☆☆

عیادت

سردار دوست سے۔ ”اب تمہاری کھانسی کا کیا حال ہے؟“

دوست۔ ”کھانسی تو بند ہو گئی ہے بس ذرا سانس رک رک کے آ رہی ہے۔“

سردار۔ ”پریشان مت ہو۔ سانس بھی بند ہو جائے گی۔“

☆☆☆☆☆

COMMING SOON

سردار کی اپنے باپ سے لڑائی ہو گئی۔ سردار نے شے میں اپنے باپ کی تصویر اٹھائی اور قبرستان میں جا کر دیوار کے ساتھ لگا کر بچھ لگا دیا۔

"COMMING SOON"

مرسدہ تفسیر عباس باہر، اوکاڑہ

”بالکل سمجھ رہا ہوں انکل۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”آپ میرے خیر خواہ ہیں، میرے لیے سب سے زیادہ بھروسے والے ہیں۔ میں تو وہی کروں گا جو آپ مجھ سے کہیں گے۔“

”شاباش بیٹا! تم بڑی دانش مندانہ باتیں کر رہے ہو۔“ وہ سر اٹھانے والے انداز میں بولا۔ ”میری ایک بات کو غور سے سنو۔ اگر تم نے میرا مشورہ مان لیا تو سمجھ لو، پھر تمہاری زندگی کو کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔“

”آپ بتائیں انکل۔“ میں نے مصنوعی سراسیمگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں پہلی فرصت میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گا۔“

”جتنا جلدی ممکن ہو، تم واپس جدہ چلے جاؤ۔“ وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ”چنگیز خان کو پتا چل چکا ہے کہ تم کراچی میں ہو۔ وہ کسی بھی لمحے یہاں سے تم تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اور اس کی رسائی کا ایک ہی مطلب ہے۔۔۔۔۔۔“

وہ جملہ مکمل چھوڑ کر خاموش ہو گیا تو میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”میری موت۔۔۔۔۔۔ آپ یہی کہنا چاہ رہے ہیں نا؟“

”اللہ تمہاری حفاظت کرے بیٹا۔“ وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ ”لیکن سچائی سے نگاہ چرائی بھی نہیں جاسکتی۔ زمینی حقائق تو اسی جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ یہاں کی دھرتی تمہارے لیے تنگ کر دی جائے گی۔“

”آپ فکر نہ کریں انکل!“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”میں کل ہی کسی فلائٹ میں اپنی سیٹ کنفرم کرا تا ہوں۔ جب ماں ہی باقی نہیں رہیں تو میں یہاں رک کر کیا کروں گا۔۔۔۔۔۔“

”بیٹا! جان ہے تو جہان ہے۔“ وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ تم نے حالات کی نزاکت کو محسوس کر لیا ہے۔ تمہاری جتنے بیچے کی فلائٹ کنفرم ہو، مجھے ضرور بتا دینا۔“

”ضرور بتاؤں گا انکل!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”آپ مطمئن ہو کر جائیں۔ ان شاء اللہ انون پر چاردار ابلد رہے گا۔“

”ان شاء اللہ۔۔۔۔۔۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر بولا۔ ”اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں یہ خط اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں!“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں انکل۔“ میں نے سرسری

انداز میں کہا۔ ”میں نے کون سا اس کاغذ کے ٹکڑے کا چار ڈالنا ہے بلکہ اگر میری ماںیں کو اسے بھاڑ کر پھینک دیں۔ اس فضول پرچے سے ہمیں کیا لینا دینا۔۔۔۔۔۔“

”تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ یہ واقعی ایک فضول سی چیز ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں اسے ایک خاص مقصد سے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اس بات کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ چنگیز خان سے اس تحریر کا دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔ کسی دوسرے یا تیسرے شخص نے چنگیز خان کی آڑ لے کر یہ چال چلی ہو تاکہ ہمیں شکار کیا جاسکے۔ ایک بات کا مجھے یقین ہے کہ یہ جو کوئی بھی ہے، تمہارا دوست تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔“

”مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے انکل۔“ میں نے بڑی مضبوطی سے اس کے خیال کی تائید کر دی۔

”تم آرام کرو۔ میں چلا ہوں۔“ وہ الودائی انداز میں بولا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ خیر کرے گا۔“

”جی انکل۔۔۔۔۔۔!“ میں نے بس اتنا ہی کہا۔

وہ ڈرائنگ روم سے نکلا تو میں نے غصہ کال کی۔ ”وہ آ رہا ہے۔ تم ریڈی ہو نا۔۔۔۔۔۔؟“

”یور ریڈی کی ہرو۔“ وہ کراہی آواز میں بولا۔

”مجھے بڑی بے قراری سے تمہاری رپورٹ کا انتظار رہے گا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ کام بہت ہوشیاری سے کرنا ہے۔“

”میں کوشش کروں گا کہ تمہارا انتظار طوالت نہ پکڑے۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”آگے جانا کو منظور۔“

”مالک کی مرضی کے سامنے سب بے بس ہیں۔“ میں نے ایک بوچھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

”نادر شاہ تمہاری اسٹریٹ سے نکل کر زمرہ لیوارڈ کی سمت بڑھ رہا ہے۔“ غصہ نے بتایا۔ ”میں اس کے تعاقب میں جا رہا ہوں۔“

میں نے دعاغیر انداز میں کہا۔ ”آل دی بیسٹ!“

میں نے تھوڑی دیر پہلے نادر شاہ سے جو گفتگو کی تھی اس سے ایک بات تو بڑی ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ وہ کسی نہ کسی حوالے سے اس معاملے میں ملوث ضرور تھا۔ میرے تحریر کردہ خط کو پڑھ کر اس کی آنکھوں اور چہرے پر ہنس نوحیت کے تاثرات نمودار ہوئے تھے اس سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا سی دقت محسوس نہیں ہوئی تھی کہ یہ سب کچھ اس کی توقع کے برعکس تھا۔ اس کے رویے میں سے بے یقینی جھلکتی تھی۔ اس کا یہ جملہ قابل غور اور نہایت ہی توجہ کا حامل

تھا۔۔۔۔۔۔ کیسے ہو گیا؟

گویا وہ کچھ اور ”ہونے“ کی توقع کر رہا تھا اور یہ ”کچھ اور“ وہ اصلی خط بھی ہو سکتا تھا جو میں نے غائب کر دیا تھا۔ میں نے اسے اس تحریر کی دوا بھی نہیں نکلے دی تھی۔ اگر یہ خط اسی نے مجھے خوفزدہ کرنے کے لیے بھیجا تھا تاکہ میں جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو جاؤں تو پھر خط کی تبدیلی پر اس کا رد عمل عین فطری تھا اور اگر یہ خط اس کی طرف سے نہیں تھا مگر وہ جانتا تھا کہ خط چنگیز خان کی جانب سے آیا ہے تو مجھ اس کا رویہ ایکشن جیستہ لگایا ہو جاتا تھا۔ اس امر کے امکانات فی الحال منہ کے برابر نظر آ رہے تھے کہ نادر شاہ مذکورہ خط سے قطعی لاتعلق یا ناظم ہو۔ اب جو بھی حقیقت تھی، چند منٹ کے بعد اسے روز روشن کے اندر عیاں ہو جاتا تھا۔

میرے سل فون کی گھنٹی بجی تو میں نے فوراً کال ریسیو کر لی۔ دوسری طرف عظیم تھا۔ میرے ”ہیلو“ کے جواب میں اس نے بتایا۔

”بمزا! اس بندے نے بدر کرشل کی جانب رخ نہیں کیا۔“

”اس کا مطلب ہے، اس کا ارادہ اپنے گھر جانے کا نہیں ہے۔“ میں نے متاستانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”کیا وہ نادر شاہ ناظم یا باؤ کی جانب جا رہا ہے؟“

”ہرگز نہیں!“ وہ دھڑک الفاظ میں بولا۔

”ہرگز نہیں کا کیا مطلب؟“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”مطلب یہ کہ وہ اس وقت شارع فیصل پر چڑھ چکا ہے اور اس کا رخ از پورٹ کی جانب ہے۔“ عظیم نے بتایا۔

”یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی۔“ میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ”وہ میرے گھر سے نکل کر از پورٹ کیوں جا رہا ہے؟“

”ابھی اس بات کی تصدیق نہیں ہوئی کہ وہ از پورٹ ہی جا رہا ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تمہیں صرف اتنا بتایا ہے کہ اس کا رخ از پورٹ کی جانب ہے۔ تم دس پندرہ منٹ روکو۔ میں تمہیں اپ ڈیٹ کرتا ہوں۔“

”اوکے۔۔۔۔۔۔ آئی ایم ویٹنگ۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔

عظیم نے مجھے جو صورت حال بتائی تھی، اس کے مطابق تو نادر شاہ اپنے گھر گیا تھا اور نہ ہی اس کا نادر ناظم آباد جانے کا کوئی ارادہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں کون سی منزل تھی، یہ اسی وقت معلوم کیا جاسکتا تھا جب وہ کہیں

پڑاؤ ڈالے۔ اس کے ٹھہرنے کے مقام کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کس کے پاس گیا تھا۔ وہ جہاں بھی جس شخص سے بھی ملے جا رہا تھا، ایک بات تو طے تھی کہ اس جگہ اور اس شخص کا مجھے پیچھے کے خط سے ٹھہرا تعلق تھا۔۔۔۔۔۔!

میں بڑی بے مبری سے اپنے بیڈ روم میں ادھر سے ادھر ٹپل رہا تھا، مجھے عظیم کی کال کا انتظار تھا۔ مجھے وہی بتا سکتا تھا کہ نادر شاہ کہاں اور کس کے پاس گیا تھا۔ میں نادر شاہ کی اس پراسرار حرکت کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ میرے سل فون کی گھنٹی بج گئی۔ دوسری جانب عظیم تھا۔

”ہاں عظیم۔“ میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ ”کیا رپورٹ ہے۔۔۔۔۔۔؟“

”بھائی صاحب! آپ کا بندہ محمد علی سوسائٹی کے ایک بنگلے میں گھسا ہے۔“ عظیم نے بتایا۔ ”بنگلے پر ”خان ہاؤس“ کی نیم پلٹ لگی ہوئی ہے۔ میں نے مذکورہ بنگلے کا نمبر اور لوکیشن ڈیٹا سین کر لی ہے۔ اب بتاؤ، آگے کیا کرنا ہے؟“

”صرف پندرہ منٹ انتظار۔“ میں نے کہا۔ ”کسی بھی محفوظ مقام پر کھڑے ہو کر نادر شاہ کی داپسی کا انتظار کرو۔ اگر وہ اس دوران میں باہر نہ نکلے تو تم اپنے گھر جاسکتے ہو۔“

”اور اگر تمہاری وی ہوئی مہلت سے پہلے وہ بنگلے سے نکل آئے تو۔۔۔۔۔۔؟“

”تو بھی تم اس پر لخت بھیج کر اپنے گھر چلے جانا۔“ میں نے کہا۔

”خان ہاؤس کی کیا مشرعی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میری معلومات کے مطابق، والد صاحب کی چنگیز خان ٹائی ایک شخص سے دشمنی تھی اور اسی بد بخت نے میرے باپ کو قتل کر لیا تھا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں عظیم کو بتایا۔ ”ماں کی خواہش کی خاطر میں نے ہر نوعیت کے انتقامی جذبات کو اپنے دل و دماغ سے نکال دیا تھا لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے گورنر سروس سے ایک لٹر لٹا تھا جو چنگیز خان کی طرف سے لکھا گیا ہے۔ اس خط میں چنگیز خان نے میرے باپ اور ماں کو قتل کرانے کا اعتراف کیا ہے اور مجھے بھی خطرناک نتائج کی دھمکیاں دی ہیں۔ میں اس دقت جو کچھ کر رہا ہوں یہ سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔“

”مجھے نہیں لگتا کہ چنگیز خان کوئی اتنا جتنی انسان ہوگا کہ تمہارے والدین کی موت کا یوں تحریری اعتراف کرے گا۔“ اس نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔ ”مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر معلوم ہوتا ہے۔“

”میں نے بھی خط پڑھ کر اسی انداز میں سوچا تھا اور

پڑتے ہی جی ایم سر کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
 میں بیٹا کے ساتھ تیزی سے ان کی جانب بڑھ گیا۔
 وہ بڑی محبت سے ملے اور نرمی علیک مسلک کے بعد
 انہوں نے کہا۔ ”پر وگرام کی وجہ سے مجبوراً میں آپ کو زیادہ
 وقت نہیں دے سکا تھا۔ ہماری ملاقات ادھوری رہ گئی تھی۔
 مجھے بتا تھا آپ دوبارہ میرے پاس آئیں گے اسی لیے میں
 آپ کے استقبال کی خاطر یہاں پہل رہا تھا۔“
 میں نے ان سے یہ پوچھنے کی غلطی نہیں کی کہ انہیں
 کیسے پتا چلا کہ میں دوبارہ ان سے ملنے آؤں گا؟ دیسے سچی
 بات یہ ہے کہ میرا جی ایم سر کی طرف آنے کا کوئی ارادہ نہیں
 تھا کیونکہ ان کے یہ الفاظ میری یادداشت میں محفوظ تھے۔
 ”آپ کو بار بار مجھ سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہماری پہلی
 اور آخری ملاقات ہے۔“ جیتل والی بلڈنگ کو دیکھ
 کر کیا ایک میرے دل میں جی ایم سر سے ملنے کا خیال ابھرا
 تھا۔ تو کیا..... یہ خیال میرے ذہن کی سیلف پروڈکشن تھا یا
 کسی بیرونی قوت کے زیر اثر پیدا کیا گیا تھا؟ اگر آخرا لڈ کر
 امکان پر غور کیا جاتا تو پھر بڑے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا
 تھا کہ یہ خیال میرے ذہن میں جی ایم سر نے اپنی کسی
 روحانی قوت کی مدد سے اجاگر کیا تھا یا اس لیے وہ بلڈنگ سے
 باہر بڑے اعتماد کے ساتھ میرا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں
 یقین تھا کہ ان کی خواہش کے مطابق میں ضرور آؤں گا اور
 میں بے اختیار ہو کر جلا آجاتا۔
 ”سر! آپ شرمندہ نہ کریں۔“ میں نے مؤدبانہ
 انداز میں کہا۔ ”میری اتنی اوقات کہاں کہ آپ جیسا عبرتی
 میری راہ دیکھ رہا ہو۔“
 ”انسان کی اوقات پر بعد میں بات ہوگی۔“ وہ اپنی
 روشن آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے پھر
 اپنے قریب کھڑے ہو جواں سے کہا۔ ”تفسیر ائم میڈم کو اندر
 لے جاؤ۔ ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔“
 ”میڈم“ سے جی ایم سر کی مراد بیٹا تھی۔ تفسیر نامی
 اس نوجوان نے فرماں برداری سے کہا۔
 ”اوسے سر!“
 بیٹا نے تفسیر کے ساتھ جانے سے پہلے سوالیہ نظر سے
 میری طرف دیکھا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ جی
 ایم سر مجھے اپنے ساتھ لے کر سروں روڈ پر ایک جانب
 بڑھنے لگے۔
 ”کھانا کھالیا آپ نے؟“ انہوں نے پوچھا۔
 میں نے جواب دیا۔ ”نہیں سر۔“

”جائے براٹھا ملے گا نا؟“
 ”آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔“
 ”ادھر ہوئی پر بہت عمدہ چائے پراٹھا ملتا ہے۔“ وہ
 مجھے اپنی محبت میں چلائے ہوئے بولے۔ ”آپ کے
 بھانے میں بھی کھانا لگاؤ۔“
 میں نے مختصر اُگھکا۔ ”جی سر۔“
 وہ مجھے مختلف گلیوں میں سے گزار کر جیتل والی بلڈنگ
 کے بچھواڑے والے علاقے میں لے آئے۔ ہم نے
 ریلوے لائن کو جوڑ کر اڈرڈ کورہ ہوئی پر پہنچ گئے۔ اس ہوٹل
 پر بیٹھنے کے لیے کرسی میز کا بندوبست نہیں تھا بلکہ اس مقصد
 کے لیے کئی ایک چوبلی تخت بچھے ہوئے تھے جن پر بیٹھے
 ہوئے گاہک چائے اور پرائے سے دل بہلا رہے تھے۔
 ہم نے بھی ایک خالی تخت پر نشست جرائی۔
 ”آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ میں آپ کو کس
 ڈھابے پر لے آیا ہوں۔“ جی ایم سر نے ٹھہرے ہوئے
 لہجے میں کہا۔ ”بلکہ آپ کے شایان شان نہیں ہے۔“
 ”اسی کوئی بات نہیں ہے سر۔“ میں نے جلدی سے کہا۔
 ”میں آپ کی کمپنی میں بہت کمزور محفل مل کر رہا
 ہوں۔ پھر ہوئی کامی ایک اپنا ہی مزہ ہے۔“
 جی ایم سر نے کڑک پرائے اور چائے کا آرڈر دیا
 پھر ہمارے بیچ ٹھنڈا کاسٹل شروع ہو گیا۔ ”آپ اپنا سیل
 فون آف کر دیں۔“ انہوں نے مشتاقانہ انداز میں کہا۔
 میں نے فوراً ان کے حکم کی تعمیل کر دی۔
 انہوں نے پوچھا۔ ”کیا آپ کے امریکا والے نمبر کا
 سم کارڈ بھی سیل فون میں لگا ہوا ہے؟“
 ”جی سر۔“ میں نے اثبات میں جواب دیا۔
 ”کچھ عرصے کے لیے آپ اس سم کارڈ کو نکال کر کہیں
 رکھ دیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ”وہ عورت جو امریکا
 سے آپ کے پیچھے آئی ہے، اس کے پاس آپ کا یہ نمبر ہے۔ وہ
 اس نمبر سے آپ کو سوائی ٹریس کر سکتی ہے۔“
 ”میں گھر پہنچ کر آپ کی ہدایت پر لازمی عمل کروں
 گا۔“ میں نے کہا۔ ”دیسے میری ٹریڈنگ اور ٹریڈنگ کے
 لیے وہ میرے پاسپورٹ کا سہارا بھی لے سکتی ہے۔“
 پھر میں نے جی ایم سر کو بتایا کہ امریکی شہریت رکھنے
 والے افراد کے میو پاسپورٹ کے اندر ایک خفیہ چپ لگی
 ہوتی ہے جس کی مدد سے اسٹیل ڈیپارٹمنٹ جب چاہے
 سیلوائن سسٹم کے تحت دنیا کے کسی بھی حصے میں اپنے شہری
 کی لوکیشن کا پتا چلا سکتا ہے۔ انہوں نے پوری توجہ سے میری

بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر کہا۔
 ”گھوڑے کو چوری ہونے سے بچانے کے لیے
 اسے کھونٹے پر منبھولی سے باندھنے کا حکم ہے۔ اس کے بعد
 اپنے معاملے کو اللہ کے سپرد کرنا چاہیے۔ پاسپورٹ چوبیس
 گھنٹے آپ کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ یہ سیل فون آپ بردت
 کیری کرتے ہیں۔ یہ پاسپورٹ کی بہ نسبت آپ کے لیے
 زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“
 ”آپ ٹھیک کہتے ہیں سر۔“ میں نے تائیدی انداز
 میں گردن ہلائی۔
 اس دوران میں میرے نے چائے پراٹھا سرور کیا۔
 جی ایم سر نے کہا۔ ”کیا بات ہے۔ آپ کا پیٹھ اٹھتے ہوئے
 نظر آ رہے ہیں۔“ کوئی پریشانی ہے کیا؟“
 ”سر! میں اپنی ایک دوست کے لیے بہت مگر مند
 ہوں۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔
 ”کچھ عرصہ پہلے اسے امریکا سے انوا کر کے یہاں پہنچا دیا گیا
 تھا۔ مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ہے۔“
 ”کیا آپ کے مگر مند ہونے سے اس کی خبر چرل
 جائے گی؟“ انہوں نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے
 سوال کیا۔
 ”نہیں سر!“ میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے
 جواب دیا۔ ”میں انسانی فطرت سے مجبور ہو کر اس کے
 بارے میں سوچ رہا ہوں اور پریشان ہو رہا ہوں۔“
 ”تو گویا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے یوں پریشان
 ہونے سے آپ کی دوست کی مشکل آسان ہو جائے گی؟“
 وہ اپنی متناہی آنکھوں کو میری آنکھوں میں گاڑتے
 ہوئے متفکر ہوئے۔
 ”نہیں سر!“ میں نے ایک مرتبہ پھر سرگوشی میں جنبش
 کی۔ ”اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے عملی اقدام کرنا
 گا۔“
 ”تو کریں عملی اقدام.....“ وہ عجب سے لہجے میں بولے۔
 ”بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔“ کیسے سر؟“
 ”اسے شدت سے یاد کریں۔“ انہوں نے سمجھیر
 انداز میں کہا۔ ”اور اس کے ساتھ ہی چائے پرائے پر بھی
 جدویں۔“
 میں ان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے شاد کو یاد
 نے لگا۔ انہوں نے کہا۔
 ”انسانی جذبات کے اندر بے پناہ قوت ہوتی ہے۔
 کم اینڈ کمپس کی قید سے آزاد ہوتے ہیں۔ اگر یہ چاہیں

تو کروڑوں اربوں کلومیٹر کا فاصلہ نیز سینکڑوں میل طے کر سکتے
 ہیں مگر..... آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟“
 ان کے اچانک کیے گئے سوال نے مجھے چونکا دیا،
 میں نے پوچھا۔ ”میں نے کیا کر دیا سر؟“
 ”آپ اپنی گمشدہ دوست کے بارے میں سوچ
 رہے ہیں۔“
 ”آپ نے یہی تو کہا تھا۔“ میں نے الجھن زدہ نظر
 سے ان کی طرف دیکھا۔
 ”میں نے کہا تھا، اپنی دوست کو شدت سے یاد
 کریں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ”اور ”یاد“
 دماغ سے نہیں، دل سے کیا جاتا ہے۔ دماغ کا کام
 سوچنا ہے اور دل کا کام محسوس کرنا ہے۔ دماغ معاملات کو
 الجھاتا ہے اور دل معاملات کو سلجھاتا ہے۔ سو، ڈونٹ
 تھنک..... جسٹ ٹیل!“
 ”ہو گیا سر!“ میں پرجوش انداز میں بولا۔
 انہوں نے پوچھا۔ ”کیا ٹیل آئی ہے؟ آپ نے اپنی
 دوست کے بارے میں کیا محسوس کیا ہے؟“
 ”شاید وہ کی عزت اور جان محفوظ ہیں۔“ میں نے
 جذبات سے غلط آواز میں بتایا۔
 ”بس اتنی سی بات تھی۔“ وہ بے تلے الفاظ میں
 بولے۔ ”آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اس عمل کی
 پریکٹس گاہے بگاہے کرتے رہا کریں۔ رفتہ رفتہ آپ
 مشاق اور تجربہ کار ہوتے جائیں گے۔ آپ کے اندر ایک
 ناویدہ اپنی نیشن انشال ہو چکی ہے۔ جب بھی آپ کسی
 ہنگامی صورت حال میں اس ایپ کو استعمال کریں گے، آپ
 کو موقع ملے گی مناسب سے فوری جواب مل جائے گا۔“
 جی ایم سر کا جواہر بھندائی تعارف مجھ تک پہنچا تھا اس کے
 مطابق، وہ اس ریجنل ٹی وی چینل میں آئی ٹی کے معاملات
 کو دیکھتے تھے لیکن میرے ذاتی تجربے کی روشنی میں نظر آ رہا
 تھا کہ وہ بہت ہی چٹکی ہوئی شخصیت ہیں۔ انہوں نے خود کو
 چھپانے کے لیے چینل کی اس جاب کا لالباہ اوڑھ رکھا تھا۔
 ”شکر یہ سر!“ میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے
 عقیدت بھرے لہجے میں کہا۔ ”آپ نے میری بہت بڑی
 مشکل آسان کر دی ہے۔“
 ”شکر یہ اس مالک کا ادا کریں جس نے چائے پرائے
 کی شکل میں یہ رزق آپ تک پہنچایا ہے۔“ وہ میری طرف
 دیکھے بغیر گہری سنجیدگی سے بولے۔ ”اور آپ مالک کی اس
 نعمت کو لطف ہی نہیں کر رہے!“

میں نے "سوری" کہتے ہوئے چائے کا کپ اٹھایا اور پراسے کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ بہت مہمان ہستی ہیں۔"

"یہ جو میڈم آپ کے ساتھ آئی ہیں، انہیں آپ کے ساتھ وہی کچھ ہو گیا ہے جو آپ کو اپنی کشیدہ دوست کے ساتھ ہو چکا ہے۔" میرے آخری جملے پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولے۔ "اس لیے آپ کبھی اسے آزمانے کی کوشش نہیں کرنا اور نہ قدرت آپ کی کشیدہ دوست کے حوالے سے آپ کو بھی کوئی آزمائش میں ڈال سکتی ہے۔"

"میں آپ کی ہدایت کو یاد رکھوں گا۔" میں نے صدقہ دل سے کہا۔

"اسی میں آپ کی بھلائی ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔ "محبت کرنے والے لوگ بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ یہ کسی کی خاطر جان دینے میں ایک لمحہ نہیں لگاتے۔"

میں اندر سے کانپ کر رہ گیا تاہم زبان سے ایک لفظ نہ کہا۔

وہ بولے۔ "آپ تینوں کسی شائستہ کے تین زاویوں کے مانند ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے ہو، چاہتے اور نہ چاہتے ہوئے بھی آپ لوگ خود کو ایک دوسرے سے زیادہ عرصے کے لیے دور نہیں کر سکتے۔ آپ اپنی کشیدہ دوست کے پیچھے بھاگو گئے اور یہ میڈم آپ کے تعاقب میں رہے گی۔ زندگی کی آخری سانس تک یہ دوڑ دوپ جاری رہے گی۔"

"کیا ہم لوگ کبھی اپنی منزل پر پہنچ بھی پائیں گے؟" میں پوچھتے نہ اندر رہا۔

"زندگی کی آخری منزل موت ہے۔" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولے۔ "اور ہم سب ایک دائرے میں جو سفر اپنی اپنی منزل کی سمت رواں دواں ہیں۔"

میں کچھ گھبرا گیا کہ وہ دانستہ میرے سوال کا جواب دینے سے گریز کر رہے تھے۔ میں نے اس سلسلے میں اصرار مناسب نہ سمجھا اور پوچھا۔

"سرا کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ ڈیلفینیا اسلام آباد میں کیا کرنے آئی تھی اور اب کراچی کا رخ کیوں کر رہی ہے؟"

"آپ کے دوسرے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ وہ آپ کی "محبت" میں کراچی آ رہی ہے۔" وہ معتدل انداز

میں بولے۔ "البتہ، روایٹری اور اسلام آباد اسے ایک خاص مقصد سے بھیجا تھا تا کہ وہ اس جوڑے کا سراغ لگا سکے جو کم و بیش بیس سال پہلے امریکا سے اچانک غائب ہو گیا تھا۔ ان کا ایک بیٹا بھی تھا بالکل آپ کی عمر کا۔"

"ادائی گاڈا!" میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ "تو ڈیلفینیا غریبہ، الغریز اور ان کے بیٹے کی تلاش میں اسلام آباد آئی تھی؟"

"اسے پتا چلا ہے کہ یہ دونوں میاں بیوی اب اس دنیا میں باقی نہیں ہیں۔" جی ایم سر نے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔ "اس نے اپنے ذرائع استعمال کر کے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ یہ جوڑا جب امریکا سے پاکستان پہنچا تو ان کے ساتھ کوئی بچہ نہیں تھا لہذا اب آپ کی اس امریکی مہربان، قدردان ڈیلفینیا کو کافی حد تک یقین ہو گیا ہے کہ انہیں جس باکمال نوجوان کی تلاش ہے وہ آپ کے سوا اور کوئی نہیں۔" "یہ تو خاصی خطرناک صورت حال ہے سر۔" میں نے تشویش بھری نظر سے ان کی طرف دیکھا پھر اپنی جیب سے چنگیز خان والا خط نکال کر ان کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھیں، میں پہلے ہی کن جمیلیوں میں پھنسا ہوا ہوں۔"

انہوں نے بڑی توجہ سے وہ خط پڑھا پھر مجھے داہن کرتے ہوئے بولے۔ "آپ نے جان بوجھ کر خود کو ان جمیلیوں میں پھنسا یا ہے ورنہ سیدھی بات تھی۔ آپ اپنی ماں کی خواہش کے مطابق ان کے حکم کی تعمیل کرتے۔ کسی جھگڑے پھڑے میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں تھی مگر مالک کا لکھا تو پورا ہوتا ہی ہے نا۔۔۔۔۔" لمحاتی توقف کر کے انہوں نے مذکورہ خط کی جانب اشارہ کیا پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

"یہ سب لوگ کیڑوں مکوڑوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ ان میں سے کسی کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی خود آگے بڑھے کہ آپ کا راستہ روکنے کی کوشش کرے تو اسے اپنے پاؤں کے نیچے چل ڈالیں۔ آپ کو دور حقیقت چیل، کووں اور نگہوں کی جانب سے محاذ رہنا چاہیے۔ یہ لوگ بولی نوچنے میں ذرا دیر نہیں لگاتے۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا۔۔۔۔۔؟"

ان کا اشارہ ڈیلفینیا، ایمل ہام اور آئزک جیسے افراد کی طرف تھا۔ جن کے لیے انہوں نے "جیل" کوئے اور "گدھ" کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "جی سرا! میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔"

"آپ کا واسطہ اس وقت دنیا کے طاقتور ترین افراد

سے ہے۔" وہ اپنی ہاتھوں کی پشت کو گھورتے ہوئے دیکھنے انداز میں بولے۔ "اسکل اینڈ یوز بڑی فعال سیکرٹ سوسائٹی ہے۔ ان سے بھی آگے کی چیز "ایلیوینیٹی" سیکرٹ سوسائٹی ہے۔"

"سرا آپ ان لوگوں کے بارے میں بڑی وسیع معلومات رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ کو یہ خوف نہیں کہ آپ کی جان کو کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے؟"

"نہیں۔۔۔۔۔!" وہ قہقہے لہجے میں بولے۔ "اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے آپ کو جو کچھ بتایا یہ کوئی خیرہ راز نہیں ہیں۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ سیکرٹ سوسائٹی سے متعلق ایسی باتیں بہت کم لوگوں کے علم میں ہیں۔ ویسے سیکرٹ سوسائٹی والے عموماً اپنے رازوں کو چھپاتے نہیں ہیں لیکن کسی غیر متعلق (نان ممبر) شخص کو یہ اپنی خفیہ پریکٹس کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے۔"

"جی سرا یہ تو میں بھی جانتا ہوں اسی لیے ڈیلفینیا نے مجھے اپنی سیکرٹ سوسائٹی کا ممبر بنانے کے لیے پورا زور لگا دیا تھا۔" میں نے کہا۔

"لگا دیا تھا نہیں۔۔۔۔۔" وہ جمع کرنے والے انداز میں بولے۔ "بلکہ وہ اس وقت بھی اسی مشن پر کمر بستہ ہے۔"

"مجھے اندازہ ہے سر۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتی پھر کہا۔ "سرا آپ سے ایک سوال پوچھوں؟"

"ضرور پوچھیں جناب۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "ہم اسی مقصد سے یہاں بیٹھے ہیں۔"

"قلعے کی پریفورم ایسا ایمل ہام نے مجھے بتایا تھا کہ یہودی پوری دنیا پر حکمرانی کے لیے ایک خصوصی جنگ کا آغاز کرنے والے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس حوالے سے ان کی مقدس کتاب تلمود میں بڑے واضح طور پر لکھا ہے کہ جب مسلسل چار مکمل چاند گرہن یہودیوں کے مذہبی تہوار والے مہینوں میں لگیں گے تو وہ پوری دنیا کا کنٹرول حاصل کرنے کے لیے میدان جنگ میں کود پڑیں گے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

"آپ ایک بات ذہن میں رکھیں کہ "تلمود" یہودیوں کی ایسی ہی کتاب ہے جیسے ہمارے ہاں احادیث کی کتب ہیں۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولے۔

یہودی اکابرین نے تلمود میں بھی ترمیم و اضافہ فرما رکھا ہے۔ ہمیشہ کے لیے سازشی دنیا پر حکمرانی کا خواب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔"

"سرا آپ یہ بات اسنے دھوکے سے کیسے کہہ رہے ہیں؟" میں نے الجھن زدہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔

وقت

"اس وقت بھی تو ساری دنیا کو دہی چلا رہے ہیں۔ آگے چل کر یہ اور زیادہ مضبوط ہو سکتے ہیں۔"

"جتنی مضبوط ہوتا تھا، ہوئے۔" وہ غیر متزلزل لہجے میں بولے۔ "اب ان کا خطا شروع ہونے والا ہے۔ یہ

اپنی حکمرانی کا عرصہ گزار چکے۔ قدرت کسی قوم کے ساتھ نا انصافی نہیں کرتی۔ کسی زمانے میں عیسائیوں کی پوری دنیا پر حکمرانی تھی۔ پھر یہی امتزاز مسلمانوں کو کافی عرصے تک حاصل رہا۔ آج کل یہودیوں کی باری چل رہی ہے۔ اگلا نمبر چینی قوم کا ہے۔"

"اوہ۔۔۔۔۔!" میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"تو آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ آئندہ کی ہر پاور چین ہوگا؟"

"بالکل!" وہ چٹائی لہجے میں بولے۔ "میں ایسا ہی سمجھتا ہوں اسی لیے میں مغرب چین جارہا ہوں۔"

"صرف گھومنے پھرنے یا۔۔۔۔۔"

"میں وہاں پر مستقل رہائش کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھے۔ "میں کیا سوچ رہا ہوں، تو یہ میرے آقا کا فرمان ہے اور اب مرشد کا حکم بھی ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں سر۔" میں نے الجھن زدہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔

"صدیوں پہلے میرے آقا ﷺ نے فرمایا تھا، علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے جہنم جانا پڑے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ "اس فرمان کے دو اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ چین عرب سے ایک

دور دراز ملک تھا۔ دوسرے یہ کہ چین اس زمانے میں علم و دانش کا گہوارہ ہوا کرتا تھا اور بلاشبہ آج بھی ہے۔ میں بھی اپنی جہالت کو تپاؤں اور علم کی پیاس بجھانے چاہتا ہوں۔"

"آپ نے اس کائنات کی عظیم ترین ہستی کے جس فرمان کا ذکر کیا، میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

میں نے عقیدت بھرے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "آپ نے کسی مرشد کے حکم کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے سر۔۔۔۔۔ کیا آپ صاحب سلسلہ ہیں؟"

"چند سال پہلے کسی شخص کے توسط سے میں شمالی علاقہ جات میں اس سے ملا تھا۔" انہوں نے گہری تنہید کی سے بتایا۔ "اس ملاقات میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ساڑھے چودہ سو سال پہلے مسجد نبوی کے صحن میں آقا ﷺ کی محفل میں بیٹھا ہوں۔ بس میں اسی لیے بارگیا۔ اپنا سب کچھ میں نے ان کی خدمت میں پیش کر دیا بلکہ میں نے اپنا آپ ان

وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے اس سے پوچھا۔
”کیا تم کھانا کھا کر گھر سے نکلی تھیں؟“
”جہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

”فرق کیوں نہیں پڑتا۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔
”تم میری دوست ہو۔ اگر تم گھر سے کھانا کھائے بغیر نکلی ہو تو یقیناً تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔“
”میرا اتنا زیادہ خیال کرنے کا بہت شکر ہے۔“ وہ رکھائی سے بولی۔

میں نے گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے اس کا غصہ کم کرنے کے لیے چھوڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رکھا۔

”اس میں شکر ہے ادا کرنے والی کون سی بات ہے۔ مجھے خود بھی شدید قسم کی بھوک محسوس ہو رہی ہے۔ اگر کہیں کھانے پینے کے پوائنٹ پر چلو تو زوری پینٹ پوجا ہی کر لیتے ہیں۔“
”تمہیں بھوک لگ رہی ہے تو کھالو۔“ وہ بہ دستور روٹھے ہوئے انداز میں بولی۔ ”میں نہیں کھاؤں گی۔“

”مطلب یہ کہ تمہارا غصہ تمہارے کھانے کا کوئی ارادہ نہیں۔“
میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”اور یہ تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟ یہ وہ راستہ تو نہیں جس سے ہم آئے تھے۔ کہیں مجھے پھانسی کا پروگرام تو نہیں؟“

”تمہاری طرحیں تو ایسی ہی ہیں کہ جس پر بہت زور کی پٹائی ہوتا چاہیے۔“ وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولی۔ ”میں نے برج سے دوسرا راستہ لے لیا ہے اور اب میرا ہی ویکی طرف جانے کا ارادہ ہے۔“

میں نے وہابی کے راستے کی وضاحت پر غور نہیں کیا اور شرارت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”میں نے تجھ کو ایک کھٹے میں تمہارے ساتھ ایسی کون سی حرکت کی ہے جس پر تم اتنی برہمی دکھا رہی ہو۔ میں نے تمہیں چھوٹا کیا نہیں؟“
”اب میں بھی تمہیں چھوٹے بھی نہیں دوں گی۔“ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

”کیوں؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”میں نے ایسا کیا قصور کر دیا ہے جو تم اتنی ظالم بن گئی ہو؟“

”تمہارے پاس چھوٹے والیوں کی کیا کمی ہے۔“ وہ طنز سے لہجے میں بولی۔ ”تین تین تو آپیشیشن ہی ہیں۔“
”تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”جبکہ میں سمجھ رہا ہوں کہ تمہاری ناراضی کی وجہ کچھ

از میں بولے۔
”لیکن..... انہوں نے..... یہ لاک کیسے لیا.....؟“ میں نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔
”تو آپ کے مرشد سے بھی ملا بھی نہیں!۔“

”آپ کو ایسے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے مرشد پاس جانے کی ضرورت نہیں۔“ وہ نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں بولے۔ ”مرشد ہر جگہ موجود ہیں اور انہیں ہر شے کی خبر ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ اس جگہ دوبارہ میرے پاس نہ آتے اور میں آپ کے استقبال کے لیے چھینک کے باہر نہ رہا ہوتا۔ میرا مرشد اللہ والا ہے اور..... اللہ والے کی نیت آپ کو ایسی طرح معلوم ہے۔“

”آپ نے مجھے حیران کر دیا ہے سر.....! میں کبھی بولی آواز میں بولا۔

”آپ کو اس وقت حیران نہیں بلکہ فکر مند ہونا ہے۔“ وہ مختصر انداز میں بولے۔
”کیوں سر.....؟“

”میڈم آپ کی کچائی کرنے کے لیے یہاں آ رہی ہیں۔“
”مکون میڈم.....؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔
”وہی لائیڈ جس کے ساتھ آپ میرے پاس آئے۔“ انہوں نے بتایا۔ ”مزید انتظار ان کی برداشت سے ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ادھر ہی آ رہی ہیں..... ہماری کراؤت آن پہنچا ہے اسٹیبل صاحب!“

ادھر ان کی بات ختم ہوئی اور پھر ہوش کے سامنے چٹائی کی سرخ کٹس نظر آئی۔ گاڑی کی کتبی نشست پر تقریر نو جوان بیٹھا تھا۔ جی ایم سراٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں بھی ان کی تقلید میں چوٹی تخت چھوڑ دیا۔

تقریر گاڑی سے نکل کر ہماری جانب بڑھنے لگا تو جی ایم نے مجھے سینے سے لگا لیا اور بہت زور سے بھیچا۔ چند منٹ میں یہ چرچوش معاندہ اختتام پذیر ہو گیا۔ انہوں نے الفاظ کے ساتھ مجھے رخصت کر دیا۔
”اللہ آپ کا حاجی و نامہ!“

☆☆☆

چٹا کا موڈ آف تھا۔ وہابی کے سفر میں وہ سنجیدہ اور چپ کھلی۔ میں اس کی ناراضی کا سبب جانتا تھا۔ اس کا خفا جائز تھا۔ میں اسے جھٹل پر بٹھا کر کچھ بتائے بغیر وہاں سے ہو گیا تھا۔ جی ایم سر کے ساتھ ہونے والی اس اہم گفتگو میں اس قدر غور ہو گیا تھا کہ وقت گزرنے کا بالکل احساس نہ ہوا تھا۔ ہم گگ بگگ سواگیا رہے وہاں پہنچے تھے اور اس

اسے ہلکان کر کے رکھ دیتا ہے لیکن جب کبھی جی کی مشکل میں پڑ جائے تو ایک قلم دوست کی طرح نام اس کی مدد بھی کرتا ہے۔ یہی معاملہ سیکرٹ سوسائٹی والوں کا بھی ہے۔ یہ اپنے شکار کے ساتھ ”نام اینڈ جری“ والا کھیل کھیلتے ہیں۔ اسے دوڑاتے ہیں، بھاگاتے ہیں اور ہلکان کرتے ہیں اور جب وہ ہانپ کر زمیں بوس ہو جاتا ہے تو پھر اس کی جانب دوڑتی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ جب یہ کسی کو اپنا دوست بناتے ہیں تو پھر وفاداری کا تقاضا بھی کرتے ہیں۔ ان کے ہاں بے وفائی اور غداری کا ایک ہی مطلب ہے..... موت! ایک ایسی موت جس کے معنی کو کوئی حل نہیں کر سکتا۔ باقی جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو..... انہوں نے ڈرائیور کو رک کر بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔

”جب آپ کے پاس کوئی آپشن باقی نہ رہے تو ان کے پیچھے گھس جائے گا۔ ذرا پتا تو چلے کہ بغیر کھڑکیوں اور دروازوں والی پراسرار عمارتوں کے اندر کون سا طلسماتی کھیل کھلا جاتا ہے.....!“

”آپ کا مطلب ہے..... ایسی صورت میں مجھے سیکرٹ سوسائٹی جوائن کر لینا چاہیے؟“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

”جی!“ انہوں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔
”اور وہ..... روح کو گردی رکھوانے کا معاملہ.....!“
میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”ان کی رکنیت کی بنیادی شرط یہی ہے اور میں کسی بھی قیمت پر یہ انورڈ نہیں کر سکتا۔“

”ہم اس وقت انتہائی صورت حال..... یعنی“ نہ پائے رفتن، نہ جانے ماندن“ کی بات کر رہے ہیں۔“ وہ سمجھانے والے انداز میں بولے۔ ”اول تو مجھے امید ہے، ایسی نویت آنے کی ہی نہیں، یہ صورت دیگر اگر آپ کو سوسائٹی جوائن کرنے کا فیصلہ کرنا ہی پڑتا ہے تو پریشان نہ ہوں۔ آپ اندر سے جو کچھ بھی ہیں اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ اگر باہر سے آپ بھی بدل جائیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مرشد نے آپ کی روح پر ایک ایسا لاک لگا دیا ہے کہ وہ مالک کائنات کے سوا کسی کے تصرف میں جاسی نہیں سکتی۔“

”مرشد نے میری روح پر لاک لگا دیا ہے.....“
شدت حیرت سے میری آواز کافی بلند ہو گئی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟“

”میں وہی کہہ رہا ہوں جو حقیقت ہے۔“ وہ معتدل

کے سپرد کر دیا۔ اب میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ یہ جو کچھ آپ کو نظر آ رہا ہے، میرے مرشد کا دیا ہوا ہے۔ مرشد نے مجھے صرف دو باتوں کی تلقین کی تھی۔ اول، بلاغترقی سلسلہ درنگ اور مذہب و ملت آپ نے ہر انسان کا احترام کرتا ہے اور جی الامکان اس کی مدد بھی کرتا ہے۔ دوم، مرشد کی بات پر اپنے ذہن کو سونپنے کی زحمت نہیں دینا۔ دل و جان سے ایمان لا کر من و عنان اس پر عمل کرتا ہے.....“ لکھائی تو قف کر کے انہوں نے ایک ہموار سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولے۔

”مرشد کا حکم کھائی دی جیتل جوائن کرلو۔ میں نے ایک لمحہ سوچے بغیر اس ریجنل جیتل پر ملازمت کر لی۔ اب مرشد کا حکم ہے جیٹن جاگیا..... اس حکم کی بھی تعمیل لازم ہے۔“
”اب سمجھ میں آگئی بات۔“ میں نے ستانی نظر سے جی ایم سر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کہ آپ کی پہلائی کس گرو اسٹیشن سے ہے۔“

”جو شخص کسی گرو اسٹیشن سے منسلک ہوتا ہے اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں رہتی۔“ وہ آسمان کی جانب نگاہ اٹھاتے ہوئے بولے۔ ”آج پورا چاند ہے۔ دیکھیں کیسا چمک رہا ہے۔“

آج تیرہواں روزہ تھا۔ اس حساب سے غروب آفتاب کے ساتھ ہی چاند کی چودہ تاریخ شروع ہوئی تھی۔ کھلے آسمان پر چودھویں کا چاند بڑا دل کش دلکش دکھائی دے رہا تھا۔ چاند کو چھوڑا اور اس بات پر غور کر دیکر سیکرٹ سوسائٹی والے کے کام نہیں کرتے۔ آپ بھی ڈیٹینا اور اس کی سوسائٹی کو ہلکانا نہیں.....“

”سر! آپ مجھے ڈرا رہے ہیں؟“ میں نے ابھین زدہ انداز میں پوچھا۔

”نہیں!“ وہ قلمی لہجے میں بولے۔ ”میں آپ کو سمجھا رہا ہوں تاکہ آپ سے کسی بھی قدم پر کوئی قلمبندی نہ ہو۔“

”سر! اگر میرے پاس کوئی آپشن باقی نہ رہے۔ میں ان لوگوں کے سامنے مجبور ہو جاؤں تو ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔
”آپ نے نام اینڈ جری کارٹون تو دیکھا ہوگا؟“

”جی، میں یہ کارٹون بہت شوق سے دیکھتا ہوں۔“

میں نے کہا۔
”اگر آپ شوق سے دیکھتے ہیں تو ایک بات آپ نے خاص طور پر نوٹ کی ہوگی۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”اگرچہ نام ہر وقت جی کی پیچھے پڑا رہتا ہے اور

اور ہے۔ اگر تینوں کا کوئی ایسا ہوتا تو تم جیل پر پہنچنے سے پہلے مجھ سے خفا ہوئیں۔ جو کچھ بھی ہوا ہے اسی گھٹے سوا گھٹے میں ہوا ہے۔

”بدتمیزی کی بھی حد ہوتی ہے۔“ وہ پھٹ پڑی۔

”مجھے وہاں بھڑا کر تم پتیاں کیاں غائب ہو گئے۔ میں بھوک پیاسی بیچی تمہارا انتظار کر رہی تھی اور بد معاشی دیکھو کہ تم نے اپنا فون بھی آف کر رکھا تھا۔“

”تم تو جانتی ہو، میں انتہائی بدتمیز اور بد معاش قسم کا انسان ہوں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”جہاں تک سبل فون آف کرنے کی بات ہے تو وہ میں نے سر کے کہنے پر کیا تھا۔ باقی تمہیں میری وجہ سے جو کوفت اٹھانا پڑی اس کے لیے میں بے حد معذرت خواہ ہوں۔“

”جاؤ، تم جی کیا یاد کرو گے۔“ وہ فراخ دلی سے بولی۔

”میں نے اس شرط پر تمہیں معاف کیا کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہونا چاہیے۔“

”تمیں ہوگی میڈم۔“ میں نے زبیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”میڈم؟“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے گھورا۔

”یہ ناکل تمہیں جی ایم سر نے دیا ہے۔“ میں نے جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر مجھے انداز میں دریافت کیا۔ ”یہ جی ایم سر کوں صاحب ہیں جو انہیں اتنی زیادہ اہمیت دے رہے ہو اور ان کے کہنے پر اپنا فون بھی آف کر دیتے ہو؟“

”جی ایم سر بہت عظیم شخصیت ہیں۔“ میں نے احترام بھرے لہجے میں چٹا کو بتایا۔ ”میری نظر میں ان کا درجہ، ایک روحانی راہنما کا ہے۔ وہ اس قابل ہیں کہ ان کی خواہش کی تعمیل کی جائے۔ میں دل و جان سے انہیں اپنا کرو مان چکا ہوں۔“

پھر میں نے اسے جی ایم سر کی جینل والی جاب کے بارے میں بھی تفصیل سے آگاہ کیا تاہم یہ نہیں بتایا کہ سر نے مجھے اس کا خیال رکھنے کی تاکید کی ہے۔ سر کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ چنا میری جاہت میں گرفتار ہو چکی ہے۔ اگر میں سر کی باتیں اس کے ظلم میں لے آتا تو اس کا دماغ خراب ہو جاتا۔ وہ سر کی تلقین کو میری کمزوری سمجھ کر سید زوری پر اتر آئی۔ وہ میرے ساتھ قربت کی جتنی منازل طے کر چکی تھی، اس کی بنا پر وہ مجھ پر حاوی ہونے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ اگر اسے یہ پتا چل جاتا کہ میں اپنے سر کی

ہدایت پر اس کا خیال رکھنے کا پابند ہوں تو پھر پتا نہیں، میرا کیا حشر کرتی۔ میں اس وقت جن حالات سے گزر رہا تھا، اس میں ڈسے داریوں کے بوجھ میں اضافہ کرنا دانش مندی نہیں تھی۔

”بتاے، وہاں کیا ہوا؟“ وہ خامے جوٹیلے انداز میں بولی۔

”کہاں؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”ارے، میں اس ریجنل جینل کی بات کر رہی ہوں۔“ اس نے بڑے خوشگوار انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے وہاں ایک ایسے شخص کو دیکھا جو مجھے دینی میں بھی ایک دو بار نظر آیا تھا۔ شاید وہ کوئی انکر، وینگر ہے۔“

چٹا کے لہجے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا موڈ بحال ہو گیا تھا اب وہ اپنے مخصوص فطری انداز میں بات کر رہی تھی۔ ”معذرت“ نے خاصا موثر کام دکھایا تھا۔

میں نے کہا۔ ”تو اس میں ایسی پریشانی والی کون سی بات ہے۔ شوہر سے متعلق افراد کا تو دینی میں آنا جانا لگایا رہتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو میری پریشانی کا سبب یہ تھا کہ وہ انکر کہیں مجھے پہچان نہ لے اور میرے نامی کے حوالے سے کوئی ہلکی بات نہ کر دے۔“

”میری بات کو توجہ سے سنو چٹا۔“ میں نے گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”جس زادیہ سے تم ڈر رہی تھیں، اگر وہ انکر تمہیں پہچان بھی لیتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی چپ حرکت نہ کرتا۔ اور پھر جب تم نے ان سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لی ہے تو مجھے یقین ہے مالک اب تمہیں کسی انسان کے سامنے شرمندہ نہیں ہونے دیے گا۔ اس خوف کو دل و دماغ سے نکال دو کہ اس حوالے سے بھی تمہیں نعمت اٹھانا پڑے گی اور آخری بات یہ کہ“

..... میں نے ذرا دیر کو رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تم اپنے شرمناک نامی کو دفن کر کے آگے بڑھ چکی ہو۔ تمہارے پاس اب خوش حال، حال اور روشن مستقبل ہے۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ کبھی اپنے نامی کا مجھ سے ذکر نہیں کرو گی اور نہ ہی کسی اس بارے میں سوچ کر خود کو کونٹن ملین کرو گی۔“

”میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری بات پر عمل کروں گی۔“ وہ بھراؤنی ہوئی آواز میں بولی پھر اس نے اپنا ہاتھ ہاتھ میرے دائیں ہاتھ پر رکھ دیا اور چڑھتی لہجے میں کہا۔

”تم بھی مجھ سے وعدہ کرو کہ اس سنبھلے میں تم میرا ساتھ

وقت

تھی یا دانستہ وہ ایسا کرنا نہیں چاہتی تھی جیسا کہ اپنی اندرونی کیفیت کو ”دوستی، لطف اور اپنائیت“ ایسے لہاڑے اڑھا کر میرے سامنے پیش کر رہی تھی۔

”اگر تم مجھ پر اعتماد کر لی ہو تو یقین کر لو کہ میں ہر ممکنہ انداز میں تمہاری بھرپور مدد کروں گا۔“ میں نے صدیقی دل سے کہا۔ ”بتاؤ، تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“

”میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“ اس نے میری توقع کے عین مطابق جواب دیا۔ ”میں تم سے دور ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“

میں نے کہا۔ ”تم میرے ساتھ ہی تو ہو.....!“

”میں نے جدہ میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ تم نے مجھے یہی بتایا تھا کہ تم جدہ میں ہوتے ہو۔“ وہ میری سنی، ان کی سنی کرتے ہوئے خواب ناک لہجے میں بولی۔ ”لیکن پھر تمہاری حقیقت مکمل کر میرے سامنے آگئی اور اب تم مجھے جرمی میں سبیل ہونے کا مشورہ دے رہے ہو جو مجھے کسی بھی طور قبول نہیں ہے۔“

”پھر میں تمہارے لیے کیا کروں؟“ میں نے پوچھا۔

”اگر تمہیں وہاں امریکا جانا ہے تو میرے لیے وہاں پہنچنے کا بندوبست کرو۔“ وہ غصوں لہجے میں بولی۔ ”اگر تم ایسا نہیں کر دے تو میں اپنی مدد آپ کے تحت کوشش کروں گی اور تمہارے پاس پہنچ کر دکھاؤں گی۔ میں تم سے زیادہ ضدی اور پلٹ ہوں۔“

”مجھے مت بتاؤ کہ تم کتنی ضدی اور پلٹ ہو۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بات مجھ سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں امریکا ضرور بلاؤں گا لیکن فوری طور پر یہ ممکن نہیں۔“

”کیوں ممکن نہیں؟“ وہ تیز لہجے میں مستفسر ہوئی۔

”تمہیں پتا ہے کہ ماں نے میرے ریفرنس سے امریکا کے وزٹ ویزا کے لیے اپلائی کیا تھا اور ان کا کام بھی ہو گیا تھا۔ یہ ساری تفصیل میں تمہیں بتا چکا ہوں۔“ میں نے اس کے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”لیکن مالک کو ماں کا امریکا جانا منظور نہیں تھا اس لیے مالک نے ماں کو اپنے پاس بلا لیا۔ اس واقعے کی اطلاع امریکن امبیسی کو بھی ہے۔ اگر میں فوری طور پر دوبارہ اپنا ریفرنس استعمال کروں گا تو وہ ریویو بھی کر سکتے ہیں۔ میں ان کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ تم تھوڑا انتظار کرو تو مناسب رہے گا۔“

”مثلاً کتنا انتظار؟“ اس نے پوچھا۔ ”تم تو دو چار دن میں یہاں سے نکل جاؤ گے۔“

سپینس ڈائجسٹ 2018

”میرا پروگرام تو یہی ہے کہ میں اگلے ہفتے میں کسی بھی دن امریکا روانہ ہو جاؤں۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں نہیں جانتا کہ ایسا ہو سکے گا یا نہیں۔ کل کیا ہوا ہے، یہ صرف مالک کے علم میں ہے یا پھر مالک اپنے کسی خاص بندے کو علم دے دے۔“

”ٹھیک ہے علی اتم جیسے کہو گے، میں ویسا ہی کروں گی۔“ اس نے کہا۔ ”میں ساری زندگی بھی تمہارا انتظار کر سکتی ہوں۔“

”میں ہر کام کے لیے کوشش ضرور کرنا چاہے لیکن یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ سب کچھ ہمارے ہاتھ میں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں محض معاملات کو مالک پر بھی چھوڑ دینا چاہیے۔“

”بے شک!“ وہ پورے یقین سے بولی۔ ”اور مالک جو بھی کرتا ہے اس میں بندے کی بہتری ہی ہوتی ہے۔“

”اب کی باتم نے پتے کی بات۔“ میں نے کہا۔

”میں تو ہمیشہ پتے ہی کی بات کرتی ہوں۔“ وہ اتر آئی۔ ”لیکن معلوم نہیں، تمہارا دھیان کہاں ہوتا ہے۔“ پھر بڑے ذم سے بولی۔

”جب تم میرے ساتھ ہوتے ہو تو صرف میرے بارے میں بات کیا کرو۔“

”اور جب تمہارے ساتھ نہیں ہوتا تب تو اجازت ہے نا۔۔۔۔۔“

”یو معاشی شروع۔۔۔۔۔“ اس نے مجھے گھورا۔

”جب تم موقع فراہم کرو گی تو میں کیوں چوکوں گا۔“ میں نے چوٹ کی۔

اس نے مجھے گھورا پھر اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی جلدی سے اس نے کہا۔ ”علی! کیا ہمارے پاس کرنے کے لیے اپنی باتیں کم ہیں جو ہم دوسروں کو ڈسٹنس کرتے پھریں۔ قدرت نے ہمیں جو موقع دیا ہے اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔“

”ہم سی دیو پہنچ گئے، مجھے ذرا بھی بھوک نہیں تھی لیکن پتا چو کہ میری وجہ سے بھوک بیٹھی رہی تھی اس لیے میں نے بھی ظاہر کیا تھا کہ اس کی طرح مجھے بھی شدید بھوک محسوس ہو رہی ہے۔ ہم نے ریسٹورنٹ سے چند نوڈ آؤٹ لے لیے اور اس کے پچھاڑے لگی ہوئی بیٹھوں کی طرف آ گئے۔ یہاں سے سمندر بہت قریب تھا۔ ہم نے ایک بیچ پر نشست جمائی اور پیٹ پوجا میں مصروف ہو گئے۔

وہ چودھویں کے چاند کی رات تھی۔ نصف شب کے وقت پورا چاند ہمارے سر پر تھا۔ ٹھنڈی چاندنی چاروں

طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سمندر کے کنارے یہ نظارہ کچھ زیادہ ہی دل کش اور رومان پرورد محسوس ہوتا تھا۔ مرطوب سالیاں ہوائیں چاندنی رات کی خراگیزی میں کئی گنا اضافہ کر رہی تھیں۔ اس سنگ اپارٹمنٹ میں اس وقت ریش نہیں تھا لہذا ہمیں مکمل تنہائی محسوس ہوئی۔ ہم پیٹ پوجا کے ساتھ ساتھ بات بات بھی کر رہے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”یہاں تمہارا کب تک اس گھر میں رہنے کا ارادہ ہے؟“

”وہاں اب ایک ہفتہ بھی رکنے کو میرا دل نہیں چاہتا۔“ اس نے کہا۔ ”میں چند دن کی مجبوری ہے۔“

”کیسی مجبوری؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے اپنا جائیداد ڈال دالا اپارٹمنٹ سٹیل کر کے۔“

”کافیلہ کر لیا تھا اور اس سلسلے میں، میں نے اپنی دوست بتا بھی دیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس نے کہا ہے کہ ہفتہ دس دن میں وہ اپنا کوئی اور بندوبست کر کے اپارٹمنٹ خالی کر دے گی۔“

میں بیٹا کے چائنا ڈائن والے اس اپارٹمنٹ پر آیا۔ مرتبہ چاکا تھا اور وہاں اس کے ساتھ کچھ وقت بھی گزارا تھا۔ میں نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے، جب تک وہ اپارٹمنٹ خالی نہیں ہو جائے گا ادھر ہی ہوگی جہاں اس وقت رہ رہی ہو؟“

”دوسرا آپشن تمہارا گھر ہے۔“ وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولی۔ ”جب تک تم کراچی میں ہو، تمہارے پاس شفٹ ہو جاتی ہوں، اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو۔۔۔۔۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن“

”بلکہ تمہارے لیے محفوظ نہیں ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ وہ انجمن زدہ نظر سے مجھ دیکھتے ہوئے بولی۔ ”جو گھر تمہارے لیے محفوظ ہے، میرے لیے کیوں نہیں؟“

”تمہیں یقین نہیں آئے گا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ میرے لیے بھی قطعی غیر محفوظ ہے۔“

”مجھے واقعی یقین نہیں آیا۔“ وہ حیرت سے آکھبرا پھیلاتے ہوئے بولی۔ ”تم یقین دلانے کی کوشش کرو۔“

”اس کا سبب ہماری دشمنی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اے دشمنی جس کی نذر میرا آپ ہوا اور اسی دشمنی نے میری ماں کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ یہ ایک طویل، دکھ بھری کہانی ہے۔“

”مجھے تھوڑا بہت اندازہ تو ہے لیکن میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔“ وہ ہمدردی بھرے انداز میں بولی۔

”کیا تم مجھے یہ اسٹوری سنانا پسند کرو گے؟“

”یہاں اب میرے اتنے قریب آئی تھی کہ یہ معاملات اس کے ساتھ شیئر کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا پھر جی ایم سر نے بھی مجھے اس کی سنجیدگی، خلوص اور وفاداری کا یقین دلایا تھا۔ اس کے بعد بیٹا میرے لیے میسٹر ہو گئی تھی۔

”میں نہیں اپنی دشمنی کی داستان تفصیل سے سناؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”مگر یہاں بیٹہ نہیں۔ کھانا ختم کر دو، مگر پتے ہیں پھر اطمینان سے بات ہوگی۔“

”اوکے۔“ یہ ٹھیک ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ”تمہارے رات کو دیر تک گھر سے باہر رہنے پر کسی کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟“

”ہرگز نہیں!“ وہ قطعی انداز میں بولی۔ ”میں جس کے لیے کام کرتی تھی وہ ہستی اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں اور میں نے اس تاریک راہ کو ترک کر کے روشنی کا سفر شروع کر دیا ہے۔ اب میں اپنی زندگی کے ہر معاملے کے لیے مکمل طور پر آزاد ہوں۔ میں جہاں بھی رہوں، کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ویسے اس بیٹلے کا چارج آئی ٹی ٹی نے سنبھال لیا ہے اور میں اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکی ہوں۔“

”پھر تو ٹھیک ہے۔“ میں نے اطمینان سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم جی جی میرے پاس شفٹ ہو جاؤ۔ جو گاہ دیکھا جائے گا۔“

”تم میری وجہ سے پریشان نہیں ہونا۔“ وہ منہ پرے لے لیتے ہیں بولی۔ ”مجھے اپنی زندگی کی پروا نہیں۔ موت ایک سفاک حقیقت ہے۔ سات پروں میں چھپ کر بیٹھو، نور، یہ اپنا راستہ بنا لیتی ہے پھر اس سے کیا ڈرنا۔ اگر تمہارا مجھے میرے رہے تو میں اس سفاک حقیقت کی آنکھوں سے آنکھیں ڈال کر اس کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ میں اب اس میں تمہارے ساتھ ہوں۔ آگ اور خون کا یہ کھیل ہم دونوں مل کر کھیلیں گے۔“

ان لمحات میں وہ ایک بدلی ہوئی بیٹا دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے اس کے چہرے میں ایک شیریں کی بہادری آئی۔ اس کے تہہ در تہہ کر میرے دل کو خاصا اطمینان ملا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ اس کا میرے ساتھ رہنا زیادہ ضروری تھا بجائے اس کے کہ میں وہ دور بھاگتا یا اسے خود سے دور کرنے کی کوشش کرتا۔

دانشوروں نے کیا

☆ ہر آدمی سے خوش اخلاقی سے پیش آؤ لیکن بے شکافی بہت کم لوگوں کے ساتھ رکھو اور ان بہت کم لوگوں پر اعتماد کرنے سے پہلے انہیں اچھی طرح آزمائو۔

☆ جس نے ایک بار اعتماد شکنی کی ہو، اس پر کبھی بھروسہ نہ کریں۔

☆ اعتماد کا پودا، آہستہ آہستہ نشوونما پاتا ہے۔

☆ جو شخص اپنے خلوص کی قسمیں کھائے، اس پر اعتماد نہ کریں۔

☆ اپنے آپ پر اعتماد رکھنے والے ہی فتح حاصل کرتے ہیں۔

☆ عورتیں مردوں پر بالکل اعتبار نہیں کرتیں لیکن کسی خاص مرد کے معاملے میں اپنے اس اصول کو بھول جاتی ہیں۔

مرسلہ: راحیل نواب..... ملتان

سادگی

ایک سردار بیوی خریدنے گیا۔ دکاندار نے ایک بیوی دکھایا۔

”مرا، یہ لے لیں اس کا ریموٹ گلی کے کونے سے ہی چیل بکڑ لیتا ہے۔“ کچھ دنوں بعد سردار بیوی واپس کرنے آ گیا۔

دکاندار نے کہا۔ ”مرا، کیا خرابی ہے؟“

سردار نے کہا۔ ”خرابی تو کوئی نہیں ہے بس اندر بار بار گلی کی کڑ پر جائے تو اچھا نہیں لگتا۔“

☆☆☆☆☆☆

لاعلاج

ڈاکٹر۔ ”آپ کے شوہر ٹھیک ہو سکتے ہیں اگر آپ ان کا خیال رکھیں، ٹینشن نہ دیں، ہڑائی نہ کریں اور ان کی دیکھ بھال کریں۔“

شوہر۔ ”ڈاکٹر نے کیا کہا؟“

بیوی۔ ”لاعلاج ہوئے۔“

☆☆☆☆☆☆

میں ایک حتیٰ فیصلے پر پہنچنے کے بعد ریٹورنٹ سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

جب ہم گھر پہنچے تو وہاں میرے لیے کافی پریشانی پائی جاتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی جمید نے فوراً گیت کھول دیا۔ ہم گاڑی سے نیچے اترے تو جمید نے فکرمندی سے پوچھا۔
”سرا! آپ کہاں چلے گئے تھے۔ سب خبریت تو ہے نا؟“

”میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔
”مگر تمہارے حواس کیوں اڑے ہوئے ہیں؟ کیا کوئی پریشانی دالی بات ہے؟“

”ہم سب آپ کے لیے فکرمند تھے۔“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”اور آپ کا قانون بھی آف آ رہا تھا۔ مگر، آپ خبریت سے سلامت لوٹ آئے ہیں۔“
”میرے فون کا چارج ختم ہو گیا تھا اس لیے وہ آف ہو گیا۔“ میں نے ایک فوری بہانہ کیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”میرے لیے کون سب پریشان تھے؟“
”میں، بنگالی باپو اور شاہ جی۔“ اس نے بتایا۔

”تمہاری اور بنگالی باپو کی پریشانی تو سمجھ میں آتی ہے۔“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ”لیکن شاہ جی کو کیا فکرا لاحق ہوئی تھی میری؟“

”پتا نہیں سر.....“ وہ سادگی سے بولا۔ ”شاہ جی یہاں آئے تھے اور آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ بتا رہے تھے کہ انہوں نے آپ کی کوئی فون کیے مگر آپ کا فون بند آ رہا تھا۔ وہ آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہ رہے تھے۔ جب آپ سے فون پر رابطہ نہیں ہو سکا تو وہ یہاں آئے تھے۔ کہہ کر گئے ہیں کہ آپ جیسے ہی آئیں، میں انہیں آپ کی آمد کی اطلاع دوں۔“

”تمہیں اس سے رابطہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ میں نے تاکید کے لہجے میں کہا۔ ”تھوڑا فون چارج کرلوں پھر میں خود اس سے بات کر لوں گا۔“

”ٹھیک ہے سر..... میں سمجھ گیا۔“ وہ فرماں برداری سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ”نارو شاہ کو تم نے اندر تو نہیں بٹھایا تھا؟“
”نہیں سر! وہ فون میں ہر کوئی سمجھتے ہوئے بولا۔ ”میری ان سے گیت پر ہی بات ہوئی تھی۔ ویسے آپ شاہ جی کو کال کر لیجئے گا۔ انہوں نے ایک بڑی عجیب کی تھی۔“

”کیا عجیب بات؟“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ”وہ کہہ رہے تھے کہ آپ کی جان کو خطرہ ہے.....!“

میں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ شاہ جی کے ”استفسار“ پر مجھے حیرت ہوئی ہے۔ میں نے بے پردائی سے کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے جمید۔ نارو شاہ دراصل آئی ہوئی کو پیش آنے والے دایئے کی وجہ سے گھبرا گیا ہے اس لیے اسے میری فکر رہنے لگی ہے کہ کہیں میرے ساتھ بھی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آجائے۔ بس اتنی بات ہے۔“

”اللہ آپ کی حفاظت کرے سرا!“ وہ دعائیہ انداز میں بولا۔

”میں نے کہا۔“ آئین.....!“
”آپ کے لیے کھانا لگوادیں سر؟“ اس نے پوچھا۔
”نہیں، ہم نے کھانا کھالیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اب ہم آرام کریں گے اور جب تک میں خود نہ اٹھوں، کوئی مجھے ڈسٹر ب نہ کرے۔“

”ٹھیک ہے سرا! آپ کو گھر کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ مژدبانہ انداز میں بولا۔

”اور کوئی بھی مجھ سے ملنے آئے تو اسے اس وقت تک بیٹھنے کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دینا جب تک مجھے اس کی آمد کی اطلاع نہ دے دو۔“
”آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی سر۔“

”گڈ.....!“ میں نے سر اٹھانے والے انداز میں کہا۔
”تم اپنی میڈم کے تنگ خوار اور سچے وفادار ہو۔ مجھے تم سے ایسی ہی سمجھ داری کی توقع ہے۔ جب میں بیٹھنے پر موجود نہ ہوں تو کسی بھی شخص کو اندر نہیں آنے دینا، چاہے وہ میرا دوست عظیم ہی کیوں نہ ہو۔ بہت ضروری ہے۔“

”میں نے آپ کی ہدایات کو ذہن نشین کر لیا ہے سر۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا..... ان شاء اللہ!“

”شاباش!“ یہ کہتے ہوئے میں نے جمید کو رخصت کر دیا۔

ہم بیڈ روم میں آئے تو بیٹا نے کہا۔ ”یہاں کی صورت حال تو خاصی کمبیر نظر آ رہی ہے اور یہ نارو شاہ کچھ زیادہ ہی الٹی نشینی نہیں دکھا رہا؟“

”تم بالکل درست انداز میں سوچ رہی ہو۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہم ذرا فزیش ہو جائیں پھر اس پر کھل کر بات کرتے ہیں۔“

وقت

ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد..... تازہ دم ہو کر ہم ایک دوسرے کے درپردہ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے نہایت ہی مختصر جگہ جامع انداز میں بیٹا کو اپنی زندگی کی کہانی سنائی۔ سیکرٹ سوسائٹی کے موضوع کو میں نے دانستہ ہی نہیں کیا تھا۔ میرا فکس پینچر خان سے والد صاحب کی دشمنی اور ماں کی موت تک محدود تھا۔ میں نے پینچر خان کا خط بھی بیٹا کو دکھایا اور نارو شاہ کے رویے کی ایکشن سے بھی اسے آگاہ کیا۔ اس سے قبل میں بیٹا کو ماں کے ٹرسٹ والے منصوبے کی تفصیلات بتا چکا تھا۔

اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے تو یہ نارو شاہ کافی مشکوک شخص لگ رہا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ پائی ہوں، یہ بندہ ہمیں خوفزدہ کر کے یہاں سے بھگتا چاہتا ہے تاکہ میڈم کی رقم پر آزادانہ پیش کر سکے۔ مجھے شک ہے، یہ خط بھی نارو شاہ ہی کی کارستانی ہے۔“

”میرا عقلمند کام بھی یہی خیال ہے۔“ میں نے کہا۔
”علی! اس مسئلے کا ایک آسان ساحل ہے۔“ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔

”میں نے پوچھا۔“ کون ساحل؟“
”تم میڈم کے بیٹے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”تم ان کے اکلوتے وارث ہو۔ تم اگر چاہو تو نارو شاہ سے سارے اختیارات واپس بھی لے سکتے ہو۔“

”یہ جتنا آسان نظر آتا ہے، حقیقت میں اتنا ہے نہیں۔“ میں نے صاف کوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ بات درست ہے کہ میں ملکی حیدر علی کا راجہ اکلوتا بیٹا ہوں مگر قانوناً اس بات کو ثابت کرنا تقریباً ناممکن ہے اور میں اس کمبیزے میں بھی نہیں پڑنا چاہتا۔ اگر ایسا کرنا ممکن بھی ہے تو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے خاصے پاپڑ بیلنا پڑیں گے اور میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ مجھے اس دولت و جائیداد سے کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے۔“

”تم عجیب بات کر رہے ہو۔“ وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ کی اور کی نہیں، تمہاری اپنی دولت ہے۔ اس پر صرف اور صرف تمہارا حق ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور اگر میں اپنی آئی پر آ جاؤں تو میں یہ سب کچھ حاصل بھی کر سکتا ہوں لیکن مجھے ماں سے کیے ہوئے وعدے کا پاس کرنا ہے۔ ماں کا خواب ضرور پورا ہوگا۔“

آواز

چیزیں چھوٹی ہی نہیں بہت بڑی بھی ہو رہی ہیں مثلاً یہ اہلیک سسٹم ملاحظہ فرمائیں۔ آئی پوڈ کے لیے بنایا گیا ڈسک سسٹم پرانے وقتوں کے عظیم الجذبہ بیٹاؤں اور گراموفون سے بھی بڑا ہے۔ اس کی لمبائی چار فٹ ہے اس میں 28 اہلیکزر لگے ہیں۔ کسی بھی آئی پوڈ وغیرہ کو اس سے منسلک کر دیں، پھر اس کی ”مسیح خراش“ دیکھیں۔ وہ بھی اس صورت میں جب اس کی آواز بہت بڑھا دی جائے، یہ کانوں کے پردے بھاڑ سکتی ہے۔ 125 واٹس کی طاقت سے 95 ڈیسی بل کی آواز خارج ہوتی ہے جو اگر کانوں سے مسلسل نکل رہی ہو تو ساعت سے مستقل محرومی کا خطرہ ہوتا ہے۔ اتنی شدید آواز ایک بڑے طیارے کے ٹیک آف پر آتی ہے۔ اس کا وزن تھوڑا کٹھک کی مناسبت سے ہے، یعنی 102 کلو گرام..... لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ آپ آواز کو بہت کم بھی کر سکتے ہیں یعنی یہ بیک وقت بہت شدید، تیز اور نہایت لمبی آواز دے سکتی ہے۔

الموسینڈن کی کمپنی ”اسٹوڈیو پر“ نے اسے بنایا ہے۔ آج کے دور میں مشینیں ہاتھوں سے نہیں بنائی جاتیں لیکن اسے ہاتھوں سے بنایا گیا ہے، یہ اس کی اضافی خوبی ہے۔ آپ اس سے ڈی پلیئر یا بی بی سی منسلک کر سکتے ہیں۔ اسے ”وال آف ساؤنڈ“ کا نام درست طور پر دیا گیا کیونکہ یہ دیواری طرح وسیع و عریض نظر آتی ہے۔

فون نمبر

- 1۔ فجر 2 فرض، ظہر 4 فرض، عصر 4 فرض، مغرب 3 فرض، عشاء 4 فرض، 3 ورتہ واجب۔
- 2۔ فون آنسوؤں کا ڈالنا نہ بھولیں۔
- 3۔ سنت اور نوافل کے ذریعے رابطہ کو مزید بڑھایا جاسکتا ہے۔
- 4۔ ارجنٹ کال آنسوؤں سے بھر پور چہرے سے تہجد۔
- 5۔ فری کال۔ درود شریف ابراہیمی کثرت سے۔

مرسلہ: ملک محمد انور، جی ٹی روڈ، واہ گینٹ۔

”یہ میرا امریکا والا نمبر ہے۔“ میں نے بتایا۔
 ”میرے راہنما نے کہا تھا کچھ دنوں کے لیے میں یہ سم کارڈ اپنے سب فون سے نکال کر رکھوں۔“
 ”تمہارے گرو نے ایسا کیوں کہا؟“ اس نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔ ”کیا اس کے پیچھے کوئی راز چھپا ہوا ہے؟“
 ”جی اہم سر کی ہر بات کے پیچھے کوئی نہ کوئی رمز پوشیدہ ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”سم کارڈ کو سب فون سے نکال کر رکھ دینے میں کون سی حکمت پوشیدہ ہے؟“ اس کی الجھن میں اضافہ ہو گیا۔
 ”میرا یہ نمبر ڈیٹلفینیا کے پاس محفوظ ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”سر کا خیال ہے کہ وہ اس نمبر کے ذریعے میری لوکیشن نہیں کر سکتی ہے۔“
 ”تمہاری باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ڈیٹلفینیا اس وقت کراچی میں موجود ہے۔“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔
 ”وہ پچھلے چند روز سے راولپنڈی اور اسلام آباد میں تھی۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”آج رات کسی وقت وہ کراچی پہنچ جائے گی اسی لیے سر نے مجھے یہ احتیاطی تدبیر اختیار کرنے کو کہا ہے۔“
 ”بہلی ملاقات میں تم نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تمہاری دوست ہے اور جدہ سے تمہارے پیچھے یہاں آ رہی ہے۔“ وہ بولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بعد میں جدہ والی کہانی نیک لگی۔ تم امریکا سے آئے ہو تو یہ ڈیٹلفینیا بھی امریکا ہی سے تمہارے پیچھے لگ کر یہاں تک پہنچی ہے۔ کیا واقعی یہ تمہاری دوست ہے؟“
 ”یہ ایسی دوست ہے کہ جس کے اندر ایک خطرناک دشمن چھپا ہوا ہے۔“ میں نے سب فون اٹھاتے ہوئے کہا۔
 ”اور یہ ایک ایسی دشمن ہے کہ جس کے اندر ایک مہربان دوست پوشیدہ ہے۔“
 میں نے پتا سے گفتگو کے دوران میں عظیم کو ٹیکسٹ کر دیا۔ ”جب کل مجھے کی نماز کے بعد میرے پاس آؤ تو میرے لیے اپنے فریول اینٹ سے بارہ جولائی کی صبح کی کسی فلائٹ کا کراچی ٹو جدہ کا ایک ڈی ٹکٹ بھولا نا۔ یہ سب نادر شاہ کو اٹھانے کے لیے ہے۔“ اس کے بعد میں نے ٹیکسٹ میں اپنی پرسنل ڈیٹیل بھی ڈال دی۔
 ”تمہارا اس سے دور بھاگنے اور چھپنے کا مطلب یہ ہوا کہ تم اس کی وجہ سے کوئی سنگین خطرہ محسوس کر رہے ہو۔“ پتا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا میرا اندازہ غلط ہے؟“

”نہیں۔ تم نے صد فیصد درست اندازہ قائم کیا ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”جب تک میں اس کی دوستی قبول نہیں کر لیتا، وہ میرے لیے بدترین دشمن ہے اور اگر میں اس کا، دوستی کے لیے اپنی جانب بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیتا ہوں تو مجھ کو اس دنیا کی ساری تحفیں، تمام سہولتیں، سب آسائشیں میرے قدموں میں ڈھیر کر دے گی۔“
 ”اوہ..... کیا وہ بہت پیسے والی ہے؟“
 ”وہ نہایت ہی با اختیار اور با اقتدار ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جیسا اس کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔“
 اسی لمحے میرے سب فون کی تصحیف ٹون بجی۔ میں نے دیکھا، عظیم نے رپلائی کیا تھا۔ ”برو! کیا تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟“
 ”نہیں۔ میں تو سو گیا تھا۔“ میں نے جی پر مصلحت اور دردغ کوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”ابھی آکھ کھلی تو تمہارا ٹیکسٹ نظر آیا۔ سو جا رہا تھا کہ روکتا ہوں۔“
 ”کیا ڈیٹلفینیا سے جینک جمل رہی ہے؟“ پتا نے پوچھا۔
 ”نہیں۔ یہ عظیم ہے۔“ میں نے بتایا۔
 ”کیا تم سے دو منٹ کے لیے بات ہو سکتی ہے؟“ عظیم کا ٹیکسٹ موصول ہوا۔
 میں نے رپلائی کیا۔ ”شیر۔“
 اگلے ہی لمحے اس کی کال آگئی۔ میں نے کال ریسیو کی تو اس نے کہا۔ ”برو! میں چند اپ ڈیٹس تم سے شیئر کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”ضرور..... میں سن رہا ہوں۔“ میں ہر تن گوش ہو گیا۔
 ”نادر شاہ محمد علی موسائی کے جس ہنگامے میں گیا تھا وہ کسی کے ڈی خان کی ملکیت ہے۔“ عظیم نے مجھے بتایا۔
 ”کے ڈی خان نے اپنا بھتیجا جینید خان نامی ایک شخص کو کرائے پر دے رکھا ہے۔ جینید خان کا تعلق شوبز سے ہے۔ اس نے مذکورہ ہنگامے میں پرائیویٹ پروڈکشن ہاؤس کھول رکھا ہے۔“
 ”سب تو ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن نادر شاہ کا کسی ٹی وی پروڈیوسر سے کیا تعلق بنتا ہے؟“
 ”برو! میں نے نہیں اس وقت اپنی بات سنانے کی زحمت ایسے ہی نہیں دی۔“ وہ پر جوش انداز میں بولا۔ ”میں نے نادر شاہ اور جینید خان کے بیچ ٹکشن کا پتا بھی چلا لیا ہے۔ میرا ایک دوست اسی گلی میں رہتا ہے جہاں جینید خان کا پروڈکشن ہاؤس ہے۔ میرے دوست کی جینید خان سے ابھی علیک ملیک ہے۔ وہ اکثر جینید خان سے ملنے اور ڈراموں کی

ریکارڈنگ دیکھنے اس ہنگامے پر جاتا رہتا ہے۔ میرے اس دوست کا نام ساجد محمود ہے۔ نادر شاہ جب ہنگامے کے اندر گیا تو میں ساجد کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ ہنگامے کے سامنے کرسیاں ڈالے بیٹھا تھا۔ میں بھی وہیں بیٹھ کر ساجد سے گپ شپ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اس کے دوست دھشت ہو گئے۔ میں ساجد کے گھر کے باہر بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا کہ نادر شاہ جینید خان والے ہنگامے سے برآمد ہوا۔ مذکورہ دونوں ہنگامے زیادہ دوری پر نہیں ہیں۔ میں نے دیکھا، نادر شاہ کے ساتھ ایک بھاری بھرکم شخص بھی تھا۔ میں ایسے زاویے پر بیٹھا تھا کہ نادر شاہ مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا تاہم وہ میری نگاہ میں تھا۔ ساجد نے خود کلامی والے انداز میں کہا۔
 ”لگتا ہے، خان صاحب نے مرغا گھیر لیا ہے۔.....“
 ”کون خان صاحب..... کیا مرغا؟“ میں نے الجھن زدہ لہجے میں ساجد سے پوچھا۔
 اس دوران میں نادر شاہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔ ساجد نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔ ”یہ جو پروڈکشن ہاؤس والے جینید خان ہیں نا، یہ کافی دنوں سے ایک اسٹیٹ ایجنٹ کو گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ پرائیویٹ پروڈکشن میں اسٹیٹ ایجنٹ سے سرمایہ کاری کرنا چاہتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ خان صاحب اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہیں ورنہ وہ کسی کوئی آف کرنے ہنگامے سے باہر تک نہیں آتے۔“
 میں نادر شاہ اور ایک بھاری بھرکم شخص کو ہنگامے سے لٹکتے ہوئے دیکھ چکا تھا لیکن میں نے ساجد پر اپنی دلچسپی کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور عام سے لہجے میں کہا۔
 ”ہاں یار! پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ ہر کوئی اسی کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔“
 ”عظیم! تمہیں اندازہ نہیں، یہ جینید خان کتنا شاطر اور مہاگ شخص ہے۔“ ساجد نے معنی خیز انداز میں کہا۔
 ”میری ایک بات نوٹ کر لو۔ یہ اسٹیٹ ایجنٹ کو فٹ پاتھ پر لے آئے گا۔“
 ”میری بلا سے یار۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔ ”وہ اسٹیٹ ایجنٹ کو کسی شیش محل میں بٹھائے یا فٹ پاتھ پر پیٹک دے، مجھے ان دونوں سے کیا لیا دیتا۔“
 ”تھوڑی دیر کے بعد میں ساجد کو ”خدا حافظ“ کہہ کر وہاں سے لوٹ آیا۔ جی میں نے نہیں ٹیکسٹ کیا تھا۔“ عظیم نے تمام تفصیلات بیان کر چکا تو میں نے کہا۔
 ”یار! تم نے بڑی سستی خیر معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ بذات نادر شاہ ہمارے سامنے نئے طور پر ایکسپوز ہو گیا ہے۔ اب اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ جینید خان والا وہ نفرت انگیز اور دشمنی آمیز خط نادر شاہ ہی نے مجھے ڈیلور کر دیا تھا تا کہ میں خوفزدہ ہو کر فی الفور یہاں سے روانہ ہو جاؤں اور وہ میری ماں کی دولت پر پیش کر سکے لیکن..... میں نے کجانی تو قوت کر کے دانت پیسے اور سنسناتے ہوئے لکھ دیے ہیں۔“
 ”میں اس کہنے کو یہ گناہ ڈاکھیل نہیں کھیلے دوں گا۔“
 ماں کا پیسا اس طرح برباد ہو، یہ میں کسی قیمت پر برداشت نہیں کروں گا۔“
 ”فکر نہیں کرو بردا“ وہ تلی آمیز لہجے میں بولا۔ ”میں نے نادر شاہ سے ہنگامے کے لیے ایک زبردست منصوبہ بنالیا ہے۔ وہ خبیث آگنی سسلی کا ایک پیسا بھی ادھر ادھر نہیں کر سکے گا۔ تم سب کچھ پھر چھوڑ دو۔“
 ”نادر شاہ! انظار کے نور! بعد میرے پاس آئے گا۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”تم سوا آٹھ بجے تک پہنچ جانا اور وہ ٹکٹ بھی بخوار اپنے ساتھ لا کر جس کا ذکر میں نے ٹیکسٹ میں کیا تھا۔ میں چاہتا ہوں، تم ایسے وقت میں میرے پاس پہنچو جب نادر شاہ پہلے سے موجود ہو اور اسے یہی محسوس ہو کہ تم میرا ٹکٹ ڈیلور کرنے آئے ہو۔“
 ”ٹھیک ہے، میں ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے شام تمہارے ہنگامے پر ہوں گا۔“ اس نے حتیٰ لکھ میں کہا۔ ”اور یہ ڈی ٹکٹ کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن شام سے پہلے دن میں بھی تو ہماری ملاقات ہونا ہے نا۔ تم نے اپنی والدہ کا پاسپورٹ اٹھانے جانا ہے۔“
 ”پاسپورٹ میں کھلیٹ کر لوں گا۔“ میں نے کہا۔
 ”تم اطمینان سے شام میں آ جاؤ۔“
 ”ٹھیک ہے۔ برو۔“ اس نے کہا۔ ”جیسی تمہاری مرضی۔“
 ”لیکن تم مجھے بتاؤ گے کہ نادر شاہ کے حوالے سے تم نے کیا منصوبہ بنا رکھا ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”پلان از ویری سیمپل۔“ وہ سرسری انداز میں بولا۔
 ”جب کل شام میں نادر شاہ تمہارے گھر سے رخصت ہوگا تو راستے میں کسی جگہ سے چند نامعلوم افراد اسے اٹھالے جائیں گے۔ یہ مقام جہاں سے نادر شاہ کو اٹھایا جائے گا، وہ تمہارے ہنگامے سے کافی فاصلے پر ہوگا۔ شاہ جی کو نہایت ہی راز داری کے ساتھ ایک خفیہ اڈے پر پہنچا دیا جائے گا جہاں پر میرے آدمی اس کی ابھی خاصی ”خاطر داری“

مریلن ایلیسپریس سے ماں کا ٹینسل ویزا والا پاسپورٹ
میکٹ کر لیا۔ بیٹا اب میرے پاس ہی شفٹ ہو گئی تھی۔ میں

”اسٹل اینڈ بونز“ کے داخلی معاملات کی تفصیل میں نہیں گیا تھا۔ اس نے نہایت انہماک سے میری بات سنی پھر مجھے لہجے

اس نے عجیب سے سہجے میں دریافت کیا۔
عظیم کا فون آنے سے پہلے میرے اور بیٹا کے

سارے ضروری کام تو ناک منہ سے باہر نکلنے والے ہیں
تھوڑی دیر میں۔۔۔ پھر میں نے چٹا کی جانب اشارہ کرتے
ہوئے نادر شاہ سے کہا۔ ”اگل! آپ ان کو تو جانتے ہی
ہوں گے؟“

”ہاں چٹا۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے
بولاً۔ ”یہ سلسلی بہن کے ساتھ کام کرتی تھیں۔“
”اب میرے ساتھ ہیں۔“ میں نے انکشاف انگیز
انداز میں بتایا۔

وہ ٹپکیں چپکاتے ہوئے بولا۔ ”میں سمجھا نہیں چٹا۔۔۔؟“
”جینا سے تیری دوتی ہو چکی ہے اور یہ آج سے ادھر
ہی شفٹ ہو گئی ہیں۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
”یہ میرے ساتھ جدہ میں پائرنر شپ بزنس کرنے کا ارادہ
رکھتی ہیں۔ میں وہاں پہنچ کر ان کے لیے ویزا کا بندوبست
کروں گا۔ بزنس ویزا کے لیے ان کے تمام ضروری
کاغذات میں اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔ جب تک ان
کا ویزا نہیں آ جاتا، یہ ادھر اسی جگہ پر قیام کریں گی اگر آپ
کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔۔۔۔۔“

بات کے اختتام پر میں نے گہری نظر سے اس کی
آنکھوں میں جھانکا۔ اس کے چہرے پر متذنب کے آثار
نمودار ہوئے پھر وہ فوراً سنبھل گیا اور بھڑکے ہوئے لہجے
میں بولا۔

”نن۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ مجھے کیوں اعتراض ہو گا چٹا۔
ویسے ویزا آنے میں کتنا عرصہ لگے گا؟“

اس کے ذہن میں کچھ یک رک رہا تھا۔ میں نے واضح
طور پر محسوس کیا کہ وہ چٹا کے ہنسنے پر قیام والی بات سن کر کچھ
پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں
دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اگل! آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ کیا کوئی
بہن ہے آپ کے ذہن میں؟“

”نہیں چٹا، ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ پوری طرح سنبھلتے
ہوئے خاصے مضبوط لہجے میں بولا۔ ”مجھے کوئی پریشانی یا الجھن
نہیں ہے۔ میں تو اس وجہ سے پوچھ رہا ہوں کہ میں نے آپ کو
بتایا تھا تا کہ آپ کے جانے کے بعد میں یہ گھر ایک ٹیلی کو کچھ
عرصے کے لیے کرائے پر دینا چاہتا ہوں۔“

”اچھا تو یہ بات ہے۔“ میں نے بے پروائی سے
کہا۔ ”پھر تو آپ شانت ہو جائیں۔ چٹا کا دیر آ آنے میں
زیادہ تاخیر تھوڑی لگے گا۔ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگے گا۔
آپ جتنا کہ جانے کے بعد یہ بگاڑ کر اپنے پر اٹھا بیٹھے گا۔“

”ٹھیک ہے چٹا! جیسی تمہاری خوشی۔ میں پہنچ کر لوں
گا۔“ وہ سرسری یا انداز میں بولا تاہم اس کے چہرے
پر الجھن موجود تھی۔

اگرچہ اس نے الفاظ سے اپنے اطمینان کا اظہار کر دیا
تھا لیکن یہ اطمینان اس کے چہرے یا آنکھوں سے نہیں
جھلک رہا تھا۔ اس کا ذہن کہیں اور اٹکا ہوا تھا۔ کہاں؟ میں
اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکا تاہم میں نے اپنی بات کی
مضبوطی کے لیے کہا۔

”اور اگل! جب چٹا کا ویزا آ جائے تو آپ ہی نے
اس کے لیے ٹکٹ وغیرہ کا بندوبست کرنا ہے۔ یہ آپ کو ٹکٹ کا
ایڈونٹ وے دیں گی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟“
”جی جی! میں اپنی طرح سمجھ گیا۔“ وہ سرکوا شباتی
جنش دیتے ہوئے بولا۔ ”آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ باقی
سب مجھ پر چھوڑ دیں۔ ہر کام آپ کے حسب نفاذ ہو گا۔“
اسی وقت جیشدے نے آ کر بتایا کہ عظیم آ یا ہے۔ میں
نے جیشدے سے کہا۔ ”عظیم صاحب کو یہاں پہنچا دو۔“ پھر میں
نے نادر شاہ کی طرف گردن مٹھاتے ہوئے کہا۔
”لیں اگل! امیر ٹکٹ تو آ گیا۔۔۔۔۔!“

وہ نامراد میرے یہاں سے جانے پر اندر سے اتنا
خوش تھا کہ اس طرف ایک لمبے کے لیے بھی اس کا دھیان
نہیں گیا کہ جب میں نے اپنا ٹکٹ عظیم سے بنوایا ہے تو چٹا
کے ٹکٹ کی ڈے داری میں اسے کیوں سوچ رہا ہوں۔

عظیم نے ڈرامٹک روم میں پہنچ کر یہ آواز بلند
”السلام علیکم“ کہا پھر میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھنے کے
بعد ڈی ٹکٹ والا لفافہ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بردا کل! صبح دس بجے آپ کی فلاح ہے۔ آپ
آٹھ بجے تک انرپورٹ پہنچ جانا اور بہت معذرت۔۔۔۔۔ میں
تمہیں سی آف کرنے نہیں آ سکتا گا۔“

”نوواٹھو۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”چٹا مجھے
انرپورٹ چھوڑ آئے گی۔“ پھر میں نے ٹکٹ والا لفافہ نادر
شاہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اگل ٹکٹ آ گیا ہے۔ آپ بھی چیک کر لیں۔۔۔۔۔“
میں نے لفافہ کھولے بغیر نادر شاہ کو ہٹا دیا تھا۔ اس
نے لفافے میں سے ٹکٹ نکال کر دیکھا۔ چند لمحات تک وہ
بے غور ٹکٹ کا جائزہ لیتا رہا پھر ٹکٹ کو لفافے میں رکھ کر لفافہ مجھے
واپس کرتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے چٹا۔ اللہ تمہیں خیر نصیب سے ملے
جائے۔ جدہ پہنچ کر مجھ سے رابطہ ضرور کرنا۔ جب تک تم صبح

وقت

سلامت اپنے گھر نہیں پہنچ جاتے، مجھے تمہاری فکر لگی رہے گی۔“
”ٹھیک ہے اگل! میں اپنے پہنچنے کی آپ کو لازمی
اطلاع دوں گا۔“ میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ ”اور اس
کے بعد بھی آپ سے رابطے میں رہوں گا۔“

”جیتے رہو چٹا۔“ وہ دعائیہ انداز میں بولا پھر کہا۔
”اب آپ مجھے اجازت دیں اور آپس میں گپ شپ کریں۔
مجھے ایک ضروری کام سے نہیں جانا ہے۔“
پھر وہ مجھ سے اور عظیم سے ٹھیک ٹھیک کر کے رخصت
ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد عظیم نے کہا۔ ”پاچو جی! ہم تو
گپ شپ کریں گے ہی، آپ اپنی خیر مانگیں۔ آپ کی جو
حاجات بننے والی ہے، اس کے بارے میں آپ نے بھی
خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا ہو گا۔“

”میں اس بات پر ہنس اور ہنسنے اختیار نہیں پڑے۔
عظیم نے چٹا سے پوچھا۔ ”آپ نے جرنی جانے کا
فیصلہ کر لیا ہے نا؟“

”نہیں یار۔“ چٹا کے بجائے میں نے جواب دیا۔
”اب اس کا امر کیا جاتا ہے۔ فی الحال تو یہ میرے پاس اسی
جنگلے پر شفٹ ہو گئی ہیں۔ جب تک میں پاکستان میں ہوں،
یہ ادھر ہی رہیں گی۔“

”اور جب تم امریکا چلے جاؤ گے تو یہ وہاں تمہارے
پاس پہنچ جائیں گی۔“ عظیم نے معنی خیز انداز میں باری
باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا میں غلط
سوچ رہا ہوں؟“

”تمہارا اندازہ کافی حد تک درست ہے۔“ میں نے
اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال یہ حالیہ مشن
میں ہمارے ساتھ ہیں۔ تازہ ترین صورت حال ان کے علم
میں ہے۔ ہمارے درمیان دوپٹی کا رشتہ استوار ہو چکا
ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ہم تینوں ایک کہنئی ہیں۔“

”میں نے تو سن رکھا ہے، تو از کہنئی اینڈ تھری
ازنن۔“ عظیم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”پھر ہم تینوں ایک
کہنئی کیسے ہو سکتے ہیں؟“

”آپ نے جو سن رکھا ہے وہ ایک انگریزی محاورہ
”چٹا نے براہ راست عظیم سے کہا۔ ”بہت سے
انگریزی محاورے ہمارے مشرقی ماحول میں منظر ثابت نہیں
ہوتے بلکہ حقیقت کو بیان کرنے کے لیے ان کے معنی اور
مفہوم الٹ جاتا ہے۔“
”بہت خوب!“ عظیم نے چٹا پر ایک بھرپور نگاہ

ڈالتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے جواب نے مجھے متاثر
کیا ہے۔ اب ذرا آپ اس انگریزی محاورے کا مشرقی
ورژن بتا کر دکھائیں۔۔۔۔۔!“

”دیری سیکل!“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”تھری از
سکینی آف آل اردن۔“

”یہ بات ا! عظیم نے حکا چکی نظر سے مجھے دیکھا۔
”تم خوب دوتی تمہارے ہو۔ میں نے سوال پٹا سے کیا تھا اور
ان کی جگہ جواب تم دے رہے ہو۔ اس کو کہتے ہیں۔۔۔۔۔
دوستوں سے ملیں دوست، کر کے رہے ہاتھ۔“

”ارے یار! دل چھو نہ کرو۔“ میں نے عظیم سے
کہا۔ ”میں تمہارا بھی اتنا ہی دوست ہوں، جتنا چٹا کا ہوں
بلکہ ہم تینوں برابر کے دوست ہیں۔“

”ویسے میں بھی آپ کو کبھی جواب دینے والی تھی لیکن علی
نے جلدی دکھادی۔“ چٹا نے عظیم کے سامنے وضاحت پیش
کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی بات کا غلط مطلب نہ نکالیں۔“
”میں کوئی بات نہیں۔“ عظیم نے مصلحت بھرے

انداز میں کہا۔ ”جب ہم تینوں آپس میں دوست ہیں تو پھر
کوئی بھی پہل کروے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ چٹا جی!
میں آپ کی کسی بات کا غلط مطلب نہیں نکال رہا۔“
”تھیک یو پکوری صاحب۔“ وہ تشکر آمیز لہجے میں بولی۔
”دوپٹی میں ”صاحب“ جیسے الفاظ اچھے نہیں لگتے۔“
عظیم نے کہا۔ ”جی! انداز میں آپ اس کو غلط سمجھ کر رہے
ویسے ہی مجھے کیا پتا کہ میں؟“

”بس۔۔۔۔۔ تو آج سے ہمارے بیچ ”آپ، چٹا
اور صاحب صاحب“ کا ٹکٹ ختم۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے
میں کہا۔ ”ہم ایک دوسرے کو اس کے نام سے نالعتنا
دوستانہ انداز میں بلاؤں گے۔“
”ڈن!“ عظیم نے کہا۔

”چٹا بولی۔“ مجھے منظور ہے۔“
اسی لمبے عظیم کے سبب فون کی کہنئی بج اٹھی۔ اس نے
فورا کال ریسیڈ کرتے ہوئے ہم سے کہا۔ ”نامعلوم افراد کا
فون ہے۔“ پھر وہ دوسری جانب متوجہ ہو گیا۔ ”بیل۔۔۔۔۔!“
چند لمحات تک وہ ”ہوں، ہاں“ کرتے ہوئے ادھر
سے بولنے والے کی بات سن رہا پھر ”ویری گڈ“ کہتے
ہوئے اس نے رابطہ موقوف کر دیا۔

عظیم نے فون رکھا تو میں نے سرسراہٹے ہوئے لہجے
میں استدعا کیا۔ ”کیا ہوا؟“
”نامعلوم افراد نے کیا رپورٹ دی ہے؟“ چٹا نے

دیدہ دلیری

شا کرلیف

قانون اور اصول کو چپ با اختیار طبقہ اپنی رعایا سمجھنے لگے تو مظلوم کو کچھ ایسا ہی لنگڑا لولا انصاف ملتا ہے جیسے کہ یہاں... رسم و رواج تو شاید رعایا کو جکڑے رکھنے کا محض بہانہ ہوتے ہیں ورنہ ان پر عمل درآمد کا اطلاق پر ایک پریکسٹن ہوتا۔

دور دل کھیت کرنے والے اصفوں کی بے ایمانی اور بے اصولی کا اجرا



ہونے والی تھی۔ اس بار ایفون کی فصل تلف کرنے کے لیے فضا کی اچھری بھی نہیں کیا گیا تھا، اس لیے سمندر خان جانتا تھا کہ اس بار اسے اچھا منافع حاصل ہونے والا ہے۔ مگر اس وقت اس کی سوچ کا محور اس کی بیٹی زرگل تھی

سمندر خان اس وقت اپنے گھر کے سامنے کھڑا پر خیال نظروں سے وہاں موجود کھیت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری تشویش اور رنج و غم کے تاثرات موجود تھے۔ سامنے اس کے کھیت میں ایفون کی فصل پک کر تیار

”یار! تم نے تو واقعی شاہ جی کو آلو بتا دیا۔“ پوری بات سننے کے بعد عظیم نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیتہ شخص اسی سلوک کا مستحق ہے۔“

”ابھی تو میں نے اسے صرف آلو ہی بتایا ہے۔“ میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”آگے آگے دیکھتے جاؤ، دہا ہے کیا۔۔۔!“

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر عظیم کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ عظیم نے بتایا۔ ”شا کر کا فون ہے۔“

”کون شا کر؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”ارے یار! وہی نامعلوم افراد کا ایک ساتھی۔“ عظیم نے جواب دیا۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے میری اسی سے تو بات ہوئی تھی۔ میں نے شا کر ہی کے توسط سے یہ ڈیل کی ہے۔“

”ٹھیک ہے، اس کی کال اٹینڈ کرو۔ ہو سکتا ہے، وہ تمہیں منزل پر پہنچنے کی اطلاع دینا چاہ رہا ہو۔“ میں نے مربیانہ انداز میں کہا۔ ”لیکن سیل فون کا آپتیکر آن کر دوتا کہ ہم دونوں بھی شا کر کی بات سن سکیں اور جنہیں بعد میں یہ کہانی ہمیں نہ سنانا پڑے۔“

عظیم نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے سیل فون کا آپتیکر آن کیا پھر شا کر کی کال ریسیو کر لی۔ اگلے ہی لمبے آپتیکر میں ایک ٹھہرائی ہوئی آواز ابھری۔

”عظیم بھائی! غضب ہو گیا۔۔۔“

”کیا ہوا شا کر؟“ عظیم نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

”یونیورسٹی روڈ پر چار پولیس موہاٹرز نے ہماری ہائی روف کو گھیرے میں لے لیا ہے۔“ شا کر نے خوفزدہ انداز میں بتایا۔ ”پولیس والوں کے ارادے بڑے خطرناک نظر آ رہے ہیں۔ میں منظر سے غائب ہو رہا ہوں۔ مجھے فون نہیں کرنا کیونکہ میں اپنا فون آف کر رہا ہوں۔۔۔۔۔“

آپتیکر خاموش ہو گیا۔ یقیناً شا کر نے رابطہ منقطع کر دیا تھا اس لیے اس کی آواز بلند ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم کی فضا میں سناٹا چھا گیا۔

ہم تینوں ہکا بکا ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کی آنکھوں میں یہی سوال تھا۔

”یہ کیا ہو گیا۔۔۔؟“

اضطراری انداز میں دریافت کیا۔

”شاہ جی کو محمد علی سوسائٹی میں داخل ہونے سے پہلے ہی اٹھا لیا گیا ہے۔“ اس نے انکشاف انگیز انداز میں اعلان کیا۔ ”نامعلوم افراد میں سے دو نے گن پوائنٹ پر اسے گاڑی میں سے نکال کر اپنی ہائی روف میں شفٹ کیا اور اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے جبکہ باقی دو نامعلوم افراد بائیک پر سوار

مذکورہ ہائی روف کے پیچھے جا رہے ہیں تاکہ کسی ہنگامی صورت حال میں وہ ہائی روف کو گور دے سکیں۔ انہی میں سے ایک نامعلوم فرد نے مجھے فون کر کے یہ تفصیل بتائی ہے۔“

”مطلب یہ کہ انتہائی سیریس مریض کو ایسیوبینس میں ڈال کر اسپتال کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے۔“ بتانے جیسے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اب منزل پر پہنچانے کے بعد اس کا آپریشن کیا جائے گا۔“

”نامعلوم افراد نے شاہ جی کو محمد علی سوسائٹی کے نزدیک سے اٹھا لیا ہے۔“ عظیم نے پُرسوج انداز میں کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ یہاں سے رخصت ہونے کے بعد سیدھا جنید خان کے پاس جا رہا تھا۔“

”مجھے تو لگتا ہے، خان ہاؤس میں اس کم بخت کی نال دہی ہوئی ہے۔“ میں نے بیزار سی کہا۔ ”جب تک یہ اپنی ذرا ذرا سی بات جنید خان تک نہ پہنچا دے، اس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔“ مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ جنید خان کو اطلاع دینے جا رہا تھا کہ میں کل صبح چہ داہن جا رہا ہوں۔ یہ پردہ میرے خط کو لے کر بھی سیدھا محمد علی سوسائٹی میں

داخل ”خان ہاؤس“ ہی پہنچا تھا۔“

”تم نے اس خط کے ذریعے نادر شاہ کو کیا ہے وقف بنا رہا تھا علی۔۔۔۔۔!“ جیٹا زرب لب مسکراتے ہوئے بولی۔

عظیم نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا پھر ابھمن زدہ انداز میں استفسار کیا۔ ”تم تو کم کس خط کا ذکر کر رہے ہو؟“

میں نے گزشتہ رات جب عظیم کو نادر شاہ کے خاقب پر مامور کیا تھا اور وہ شاہ جی کا چپچھا کرتے ہوئے خان ہاؤس تک جا پہنچا تھا تو میں نے اسے چپکے خان کے زہر پلے خط کے بارے میں تو بتا دیا تھا لیکن اس خط کا تذکرہ کرنا بھول گیا تھا جو میں نے نادر شاہ کو تھمایا تھا۔

عظیم کے استفسار پر میں نے اسے اس خط کی اسٹوری سنا دی جو میں نے چپکے خان والے خط کی تحریر کی کاپی کر کے خود لکھا تھا اور مذکورہ خط کا مفہوم اصل خط کے برعکس ہو گیا تھا۔

انگوں حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلائی۔ کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدد گیت سنائی اس ناقابل فراموش داستان کے مزید واقعات اچھے ماہ ملاحظہ کریں

جس کی وجہ سے وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا جس نے اس کی عزت کا سرعام چناڑہ نکال کر اسے ذلیل و رسوا کر ڈالا تھا۔

زرگل اس قبیلے کے سردار شیرخان کے بیٹے بہادر خان کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ ان دونوں کے درمیان کب محبت کی چٹکیں بڑھیں اور کب ان کی دیوانگی اس حد تک جا چکی کہ وہ اس وادی سے فرار ہونے پر مجبور ہو گئے، سمندر خان آخری وقت تک لاعلم رہا۔ اب اس کے پاس اپنی عزت اور غیرت بچانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ زرگل اور بہادر خان کو پکڑ کر وادی میں واپس لایا جائے اور پھر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ غیرت کے نام پر قتل اس علاقے کا قانون تھا۔

سمندر خان کے علاقے کا نام چٹان وادی تھا۔ شاید یہ نام یہاں پہلی ہوئیں لاتعداد پہاڑی چٹانوں کی وجہ سے تجویز کیا گیا تھا۔ اگرچہ کھڑکی دھجکی کے باعث یہاں روزگار کے دوسرے مواقع بھی پیدا ہو چکے تھے مگر اب بھی یہاں کے کمینوں کا سب سے بڑا روزگار ایوان کی کاشت ہی تھا کیونکہ کسی دوسرے کام میں اتنا منافع ممکن نہ تھا جیسی وجہ تھی کہ پرکشش کھیتی ترغیب دہریں کے باوجود یہاں کے باشندے اس پیشے کو ترک کرنے پر تیار نہیں تھے۔ سمندر خان کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔ تاہم اس کے پاس بہت ٹھوڑی سی زمین تھی، اس لیے اس کا شمار علاقے کے غریب افراد میں ہوتا تھا۔

سمندر خان اب بچپن برس سے ادھر کا ہو چکا تھا۔ وہ مضبوط جسم اور لمبے قد کا ٹھکانا مالک تھا۔ اس کی دو بیٹیاں زرگل اور فرشتہ گل تھیں۔ جوانی میں سمندر خان کی بوی جنت گل خوب صورتی میں اپنی مثال آپ تھی اور اس کی خوب صورتی کا اثر اس کی دونوں بیٹیوں پر بھی آیا تھا، وہ بھی حسن و جمال میں اپنی ماں سے کسی صورت کم نہ تھیں۔ خاص کر چھوٹی بیٹی فرشتہ گل تو گو یا کوئی معلوم ہوتی تھی۔ جو بھی اسے دیکھتا اس کے چہرے کی مصومیت اور پاکیزگی دیکھ کر مبہوت رہ جاتا۔ وہ اپنی بڑی بہن زرگل سے تین سال چھوٹی تھی۔

سمندر خان کو بچنے کی بڑی ترغیب تھی مگر وہ بیٹیوں کی پیدائش کے بعد جنت گل کی گود ہری نہ ہوئی اور سمندر خان کی یہ خواہش تشہ ہی رہ گئی۔

اس وقت وہ ایک مشکل صورت حال سے دوچار تھا۔ اس کی بڑی بیٹی زرگل نے سردار کے بیٹے کے ساتھ گھر سے

فرار ہو کر پورے قبیلے میں اس کا منہ کالا کر دیا تھا اور اب اس کے پاس اپنی عزت بچانے کی ایک ہی صورت تھی کہ زرگل اور اس کے عاشق کو واپس لا کر یہاں کے دستور کے مطابق موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

چٹان وادی میں برسوں سے یہ دستور رائج تھا کہ جس کی بیٹی اپنے کسی آشنا کے ساتھ گھر سے فرار ہو جائے، وہ اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیتا تھا۔ اب سمندر خان کو بھی اس قانون پر عملدرآمد کرنا تھا۔ اسے زرگل اور اس کے آشنا بہادر خان کو اپنے ہاتھوں سے موت کے سپرد کرنا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اس باریہ اتنا آسان نہ ہوگا کیونکہ بہادر خان اس قبیلے کے سردار شیرخان کا اکلوتا بیٹا تھا۔

اگرچہ وادی کے دستور کے مطابق گھر سے فرار ہونے والے لڑکا اور لڑکی دونوں ہی قصور وار ٹھہرے تھے اور دستور کے مطابق دونوں کو موت کی سزا سنائی جانی تھی مگر سمندر خان کو اس حقیقت کا بھی ادراک تھا کہ زرگل تک تو بات ٹھیک تھی مگر سردار شیرخان اتنی آسانی سے اپنے اکلوتے بیٹے کو موت کے سپرد نہیں ہونے دے گا۔ بہر حال یہ باتیں بعد میں طے ہو جائیں گی قبیلے کے لوگ اپنے دستور کو ترجیح دیتے ہیں یا سردار کو۔ فی الحال سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ ان دونوں کو گرفتار کر کے واپس چٹان وادی لایا جائے اور پھر جرگے کے سامنے پیش کیا جائے جو دونوں کا موقف سننے کے بعد ان کی سزا کا فیصلہ کرتا۔

کیونکہ کسی لڑکے اور لڑکی کے گھر سے فرار ہو ایک اجتماعی مسئلہ سمجھا جاتا تھا، اس لیے چٹان وادی کے تقریباً پچاس کے قریب سب جوان بہادر خان اور زرگل کی تلاش میں روانہ ہو چکے تھے۔ سمندر خان کو امید تھی کہ یہ افراد بہادر خان اور زرگل کو کسی بڑے شہر پہنچنے سے پہلے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے ورنہ پھر انہیں واپس لانا تقریباً ناممکن ہو جاتا۔ وہاں بڑی تعداد میں امریکی این جی اوز کام کر رہی تھیں اور شہر میں خاصی بڑی تعداد میں امریکی فوج بھی موجود رہتی تھی اس لیے وہاں کسی قسم کی زبردستی بھی نہیں کی جاسکتی تھی اور اس طرح سمندر خان ہمیشہ کے لیے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔

وہ خود بھی ان دونوں کے تعاقب میں جانا چاہتا تھا مگر تعاقب میں جانے والوں میں سردار شیرخان کے آدمی بھی شامل تھے۔ انہوں نے اسے روک دیا تھا۔ سمندر خان اس کی وجہ بھی جانتا تھا۔ سردار شیرخان کو خیرہ تھا کہ کہیں سمندر خان جوش میں آکر اس کے بیٹے پر گولی نہ چلا دے۔

اس وقت وہ انہی پریشان کن حالات میں الجھا ہوا تھا کہ ایک طرف واقع اس کے تین مردوں پر مشتمل چھوٹے سے کچے مکان سے اس کی چودہ سالہ بیٹی فرشتہ گل برآمد ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی گڑیا تھی جس سے وہ کھیل رہی تھی۔ اسے دیکھ کر سمندر خان کے چہرے پر برہمی کے تاثرات عود آئے۔

”جنت گل! تم کہاں مر گئی ہو؟“ اس نے غصیلے لہجے میں اپنی بیٹی کو آواز دی۔

”کیا ہوا؟“ دوسرے ہی لمحے مکان کے اندر سے اس کی بیوی بھی برآمد ہوئی۔ اس کے لہجے میں گھبراہٹ کا عنصر نمایاں تھا۔

”اسے میری نظروں سے دور لے جاؤ۔“ سمندر خان نے فرشتہ گل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ایسا نہ ہو کہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور میں اسے گولی مار دوں۔“

”زرگل کے کیے کی سزا اسے کیوں دینا چاہتے ہو۔ اس کا کیا قصور ہے؟“ جنت گل تیز لہجے میں بولی۔

”اس کا یہی قصور کیا کم ہے کہ یہ ایک لڑکی ہے۔“ ”زرگل کا قصہ اس پر مت نکالو۔“ جنت گل نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”جب بہادر خان نے زرگل کا رشتہ مانگا تھا تو تم نے انکار کیوں کر دیا تھا؟ اگر تم اس رشتے کو قبول کر لیتے تو آج ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔“

”میں نے انکار نہیں کیا تھا۔“ سمندر خان پھر سے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مگر یہ قبیلے کا دستور ہے کہ رشتہ مانگنے کے لیے خاندان کے کسی بڑے کو آنا پڑتا ہے۔ جب بہادر خان کا باپ ہی راشی نہیں تھا تو پھر میں کیسے آدمی ظاہر کر دیتا؟ یہ تو میرے دہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ زرگل اور بہادر خان کے درمیان خفیہ معاشرت چل رہا تھا اور میرے انکار کے بعد وہ گھر سے بھاگنے کا منصوبہ بنائے بیٹھے ہیں۔ تمہیں ضرور اس بات کا پتا ہوگا مگر تم نے جان بوجھ کر اپنی بیٹی کے اس جرم پر پردہ ڈالے رکھا۔“

”میں نے نفی بار قسم کیا کہ تمہیں یقین دہانی کراؤں ہے کہ میں اس معاملے سے بے خبر تھی۔ زرگل پہاڑ کی پچھلی جانب بکریاں چرانے کے لیے جاتی تھی اور شاید وہیں اس کے اور بہادر خان کے درمیان ملاقات ہوتی تھی جو محبت میں بدل گئی۔“

”جو اس بندہ کو جنت گل۔“ سمندر خان اتنی زور سے دھاڑا کہ فرشتہ گل ہم کراں سے لپٹ گئی۔

”عورت سے زیادہ مکار و عیا راستی اس روئے زمین پر نہیں ہے۔“ سمندر خان نفرت بھرے لہجے میں بولا۔ ”تم عورتوں کو کھنٹ مردوں کی خدمت گزار کی بے پید کیا کیا ہے۔ تمہاری حیثیت مردوں کی پاؤں کی جوتی سے زیادہ نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تم عورتوں کی وجہ سے ہی مردوں کی عزت خاک میں ملتی ہے۔ زرگل بھی میری بیٹی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عورت ہی تھی۔ اس نے ایک غیر مرد کے ساتھ گھر سے بھاگ کر میری برسوں کی کمائی ہوئی عزت کھوں میں خاک میں ملا ڈالی۔“

”تمہاری ماں بھی ایک عورت ہی تھی سمندر خان۔“ جنت گل سے شاید اپنی توہین برداشت نہ ہوئی تھی۔

”میری مرحوم ماں کو درمیان میں مت لاؤ۔“ سمندر خان مگر جدار و آواز میں بولا۔ ”وہ بہت عظیم عورت تھی کیونکہ اس نے مجھ جیسا بہادر اور غیرت مند بیٹا پیدا کیا تھا مگر تم کیا ہو؟ تم تو بیٹا پیدا کرنے کی صلاحیت سے ہی محروم ہو۔ اس لیے خود کو محسوس اور بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش مت کرو۔“

جنت گل نے اس بار سمندر خان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ مزید بولی تو سمندر خان آپے سے باہر ہو جائے گا اور ممکن تھا اسے مارا، پیٹا بھی شروع کر دیتا۔ خاموش رہنے میں ہی عاقبت تھی، اس کی بوڑھی ہڈیوں میں اب سمندر خان کی مار کھانے کی سکت نہیں رہی تھی۔ چٹان وادی میں عورتوں کا اپنے مردوں کے ہاتھوں پٹنا عام سی بات تھی اور اسے معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اسی لمحے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نے سمندر خان اور جنت گل کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔

گھڑسوار خاصی تیز رفتار سے گھوڑا دوڑاتا ہوا سمندر خان کے گھر کی جانب ہی آ رہا تھا۔ قریب آنے پر سمندر خان نے اسے پہچان لیا۔ یہ اسی کے قبیلے کا ایک نوجوان تھا۔

”مبارک ہو سمندر خان! تمہاری اور قبیلے کی عزت بچ گئی ہے۔“ قریب آتے ہی وہ بولا۔ تاہم اس نے گھوڑے سے اترنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ زرگل اور بہادر خان کے تعاقب میں جانے والے انہیں پکڑ کر واپس لانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

”تم کو بھی مبارک ہو۔“ نوجوان کی بات سن کر سمندر خان نے برسرِ تلے لہجے میں کہا۔ ”صرف میری ہی نہیں پورے قبیلے کی عزت بچ گئی ہے۔ وہ دونوں اب کہاں ہیں؟“

”وہ دونوں اب سردار شیر خان کی قید میں ہیں۔ کل ان کی سزا کا تعین کرنے کے لیے جگہ بیٹھے گا۔ سردار شیر خان کا کہنا ہے کہ جرم کے گے افراد جو بھی فیصلہ کریں گے وہ قبول کرے گا، چاہے یہ فیصلہ اس کے بیٹے کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔“ نوجوان نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”جرم کے کیا وقت مقرر کیا ہے؟“ سمندر خان نے استفسار کیا۔

”کل صبح سورج طلوع ہونے کے کچھ دیر بعد ہی سردار کے ڈیرے میں جگہ بیٹھ جائے گا۔ مقررہ وقت پر پہنچ جانا۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نوجوان نے گھوڑا واپسی کے لیے موڑا اور پھر اسے دوڑاتا ہوا سمندر خان کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی سمندر خان نے مطمئن چہرے کے ساتھ جنت گل کی جانب دیکھا جس کے چہرے پر اب خوف کے ساتھ ساتھ گہرے رنج و غم کے تاثرات بھی نمایاں تھے۔ شاید اس لیے کہ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اب اس کی بیٹی کو مرنے سے کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اس کی عبرتناک موت سنیں ہو چکی تھی۔ زرگل اپنی چھوٹی بہن فرشتہ گل سے بہت مختلف تھی۔ وہ بچپن سے ہی بے چین اور باغیاہ طبیعت کی مالک ہوئے کے ساتھ ساتھ خاصی سنجیدہ بھی واقع ہوئی تھی۔ کبھی کبھی تو باپ کے سامنے بھی سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی تھی، اس وجہ سے اکثر اوقات سمندر خان سے مار کھاتی رہتی تھی۔ ایک دفعہ تو سمندر خان نے اسے گولی مارنے کا بھی فیصلہ کر لیا تھا۔ اگر جنت گل اس کے قدموں میں گر کر اس کی منت سماجت نہ کرتی تو شاید وہ اپنے ارادے پر عمل بھی کر گزرتا اور اب وہ چاہے کبھی اپنی بیٹی کی کوئی مدد کرنے سے قاصر تھی۔

وہ زرگل کی ماں تھی مگر اس کے باوجود اسے آخری وقت تک اندازہ نہ ہوا کہ اس کی بیٹی کسی کی محبت میں گرفتار ہو کر اس کے ساتھ بھاگنے کا منصوبہ بنا چکی ہے۔ ورنہ شاید وہ زرگل کے آگے بھاڑ جو ذکر اسے روک لیتی مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ زرگل اور بہادر خان گرفتار ہو چکے تھے اور کل انہیں سزا دینے کے لیے جگہ پہنچ رہا تھا۔ گویا اس کی بیٹی کے پاس بس آج رات ہی کی زندگی تھی۔

جنت گل جب رات کو سونے کے لیے لیٹی تو فیصلہ اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کے سامنے دوسری چار پائی پر سمندر خان گہری نیند سو رہا تھا۔ وہاں تو اس کے خراٹوں کی آواز بھی نہ سنی جاتی تھی۔ فرشتہ گل، جنت گل کے

ساتھ لیٹی سو رہی تھی۔ وہ چودہ سال کی تھی مگر جنت گل کو اندازہ تھا کہ وہی طور پر وہ اپنی عمر سے ابھی نہیں چھوٹی ہے۔ اس کے معصوم ذہن کو اس حقیقت کا ادراک نہیں تھا کہ اس کی بڑی بہن کس مصیبت سے دوچار ہو چکی ہے۔

یہ رات جنت گل پر بہت بھاری تھی۔ آنسوؤں کا گویا ایک سیلاب تھا جو اس کی آنکھوں سے رواں تھا۔ اس کے لیے یہ صورت حال بڑی کرناک تھی کہ جس بیٹی کو اس نے بڑی محبت سے اپنی بساط کے مطابق پال پوس کر جوان کیا تھا، اسے کل وادی کے قانون کے مطابق اس کا اپنا ہی باپ موت کے سپرد کر دے گا۔ جنت گل کو اس وقت شدت کے ساتھ اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ صنف نازک ہونے کے ناتے وہ کسی قدر بے بس اور ناتواں مخلوق ہے۔ شاید سمندر خان نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس وادی میں عورتوں کی اوقات مردوں کی جوتی کے برابر ہے۔ وہ اپنی پوری زندگی میں اس وادی سے باہر نہیں نکلی تھی۔ تاہم اس نے وادی سے باہر شہری طرز زندگی کے بارے میں بھی بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ وہاں عورتوں اور مردوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ اگر کوئی مرد کسی عورت پر تشدد کرے تو وہ عورت تو ان کا سہارا لے سکتی ہے۔ مرد کا عورت پر تشدد ایک سنگین جرم تصور کیا جاتا ہے مگر اس وادی میں تو عورت پر تشدد بالکل عام ہی بات تھی۔

جب اسے زرگل کے بہادر خان کے ساتھ بھاگنے کی خبر ہوئی تو ایک ماں ہونے کے ناتے اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ دونوں تعاقب میں جانے والوں کی پکڑ میں نہ آسکیں اور کہیں دور جا کر اپنی نئی دنیا بسالیں مگر جنت گل کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی تھی۔ قبیلے کے لوگ بہادر خان اور زرگل کو زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ بہادر خان سردار کا بیٹا تھا۔ آج تک گھر سے بھاگنے والی کسی لڑکی کو زندہ نہیں چھوڑا گیا تھا۔ جنت گل کی وہ رات سسکیوں اور ہچکیوں میں روتے ہی گزرتی۔ صبح کے وقت اسے ہلکی ہلکی نیند آنے لگی مگر سمندر خان کی آواز نے اسے بڑبڑا کر اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

”جنت گل! اللہ جادوئی ہو گئی ہے، مجھے جرم کے میں جانا ہے۔“

”آ رہی ہوں آہستہ بولو، فرشتہ گل سو رہی ہے۔“

جنت گل نے کہا اور پھر اپنی چار پائی سے اٹھ کھڑی۔

”کیا بات ہے، تمہاری آنکھیں کیوں سو جاتی ہوئی ہیں؟“ اس نے قبوہ بنا کر سمندر خان کے سامنے رکھا تو اس نے استفسار کیا۔

”سمندر خان! زرگل ہماری اولاد ہے۔ تم اپنے ہی

ہاتھوں اپنی اولاد کو موت کے سپرد کرنے جا رہے ہو۔“ جنت گل رو پائے لیجے بی بی۔

”میرے لیے وہ اسی دن مرنے لگی جس دن اس نے ایک غیر مرد کے ساتھ گھر سے بھاگنے جیسا مذہم عمل سرانجام دیا تھا۔ بطور ایک غیرت مند باپ اس پر عملدرآمد کرنا میرا فرض ہوگا۔“ سمندر خان نے قبوہ کے گھونٹ لیے ہوئے کرخت لیجے میں کہا۔

”وہ ہماری بیٹی ہے سمندر خان۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ اس نے غلطی کی ہے مگر اس کی یہ غلطی معاف بھی تو کی جاسکتی ہے۔ تم مجھے وہاں لے جاؤ، میں جرم کے افراد سے اپنی بیٹی کے لیے رخصت بھیک مانگوں گی۔“

”کواس بند کرو۔“ سمندر خان نے فرماتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری باتوں سے میں کمزور پڑنے والا نہیں ہوں۔ چٹان وادی کے کھینوں کے قبیلے بھی چٹانوں کی طرح مضبوط اور اٹکے ہوئے ہیں۔ میرے بعد آنے والی نسلیں بھی مجھے ایک غیرت مند باپ کے طور پر یاد رکھیں گی۔ جب کبھی بھی چٹان وادی کی غیرت قوم کا ذکر آئے گا۔ سمندر خان کا نام سرفہرست ہوگا۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے قبوہ کے آخری گھونٹ لیا اور ایک طرف رخ اپنی کلاشکوف اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ جرم کے میں جانے کے لیے اس نے اپنی پگڑی نہیں ہٹائی تھی کیونکہ یہ یہاں کا قانون تھا کہ جس گھر کی کوئی عورت گھر سے بھاگے اس گھر کا کوئی مرد اس وقت تک اپنی پگڑی نہیں ہٹا سکتا تھا جب تک وہ گھر سے بھاگنے والی لڑکی کو اپنے ہاتھوں سے موت کی نیند نہ سلا دے۔

جرم کے کا وقت ہو رہا تھا اس لیے سمندر خان گھر سے باہر نکل آیا۔ جنت گل بھی پریشان چہرہ لیے اس کے ساتھ ہی باہر نکل آئی۔

”سمندر خان! زرگل تمہاری بیٹی ہے۔“ اسے اپنے پیچھے جنت گل کی بے چین سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں مگر وہ بے پروائی سے آگے بڑھتا رہا۔ جب وہ سردار شیر خان کے ڈیرے پر پہنچا تو جرم کے کی کارروائی دیکھنے کے لیے خاصی بڑی تعداد میں لوگ آئے ہوئے تھے۔ سامنے ایک بڑی سی کرسی پر سردار شیر خان براجمان تھا۔ اس کے پیچھے اس کے سب آدی بڑے موہ بانہ انداز میں کھڑے تھے۔ زرگل کا باپ ہونے کے ناتے سمندر خان بھی اس مقدمے کا ایک اہم فریق تھا اس لیے اسے بھی بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کر دی گئی۔ سمندر خان سب کو سلام کرتا ہوا کرسی

پر بیٹھ گیا۔ اسی لمحے ان افراد میں سے ایک شخص کھڑا ہو گیا اور اس نے اونچی آواز میں بولنا شروع کر دیا۔

”جیسا کہ آپ سب حضرات جانتے ہیں کہ آج آپ کو بہادر خان اور زرگل کی سزا کا تعین کرنے کے لیے بلایا گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگ اپنی عزت اور غیرت پر کبھی سمجھوتہ نہیں کرتے۔ چاہے ہمیں اپنی جان دینی پڑے یا کسی کی جان لینی پڑے۔“

”آج بہادر خان اور زرگل کو بھی یہاں کے قانون کے مطابق سزا دی جائے گی تاکہ ان دونوں کا انجام دوسروں کے لیے باعث عبرت ہو۔ مگر یہ تقاضائے انصاف ہے کہ نرمان کو صفائی کا پورا پورا موقع دیا جائے۔ اس لیے میں کارروائی کے آغاز کا باقاعدہ اعلان کرتے ہوئے ملزمان کو حاضر کرنے کا حکم دیتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ شخص اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

سردار شیر خان نے اس شخص کا حکم سن کر پیچھے کھڑے ایک آدمی سے کان میں کھسکے کہ تو وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا ایک طرف بڑھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں بہادر خان اور زرگل کو سب آدمیوں کے زمرے میں جرم کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

بہادر خان چھٹ سے بھی لٹکتے ہوئے قدامت کا ایک کڑیل اور خور بنو جوان تھا، زرگل اس کے ساتھ کھڑی تھی تاہم اس نے برقع اودھ رکھا تھا۔

بہادر خان کے چہرے پر خوف کے تاثرات نہیں تھے تاہم تذبذب کے تاثرات ضرور موجود تھے۔ اس کے چہرے سے صاف عیاں ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی فیصلہ کرنے کے بارے میں کشمکش کی کیفیت سے دوچار ہو کیونکہ وہ قبیلے کے سردار کا بیٹا تھا اس لیے اسے بھی بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کر دی گئی تھی جبکہ زرگل کو صنف نازک ہونے کے باوجود کھڑا ہی رہنے دیا گیا۔

سمندر خان خاموشی سے بیٹھا جرم کے کی کارروائی کے آغاز کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر زرگل کے لیے نفرت کے تاثرات موجود تھے۔

”بہادر خان.....“ ان افراد میں سے ایک باریش شخص بولا۔ ”تم نے اور زرگل نے گھر سے بھاگ کر نہ صرف قبیلے کی غیرت کو لگا دیا ہے بلکہ یہاں کے قانون کو توڑنے کی بھی جسارت کی ہے۔ کیا تم اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہو؟“

”نہیں۔“ بہادر خان کے بولنے سے پہلے ہی سردار شیر خان بول پڑا۔ ”اصل مسئلہ یہ نہیں کہ یہ دونوں گھر

سے بھاگے ہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان دونوں میں سے یہ فیصلہ کس کا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ میرے بیٹے نے زرگل کو گھر سے بھاگنے پر اکسایا ہو۔ ایسی صورت میں زرگل کے ساتھ رعایت برتی جاسکتی ہے اور اسے سزائے موت نہیں دی جاسکتی لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ زرگل نے میرے بیٹے کو ہرنیا تھا تو پھر سزا کا اطلاق بھی صرف اسی پر ہوگا۔

”مگر سردار شیر خان! آج سے پہلے بھی قانون رائج رہا ہے کہ فرار ہونے والے لڑکا اور لڑکی دونوں کو برابر کا قصور وار تسلیم کیا جاتا ہے۔۔۔۔۔“ ان معززین میں سے ایک شخص بولا۔

”میں تسلیم کرتا ہوں کہ آج سے پہلے ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔“ سردار نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مگر وہ سزا اس لیے دی جاتی رہی ہے کہ دونوں ہی قصور وار ٹھہرتے تھے فرار کا فیصلہ ان کا مشترک ہوتا تھا۔

”مگر میرا بیٹا بہادر خان تو فیصلہ کرنے کے قابل ہی نہیں ہے کیونکہ تقریباً ایک ماہ پہلے اس پر ایک برسرار بیماری کا حملہ ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کے ذہن پر گہرا اثر ہوا ہے۔ اب اس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں رہا۔ یہ بظاہر ہوش مند شخص دکھائی دیتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ بیماری کے بعد سے یہ نیم پاگل ہو چکا ہے۔ میری آپ سب سے اتھاس ہے کہ فیصلہ کرتے وقت اس کی ذہنی بیماری کو ضرور مد نظر رکھا جائے۔ آپ سب جانتے ہی ہیں کہ میں کسی کے ساتھ زیادتی برداشت نہیں کر سکتا۔ چاہے وہ میرا بیٹا ہو یا کوئی اور۔“ اگرچہ شیر خان نے بات کرتے ہوئے اپنا لہجہ نرم ہی رکھا تھا اور الفاظ کا بھی مناسب چناؤ کیا تھا مگر اس کے باوجود جرم کے سبھی افراد نے اس کے الفاظ میں پوشیدہ دھمکی کو واضح طور پر محسوس کر لیا تھا۔ سردار انہیں کیا چلتا نا چاہ رہا تھا وہ بخوبی سمجھ چکے تھے۔ جرم کے افراد کو اس حقیقت کا بھی ادراک تھا کہ سردار سے خاصیت مول لے کر چٹان دادی میں رہنا بہت مشکل تھا۔

انہیں اب بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا تھا۔ شیر خان کے بدلے ہوئے تھوڑے سب کو دکھائی دے رہے تھے۔ ان سب کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنے اگوتے بیٹے کو بچانے کے لیے آخری حد تک جانے گا اور اس کی خاطر وہ کسی خونریز تصادم سے بھی گریز نہیں کرے گا۔

”سردار شیر خان! آپ کے بیٹے کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے بات آپ کو ثابت کرنا ہوگی۔ کیا آپ کے بیٹے کے پاگل پن کا کوئی گواہ موجود ہے؟“ جرم کے ایک فرد نے

مقاہانہ لہجے میں شیر خان کو مخاطب کیا۔

”میں اس سلسلے میں بیسوں گواہ پیش کر سکتا ہوں۔“ شیر خان مضبوط لہجے میں بولا۔ ”ویسے تو میری گواہی کافی ہے مگر شاید باپ ہونے کی وجہ سے میری گواہی کو غیر جانبدارانہ سمجھا جائے اس لیے میں اپنے بیٹے کے حق میں چند دوسرے گواہ پیش کرتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک طرف کھڑے کچھ افراد کو اشارہ کیا تو وہ افراد آگے بڑھ کر جرم کے افراد کے سامنے آ گئے۔

یہ سب اسی قبیلے کے مکین تھے۔ ”ہم سب اس بات کے گواہ ہیں کہ سردار شیر خان کا بیٹا بہادر خان بیماری کی وجہ سے اپنا ذہنی توازن کھو چکا ہے۔“ گواہان میں سے ایک بار پیش شخص بولا۔

”کیا باقی افراد بھی یہی گواہی دیتے ہیں؟“ جرم کے ایک فرد نے پوچھا۔

”ہاں ہم سب بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ سردار کے بیٹے کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔“ باقی افراد نے بھی ایک زبان ہو کر جواب دیا۔ سردار شیر خان نے انہیں رات ہی اچھی طرح ذہن نشین کرادیا تھا کہ انہیں کیا کہنا ہے۔ اس لیے وہ سب بڑے پُر اعتماد انداز میں کھڑے تھے اور پھر اس گواہی کے بعد شیر خان سے انعام بھی تو ملنا تھا۔ شیر خان نے جرم کے افراد کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھیکسی لہجے میں کہا۔

”کیا ایک نیم پاگل شخص پر بھی اس سزا کا اطلاق ہوگا جو کسی ہوش مند انسان پر ہوگا؟ اگر واقعی تو پھر مجھے آپ سب کی ذہنی صحت پر بھی شبہ ہوگا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس سارے فسادی جڑیہ لڑکی ہے، اسی نے میرے بیٹے کو ہرنیا یا تھا۔ دیکھیے۔ اس کے باپ کا جھکا ہوا سر۔ انہوں اس لڑکی نے تو اس کی عزت کی بھی کوئی برداشت نہیں کی۔“ شیر خان نے باقاعدہ سمندر خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس نے سردار کو اپنی طرف اشارہ کرتے دیکھ کر ذہنی میں سر جھکا لیا تھا۔

”اتنے افراد کی گواہی نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔“ جرم کے ایک فرد شیر خان کی حمایت کرتے ہوئے بولا۔ ”اگرچہ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ بہادر خان کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے پھر بھی میں چاہوں گا کہ بہادر خان ہمیں بتائے کہ اس لڑکی نے اسے گھر سے فرار ہونے کے لیے کس طرح مجبور کیا تھا؟“

اس شخص کا سوال سن کر سب کی نگاہیں بہادر خان کی جانب مبذول ہو گئیں۔ جیسے میں گویا ایک سکوت سا طاری

ہو گیا۔ بہادر خان کا جواب بہت اہمیت کا حامل تھا۔ زرگل بھی اپنی جگہ خاموش کھڑی تھی اگرچہ اس نے نقاب اوڑھ رکھا تھا مگر نقاب کی باریک جالی سے وہ سب کچھ دیکھ سکتی تھی۔ اسے پکڑے جانے کے بعد بہادر خان کے ساتھ نہیں رکھا گیا تھا بلکہ اسے ایک علیحدہ کمرے میں بند کیا گیا تھا۔ اس دادی میں سرکیں اور گاڑیاں نہیں تھیں۔ کچے راستے بنے ہوئے تھے جن پر سڑک کے لیے گھوڑوں اور خچروں کا استعمال ہوتا تھا۔ بہادر خان نے اسے نئی زندگی کی امید دلائی تھی۔ اس سے محبت کے بلند بانگ دعوے کیے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ شہر پہنچتے ہی وہ دونوں نکاح کر لیں گے۔

زرگل اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھی کہ کسی غیر مرد کے ساتھ گھر سے فرار ہونے کا کیا مطلب ہے۔ وہ جس معاشرے میں رہ رہی تھی، وہاں اسے ایک مذموم اور ناقابل معافی فعل سمجھا جاتا تھا۔ یہ ایک ایسا جرم تھا جس کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں تھی۔

اگرچہ وہ بچپن سے ہی باغیانہ مزاج رکھتی تھی مگر اس کے باوجود شاید وہ بھاگنے کا فیصلہ نہ کرتی لیکن بہادر خان کی محبت میں مجبور ہو کر وہ ایسا کر بیٹھی تھی۔ بہادر خان نے اسے ایک حسین اور خوشگوار زندگی کا خواب دکھلایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر اس کے باپ نے اس کا رشتہ نہیں اور طے نہ کر رکھا ہوتا تو وہ بھی یہ فیصلہ نہ کرتا۔ اس نے قسم کھا کر زرگل کو یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ زندگی بھر ساتھ بھائے گا۔ دھوکا نہیں دے گا۔ جب وہ قسمیں کھا کر اسے اپنی محبت کا یقین دلارہا تھا تو پھر زرگل کیسے پیچھے رہ سکتی تھی۔ بہادر خان پچھلے ایک سال سے اس کے پیچھے بڑا تھا۔ چھپ کر اس سے ملنے کے لیے آتا تھا، اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے گھنٹوں انتظار کیا کرتا تھا۔ اس کی منتقلی مزاحمتی نے آخر کار زرگل کو بھی ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

وہ اس کے ساتھ ایک نئی زندگی کی امید لے کر گھوڑے پر سوار ہوئی تھی۔ بہادر خان کا گھوڑا بہت برق رفتار اور طاقتور تھا۔ دو سواردوں کے وزن کے باوجود صبح سے لے کر شام تک مسلسل دوڑ سکتا تھا۔ برق رفتاری میں قبیلے کا کوئی دوسرا گھوڑا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ شاید وہ شہر تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہو جاتا مگر راستے میں ایک ہتھر پر ٹھوکر کھانے سے گھوڑے کی ٹانگ زخمی ہوئی جس کی وجہ سے وہ لنگڑا کر چلنے لگا۔ اس کی اس سست روی کے باعث ہی تعاقب میں آنے والے ان تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ بہادر خان کے پاس اپنی کلاشکوف

گزشتہ

مانتا پڑے گا کہ ہمارا ملک ابھی بہت پسماندہ ہے۔ یوں دکن روغیرہ تو بڑی چیزیں ہیں۔ نگاہ التفات تک کے لیے لائسنس مطلوب ہوتا ہے اور شادی کے لیے لڑکی کا پابند صوم و صلوٰۃ اور سکھ اور قبول صورت ہونا شرط ہے اور لڑکے کے لیے ضروری ہے کہ گزریڈو انسر ہو۔ عالی خاندان ہو، پنجابی اور اثنا عشری کو ترجیح دی جائے گی وغیرہ۔۔۔۔۔ یہاں طلب مغرب میں مزے بیٹھے اثر خواب آوری۔ اگلے روز آکسفورڈ اسٹریٹ پر جاتے ہوئے ہم ایک جگہ ٹھکے۔ بڑے بڑے حرفوں میں لکھا تھا۔ ”آئیے آئیے۔ نئے نئے دوست بنائیے۔“ دوٹی بڑی اچھی چیز ہے اور شاعر تک نصیحت کر گیا ہے۔ تو برائے وصل کردن آمدی۔ پردیس میں تو یوں بھی بے یاری و مددگاری کا سامن ہوتا ہے۔ ہم نے قریب جا کر دیکھا تو کاؤنٹر پر کھڑی روٹینہ نے ہمیں ایک فارم تھما دیا اور ایک ڈائجسٹ والے نو جوان کا کھڑے کھڑے بوسہ لیا۔ ہم نے رشک کیا کہ کاش یہ فارم ان صاحب کو دیا جاتا اور۔۔۔۔۔ شاید جلدی میں گزربارودرو بدل ہوگئی ہوتی۔ ابن انشا کے سفر نامے ”دنیا گول ہے“ سے اقتباس

- جس اے بے ایمان کننا نہیں چاہتے لیکن اگر کسی کے پاس اس سے بہتر لفظ ہو تو میں منہ جھکی رقم دے کر لفظ خریدنے کو بھی تیار ہوں۔
- جان آفت آگ۔ وہ حسن جیسے آگ بھی جلانہ سکے۔
- اہی دو میں ساری محبتیں پارسلٹم ہوتی ہیں۔
- حسین وہ ہے جسے میں پسند کرتا ہوں مگر دل کش وہ ہے جو مجھے پسند کرتی ہے
- مجھے بڑھاپا پسند ہے بشرطیکہ اس کا مستقبل روشن ہو۔
- تم ہمسد ہو اگرچہ سیکند ہرینڈ۔

موجودہ جی مہراٹھ آرمیوں کے ساتھ مقابلہ کرنا دانش مندی نہیں تھی۔ اس لیے اس نے گرفتاری دے دی تھی، بہر حال اب وہ پکڑے جانے لگے تھے۔

زرگل بڑے حوصلے کے ساتھ اپنی جگہ کھڑی تھی۔ اسے پکڑے جانے کے بعد سے کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ پیاس کی شدت سے اس کا حلق سوکھ رہا تھا مگر وہ پھر بھی یہ سب کچھ حوصلے سے سہہ رہی تھی۔ اس نے بہادر خان کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ جینے کے امکانات تو شاید اب معدوم ہو چکے تھے مگر ساتھ میں مرنے کے امکانات روشن تھے اور وہ بہادر خان کے ساتھ مرنے کو بھی تیار تھی۔ عہد کیا تھا اور اب دفائے عہد کا وقت آچکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ بہادر خان بھی پیچھے نہیں ہٹے گا۔ وہ محض نام کا بہادر نہیں تھا اور نہ ہی موت کو سامنے دیکھ کر گھبرانے والوں میں سے تھا۔

یہ زرگل کے خیالات تھے اور خیالات کا تعلق بھی خیالی دنیا سے ہوتا ہے۔ حقیقت کی دنیا بڑی مختلف اور تنگ ہوتی ہے۔ بہادر خان نے جرجے کے فرد کے سوال کا جو جواب دیا اس نے زرگل کو حقیقت کی دنیا میں آنے پر مجبور کر دیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے آسمان سے زمین پر بھیج دیا ہو۔

”ہاں۔ زرگل نے ہی مجھے فرار کی راہ دکھائی تھی۔ اسی نے مجھے مجبور کیا تھا، ورنہ میرا سمندر خان کی عزت پر قدغن لگانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ زرگل نے مجھے دھکی دی تھی کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ مجھے بدنام کر دے گی اور لوگوں سے کہے گی کہ میں نے اس کی عزت پر حملہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ پیادگی کی وجہ سے میرا ذہن پہلے ہی صحیح طرح کام نہیں کرتا، اس لیے میں نے پریشانی کے عالم میں زرگل کے ساتھ قبیلے سے فرار کا فیصلہ کر لیا۔“

زرگل نے تھیر لگائے۔ بہادر خان کا جواب سنا، لمحہ بھر کے لیے تو اسے یقین چلا نہ آیا کہ یہ جواب بہادر خان نے دیا ہے۔ وہ بزدل نہیں تھی، بچپن سے ہی اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور نا انصافیوں پر سراپا احتجاج تھی اور اس وجہ سے اپنے باپ سمندر خان سے مار بھی کھائی تھی پھر بہادر خان کا اتنا بڑا جھوٹ کیسے برداشت کر لیتی۔

اس نے ٹیگٹ اپنا نقاب الٹ دیا اور چٹنی ہوئی بہادر کی جانب بڑھی۔ ”ذلیل انسان! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ اس کی جارحانہ پیش قدمی پر بہادر خان اپنی کرسی سے اٹھ کر ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ زرگل شاید غصے

کے عالم میں اپنے ناخنوں سے بہادر خان کا منہ لوج لیتے مگر سردار شیر خان کے اشارے پر اس کے دو آدمیوں نے آگے بڑھ کر اطراف سے اس کے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ زرگل نے خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کی مگر دو طاقتور مردوں کی گرفت میں بے بس ہوئی۔

”بے جیا لڑکی!“ اسی لمحے سمندر خان اپنی کلا شکوف سیدھی کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ ”تم نے گھر سے بھاگ کر بطور باپ تو میرا سر شرم سے جھکا ہی دیا تھا مگر آج بھرے غمے میں بے پردہ ہو کر رہی کسی کسر بھی پوری کر دی ہے۔ میں تمہارے ناپاک وجود کو سنا دوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی کن کارخ زرگل کی جانب کر دیا۔

”نہیں سمندر خان۔“ اسی لمحے سردار شیر خان کی دہاڑی ہوئی آواز ابھری تو اس نے ٹریگر سے انگلی ہٹائی۔

”سمندر خان میں تمہارے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں۔“ شیر خان تیز لہجے میں بولا۔ ”مگر ابھی جرجے نے فیصلہ نہیں سنایا ہم سب یہاں کے قانون کے پابند ہیں اور قانون کا احترام کرتے ہیں۔ میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم خود پر قابو رکھتے ہوئے صبر تحمل سے کام لو اور جرجے کے فیصلے کا انتظار کرو۔“

”سردار ٹھیک کہہ رہا ہے سمندر خان۔“ جرجے کا ایک فرد شیر خان کی تائید میں بولا۔ ”تمہیں اپنی غیرت مندی کا مظاہرہ کرنے کا پورا پورا موقع دیا جائے گا۔ فی الحال صبر سے کام لو اور اپنی کلا شکوف نیچے کر کے کرسی پر بیٹھ جاؤ۔“

سردار اور جرجے کے فرد کی بات سن کر سمندر خان گود میں کلا شکوف رکھ کر دو پارہ کرسی پر بیٹھ گیا تاہم اس کے چہرے سے عیاں ہو رہا تھا کہ اس نے بڑی مشکل سے ضبط کیا ہے۔

”لڑکی۔۔۔ تمہیں بھی صفائی کا پورا پورا موقع دیا جائے گا مگر تم شاگنے کی اجازت ہرگز نہیں دی جاسکتی۔ آرام سے اپنا موقف بیان کرو۔“ جرجے کا وہی شخص درشت لہجے میں بولا جس نے سمندر خان کو کمرے سے کام لینے کا مشورہ دیا تھا۔

”مردوں کے معاشرے میں کسی عورت کے موقف کی بھلا کیا حیثیت؟“ زرگل کے بے باک اور دلیرانہ لہجے نے سب کو حیرت زدہ کر دیا۔

”میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں نے بہادر خان کے ساتھ بھاگ کر قبیلے کے قانون کو توڑا ہے اور میرا یہ اقدام غلط بھی ہے۔ میں بہادر خان کی باتوں میں آگئی تھی کیونکہ میں نے جرم کیا ہے اس لیے مجھے یہاں کے قانون کے

مطابق جرمی سزا سنائی جائے گی میں اسے قبول کروں گی مگر قانون سب کے لیے برابر ہوتا ہے۔ قانون میں سزا کا تعین کرتے وقت عورت اور مرد کی تفریق نہیں کی جاتی۔ مجھے جرجے کی جانب سے دی جانے والی ہرزاسی قبول ہے مگر اس سزا کا اطلاق بہادر خان پر بھی ہوتا ہے۔ یہ کہاں سے پاگل نظر آتا ہے؟“

”اس کے پاگل پن کی اتنے افراد نے گواہی دی ہے۔ ہم ان کی گواہی کیوں تسلیم نہ کریں؟“ اس شخص نے زرگل سے کہا۔ اس کا لہجہ بدستور درشت تھا۔ شاید وہ عورتوں سے اسی طرح بات کرنے کا عادی تھا۔

”چونکہ ان سب گواہان کا حقد پانی سردار شیر خان سے وابستہ ہے۔ ان کی گواہی غیر جانبدارانہ کیسے ہو سکتی ہے؟“ زرگل پُر اعتماد لہجے میں بولی۔

فوری طور پر جرجے کے اس فرد سے کوئی جواب نہ بن پڑا مگر اسی لمحے جرجے کا ایک اور فرد اس کی مدد کو آگے بڑھا اور بولا۔ ”اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ ان کی گواہی غیر جانبدارانہ نہیں ہے تو پھر بھی بہادر خان کی گواہی تمہاری گواہی سے زیادہ وزن رکھتی ہے کیونکہ مرد عورت سے افضل پیدا کیا گیا ہے۔ کسی کٹر عورت کی گواہی کو کسی افضل مرد کی گواہی پر فوقیت نہیں دی جاسکتی۔“

”وہ افضل مرد وہی کٹر عورت کے بطن سے جنم لیتا ہے۔“ زرگل نے زہر خند لہجے میں جواب دیا۔ زرگل کی بات وہاں موجود تمام افراد کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس نے بڑی جفاکی سے وہاں موجود افراد کی انا پر براہ راست حملہ کیا تھا۔

”مجھے کے اندر سے غصے اور تہمیں ڈوبی دلی دلی آواز میں ابھرنے لگیں۔ سمندر خان کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر آئندہ اس کے ہاں کسی بیٹی کی پیدائش ہوئی تو وہ اسے اسی وقت زمین میں دفن کر دے گا۔ اسے اب بس فیصلے کا انتظار تھا۔ اس کے بعد تو شاید وہ زرگل کو مارنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہ کرتا۔

”خاموش۔“ اسی لمحے سردار شیر خان کی تھمکانہ آواز ابھری تو مجمعے میں ابھرنے والی جھنجھٹاٹھم گئی۔

”دیکھنا میں نہ کہتا تھا کہ لڑکی آکسانے اور بھڑکانے میں خاصی مہارت رکھتی ہے۔“ قدرے توقف کے بعد شیر خان بولا۔ ”جب اس کی باتوں سے یہ سارا مجمع بھوک سکتا ہے تو پھر میرے معصوم اور بھولے بھالے بیٹے کی بھلائی کی حیثیت ہے۔ میرے خیال میں اب حقیقت سب پر واضح

ہو چکی ہے، اب اپنا فیصلہ سنا دینا چاہیے۔“

سردار کی بات سن کر تمام افراد مدھم آواز میں آپس میں صلح مشورہ کرنے لگے۔

زرگل ابھی سردار کے آدمیوں کی گرفت میں تھی۔ وہ اپنے سامنے خطرے سے گریزاں تھا۔ بہادر خان کو گھور رہی تھی جو مسلسل اس سے نظریں ملانے سے گریزاں تھا۔ بہادر خان کو رات اس کے باپ شیر خان سے سختی سے یہ ذہن نشین کر دیا تھا کہ اسے جرجے میں کیا کہنا ہے۔ باقی معاملات وہ خود سنبھال لے گا۔

یہ حقیقت تھی کہ بہادر خان زرگل کو پسند کرتا تھا اور اس سے شادی کا خواہش مند بھی تھا۔ اس نے شیر خان کو اس رشتے پر راضی کرنے کی بہت کوشش کی تھی مگر شیر خان مسلسل انکاری تھا۔ وہ بہادر خان کے سلسلے میں اپنے کسی عزیز کو زبان دے چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ زرگل کو لے کر اس جگہ سے فرار ہوا تھا۔ وہ زرگل کے ساتھ ایک نئی دنیا بسانا چاہتا تھا مگر قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا اور گھوڑا ازمنی ہونے کی وجہ سے وہ پکڑا گیا۔

پکڑے جانے کے بعد اسے اس حقیقت کا بخوبی ادراک ہو چکا تھا کہ اگر اس نے اپنے باپ کے حکم پر عمل نہ کیا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے موت سے نہیں بچا سکے گی۔ بہادر خان بھی دل ہی دل میں خوفزدہ ہو گیا تھا اور اسی وجہ سے اس جرجے کے سامنے گواہی دیتے ہوئے باپ کے حکم پر عمل کر ڈالا تھا اور پھر اس کے باپ نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ زندگی دوبارہ نہیں ملے گی۔ زرگل جیسی بیگم لڑکیاں دوبارہ مل جا سکتی ہیں۔

اسی لمحے جرجے کے افراد کی آہیں میں گنت دشمنی فتم ہو گئی۔ شاید وہ کسی فیصلے پر پہنچ گئے تھے۔ ان میں سے ایک باریش شخص کھڑا ہوا اور اس نے باقاعدہ اعلان شروع کر دیا۔

”ہم سب ایک حقد فیصلے پر پہنچ گئے ہیں۔ ہم نے تمام فریقین کو اپنا اپنا موقف پیش کرنے کا پورا پورا موقع دیا ہے۔ ہم نے زرگل اور بہادر خان کی باتیں بھی سنی ہیں۔ اگر زرگل کی یہ بات تسلیم کر بھی لی جائے کہ بہادر خان کے پاگل پن کی گواہی دینے والے افراد سردار شیر خان کے زیر اثر ہیں تو پھر بھی ہم یہی فیصلہ کرتے۔“

”بہادر خان کا کہنا ہے کہ زرگل نے اسے گھر سے پھاگنے پر مجبور کیا تھا اور کیونکہ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی، اس لیے وہ زرگل کی باتوں میں آکر بہک گیا تھا جبکہ

زرگل کا کہنا ہے کہ اسے بہادر خان نے ایسا کرنے پر اکسایا تھا، دونوں طرف سے لگا گیا الزام انصاف کے تقاضوں کے مطابق برابر بٹھرتا ہے مگر کیونکہ غور کی کوئی آدمی تسلیم کی جاتی ہے اس لیے بہادر خان کو مرد ہونے کی وجہ سے فوقیت دی جاتی ہے اور ہم اس کے موقف کو تسلیم کرتے ہیں۔

”کیونکہ وہ ذہنی طور پر بہار ہے اس لیے اس پر ہمارے قبیلے کے قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا۔ غیرت کے نام پر سزا صرف باہوش شخص کو ہی دی جاسکتی ہے تاہم ان سب باتوں کے باوجود بہادر خان کو بری الذمہ بھی قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اس سے بہر حال گناہ سرزد ہوا ہے۔ اس لیے اسے پچاس دنبوں کی قربانی کرنا ہوگی تاکہ اس کے گناہ کا کفادہ ادا ہو جائے۔“

”بہادر خان کے برعکس زرگل ایک بہ ہوش و حواس اور عقلمند لڑکی ہے، اس نے گھر سے فرار ہو کر بے حیائی کی ایک ایسی مثال قائم کی ہے جس کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی اس لیے ہم زرگل کے لیے سزا موت تجویز کرتے ہیں اور دستور کے مطابق اس سزا پر عملدرآمد اس کا باپ سمندر خان کرے گا۔“

”مجھے فیصلہ منظور ہے۔“ شیر خان مسرت بھرے لہجے میں بولا۔

”یہ کیا فیصلہ ہے بے غیردرا“ زرگل خود کو سردار کے آدمیوں سے چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ سردار کے بیٹے کے خلاف فیصلہ کرنے کی تم لوگوں میں جرأت ہی نہیں۔“

”سب لوگ چیخے ہٹ جاؤ۔“ اسی لمحے سمندر خان اپنی کلاشکوف سیدھی کرتے ہوئے دوبارہ کھڑا ہو گیا تو وہ دونوں آدمی زرگل کو چھوڑ کر پیچھے ہٹتے چلے گئے جنہوں نے سردار کے حکم پر اسے گرفت میں لے رکھا تھا۔ اطراف سے دوسرے افراد بھی اس خطرے کے پیش نظر پیچھے ہٹ گئے کہ کہیں ناگہانی طور پر سمندر خان کی گولیوں کی زد میں نہ آجائیں۔ سب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ سمندر خان اب زرگل پر گولیاں برسانے ہی والا ہے۔ زرگل اپنی جگہ تن کر کھڑی ہوئی تھی۔

”ظہر و سمندر خان۔“ اسی لمحے ایک فرد نے اسے گولی چلانے سے روک دیا۔ ”ہمارے دستور کے مطابق مرنے والے سے اس کی آخری خواہش ضرور پوری کی جاتی ہے۔“ اس شخص نے کہا اور پھر وہ زرگل کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”زرگل! اگر تمہاری کوئی آخری خواہش ہو تو بتاؤ۔ تمہاری ہر جائز خواہش پوری کی جائے گی۔“

اس کا سوال سن کر زرگل ہڈیانی انداز میں جس پڑی اور پھر بولی۔ ”ہاں میری ایک آخری خواہش ہے اور یہ بالکل جائز خواہش ہے مگر آپ لوگوں کے لیے اسے پورا کرنا شاید ممکن نہ ہو۔“

”تم اپنی خواہش بیان تو کرو یہ فیصلہ کرنا ہمارا کام ہے کہ تمہاری آخری خواہش پوری کی جاسکتی ہے یا نہیں۔“ اس شخص نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”میرا پیاس کی شدت سے حلق سوکھ گیا ہے میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید پانی مانگتی مگر میں تم لوگوں سے اپنی پیاس بھگانے کی درخواست نہیں کروں گی۔ میری آخری خواہش بس اتنی سی ہے کہ بہادر خان کا نام تبدیل کر کے بزدل خان رکھ دیا جائے کیونکہ اگر کوئی گیدڑ کا نام شیر بھی رکھ دے تو وہ بچ بچ شیر نہیں بن جاتا۔ اس نے مجھ سے محبت کے بڑے بلند و بالا دھنگ دعوے کیے تھے یہ کہتا تھا کہ یہ پہاڑوں کا سید ہے میرے لیے ہمت رکھتا ہے۔“

”اے خود پر بڑا ناز تھا مگر اب مجھ پر اس کی حقیقت منکشف ہو گئی ہے۔ یہ تو ایک چوہے ہے غمی زیادہ کیا کر رہا ہے۔“ زرگل کے الفاظ بہت توہین آمیز تھے۔ بہادر خان کا چہرہ تھمتھا اٹھا مگر وہ پھر بھی خاموش ہی رہا کیونکہ اسے زندگی عزیز تھی۔

”سمندر خان جرمے کے فیصلے پر عملدرآمد کرو۔“ اسی لمحے شیر خان نے دہاتے ہوئے کہا۔ شاید اس سے اپنے بیٹے کی توہین برداشت نہیں ہوئی۔

”بہت جاؤ میرے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو گیا ہے۔“ سمندر خان انہی آدمی آواز میں بولا اور پھر اس کی انگلی ٹریگر پر سخت ہوتی چلی گئی۔

”زرگل کو پانی تو پلا دو۔۔۔“ ایک فرد اونچی آواز میں بولا۔ ”جان لینے سے پہلے تو جانور کو بھی پانی پلا جاتا ہے۔“ مگر اس کی بات سمندر خان نے نظر انداز کرتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ ترزا ہٹ کی آواز کے ساتھ ہی سمندر خان کی کلاشکوف سے لٹکا ہوا برست زرگل کا سیدھ چلتی کر گیا اور وہ ایک دھماکے سے زمین پر جا گری۔ اس کا جسم کچھ دیر کے لیے تڑا اور پھر سکت ہو گیا۔ اس کی پٹھنی ٹکڑیوں میں اب بے نور ہو چکی تھیں مگر ان بے نور آنکھوں میں گویا بہت سے سوالات ثبت ہو گئے تھے بہت ہی حیرتیں جھپک رہی تھیں۔

”شاباش! سمندر خان شاباش۔“ سردار شیر خان نے

آگے بڑھ کر سمندر خان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اپنی بیٹی کو مار کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ تم ایک غیرت مند شخص ہو۔ زرگل کو مارتے وقت تمہارے ہاتھ کانپنے نہ چکے۔“ میں تمہیں سلام پیش کرتا ہوں اور ساتھ ہی اپنی پگڑی بھی۔“ یہ کہتے ہوئے شیر خان نے اپنی پگڑی اتار کر سمندر خان کے سر پر رکھ دی۔

سردار کا کسی کو اپنی پگڑی پیش کرنا اس کی بہت بڑی عزت افزائی تھی۔ سمندر خان نے اپنی کلاشکوف کندھے سے لٹکانی اور پھر بڑے فخر سے انداز میں تن کر کھڑا ہو گیا۔

”زرگل کی لاش کو لے جاؤ اور وادی کی سب سے گہری کھائی میں سپیک دو۔ اسے وادی کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جاسکتا۔ وہاں ہماری مائیں بہنیں اور بیٹیاں مدفون ہیں۔ اس بدکردار لڑکی کا مردہ جسم اس قابل ہے کہ اسے ساتھ پھینک دیا جائے۔“ سردار شیر خان نے دعوت بھرے لہجے میں کہا تو اس کے دو آدمیوں نے آگے بڑھ کر زرگل کی لاش کو اٹھا یا اور پھر ڈیرے کے خارجی وردازے کی جانب بڑھ گئے۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں کہاں جانا ہے۔

”میں آپ تمام افراد کو بھی ایک منعغانہ فیصلہ کرنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔“ سردار نے تمام افراد کی جانب متوجہ ہو کر کہا۔ ”چاہے کچھ بھی ہو انصاف کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ آپ کے فیصلے کے مطابق بہادر خان کی طرف سے کل ہی پچاس دنبوں کی قربانی دے دی جائے گی تاکہ سب کو قینیں آجائے کہ یہاں کا قانون سب کے لیے برابر ہے اور قانون کا اطلاق سردار کے بیٹے پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کسی عام آدمی پر۔ ساتھ ہی ساتھ میں نصرت ختم کرنے کا بھی اعلان کرتا ہوں۔“ شیر خان نے کہا تو نصرت میں شامل اور دیگر افراد سردار اور سمندر خان سے ہاتھ ملاتے ہوئے ڈیرے سے باہر نکلتا شروں ہو گئے۔

بہادر خان سب سے الگ تھلک ایک طرف خاموشی سے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں زرگل کے کہے ہوئے الفاظ ابھی تک گونج رہے تھے کہ گیدڑ کا نام شیر رکھ دیا جائے تو وہ بچ بچ شیر نہیں بن جاتا۔ بہادر خان کو اپنے پورے وجود پر ایک نامعلوم سا بوجھ محسوس ہو رہا تھا اور شاید یہ بوجھ اب اسے عمر بھر اٹھانا تھا۔

”اچھا سردار اب مجھے بھی اجازت دیجیے۔“ سمندر خان نے بھی جانے کی اجازت طلب کی۔

”ٹھیک ہے مگر تمہاری عزت افزائی کے لیے میرے

آدمی تمہیں گھر تک چھوڑنے ساتھ جائیں گے حشمت خان!“ یہ کہتے ہوئے سردار شیر خان نے اپنے ایک آدمی کو آواز دی تو ایک بڑی بڑی موچوں والا شخص سامنے آ گیا۔

سمندر خان بھی حشمت خان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ سردار کا بہت قریبی اور اہم آدمی تھا۔ یہ بات پورے قبیلے میں مشہور تھی کہ سردار اپنے تمام آدمیوں میں سب سے زیادہ اعتماد حشمت خان پر ہی کرتا ہے۔

”حشمت خان! دو سح آدمی ساتھ لے لو اور سمندر خان کو عزت کے ساتھ اس کے گھر تک چھوڑ آؤ۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے حشمت خان کو مخصوص انداز میں آنکھ سے اشارہ بھی دیا۔

”جی بھتر خان صاحب۔“ حشمت خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سمندر خان سردار کے آدمیوں کے ہمراہ ڈیرے سے باہر آ گیا۔ جب وہ ڈیرے میں داخل ہوا تو اس کی گردن جھکی ہوئی تھی مگر اب وہ گردن اٹھا کر بڑی شان اور حمکنت سے چل رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ سب چلتے چلتے سمندر خان کے کچے مکان کے پاس پہنچ گئے۔

”تم دونوں یہیں ٹھہرو مجھے سمندر خان سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ حشمت خان نے کہا تو ان کے پیچھے چلنے والے دونوں سح افراد وہیں رک گئے۔

”تمہیں مجھ سے کیا بات کرنی ہے؟“ سمندر خان نے حیرت بھرے لہجے میں سوال۔

”میں تمہیں سردار کا ایک پیغام پہنچانا چاہتا ہوں۔ میں اسی کی ایما پر تمہارے ساتھ آیا ہوں۔ میرے خیال میں بیٹے کی بات ہو جائے تو بہتر ہے۔“ حشمت خان نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں چلتے چلتے اب سمندر خان کے گھر کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ عین اسی وقت گھر کے اندر سے سمندر خان کی بیوی جنت گل برآمد ہوئی۔ سمندر خان کی چھوٹی بیٹی فرشتہ گل بھی اس کے ہمراہ تھی۔ جنت گل نے بغور سمندر خان کے چہرے کا جائزہ لیا پھر اس کی پگڑی کی جانب دیکھا اور ساری صورت حال اسے کچھ میں آ گئی۔ اسے سمندر خان کے تھمتھاتے چہرے اور سر پر موجود خوب صورت پگڑی سے ہی اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کی بیٹی زرگل اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ گولیاں چلنے کی آواز اس نے بھی سنی تھی تو گویا اس وقت ایک باپ اپنی ہی اولاد کا خون بہا رہا تھا۔ آنسوؤں کا ایک سیلابی ریلوا تھا جو بکثرت جنت گل کی

تجاوز کر چکی ہے۔“
 ”تو کیا ہوا؟“ حشمت خان نے سامحانہ لہجے میں کہا۔ ”کیا یہ کوئی انہونی بات ہے؟ کیا اس سے پہلے ہمارے قبیلے میں بھی ایسا نہیں ہوا۔“
 ”مگر سردار بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔“ سمندر خان نے متذبذب لہجے میں کہا۔
 ”مرد بھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ سردار کو اپنی دامادی میں قبول کر لینے سے قبیلے میں تمہاری کتنی عزت ہوگی۔“

”مگر لوگ باتیں بنا نہیں گے کہ سمندر خان بے حس ہو گیا ہے۔ پیسوں کے لالچ میں اپنی چودہ سالہ بیٹی کو ایک پچاس سالہ شخص سے بیاہ دیا ہے۔“ سمندر خان نے مضطرب لہجے میں کہا۔

”اس وقت اس بات کو چھوڑو، یہ دیکھو کہ بدلے میں بال کتنا مل رہا ہے۔ سردار رشتہ قبول کر لینے کی صورت میں تمہیں اپنی انیوں کی فصل کے کل منافع میں سے بیس فیصد حصہ دے گا۔ تم جانتے ہی ہو کہ وہ کتنی بڑی زمین کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ کراچ کے وقت پانچ لاکھ نقد بھی دے گا۔“ حشمت خان نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ اتنی بڑی پیشکش کا سن کر سمندر خان انگشت بدعاں رہ گیا۔

”کیا واقعی؟“ اس نے سرت سرت بھرے لہجے میں پوچھا۔
 ”بالکل.....“ حشمت خان اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”سردار اپنا سر تو کٹوا سکتا ہے مگر اپنے قول سے نہیں پھر سکتا۔ دیے بھی تم جانتے ہی ہو کہ سردار کو نہ سننے کی عادت نہیں ہے۔“

اس کی بات سن کر سمندر خان سوچ میں پڑ گیا۔ سردار کو انکار کر کے اس سے خاصیت مول نہیں لی جاسکتی تھی اور پھر اس کی پیشکش بھی بہت بڑی تھی۔ سمندر خان کی تو قسمت ہی بدل جاتی۔ اگرچہ جنت کل اپنی بیٹی کے اس رشتے پر بھی رضامند ہونے والی نہیں تھی مگر تھوڑا سا تشدد کر کے اس کی زبان بند کی جاسکتی تھی۔

حشمت خان ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا کہ یہ وقت زیادہ سوچ بچار کا نہیں تھا۔ سردار کی پیشکش قبول کر لینے میں عافیت بھی تھی اور فائدہ بھی۔ ”مجھے منظور ہے۔“ فیصلہ کرتے ہی سمندر خان بولا۔ ”مگر سردار کو کہہ دو کہ انیوں کے منافع میں سے تو بیس فیصد ٹھیک ہے مگر نقد میں پانچ نہیں پورے دس لاکھ لوں گا..... پورے دس لاکھ۔“

آنکھوں سے بہہ نکلا۔ اس نے برقی آنکھوں کے ساتھ ایک حسرت بھری نگاہ آسان پر ڈالی اور فرشتہ گل کا ہاتھ تھام کر مکان کے اندر چلی گئی۔

”آؤ حشمت خان! ایک طرف بیٹھتے ہیں۔“ سمندر خان نے کہا تو وہ سر ہلاتا ہوا اس کے ہمراہ ایک طرف بھیجی ہوئی ایک پرانی سی درزی پر بیٹھ گیا۔ ”معاف کرنا حشمت خان اگرچہ تم میرے مہمان ہو مگر اس وقت میں تمہاری توجہ سے تو اسٹین نہیں کر سکتا۔ تم نے میری بیوی کی حالت تو دیکھ لی ہی ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ حشمت خان نے ہنسی لہجے میں جواب دیا۔ ”وہ ایک ماں ہے اپنی بیٹی کے لیے غمزدہ ہونا اس کی فطرت میں شامل ہے۔ بہر حال اس وقت ان باتوں کو چھوڑو، مجھے تم سے بہت اہم بات کرنی ہے۔“

”ہاں تم نے کہا تھا کہ سردار نے میرے لیے کوئی پیغام بھیجا ہے۔“ سمندر خان نے استفسار کیا۔

”بات دراصل یہ ہے میرے دوست۔“ حشمت خان نے باقاعدہ تجویز باندھتے ہوئے کہا۔ ”سردار شیر خان بہت رحم و دل انسان واقع ہوا ہے۔ اسے تمہاری غربت کا بڑا احساس اور دکھ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تمہاری یہ غربت دور ہو جائے۔ اگر یہ زرگل والا معاملہ درمیان میں نہ چبکتا تو میں پہلے ہی اس بارے میں تم سے بات کر چکا ہوتا۔ دراصل سردار نے تمہاری غربت دور کرنے کے لیے تمہیں ایک پیشکش کی ہے اس نے تمہاری چھوٹی بیٹی فرشتہ گل کے لیے رشتے کا پیغام بھیجا ہے۔“

”تم کیا کہہ رہے ہو حشمت خان۔“ سمندر خان متعجب لہجے میں بولا۔ ”فرشتہ گل ابھی بہت چھوٹی ہے اور بہت معصوم بھی اور پھر سردار کا بیٹا بہادر خان پہلے زرگل کو ہکا کر لے گیا تھا۔ کیا اب اس سے فرشتہ گل کا رشتہ مناسب ہوگا؟“

”تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ حشمت خان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”سردار شیر خان نے فرشتہ گل کا رشتہ بہادر خان کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے مانگا ہے۔ وہ خود تمہاری بیٹی سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ایک دو دفعہ فرشتہ گل کو دیکھا تھا اور اسی وقت اسے اپنی دہن بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔“

”تم کیا کہہ رہے ہو حشمت خان۔“ سمندر خان نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”جانتے بھی ہو کہ فرشتہ گل ابھی صرف چودہ سال کی ہے اور شاید ذہنی طور پر اپنی عمر سے بھی کہیں چھوٹی جبکہ سردار شیر خان کی عمر پچاس برس سے بھی



انتقام

انجمن داروق حاصل

یہ بات تو طے ہے کہ مجرمانہ ذہنیت کے حامل افراد کبھی انصاف کے تقاضے پورے نہیں کر سکتے... انہیں بھی اپنے زور بازو پر بڑا ناز تھا... لیکن وہ پھر بھی عقل والوں سے مقابلہ نہ کر سکے... کیونکہ عقل کا پھندا ان کے گلے میں اٹک گیا تھا جہاں بازو زور لگانے کے باوجود پھانسی نہ پاسکے۔

جوش میں ہوش کھو دینے والے

مجرموں کا غیر تاک انجمن

دروازے پر پہنچ کر کھنٹی بجانے سے پہلے میں نے آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ سو ڈالریں، میں نے بالوں کی نئی وگ خریدی تھی اور جیکے ہوئے شانوں کو سیدھا کرنے کے لیے خصوصی سوٹ پر بھی میرے ساڑھے

کیا۔ ”جناب اچھے تھامس کہتے ہیں۔ چند منٹ پیشتر میں نے پیٹرول پمپ پر لینے کے لیے بات کی تھی۔“

”اوہو..... تو مسٹر تھامس آپ ہیں؟ آئیے اندر تشریف لے آئیے۔“ مکان اندر سے انتہائی شاندار تھا۔ قیمتی فرنیچر اور دیگر قسم کی آرامی اشیاء بڑے سلیقے سے سجائی گئی تھیں۔ ایک تباہی خیز کے لیے یہ مکان ضرورت سے زیادہ بڑا تھا۔ ”کیا آپ کو پیٹرول پمپ چلانے کا سابقہ تجربہ بھی ہے؟“

”جی ہاں اس سے پہلے میں کئی پیٹرول پمپوں پر کام کر چکا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ اگر آپ ساز و سامان کے اڑھائی سو ڈالرز کا کر سکتے ہیں تو کل صبح سے ہی پمپ کھول لیں۔“

”جناب! جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ میرے پاس زیادہ رقم نہیں ہے۔ کیا آپ نے میرے بینک سے قرض کی بات کی تھی؟“

”یقیناً میں بینک گیا تھا۔ اس نے اس طرح جواب دیا جیسے وہ میرے سوال پر چونک گیا ہو۔“ میں نے ان تمام لوگوں کے اکاؤنٹ چیک کیے جن سے میرا کاروبار ہے۔ میرے بینک پیٹرول پمپ ہیں اور میں نے ان سب کے لیے ساز و سامان کے ڈھائی سو ڈالرز وصول کیے ہیں۔“

”مجھے افسوس ہے مسٹر ایروڈز میں نے آپ کا وقت برباد کیا۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ایک منٹ ٹھہریے۔ شاید میں اس پمپ کے لیے کچھ رعایت دے سکوں۔“

”صرف اس پمپ کے لیے کیوں؟“ میں نے استفسار کیا۔

”اس کا ساز و سامان پرانا ہو چکا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ یہ پمپ بند پڑا رہے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر میری طرف اشارہ کرنے کے انداز میں دیکھا اور میری نظر اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ پر پڑی۔ اس کے دامن ہاتھ کی انگلی میں پڑی انگلی میں ایک بڑا سا ہیرا جگمگا رہا تھا۔

”کیا آپ ساز و سامان کے لیے ایک معاہدے پر دستخط کرویں گے؟“

”یقیناً۔“ میں نے جلدی سے جواب دیا۔ وہ سامنے پڑی ہوئی ایک ڈبیک کی طرف پلٹا اور پھر معاہدے کے فارموں کا ایک پیڑ اٹھالایا۔ اس نے معاہدے کے چند فارم نکال کر ڈرائنگ روم کی میز پر پھیلا دیے اور انہیں پُر کرنے لگا۔

”ہم معاہدے اور لیز کے سمجھوتے کی دو دو کاہیوں پر دستخط کریں گے اور ایک ایک کا پی اپنے پاس رکھیں گے۔“

میں نے سمجھوتے کا سوہ پڑھا..... ایک مین پر تین سینٹ۔

”ایک مین پر تین سینٹ کیا کرانے کے اعتبار سے زیادہ نہیں؟“ میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

”مسٹر تھامس! یہ بھی تو سوچئے کہ آپ سے کسی قسم کی رقم لیے بغیر صرف آپ کی زبان پر اعتبار کرتے ہوئے میں پیٹرول پمپ آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ اس بنیاد پر کیا میں کچھ زیادہ منافع لینے کا حق دار نہیں ہوں؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے مسٹر ایروڈز، میں معاہدے پر دستخط کروں گا اور کل صبح ہی پیٹرول پمپ کھول لوں گا۔“

”یہ ہوئی بات۔“ یہ کہتے ہوئے مسٹر ایروڈز کے چہرے پر اطمینان کا تاثر نمودار ہوا۔ انہوں نے پیٹرول پمپ کی چابیاں اور وہاں کی ساری اشیاء کی فہرست تمبا کر مجھ سے اشیاء کی فہرست پر دستخط لے لیے۔

”مسٹر ایروڈز! میں اس شخص سے کہاں مل سکتا ہوں جو اس سے قبل پیٹرول پمپ چلاتا رہا ہے۔“ میں نے دروازے سے نکلنے سے پہلے سوال کیا۔

”آپ اس سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟“ وہ کچھ مضطرب نظر آنے لگا۔

”میں اس سے کچھ معلومات حاصل کرنے کے لیے ملنا چاہتا ہوں۔“

”آپ اس سے نہیں مل سکیں گے کیونکہ میں نہیں جانتا کہ وہ اب کہاں ہوگا۔“

”لیکن اس نے پیٹرول پمپ بند کیوں کر دیا؟“ میں نے اصرار کیا۔

”میرے خیال میں وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا تھا..... خدا حافظ۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے دروازہ بند کر لیا۔ مجھے تالا لگانے کی آواز سنائی دی۔

☆☆☆☆

دوسرے دن سورج طلوع ہونے سے قبل ہی میں ایک ٹیکسی میں پیٹرول پمپ جا پہنچا۔ تباہی جلاہیں۔ تیل اور ٹانروں کی الماریاں ٹھیک ہیں اور سامنے بھی ہوئی برف صاف کی۔ چند منٹ بعد ہی میرا پہلا گاہک اندر داخل ہوا۔ ایک اچھے سلازمین کی طرح میں اپنے گاہکوں سے بہت ہی دوستانہ قسم کا رویہ رکھتا تھا اور انہیں مطمئن کرنے کی ہر ممکن

کوشش کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گاہک مجھے بہت پسند کرتے تھے لیکن مسٹر ایروڈز کو میری تاجرانہ صلاحیتوں پر شک تھا کیونکہ میں نے پیٹرول کی لیٹر کا نرخ، دو سینٹ فی گیلن زیادہ رکھا تھا نیز ٹائریوب اور دوسرا سامان انتہائی کم قیمت پر فروخت کرتا تھا۔

پہلے ہفتے کے آخر تک میں نے پیٹرول بہت ہی کم فروخت کیا تھا لیکن دوسری اشیاء کی فروخت بہت بڑھ چکی تھی۔ سلازمین صرف مجھے زیادہ سے زیادہ سامان دینے کو تیار تھے بلکہ ایک ہفتے کے ادھار پر مال دے رہے تھے۔ پیٹرول کے پلانٹ سے مجھے ادھار نہیں مل سکتا تھا اور مجھے پیٹرول کی زیادہ ضرورت بھی نہیں تھی۔ دوسرے ہفتے کے پہلے دن میں رات کو پمپ بند کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک لمبی سیاہ ہوک کار پمپ کی حدود میں داخل ہوئی اور دروازے کے قریب رک گئی۔ دو لمبے ترنگے آوی کار سے اترے اور آفس میں داخل ہو گئے۔

”کیسے کیسے ہیں؟“ ان میں سے ایک نے شیشے کو ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے سوال کیا۔

”فرمائیے جناب۔“ میں نے ایک ایک کر کہا اور انہیں مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”میں اور میرا ساتھی تاجروں کو تحفظ دینے کا کام کرتے ہیں۔ معمولی سی ہفتہ وار اجرت پر ہم آپ کے پمپ کو آتشزدگی، کھڑکی کے شیشے ٹوٹنے اور دوسرے نقصانات سے تحفظ فراہم کریں گے اور آپ کو بھی ٹھکوں اور غنڈوں سے محفوظ رکھیں گے۔“

”جی مجھے ابھی ایسا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہے۔“ میں نے منمناتے ہوئے جواب دیا۔ اس شخص نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ دوسرا آوی کار سے اتر کر اندر آیا اور محوم کر ایک ہتھر پمپ کے بڑے شیشے پر دے مارا۔ شیشہ چھٹا کے سے ٹوٹ کر زمین پر آ رہا۔

”میرا مطلب سمجھ گئے۔“ اجنبی نے سوال کیا۔

”جی ہاں۔“ میں نے ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ اجنبی اچانک پلٹا۔ اس نے میرا گر بیان پکڑ لیا اور مجھے دھکا دے کر ڈبیک کی دوسری طرف لے آیا۔

”تم حادثے کا شکار ہو سکتے ہو۔“ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ میں نے تھوک نچتے ہوئے جواب دیا۔

”اس کی ضرورت نہیں پڑے گی، میں ادائیگی کروں گا۔“

سنہری باتیں

☆ ہاتھوں کی خوبصورتی کے لیے ہاتھوں سے صدقہ کریں۔

☆ آواز کی خوبصورتی کے لیے تلاوت قرآن کریں۔

☆ آنکھ کی خوبصورتی کے لیے اللہ کے خوف سے آنسو نکالیں۔

☆ چہرے کی خوبصورتی کے لیے طہارت کے ساتھ وضو کریں۔

☆ دل کی خوبصورتی کے لیے اللہ کا ذکر کریں۔

☆ دماغ کی طاقت کے لیے اللہ کی بارگاہ میں سجدہ کریں۔

اللہ کو پسند ہے

- وہ دل جس میں مخلوق کا درد ہو۔
- وہ جگہ جہاں اللہ کا ذکر ہو۔
- وہ آنکھیں جس میں حیا ہو۔
- وہ شخص جو وعدہ وفا کرتا ہو۔
- وہ آنسو جو خوف خدا سے گرے۔
- وہ خدمت جو بغیر مطلب کے ہو۔

کترینین

☆ زندگی میں چھوٹا بن کر ہو گے تو اللہ پاک بڑی نعمتیں دیں گے۔

☆ بڑا ہونے پر تو ہاں بھی گود سے اتار دیں گے۔

☆ تمام تعریفیں اس اللہ رب العزت کے لیے جو اتنا کریم اور مہربان ہے کہ ہماری عبادت اور تقویٰ کو تو ہمارے چہروں سے ظاہر کر دیتا ہے مگر ہمارے گناہ ساری دنیا سے پوشیدہ رکھتا ہے۔

مرسلہ: براہیل شفیق، سندھی ہوٹل، نیوکراچی

دوست

میں اچھے دوست کو اچھے وقت سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں کیونکہ اچھا دوست اچھا وقت دے سکتا ہے مگر اچھا وقت اچھا دوست نہیں پیدا کر سکتا۔ (شیخ سعدی رحمۃ اللہ)

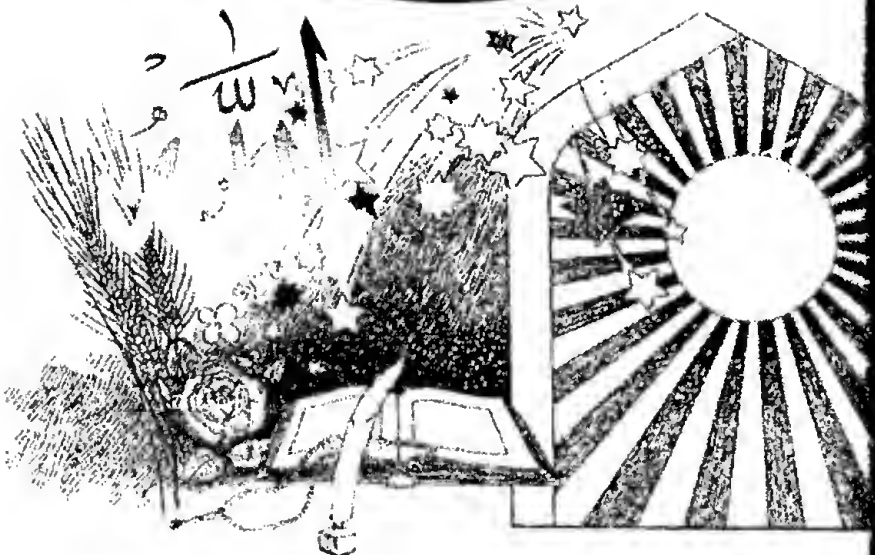
مرسلہ: محمد جاوید خان، قصہ میل پور

تیرا حصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام

رضوانہ صاحبہ

بادشاہت کو خطرہ ہمیشہ سے رہا ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا... یہ دور مختلف ادبیا کے آنے کا اور تبلیغی کام کرنے کے رہنے کا تھا... ان میں مصریوں کے بادشاہ فرعون کا قصہ سرفہرست ہے... حیرت ہے قدرت بھی کیسے نظارے دکھاتی ہے۔ نجومیوں نے ایک انتہائی طاقتور بادشاہ کے لیے نومولود بچے کو خطرے کی علامت بنا کر اشارہ نہ دیا تھا اور انہی اندیشوں میں اس وقت پیدا ہونے والے تمام نومولود بچے قتل کر دیے گئے ماسوائے ایک کے... جسے اللہ نے فرعون کی ہلاکت کا سبب اور اپنا پیغمبر بنا کر دنیا میں اتارا تھا۔ اس دور کی تمام مائیں خوف و دہشت کا شکار تھیں۔ ایسے میں موسیٰ کی ماں کو غیبی آواز آئی ”اس کو دودھ پلا... پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ غم اور خوف نہ کر کہ ہم اسے تیرے ہی پاس لوٹائیں گے اور اسے پیغمبروں میں شامل کریں گے۔“ سبحان قبری قدرت، یہ وعدہ پورا ہوا۔

مصر کی سرزمین پر مصریوں کی زنجیں اور
غیر کے مجرات کا احوال



حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام نے عرض کیا۔
”پروردگار! ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا یا ہم پڑے گا۔ فرمایا ڈرو مت۔ میں تمہارے ساتھ ہوں سب کچھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ جاؤ اس کے پاس اور کہو کہ ہم تیرے رب کے فرستادہ ہیں۔ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے لیے چھوڑ دے اور ان کو تکلیف نہ دے۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے ہیں اور سلاقتی ہے

پیٹرول کے ٹینک خالی ہو چکے تھے۔ ٹائر، بیٹری اور دوسرا سامان بھی تقریباً یک چکا تھا۔ سپلائی سامان دے کر واجبات وصول کر چکے تھے۔ جیسے ہی میں نے باہر کی بڑی لائش آف کیں، سیاہ بیوک دروازے کے پاس آ کر رکی۔ طویل قامت دیونما آدی گاڑی سے نیچے اترا اور ایک بریف کیس لیتے ہوئے آفس میں داخل ہوا۔ اس کا ساتھی اس کی پشت پر ساتھ ساتھ آ رہا تھا۔ طویل قامت آدی نے بریف کیس میری میز پر رکھ دیا اور ہاتھوں پر دستانے چڑھانے لگا۔
”دوسو ارز۔“ اس نے سرگوشی میں مطالبہ کیا۔
”ٹھیک ہے۔“ میں نے مکرراتے ہوئے کہا۔ ”رقم تیار ہے۔“ میں نے میز کی دراز کھلی اور سائینس لگا ہوا ریوالر نکال لیا پھر سوچنے کا موقع دیے بغیر ہی دونوں کی آنکھوں کو نشانہ بنا ڈالا۔
”گولیاں نکلتے ہی وہ فرش پر گر پڑے۔ میں نے ریوالر جب میں رکھ لیا اور انتہائی احتیاط سے ان کے بریف کیس کا معائنہ کیا۔ میری توقع کے مطابق یہ لوگ میری دکان پر آنے سے پہلے اور بھی کئی جگہوں سے بھتا وصول کر کے لائے تھے۔ بریف کیس میں غنڈا لکیں کی مدد میں وصول کیے ہوئے سات ہزار ڈالر موجود تھے۔ میں نے پیٹرول پمپ پر کمانی ہوئی رقم بھی اس میں شامل کی اور بریف کیس کو آگنی سے بند کر دیا۔
میں نے دگ اتاری اور جھکے ہوئے شانے صبح کرنے کے لیے لگائے جانے والے بیڈنگی تیس کے نیچے سے نکال لیے۔ یہ دونوں چیزیں میں نے احتیاط سے سوٹ کیس میں رکھ لیں اور تھوڑی دیر بعد سوٹ کیس اور رقم سے بھرا ہوا بریف کیس لیے بڑی شان سے لمبی سیاہ بیوک میں بیچے گیا۔
اصلی لیو تھامس کا نام میں نے ڈائریکٹری سے حاصل کیا تھا۔ پولیس جب اسے گرفتار کرے گی تو وہ یقیناً حیرت زدہ رہ جائے گا اور اس سے زیادہ حیرت مسٹر ایروڈ کو اس وقت ہوگی جب وہ دیکھے گا کہ لیو تھامس اس شخص سے قطعی مختلف ہے جسے اس نے پیٹرول پمپ لیز پر دیا تھا۔
شاید میرا یہ کام قرین انصاف نہ معلوم ہو لیکن وہ شخص میرا حقیقی بھائی اور دو معصوم بچوں کا باپ تھا جسے ان لوگوں نے دریا میں ڈبو کر ہلاک کر دیا تھا۔

”یقیناً تم ایسا ہی کرو گے۔“ اس کے بعد اس نے میری پینہ اور چہرے پر کچے برسانے شروع کر دیے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ہاتھ روکا اور مجھے کرسی پر دیکھ لیا۔
”میں اگلے جمعے کی رات کو پہلی قسط لینے آؤں گا۔ دو سو ڈالر تیار رکھنا۔“ اس نے میرا سر پیچھے کی طرف جھکایا اور چہرہ قریب لاکر تجھمانے لہجے میں بولا۔
”یاد رکھنا تمہیں دوسو ڈالر تیار رکھنا ہیں۔“
”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ میں نے ہلکاتے ہوئے کہا۔ ”ایسا ہی ہوگا۔“
دوسرے دن میں نے پیٹرول پمپ سے مسٹر ایروڈ کو فون کیا۔
”مسٹر ایروڈ! اکل کچھ لوگ میرے پاس آئے تھے۔“ میں نے اسے بتایا۔
”اوہ۔“ اس نے سہمہری سے جواب دیا۔
”دو افراد جو خود کو تاجروں کی حاضقی سروک کا آدی ظاہر کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے مارا پٹا اور دوسو ڈالر فی ہفتہ طلب کر رہے ہیں۔“ میں نے غصے سے کہا۔
”ٹھیک ہے بیٹے۔ یہ دنیا بڑی ظالم شے ہے۔“
”آپ ان کے بارے میں جانتے تھے مسٹر ایروڈ؟“
”ہوسکتا ہے کہ میں انہیں جانتا ہوں لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے!“
”اس شخص کا کیا بنا جس نے مجھ سے پہلے پیٹرول پمپ لیز پر لیا تھا؟“
”بیٹے! غالباً اس نے ادائیگی نہیں کی تھی۔ دو ہفتے قبل دریا سے اس کی لاش ملی ہے۔“
”مسٹر ایروڈ! اس کے بعد آپ کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ میں پیٹرول پمپ چلاؤں گا۔“
”کیا کہا... میرے خیال میں تم ایک اچھے لڑکے ہو۔“ ایروڈ نے جواب دیا۔
”لیکن میں آپ کو تین سینٹ فی گیلن اور ان بد معاشوں کو دوسو ڈالر فی ہفتہ ادائیگی کر سکتا۔“
”یاد رکھو! تم نے لیز اور ایک معاہدے پر دستخط کیے ہیں۔“ اس نے غراتے ہوئے دھمکی دی۔ ”اگر تم نے پمپ بند کیا تو میں تم پر مقدمہ کر دوں گا۔“
☆☆☆
اگلے جمعے کی رات کو میں نے حساب کتاب کیا تو میرے پاس تقریباً پانچ ہزار ڈالر کی رقم موجود تھی۔

اس کے لیے جو راہ راست کی پیروی کرے۔ ہم کو دینی سے بنایا گیا ہے کہ عذاب ہے اس کے لیے جو جھٹلائے اور منہ موڑے۔“ (طہ)

دونوں بھائیوں نے یہ سنا کہ وہ فرعون کے محل میں جا رہے ہیں اور اسے دعوت حق دیں گے لیکن پھر کچھ سوچ کر حضرت ہارون نے یہ تجویز دی کہ پہلے بنی اسرائیل کے بزرگوں کو جمع کر کے انہیں اپنی حالت سے آگاہ کیا جائے تاکہ فرعون کے مقابلے میں وہ ان کے حمایتی بن جائیں۔

جمع ہوئی تو انہوں نے قبیلے کے بزرگوں کو اپنے گھر میں جمع کیا اور جو کچھ ان پر گزرا تھا، وہ سب کہہ سنایا۔ ان بزرگوں نے یہ سن کر کہ خداوند نے بنی اسرائیل کی خبر لی اور ان کے دکھوں پر نظر کی انہوں نے اپنا سر جھکا کر سجدہ کیا اور یو کا بد کو مبارک باد دی کہ خدا نے ان کے بیٹوں کو بنی اسرائیل کا نجات دہندہ بنایا ہے۔

ان کی والدہ نے جب یہ سنا کہ وہ فرعون کے دربار میں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو بڑے شغف سے انہیں روکنے لگیں۔ ”تم ایک ایسے شخص کے پاس جانا چاہتے ہو جو صاحب تاج و تخت بھی ہے اور ظالم و مغرور بھی۔ وہ تمہارے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کرے۔ تم عام مصریوں تک جا کر اپنا پیغام کیوں نہیں پہنچاتے۔“

”اماں جان! آپ گھبرائی کیوں ہیں۔ ہمیں کہا گیا ہے کہ ہم فرعون کے پاس جائیں۔ خدا کا حکم ٹالنا نہیں سکتا۔ اس نے ہمیں یہ نوید بھی سنائی ہے کہ ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔ عام مصریوں کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ سب فرعون کے غلام ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں۔ وہ بھی ہماری بات نہیں سنیں گے۔ ہاں اگر ہم نے فرعون کو قائل کر لیا تو سب ہمارے قائل ہو جائیں گے اور پھر ہمیں بنی اسرائیل کو نکال لے جانے کے لیے فرعون ہی کی اجازت کی ضرورت ہوگی۔“

”میں تو اس لیے ڈرتی ہوں کہ وہ ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچائے۔“

”کیا آپ کو اللہ کے وعدے پر یقین نہیں؟“

”مجھے تو اس پر بھی یقین ہے اور اس کے رسول موئی پر بھی۔ مجھے یہ بھی خبر ہے کہ میں اس کی ماں ہوں۔“

”تو پھر ہمیں خوشی خوشی اجازت دیں اور ہمارے لیے دعائے خیر کریں۔“

”اللہ ہمیں کامیاب کرنے والا ہے اور میں اپنے اس فعل پر تادم ہوں کہ میں نے تمہیں روکنے کی کوشش کی۔“

حضرت موئی علیہ السلام نے اپنا بیچرانی عصا اٹھایا اور فرعون کے محل کی طرف چل دیے۔ حضرت ہارون ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ وہ جس بازار سے بھی گزرے استہزائی قبیلوں نے ان کا پیچھا کیا۔ ایک جگہ کر کہ حضرت موئی علیہ السلام نے ان لوگوں سے پوچھا۔

”تم لوگ ہمیں فرعون کے پاس جاتے ہوئے دیکھ کر ہنس کیوں رہے ہو؟“

”اس لیے ہنس رہے ہیں کہ جب تم وہاں سے واپس آؤ گے یا لائے جاؤ گے تو تمہاری حالت ہمیں رونے پر مجبور کر دے گی۔ ہمیں جتنا ہنسا ہے ابھی ہنس لیں۔“ انہوں نے کہا اور ایک ساتھ پھر کئی تہمتیں بلند ہوئے۔

حضرت موئی علیہ السلام جس عظیم مقصد کے لیے روانہ ہوئے تھے ان نادانوں سے الجھ کر اس مقصد سے غافل نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ آگے بڑھتے چلے گئے اور فرعون کے محل کے سامنے جا کر رک گئے۔

حضرت موئی کے لیے نہ یہ مشکل تھا نہ اس محل کے لیے حضرت موئی علیہ السلام۔ پھر سے دار انہیں اچھی طرح جانتے تھے لیکن اس وقت ان کے چہرے پر جو جلال تھا، وہ اس سے کڑھ بر اندام تھے۔ ان کے چہرے سے پہلے یہ خبر بھی پھر سے واردوں تک پہنچ گئی تھی کہ وہ فرعون سے دودھ ہاتھ کرنے آ رہے ہیں۔ انہیں حضرت موئی علیہ السلام سے محبت بھی تھی اور فرعون سے ڈرتے بھی تھے۔ انہوں نے بھی وہی شور مچا دیا جو ابتدا میں ان کی والدہ دوسے بچے تھیں۔

”آپ کیوں فرعون سے جھگڑا مول لیتے ہیں۔ کیا آپ اس کی جلالت و عظمت سے واقف نہیں؟“

انہوں نے وہی جواب پھر سے داروں کو بھی دیا جو وہ والدہ کو دے چکے تھے۔

”ہم اپنی رضا سے یہاں نہیں آئے۔ خدا کا حکم ہے اور ہم اسے ٹال نہیں سکتے اور تم فکر نہ کرو۔ وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

اس وقت تک پورے شہر میں خبر پھیل چکی تھی۔ بہت سے لوگ حضرت موئی علیہ السلام کے ساتھ لگے چلے آئے تھے۔ محل کے سامنے ایک پیٹری جمع ہو گئی تھی۔ کوئی فرعون کی خدائی سے اس کے منہ پر انکار کرنے آیا تھا۔ کچھ لوگ حضرت موئی

علیہ السلام کی ہمت کو داد دے رہے تھے تو کچھ لوگ ان پر افسوس کر رہے تھے۔

کچھ دیر کی سیل و جھت کے بعد محل کا دروازہ ان پر کھول دیا گیا۔ غالباً فرعون نے نہیں چاہتا تھا کہ موئی علیہ السلام پر دروازے بند کر کے یہ تاثر دیا جائے کہ فرعون ان سے مقابلے کی تاب نہ لا سکا۔ انہی دیر میں اسے یہ موقع بھی مل گیا کہ وہ اپنے شیروں کو اپنے گرد جمع کر سکے۔

حضرت موئی نے خوف و خطر اندر داخل ہوئے اور اس کے تخت کے قریب پہنچ کر اس سے مخاطب ہوئے۔

”اے فرعون۔“

”تم دیوتاؤں کے دیوتا کو سجدہ کیوں نہیں کرتے؟“ فرعون کے ایک شیر نے انہیں ٹوکا۔ ”کیا تو نہیں جانتا کہ تو آسمان راجہ“ کے منظر کے سامنے کھڑا ہے۔“

”اس کا سبب تو میں بعد میں بتاؤں گا، اس وقت تو میں دو درجہ بتاؤں گا جس نے مجھے یہاں آنے پر مجبور کیا۔ میں تجھے بتانے آیا ہوں کہ مجھے خدا نے اپنا پیغمبر اور رسول بنا کر حیرے پاس بھیجا ہے۔ اے فرعون! ہم تجھ سے دو باتیں چاہتے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا پر یقین لا اور کسی کو اس کا شریک نہ بنا۔ دوسرے یہ کہ ظلم سے باز آوری اسرائیل کو اپنی غلامی سے نجات دے۔“

”تو نے اپنے دل سے یہ دونوں باتیں خود گھڑی ہیں۔“ فرعون نے حقارت سے کہا۔

”مجھے یہ حیرات کیسے ہو سکتی ہے کہ خدا کا نام لے کر اپنی جانب سے کوئی بات کہوں۔ میری صداقت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ مجھے خدا نے معجزات عطا کیے ہیں لہذا حیرے لیے مناسب یہی ہے کہ صداقت و حق کے اس پیغام کو قبول کر اور بنی اسرائیل کو جنہیں تو نے قیدی بنا کر رکھا ہے، چھٹکارا دے کر میرے ساتھ کروے تاکہ میں انہیں پیغمبروں کی اس سر زمین میں لے جاؤں جہاں ذات واحد کے سوا یہ کسی اور کی پرستش نہ کریں۔“

”ہاں! فرعون کی آواز گونگی۔ ”کیا یہ شخص بنی اسرائیل ہی کا ایک فرد نہیں؟“

”میں نے تو اس کے بچپن ہی میں کہہ دیا تھا۔“

”کیا اس کی قوم ہماری غلام نہیں؟“

”یہ بھی غلام ہی ہے بلکہ خاندانہ اور غلام۔“

خاندانہ اور غلام کا کہنے ہی مفتاح (فرعون) کو کچھ یاد آ گیا۔ اب وہ حضرت موئی علیہ السلام سے مخاطب ہوا۔

”اے موئی! کیا تو وہی نہیں جس نے میرے گھر میں پرورش پائی؟ بچپن کی زندگی میں گزاری اور کیا تجھے وہ وقت بھی یاد نہیں جب تو نے ایک مصری کو قتل کر دیا تھا اور کہیں بھاگ گیا تھا۔ تجھے نہ ان احسانات کا پاس ہے جو میرے گھرانے کے تجھ پر ہیں اور نہ یہ خوف کہ تو ایک مجرم ہے جسے میں کسی وقت بھی گرفتار کر سکتا ہوں۔“

”مجھے حیرت کی بات سے انکار نہیں۔ میں نے حیرے گھر میں پرورش پائی۔ یہی تو قدرت کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ جو میرا بھی دشمن تھا اور میری قوم کا بھی، اس سے میری چاکری کرائی۔ اگر اسے میں احسان مان بھی لوں تو میرا یہ احسان مجھ پر ہے۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اس کے صلے میں تو میری قوم کو اپنا غلام بنالے۔ بنی اسرائیل جیسی عظیم قوم سے پیگار لے اور ان سے ذلیل کام کرانے۔ جہاں تک مصری کے قتل کا واقعہ ہے اس وقت میں بھٹکے والوں میں سے تھا۔ یہ واقعہ اچانک ہوا تھا اور نزول وحی سے قبل ہوا تھا۔ پھر اللہ نے مجھے نبوت دی اور مجھے رسولوں میں سے بنالیا۔“

فرعون نے یہ چاہا تھا کہ اپنے احسانات یا داد کر حضرت موئی علیہ السلام کے جذبات کو بھارا جائے لیکن ان کی دلیل سن کر لا جواب ہو گیا۔ اب وہ اپنی کرنا چاہتا تھا تاکہ اگر گردیشے ہوئے لوگوں پر فرعون کی کمزوری ظاہر نہ ہو۔

”اے موئی! میں نے بہت چاہا کہ تجھے وہ رعایت دوں جو خاندانہ اور غلاموں کو دی جاتی ہے لیکن تو اس کا اہل نہیں۔ اب تو سچ جگہ بتا جسے تھے مصری دیوتا نے اپنا نمائندہ بنا کر میرے پاس بھیجا ہے جسے تو نبوت اور رسالت کا نام دے رہا ہے؟“

مصری مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے جن میں سے بعض تو خاص خاص قبیلوں اور علاقوں کے تھے اور ان سب سے بلند آسمان راجہ تھامنی سورج۔

مصریوں کے اثر سے بہت سے بنی اسرائیل کے لوگ بھی ان دیوتاؤں کی پرستش کرنے لگے تھے۔ حضرت موئی علیہ السلام بنی اسرائیل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ یہی جتانے کے لیے ان سے یہ سوال کر رہا تھا کہ مجھے سمجھانے چلے آئے ہو، بنی اسرائیل تو خود ان کی پرستش کرتے ہیں۔

اس کا ایک ہوشیار مصاحب رخ نسواں بحث پر برابر نظر رکھے ہوئے تھا اور بھانپ گیا تھا کہ فرعون لا جواب ہوتا جا رہا ہے۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام غالب آگئے تو فرعون کی قوم پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔ کسی طرح اس مناظرے کو روک دیا جائے اور پھر کوئی تدبیر سوچی جائے۔

رخ نسوے ایک مرتبہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سمجھانے کی کوشش کی اس سے پہلے بھی وہ گفتگو میں دخل دے چکا تھا۔ ”موسیٰ! اس نکل میں تم کوئی شے نہیں ہو۔ فرعون سے بھی واقف ہو اور اس کے مرتبے سے بھی۔ فرعون کی جو حیثیت اس کی قوم میں ہے اس سے بھی واقف ہو۔ مصری قوم اس کی عبادت کرتی ہے۔ تمہیں اگر اس بے باک گفتگو کرنے کی اجازت دی جا رہی ہے تو اسے بھی اپنے لیے رعایت سمجھو۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم فرعون سے دشمنی مول لے کر اپنی قوم کو ہلاکت میں ڈال دو۔ تمہیں اگر مال و دولت درکار ہے جس کے لیے تم نے یہ ڈھونڈ کر چایا ہے تو میں فرعون سے تمہاری سفارش کر سکتا ہوں۔“

”اس کے لیے مجھے تمہاری سفارش کی ضرورت نہیں۔ اگر میرا منہ بند رکھنے کے لیے فرعون مجھے مال و دولت دینا چاہتا ہے تو خود اپنی زبان سے کہے۔“

رخ نسو کو چاک انکس احساس ہوا کہ وہ اپنے دام میں خود پھنس گیا ہے۔ اگر موسیٰ کے سامنے مال و دولت کے ڈھیر لگائے گئے تو یہ خبر چھپی نہیں رہے گی۔ لوگوں میں خورباتیں نہیں کی کہ فرعون کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باتوں کا جواب نہیں تھا۔ اس پیشکش کے جواب میں فرعون نے بھی اس کی طرف غصے سے دیکھا تھا۔

رخ نسوے ایک فلک بازی کھائی اور فرعون کے کان میں کہا۔ ”اس گفتگو کو چند روز کے لیے موقوف کر دیا جائے۔ اس کے بعد کوئی تدبیر سوچی جائے۔“

فرعون کا ترش بھی اب دلائل کے تیروں سے خالی ہو چکا تھا، وہ تو خود فرار کے مواقع ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے رخ نسو کو اشارہ کر دیا۔

رخ نسو نے کہنا شروع کیا۔ ”دلو تائی کے دلو تاجے ایک موقع اور دینا چاہتے ہیں۔ اس وقت بہتر ہے اس گفتگو کو موقوف کر دیا جائے اور تو چند روز بعد حاضر ہو۔ اس عرصے میں تو بھی سوچ لے گا کہ تیری قوم کے مناد میں کیا ہے اور میں بھی کوشش کروں گا کہ فرعون کے غصے میں کمی آجائے ورنہ تو وہ تجھے قید میں ڈالنے کا ارادہ کر ہی چکا ہے۔“

”میں بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ ہم تو خود یہ چاہتے ہیں کہ فرعون اس طرح ایمان نہ لائے جیسے کہ اس کے بیروکار خوف اور لالچ سے اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ ہم اسے سوچنے کا موقع دیتے ہیں تاکہ وہ خوب انجلی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لے۔“

رخ نسو نے کچھ آدمیوں کو گل کے بڑے پھانک کے ارد گرد پھیلا دیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام جیسے ہی باہر آئیں، انہیں گرفتار کر لینا اور جب تک میرا حکم نہ آئے انہیں باتوں میں الجھائے رکھنا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رخصت ہوتے ہی مصاحب خاص نے فرعون کو مشورہ دیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کے احکام دے دیے جائیں۔

”تو جب بھی سوچے گا لالسا سوچے گا۔ بنی اسرائیل کو ایک راہنما مل گیا ہے۔ اگر اسے گرفتار کیا گیا تو اس کی پوری قوم اس کی رہائی کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی اور ملک میں فساد برپا ہو جائے گا۔ اس کا علاج تو یہ ہے کہ موسیٰ کو اس کی قوم کی نظروں میں گرا دو۔ اس کی قوم کو یہ احساس دلادو کہ موسیٰ اپنی قوم کے کام نہیں آ سکتا بلکہ فرعون سے اچھے کا نتیجہ قوم کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ موسیٰ کو اس وقت جانے دو لیکن یہ انوہ پھیلا دو کہ موسیٰ، فرعون کو قائل کرنے میں ناکام رہا۔ لا جواب ہو کر واپس چلا گیا اور کہہ گیا ہے کہ تیار کیے کہ دوبارہ آئے گا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام جب تک گھر پہنچے، مصری قوم میں یہ خبر گردش کرنے لگی کہ مناظرے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شکست اٹھانی پڑی ہے۔ وہ فرعون کے سامنے ٹک نہیں سکے اور فرار ہو گئے۔

یہ خبر حضرت موسیٰ کو اس وقت معلوم ہوئی جب ان کی بہن حضرت مریم کے شوہر گھر تشریف لائے اور انہوں نے بازاروں میں ہونے والی گفتگو سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آگاہ کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں حقیقت سے آگاہ کیا لیکن وہ پورے شہر کو سمجھانے نہیں جاسکتے تھے۔ انہوں نے معاملہ خدا پر چھوڑ دیا۔

وہ فرعون کی مکاری کو سمجھ گئے تھے کہ انہیں بدنام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن یہ خوش آئند بات بھی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فرعون کے پاس دلائل ختم ہو گئے ہیں اور وہ قائل ہونے لگا ہے۔ یہ اس کی خدہ ہے جو اسے آخری حربے

اس کی مزید وضاحت فرعون کے قریب بیٹھے ہوئے ایک مشیر نے کی۔

”موسیٰ! تم ان دیوی دیوتاؤں سے واقف تو ہو گے۔ تم نے مصر ہی میں پرورش پائی ہے۔ ان کی پرستش بھی کرتے رہے ہو گے اور آج سورج دیوتا سے مخالفت پر کمر بستہ ہو۔ تم ضرور کسی شیطانی طاقت کے قبضے میں آ گئے ہو۔“

”میں تمہارے بنائے ہوئے معبودوں کا قائل نہیں۔ میں تو صرف ایک ہی ہستی کا قائل ہوں جو مارتی ہے، زندگی دیتی ہے۔ وہ اکیلا ہے، اس کے سوا کوئی نہیں۔ وہی رب العالمین ہے۔“

”یہ تو نئی بات کیا سنا تا ہے کہ میرے علاوہ بھی کوئی رب ہے کہ جس کو تو رب العالمین کہتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو اس کی حقیقت بیان کر۔“

اب یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مناظرے پر آمادہ ہو گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ ”اگر تجھ میں یقین اور ایمان سچ کی منجائش ہے تو تجھ کو سمجھنا چاہیے کہ میں جس ہستی کو رب العالمین کہتا ہوں، وہ ذاتہ اقدس ہے جس کے قبضہ قدرت میں آسمان، زمین اور ان دونوں کے درمیان کل مخلوقات کی ربوبیت ہے۔ فرعون! کیا تو دعویٰ کر سکتا ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے اسے تو نے پیدا کیا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر رب العالمین کی ربوبیت سے انکار کیوں کرتا ہے؟“

اس دلیل کا جواب فرعون کو تو سمجھنا نہیں، وہ اپنے ارد گرد بیٹھے ہوئے وزیروں کی مدد لینے پر مجبور ہو گیا۔

”تم سنتے ہو یہ کسی عجیب بات کہہ رہا ہے۔ میری ربوبیت سے انکار کرنے کے لیے کسی کیسی عجیب باتیں کر رہا ہے۔“

”آپ اس سے کہتے کیوں نہیں کہ مارا اور زندہ کرنا تو آپ کے اختیار میں بھی ہے۔ آپ ابھی کسی کے قتل کا حکم جاری کریں تو اسے قتل کر دیا جائے۔ جسے قتل کا حکم دیا جا چکا ہے اسے معاف کر دیں اور حیات بخش دیں۔“

”میں نے معاف کرنے کا نہیں کہا۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ کسی کو قتل کر کے دوبارہ زندہ فرمادیں۔ وہ مصری جو میرے ہاتھ سے قتل ہو گیا تھا اسی کو زندہ کر دیں۔ تم لوگ کیسے خوشامدی درباری ہو کہ جو اپنے آپ کو رب کہتا ہے اس سے اتنا سا امتحان بھی نہیں لے سکتے۔“

”تو اپنے رب سے کیوں نہیں کہتا کہ اس مصری کو زندہ کر دے جو تیرے ہاتھوں سے قتل ہوا تھا۔“

”میرے رب کی خدائی ایک نظام کے ماتحت ہے۔ ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔ جب وقت آئے گا، وہ مصری زندہ کر دیا جائے گا۔ کیا تو اس پر بھی ایمان نہیں رکھتا کہ جو مر گیا وہ دوبارہ زندہ ہوگا اور اسے زندہ کرنے والا میرا رب ہوگا تو نہیں۔“

”اس طرح تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ میرا جب جی چاہے گا میں مصری کو زندہ کر دوں گا۔“

”کیا تو ان اصولوں کے برخلاف کسی انسان کو پیدا کر سکتا ہے جو اصول خدا سے مقرر کیے ہیں۔ کیا تو میرے خدا کے مقرر کردہ اصولوں کا کوئی متبادل نظام پیدا کر سکتا ہے؟ اگر نہیں تو رب العالمین کی ربوبیت سے انکار کیوں کرتا ہے؟“

”جب تیرا رب تمام مخلوقات کا خالق و مالک ہے اور اس مرتبے پر ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں تو پھر پہلے کے لوگوں نے اس کے فیروں کی پرستش کیوں کی؟ ستاروں، سیاروں اور چاند سورج کو معبود کیوں بنایا؟ تو اس وقت ان کی رہبری کے لیے کیوں نہیں اتارا کیا؟“

”اس کا علم میرے پروردگار کے پاس ہے اور یہ تیرے معبود بننے پر دلیل نہیں۔ تجھ سے پہلے کے لوگوں نے جو کچھ کیا وہ سب اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ ہے۔ اس لیے کہ میرا پروردگار وہ ہے جس کی ربوبیت کے اثر سے تیرا اور تیرے باپ کا وجود بھی خالی نہیں۔ تیرے آباؤ اجداد کو بھی وہی وجود میں لایا تھا جو تجھے وجود میں لایا۔“

فرعون کے پاس ان دلیلوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ جب کسی کے پاس کوئی جواب نہ ہو اور سامنے کو بھی تیار نہ ہو تو پھر سیدی راہ سے ہٹ کر اپنا پٹا بٹا کر لے لیتا ہے۔ فرعون کے پاس بھی جواب ختم ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے مصاحبوں کو طلب کیا۔

”فیصل اپنے حواس کو بیٹھا ہے۔ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ میں یاگوں سے کیا بحث کروں۔“

”فرعون! اس کا مطلب ہے تیرے پاس مجھے جھٹلانے کے لیے کوئی دلیل نہیں رہی۔ ایک مرتبہ پھر زن لے کہ یہ جو شرقت و مغرب اور اس کے درمیان ساری کائنات نظر آتی ہے، اس کی ربوبیت جس کے قدرت میں ہے اس کو میں رب کہتا ہوں یعنی رب العالمین۔ اگر تم ذرا بھی عقل سے کام لو اور ضد چھوڑ دو تو یہ آسانی اس حقیقت کو پا سکتے ہو۔“

ذکر الہی

ایک بندہ خدا ایک رات اللہ اللہ کر رہا تھا تاکہ اس مالکِ حقیقی کے ذکر سے اس کے ہونٹ شیریں ہو جائیں۔
 ابلیس نے یہ دیکھا تو اس کے پاس جا کر بولا۔
 ”اوپے وقوف چپ کر تک اللہ اللہ کرنے میں مصروف رہے گا۔ کبھی اس کی طرف سے جواب بھی آیا ہے تجھے؟ جب جواب نہیں مل رہا تو اس کے ذکر کیا فائدہ؟“
 وہ بندہ خدا سوچ میں پڑ گیا۔ اس کا دل بہت دکھا۔ اسی خیال میں اسے نیند آگئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام تشریف فرما ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں۔ ”اے اللہ کے بندے! تو نے ذکر کیوں چھوڑ دیا؟“
 اس نے جواب دیا۔ ”میں فکر مند ہو گیا ہوں کہ مجھے اللہ کی طرف سے جواب کیوں موصول نہیں ہوا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرے پروردگار نے مجھ پر اپنا دردناک وازہ بند تو نہیں کر دیا۔“
 حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا۔ ”مجھ سے اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تجھ کو یہ بتاؤں کہ تو جو اللہ اللہ کرتا ہے وہ ہماری ہی توحید اے لیک ہے۔ وہ سوز و گداز جو تیرے دل میں پیدا ہو گیا ہے، وہ بھی تو ہمارا ہی بیجا ہوا ہے۔ کیا میں نے ہی تجھے اس ذکر میں مصروف نہیں کیا؟ کیا تیرا خوف، تیرا عشق الہی ہماری عنایت نہیں؟ تو جب ایک بار اللہ کہہ کر پکارتا ہے تو تیرے ذکر میں ہماری بار لیک پوشیدہ ہوتی ہے۔ جو میرا ذکر نہیں کرتے ان کے منہ اور دل پر قفل لگے ہوئے ہیں۔“
 اس حکایت میں یہ.... پوشیدہ ہے کہ بندہ جب اللہ کو یاد کرتا ہے، اسے پکارتا ہے تو اس کا مالک و خالق اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہے۔

انتخاب: میمونہ عزیز، کراچی

”مجھے خداوند نے بشارت دی ہے کہ یہ سختیاں کچھ دن رہیں گی، اس کے بعد میں تجھے مصر سے نکال لے جاؤں گا۔ تم فرعون کی دسڑی سے باہر چلے جاؤ گے۔“
 ”تم نے تو کہا تھا تم ہمارے نجات دہندہ ہو۔ ہم تمہارے وعدوں پر خوش ہو گئے تھے مگر اب تو مصری تمہارا بدلہ بھی ہم سے لے رہے ہیں۔“
 ”میرا وعدہ غلط ہو سکتا ہے مگر میرے رب کا وعدہ غلط نہیں ہو سکتا۔ وہ تمہیں فرعون سے ضرور نجات دلانے گا۔ اب تم راستے سے ہٹ جاؤ اور مجھے جانے دو۔“
 بنی اسرائیل نے راستہ دے دیا لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ایسا بے دلی سے کر رہے ہیں۔ آگے چل کر اگر سختیاں اور برصیں تو وہ حضرت موسیٰ کے بالکل ہی خلاف ہو جائیں گے۔
 حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام شاہی محل کے پھانک پر پہنچے تو خلاف توقع پہرے داروں نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ اندر جانے میں بس اتنی دیر لگی جتنی وہیں فرعون انہیں اندر آنے کی اجازت دیتا۔
 فرعون نہایت کدوفر کے ساتھ اپنے مشیروں کو ارد گرد لے کر تخت پر بیٹھا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے گفتگو میں پہل کی۔
 ”اے فرعون! ہم نے تجھے سوچنے کا موقع خوب دے دیا۔ تیرے مشیروں نے تجھے کیا اصلاح دی اور تو نے کیا فیصلہ کیا؟“
 ”میں بات میں مجھ سے پوچھتا ہوں۔ تو نے مجھے اپنا رب مان کر اپنی قوم کے لیے بھلائی کیا یا نہیں؟“
 ”ہمارا پروردگار تو وہ ایک ہی پروردگار ہے جس نے دنیا کی ہر چیز کو اس کا وجود بخشتا اور ہر طرح کی ضروری قوتیں دے کر اس پر زندگی ڈال کی راہیں کھول دیں۔ جس نے ہر چیز کو کثرت جسم و وجود عطا کی اور ہر سب کو منزل کمال کی طرف چلنے کی راہ دکھائی۔ تم کیسے رب ہو سکتے ہو۔ تم تو دوسرے انسانوں کی طرح خالی ہو۔ تم میرے رب پر ایمان لاؤ یا پھر بنی اسرائیل کو مصر سے نکل جانے کی اجازت دو۔“
 ”اے موسیٰ! یہی باتیں تم پہلے بھی کہہ چکے ہو۔ میں تمہاری یک بیک سے تنگ آ گیا ہوں۔ اب تم میری ربوبیت تسلیم کر دو۔ میں تمہیں قید میں ڈال دوں گا اور تمہاری قوم کو طرح طرح کی آزمائشیں دوں گا۔“
 ”اگر تو رب ہوتا تو بنی اسرائیل بھی تیری ہی مخلوق ہوتے۔ خیر ان باتوں کو چھوڑ۔ ہم ایک بار پھر تجھ سے کہتے ہیں کہ ہم

استعمال کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔
 ابھی یہ مشکل ایک دن گزرا تھا کہ بنی اسرائیل کے بہت سے لوگوں نے ان کے گھر کو گھیر لیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام باہر نکلے تو یہ لوگ بہت مشتعل تھے۔

”اے موسیٰ! تم کیا آئے ہماری مشکلیں تو اور بڑھ گئیں۔ اس سے تو ہم پہلے ہی اچھے تھے۔“
 ”صاف صاف بتاؤ۔ میں نے تمہاری کون سی مشکلیں بڑھا دیں؟“
 ”تم نے فرعون کو ناراض کر دیا۔ اب وہ تمہارا بدلہ ہم سے لے رہا ہے۔“
 ”کیسا بدلہ؟“

”فرعون نے بیگار لینے والوں اور سرداروں کو جو ہم پر حاکم ہیں، حکم دیا ہے کہ اب تم بنی اسرائیل کو انہیں بنانے کے لیے ”بھس“ نہ دینا جیسے اب تک دیتے رہے ہو۔ وہ سردار اب ہم سے کہہ رہے ہیں کہ ہم خود ہی جا کر بھس بنوریں اور اتنی ہی انہیں بنا دیں جتنی پہلے بناتے تھے۔ اب موسیٰ تم ہی بتاؤ کہ ہم بھس بنوریں یا انہیں بنا دیں۔ تم ہمیں جج بناؤ، فرعون سے تم نے کیا باتیں کی ہیں؟“

”میں نے تو تم لوگوں کو مصر سے باہر لے جانے کی بات ہے۔“
 ”وہ ہمیں کالی کے طعنے دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ ہم کام سے بچنے کے لیے موسیٰ کے ساتھ مصر سے باہر جانا چاہتے ہیں لہذا اس کا حکم ہے کہ ہم سے سخت محنت لی جائے۔“
 حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ”تم فرعون کے مظالم سے مت گھبراؤ۔ میرا ذکر سے کام لیتے رہو اور خدا کی ذات سے مایوس نہ ہو۔“

ایک بوڑھا آدمی آگے بڑھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گستاخی سے پیش آیا۔ ”خداوند تمہیں کبھے اور تمہارا انصاف کرے، تم نے تو فرعون اور اس کے خادموں کی نظروں میں ہمیں ایسا گرا دیا ہے کہ گو گو ہمارے قتل کے لیے ان کے ہاتھ میں لکوار دے دی ہے۔ ہمیں ہمارے سال پر چھوڑ دو۔ ہم یہاں بہت خوش ہیں۔ ہم مصر کو چھوڑ کر کہیں اور نہیں جائیں گے۔“
 ”اے میری قوم کے لوگو! میں فرعون کے پاس اپنی مرضی سے نہیں گیا تھا۔ میں تمہاری خواہشوں کے سامنے خدا کے فرمان کو نظر انداز نہیں کر سکتا، البتہ اسی سے پوچھوں گا کہ تو نے مجھے فرعون کے پاس کیوں بھیجا اور میرے لوگوں کو برائی میں کیوں ڈالا۔ اب تم لوگ جاؤ اور مجھے خداوند سے پوچھنے دو۔“
 وہ لوگ چلے گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر دلی نازل ہوئی۔

”میں فرعون کے دل کو سخت کروں گا اور اپنے نشان اور عجائب ملک مصر میں کثرت سے دکھاؤں گا تو بھی فرعون تمہاری نہ سنے گا۔ جب میں مصر کو ہاتھ لگاؤں گا اور اسے بڑی بڑی مزامیں دے کر اپنے لوگوں بنی اسرائیل کے جتوں کو ملک مصر سے نکال لاؤں گا اور میں جب مصر پر ہاتھ چلاؤں گا اور بنی اسرائیل کو ان میں سے نکال لاؤں گا تب مصری جانیں گے کہ میں خداوند ہوں اور جب فرعون تم کو کیے کہ اپنا بیچارہ بچہ دکھاؤ تو اپنی لائچی کو لے کر فرعون کے سامنے ڈال دینا تاکہ وہ صائب بن جائے۔“

ادھر یہ دلی نازل ہو رہی تھی، دوسری طرف فرعون گھبراہٹ کے عالم میں اپنے درباریوں کو لیے بیٹھا تھا۔ اس کے مشیر اسے مشورہ دے رہے تھے کہ وہ موسیٰ سے ہونے والی گفتگو میں رب العالمین کا تذکرہ نہ چھیڑے۔ لگتا ہے وہ اس موضوع پر خوب تیاری کر کے آئے تھے گفتگو موسیٰ کی ذات تک محدود رہے اور اس سے یہ کہہ کر کہ وہ رسالت کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ اس کا کوئی ثبوت پیش کرے اور کوئی بیچارہ بچہ دکھائے۔ پس وہ لا جواب ہو جائے گا۔

اس کے مشیروں کے دل میں اللہ ہی نے یہ بات ڈالی ہوگی کیونکہ اللہ کو اپنا بیچارہ بچہ دکھانا تھا۔ اسی کے لیے راہ ہموار کی جا رہی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک مرتبہ پھر فرعون کے دربار میں جانے کے لیے گھر سے نکلے۔ اس مرتبہ انہیں روکنے والے مصری نہیں بلکہ خود بنی اسرائیل کے لوگ تھے جو ان کی راہ میں کھڑے تھے۔

”موسیٰ! تم پھر فرعون سے اعلان جنگ کرنے جا رہے ہو۔ تمہاری ذاتی دشمنی میں ہماری مصیبت آگئی ہے۔ تم اس سے لڑائی مول لے رہے ہو اور ہم پر سختیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ہم تمہیں ہرگز اس کے پاس نہیں جانے دیں گے۔“
 ”میری قوم کے نادان لوگو! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ہم دونوں بھائیوں کو اپنا کام کرنے دو اور کچھ دن صبر سے کام لو۔“

دونوں یہاں اپنے خدا کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ ہم نے اس کا پیغام تجھ تک پہنچا دیا۔ اب تم لوگ باز آ جاؤ اور گمراہی سے کنارہ کشی اختیار کر لو۔“

”تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ تو ایک ان دیکھے خدا کا بھیجا ہوا ہے۔“

”میں خدا کی جانب سے واضح نشان لے کر آیا ہوں۔“

”اگر تو سچا ہے تو لا، وہ نشان دکھا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھے اور اللہ کے حکم کے مطابق اپنا عصا (لاٹھی) زمین پر ڈال دی۔ یہ عصا زمین پر گرتے ہی اڑو پہ کی شکل اختیار کر گیا۔ اس اڑو سے نے حرکت کی تو کھلی جگہ کئی۔ فرعون کا وہ بدبہ خاک میں مل گیا، لوگ اس کی بے ادبی کرتے ہوئے اس کے سامنے سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی اٹھنے کی جرأت نہیں کرتا تھا اور اب بھاگتے پھرتے تھے۔ خود فرعون نے اپنے پاؤں میٹر لیے تھے۔

”موسیٰ یہ کیا؟“

”یہ اللہ کی نشانیں میں سے ایک نشان ہے۔“

”یہ تو سراسر جادو ہے۔ اب اس اڑو پہ کو قابو کرو۔ ہم نے تمہارا جادو دیکھ لیا۔“

فرعون کو زبردست شکست ہوئی تھی۔ وہ خود کو ”رب“ کہلاتا تھا اور اب ایک اڑو پہ سے خوفزدہ ہو کر اپنے تخت پر پاؤں سینے بیٹھا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ رہا تھا کہ وہ اس کے پاس آ کر توڑ دیں نہ ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سانپ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہاتھ میں آتے ہی وہ عصا کی شکل اختیار کر گیا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالا اور نکالا تو انتہائی تیز روشن اور پتکدار ہو گیا۔ پھر واپس اپنے گریبان میں ڈالا تو اصلی حالت میں آ گیا۔

سانپ نے لاٹھی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ درباریوں کا خوف کسی حد تک زائل ہو چکا تھا۔ ان کے حواس بحال ہوئے تو ان کے دل پہلے کی طرح ایک مرتبہ پھر سخت ہو گئے۔

درباریوں نے فرعون سے کہا: ”یہ تو بہت بڑا جادوگر ہے۔ یہ ہمیں خوفزدہ کر کے ملک مصر سے نکال دینا چاہتا ہے تاکہ خود حکومت کرے اس کے فریب میں ہرگز نہ آنا۔“

”تم نے مجھ سے نشانیاں طلب کی تھیں۔ میں نشانیاں دکھا چکا۔ تم اب بھی اسے جادو کہتے ہو۔ یاد رکھو اگر اب بھی تم انکار کرو تو کوئی عذاب تمہارے لیے تیار کھڑے ہیں۔“

فرعون نے بے بسی سے درباریوں کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو اب کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔ ہامان آگے بڑھا تاکہ صورت حال کو سنبھالے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ موسیٰ کا جادو درباریوں پر چل جائے۔

”تم جو دس سال مصر سے باہر رہے ہو تو تم نے یقیناً کسی ماہر جادوگر سے جادو سیکھ لیا ہے۔ مگر یاد رکھو کہ مصر میں اس فن کے بڑے بڑے ماہر موجود ہیں۔ تم ان سے مقابلہ کر کے ثابت کرو گے کہ تم کسی کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہو یا جادوگر ہو۔“

”افسوس کہ تم مجھے جھوٹا سمجھ کر اپنے لیے عذاب خرید رہے ہو۔“

”بس اب مقابلے سے بھاگنے کی باتیں مت کرو۔ مقابلے کا کوئی دن مقرر کر لے تاکہ تیرا جھوٹ سب پر ظاہر ہو جائے۔“

”میں مقابلے کے لیے تیار ہوں لیکن وعدہ کرنا کہ اگر تو مقابلہ ہار گیا تو میرے خدا پر یقین لے آئے گا اور میری قوم کو مصر سے چلے جانے کی اجازت دے گا۔“

”اور اگر تو ہار گیا؟“

”تیرے پاس یہ سوچنے کی گنجائش ہی نہیں کیونکہ میں جادوگر نہیں جو تیرے ساحر مجھے شکست دے دیں گے۔ میں تو خدا کا بھیجا ہوا فرستادہ ہوں اور جو کچھ میں نے دکھایا وہ جادو نہیں مجرات ہیں۔“

فرعون کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ خوف چھپا ہوا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شکست نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے وہ ان کی شرط ماننے کو تیار نہیں تھا اور بات کو کھما پھرا کر نالے کی کوشش کر رہا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا کہ کہیں فرعون مقابلے سے دستبردار نہ ہو جائے۔ وہ چاہتے ہی یہ

تھے کہ تمام لوگ ایک جگہ اکٹھے ہوں تو وہ اللہ کی نشانیں اور براہین کو سب کے سامنے روز روشن کی طرح واضح کر دیں۔ خدا کا مجزہ غالب رہے گا تو ناچار ان کو صداقت اور حق کے سامنے ہٹانا پڑے گا اور اقرار کر کے بغیر کوئی چارہ نہ رہے گا۔ نیز یہ سوچا کہ اگرچہ ”وہی الٰہی“ کے مطابق صداقت کا یقین دلا چکا ہوں تاہم فرعون اور اس کے ساتھی اسے جادو کہتے رہے ہیں اور عوام کو اصل حقیقت سے بے خبر رکھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اگر مظاہرہ عوام کے سامنے ہوا اور انہوں نے صداقت کا اقرار کر لیا تو کسی کو لب کشائی کا موقع نہ مل سکے گا۔

”اس کام کے لیے پہلا وقت یوم الزینت (جشن کاروز) ہے۔ تیرے ماہر جادوگر اس روز چاشت کے وقت شہر سے باہر میدان میں جمع ہو جائیں۔“

یہ وقت آپ نے اس لیے طے کیا کہ اس وقت آفتاب کی روشنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ دن چڑھ چکا ہوتا ہے اور ہر چیز خوب واضح اور روشن ہو جاتی ہے۔

فرعون نے باہمی مشورے سے طے کیا کہ فی الحال تو موسیٰ اور ہارون کو مہلت دو اور اس دوران تمام قلمرو سے ماہر جادوگروں کو دارالسلطنت میں جمع کر دو اور پھر موسیٰ کا مقابلہ کراؤ۔

اس دن کے آنے میں ابھی کئی ماہ تھے۔

نجاہ مصری کہتے ہیں کہ غالباً یوم الزینت سے مصریوں کی عید کا وہ دن مراد ہے جو وفالنبیل کے نام سے مشہور ہے کیونکہ ان کے یہاں تمام عیدوں میں سب سے بڑی عید کا دن یہی تھا۔

☆☆☆

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا زمانہ مصری تمدن کی جو تاریخ پیش کرتا ہے اس میں یہ بات بہت نمایاں نظر آتی ہے کہ مصری علوم دنوں میں سیکڑوں ایک مستقل علم کی حیثیت حاصل تھی اور اسی بنا پر ساحرین کا رتبہ مصریوں میں بہت بڑا سمجھا جاتا تھا۔ شاہی دربار تک میں انہیں رسوخ حاصل ہوا کرتا تھا۔ اہم سرکاری معاملات میں بھی انہی کی جانب رجوع کیا جاتا تھا۔

قدیم قوموں کی عام گمراہیوں میں سے ایک گمراہی یہ بھی رہی ہے کہ وہ جادو کی مذہبی حیثیت کے قائل تھے۔ اسی اعتقاد کے پیش نظر وہ اس کو سیکھ سکتے تھے۔ مصر بھی انہی میں سے ایک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مصری قوم پر فرعون کا یہ جادو چل گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جادوگر ہیں اور یہ اپنے جادو کے زور پر مصری حکومت پر قابض ہونا چاہتے ہیں اور اس کا ایک ہی علاج ہے کہ ماہر جادوگروں کو جمع کر کے موسیٰ کو شکست دے دی جائے۔

لغت میں سحر کے معنی امراضی اور پوشیدہ چیز کے ہیں چنانچہ صبح کے اول وقت کو سحر اس لیے کہتے ہیں کہ ابھی دن کی روشنی پوری طرح نمودار نہیں ہوئی اور علمی اصطلاح میں سحر ایسے عجیب و غریب امور کا نام ہے جن کے وجود پذیر ہونے کے اسباب نظر سے اوجھل ہوں اور بادی النظر میں محسوس نہ ہوتے ہوں۔

”سحر حقیقت ہے یا نظر کا دھوکا؟ اس بارے میں یہ رائے پائی جاتی ہے کہ سحر حقیقت ہے اور مضر رساں اثرات رکھتا ہے۔ حق تعالیٰ نے اس میں ایسے مضرات رکھ دیے ہیں جیسے زہر ہیں۔“

اس کے برعکس مجزہ دراصل براہ راست خدا سے تعالیٰ کا فعل ہے جو بغیر اسباب کے ایک صادق کی صداقت کے لیے وجود میں آتا ہے اور وہ کسی اصول و قوانین پر مبنی نہیں ہوتا کہ ایک فن کی طرح سیکھا جاسکے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بینا کے نشانات اس لیے عطا کیے گئے کہ ان کے زمانے میں مصر جادو کا مرکز سمجھا جاتا تھا لہذا اتفاقاً تھا کہ ایسے زمانے میں مبعوث ہونے والے نبی کو ایسے معجزات عطا ہوں جو اسی نوع (جادو) سے تعلق رکھتے ہوں تاکہ جب انکار پر اصرار حد سے زیادہ بڑھ جائے تو نبی یہ ثابت کرے کہ اس کے پاس جو مجزہ ہے وہ بشری و دسرس سے باہر ہے۔

☆☆☆

”موسیٰ (موسیٰ) چاہتے ہیں کہ اپنے جادو سے تم کو تمہارے ملک سے نکال دیں اور تمہارے شانہ مذہب کو نیست و نابود کر دیں۔ تم اپنا جادو کا قبیلہ اکٹھا کرو اور پھر قتار باندھ کر آؤ۔ جو غالب رہا وہی کامیاب ہوگا۔“ (طہ)

درباریوں نے فرعون کو مشورہ دیا اور فرعون نے اپنے تمام اعیان و دارکان کے نام احکام جاری کر دیے کہ تمام قلمرو میں جو مشہور اور ماہر جادوگر ہیں ان کو جلد از جلد دارالسلطنت روانہ کر دو۔

ان خطوط کے علاوہ اس نے ایسے افراد بھی مختلف شہروں میں دوڑا دیے جو جادوگروں سے رابطہ کریں اور انہیں مقابلے کے لیے آدہ کر کے دارالحکومت میں لے کر آئیں۔
قدرت الہی کی حکمت مسلسل اپنا کام کر رہی تھی۔ یہ افراد جس شہر میں بھی پہنچتے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کا تذکرہ ضرور کرتے۔

ابھی تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیغام حق فرعون کے دربار سے باہر نہیں نکلا تھا۔ مصر کے دوسرے شہروں میں لوگ ان کے نام سے بھی واقف نہیں تھے۔ فرعون خود ان کی شہرت میں اضافہ کر رہا تھا۔
ان کے نام کے ساتھ ان کے پیغام کا ذکر بھی ضرور ہوتا تھا۔ یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ ان کی لانگی سانپ بن جاتی ہے اور وہ اسے اللہ کی نشانی کہتے ہیں۔ لوگوں میں یہ چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں کہ ہوسکا ہے وہ واقعی بنی ہوں جیسے کہ ان سے پہلے بنی آتے رہے ہیں۔

بعض جادوگر تو مقابلے سے پہلے اپنے حریف کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات کے خواہش مند تھے اور جب انہیں یہ بتایا جاتا کہ موسیٰ وہی ہیں جنہیں بیٹے ہوئے پانی میں صندوق سے نکالا گیا تھا اور پھر فرعون کے گھر میں پرورش پا کر جوان ہوئے اور پھر مصر سے کہیں چلے گئے اور اب آئے ہیں تو یہ کہتے ہوئے آئے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔
ان جادوگروں میں سے بہت سوں کو یہ حالات سن کر یقین ہو گیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی وہ ہیں جن کے آنے کی پیش گوئی نبیوں نے کی تھی۔

وہ یہ سوچتے بھی تھے کہ ان سے مقابلہ کرنا بے کار ہے لیکن فرعون کے حکم سے بے بس تھے اور یہ شوق بھی دامن گیر تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔
بعض کو یہ تعجب ہوتا تھا کہ وہ کیسے جادوگر ہیں جو تعداد میں صرف دو ہیں اور فرعون ان کے مقابلے کے لیے ہزاروں جادوگروں کو اکٹھا کر رہا ہے۔

یہ سوچ سوچ کر ان کے دل ڈرے جا رہے تھے۔ غرض مقابلے سے پہلے ہی ان جادوگروں پر بے دلی سی طاری ہو گئی تھی یوم الزیچہ میں دن دس دن باقی رہ گئے تھے کہ جادوگروں کے قافلے دھڑا دھڑا دارالحکومت پہنچنے لگے۔
فرعون نے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے ان جادوگروں کو رتھوں میں بٹھایا اور سڑکوں پر ان کا گشت کرایا۔ یہ جادوگر طرح طرح کے جادو دکھاتے ہوئے سڑکوں سے گزر رہے تھے۔

مصریوں میں ایک خاص قسم کا جوش و خروش تھا۔ انہیں بے یقینی سے اس دن کا انتظار تھا جب یہ مقابلہ منعقد ہو۔
صرف جادوگر ہی نہیں، دوسرے شہروں کے عام لوگ اس قماشے کو دیکھنے کے لیے دارالحکومت کا رخ کر رہے تھے۔ ایک جشن تھا جو عید سے پہلے ہی برپا ہو گیا تھا۔

مصریوں کے گھروں میں خوشیوں کے چراغ جل رہے تھے لیکن بنی اسرائیل کے دل خوف اور اندیشوں سے کانپ رہے تھے۔ انہیں یہ ڈر تھا کہ اگر اس مقابلے میں موسیٰ کو شکست ہوگی تو پھر فرعون کے مظالم کی حد نہیں ہوگی۔ اب تک تو ہم فرعون ہی سے نمٹ رہے تھے اب یہ جادوگر بھی ہم سے بدلے لیں گے۔

مصر میں بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے۔ ان کے بارہ سرداروں نے آپس میں طے کیا کہ موسیٰ کے پاس چلا جائے اور انہیں سمجھا یا جائے کہ وہ اس مقابلے سے دستبردار ہو کر ہمیں معصیت سے بچالیں۔ یہ سردار جمع ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچے۔ کچھ مشتعل تھے کچھ نرم خو۔

”اے موسیٰ! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم فرعون سے صلح کر لو تا کہ ہماری جانیں بچ جائیں۔“

”کیوں تمہاری جانوں کو کیا ہوا۔ مقابلہ تو ہم دو بھائی کر رہے ہیں۔“

”اگر آپ کو شکست ہوگی تو پھر ہماری خیر نہیں۔“

”تم لوگوں نے یہ سوچ بھی کیسے کیا کہ مجھے شکست ہوگی۔“

”کیا تم جادوگروں کی کثیر تعداد کا مقابلہ کر سکتے ہو؟“

”تم انہیں جادوگر کہتے ہو اور یہ خوف بھی رکھتے ہو کہ ہمیں شکست ہو جائے گی۔ یہ تو سمجھو کہ ہم جادوگر نہیں۔ ہمیں تو خدا ان کے مقابلے پر بھیج رہا ہے۔ جادوگروں کا خدا فرعون ہے اور ہمارا خدا رب العالمین ہے۔ پھر ہمیں شکست کیسے ہو جائے

کی۔ کیا تمہارا ایمان اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ فرعون سے ڈرنے لگے ہو۔ ایک غیر فانی کے مقابلے میں فانی سے ڈرتے ہو۔ کیا بھول گئے کہ تمہارے اجداد ایک خدا کی عبادت کرتے تھے اور ایمان کے مضبوط تھے۔ جاؤ اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔ آرام سے بیٹھو۔ فتح انشاء اللہ ہماری ہوگی۔“

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ وہ ستر جادوگر تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے پر آئے۔
مقابلے سے ایک دن پہلے فرعون نے ساحروں کو طلب کیا اور ان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ان سے وعدہ کیا کہ اگر انہوں نے موسیٰ کو شکست دے دی تو وہ انہیں اتنا انعام دے گا کہ ان سے سنبھالائیں جائے گا اور سب کو اپنے مقربین خاص میں شامل کر لے گا۔

جادوگروں نے بھی انعام کے لالچ میں آ کر فرعون سے بڑے بڑے وعدے کر لیے۔ یہ وعدے کچھ ایسے بے جا بھی نہیں تھے۔ جادوگروں کو بتایا گیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک عصا ہے جو سانپ بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی اور جادو نہیں۔ جادوگروں کو اپنی کثرت پر بھی ماز تھا۔
عید کا دن آیا تو فرعون اپنی پوری فرعونیت کے ساتھ میدان میں پہنچا۔ اس کے لیے ایک اونچی جگہ پر تخت بچھایا گیا تھا۔ وہ تخت نشین ہوا تو درباری بھی حسب مراتب بیٹھ گئے۔

لاکھوں کا بیچ تھا جو اس مقابلے کو دیکھنے آیا تھا۔ ان میں بنی اسرائیل بھی تھے۔ ان کے لیے یہ صرف مقابلہ نہیں، ان کی قسمت کا فیصلہ تھا۔ ایک طرف مصری جادوگروں کا گروہ اپنے ساز و سامان سحر سے لیس کھڑا تھا۔ دوسری جانب خدا کے رسول حق کے پیغام بڑھاپائی اور راستی کے پیچھے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کھڑے تھے۔
جادوگر ایک مرتبہ پھر فرعون کے تخت کے قریب گئے اور کہنے لگے کیا ہمارے لیے انعام ہے اگر ہم غالب رہیں۔ فرعون نے کہا ضرور اور یہی نہیں بلکہ مقربین بادشاہی بنو گے۔

فرعون کا تو یہ حال تھا کہ اگر اس وقت اس سے کچھ بھی مانگا جاتا تو وہ دینے کو تیار ہو جاتا۔

جادوگر فرعون کے پاس سے ہٹ کر اپنی جگہ پر آئے۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق تبلیغ ادا کرتے ہوئے جادوگروں کو مخاطب کیا۔ فرعون اور اس کے درباری ان کی آواز کو صاف سن رہے تھے۔

”افسوس ہے تم پر کہ تم ہمیں جادوگر کہہ کر خدا پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو اور ہمارے مقابلے پر اتر آئے ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ اللہ تمہیں اس بہتان طرازی کی سزا میں عذاب دے کر تم کو جڑ سے ناکھاڑ پھینکے کیونکہ جس کسی نے بھی بہتان باندھا وہ نافرادی رہا۔“

درباریوں کو فکر ہوئی کہ کہیں جادوگر ان کی باتوں میں آ کر مقابلے سے دستبردار نہ ہو جائیں کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باتیں سن کر جادوگر آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے تھے۔ ان کے درمیان آپس میں اختلافات ہو گئے تھے۔ کچھ کہنے لگے یہ پیغمبر کا کام ہے اور یہ جادوگر نہیں ہیں۔ کچھ کہہ رہے تھے یہ جادوگر ہیں۔
درباریوں نے یہ حال دیکھا تو جادوگروں کو مخاطب کیا۔

”یہ دونوں بھائی بلاشبہ جادوگر ہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ جادو کے زور سے تم کو تمہارے وطن سے نکال دیں اور تم پر غلبہ کر لیں۔ تم اپنا کام شروع کر دو اور پرے باندھ کر موسیٰ کے مقابلے میں ڈٹ جاؤ۔ آج جو بھی غالب آ جائے گا وہی کامیاب ثابت ہوگا۔“

قرآن نے اس مضمون کو یوں بیان کیا۔

”حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا افسوس تم پر۔ دیکھو اللہ پر جھوٹی تہمت نہ لگاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی عذاب بھیج کر تمہاری جڑ اکھاڑ دے۔ جس کسی نے جھوٹ بات بنائی وہ ضرور نافرما ہوا۔ بس آپس میں لوگ ردو کر کرنے لگے اور پوشیدہ سرگوشیاں شروع ہوئیں پھر (درباری) بولے یہ دونوں بھائی ضرور جادوگر ہیں۔ یہ جانتے ہیں اپنے جادو کے زور پر تمہیں تمہارے ملک سے نکال کر باہر کریں اور پھر تمہارے شرف اور تمہاری عظمت کے مالک بن جائیں۔ پس اپنے مہارے داؤ جمع کر دو اور پرہیزگار ڈٹ جاؤ۔ جو آج بازی لے گیا وہی کامیاب ہوا۔“ (سورہ طہ)

تمام جمع ہو کر دیکھا تھا۔ ہر ذہن یہ سوچ ضرور رہا تھا کہ ایک طرف فرعون جیسے بادشاہ کی ریاستی طاقت اور جادوگروں

”موسیٰ تم سب کا استاد ہے۔ تم سب نے سازش کر رکھی تھی۔ اسی لیے تو نہ صرف اپنی جلدی شکست تسلیم کرنی بلکہ میری رعایا ہوتے ہوئے میری اجازت کے بغیر موسیٰ کے خدا پر ایمان لے آئے تاکہ دوسرے لوگ بھی تمہاری پیروی کریں لیکن میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔ تم میں تو کعبہ تک سزا دوں گا تاکہ آئندہ کسی کو ایسی غداری کی جرأت نہ ہو۔ پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں کنواؤں گا اور پھر سب کو سولی پر چڑھاؤں گا۔ اگر موسیٰ کا خدا تمہیں بچا سکتا ہے تو بچالے۔ ابھی سب کو معلوم ہو جائے گا کہ مصریوں کا خدا میں ہیں۔“

جادوگروں نے بھی ترکی پر ترکی جواب دیا۔

”ہم یہ بھی نہیں کر سکتے کہ سچائی کے جو روشن دلائل ہمارے سامنے آ گئے اور جس خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے اس سے منہ موڑ کر تیرا حکم مان لیں تو جو فیصلہ کرنا چاہتا ہے کر گزر۔ تو زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ دنیا کی اس زندگی کا فیصلہ کر دے۔ ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لائے کہ وہ ہماری خطائیں بخش دے خصوصاً جادوگری کی خطائیں پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا۔ ہمارے لیے اللہ ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے۔“

ان جادوگروں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فرعون کو بھی نصیحت کر ڈالی۔

”اے فرعون! تو مجرموں میں سے مت ہو جا۔ ہماری طرح تو بھی ایمان لے آؤ نہ جہنم تیرا ٹھکانا ہوگا۔ کیا تجھے خود اور لوٹکی بستیوں یا وہیں۔ اب بھی وقت ہے ایمان لے آ۔“

فرعون کے لیے عذاب عظیم مقدر ہو گیا تھا۔ کھلی نشانیاں دیکھ کر بھی اس کے دل کی سختی میں نرمی پیدا نہ ہو سکی۔ اس کی ضد اور بے جا مصیبت نے اسے راہِ راست پر نہ آنے دیا۔ اس نے حکم دیا کہ جادوگر موسیٰ کے خدا پر ایمان لے آئے ہیں انہیں سولی پر لٹکا دو۔ تاکہ دوسروں کو معلوم ہو کہ مجھے سے غداری کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔

فرعون نے ان ایمان لانے والوں کو عذاب سے دو چار کر کے سولی پر چڑھا دیا۔ یہ سینہیں یہ کہتے ہوئے سولی پر چڑھ گئے۔

”ہمارے رب ہم پر میری مثال اور ہم کو اسلام کی حالت میں وفات دے۔“

جادوگروں کے علاوہ اسرائیلیوں جو ان میں سے بھی ایک مختصر جماعت مسلمان ہو گئی مگر وہ فرعون کے ظلم و ستم کی دہرے اعلان نہ کر سکی۔

”پھر موسیٰ علیہ السلام پر کوئی ایمان نہیں لایا مگر صرف ایک۔۔۔ گروہ جو اس قوم کے جو جوانوں کا گروہ تھا۔ وہ بھی فرعون اور اس کے سرداروں سے ڈرتا ہوا کہ کہیں کسی مصیبت میں نہ ڈال دے۔“ (سورہ یونس)

جب اس عظیم واقعے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دو چار ہواؤں کا پریشانی اور گھبراہٹ میں جھلا ہوا فطری تھا لہذا اس کی ضد کا براہ کو دل کی سختی مزید بڑھ گئی۔ اسے اپنی عافیت سے زیادہ اپنی شان و شوکت کی فکر تھی۔ شاید اب تک وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے زیادہ فکر مند نہیں ہوا تھا۔ یہ سمجھتا رہا تھا کہ انہیں زیر کر لے گا۔ دوسرے یہ کہ اب تک موسیٰ اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو اس کے دربار تک محدود تھی لیکن اس نے خود ہی سمجھنے میں آ کر اس جنگ کو محل سے باہر کھیلے میدان میں منتقل کر دیا۔ اب اسے یہ ڈر ہو رہا تھا کہ اگر موسیٰ سے متاثر ہو کر میری قوم موسیٰ پر ایمان لے آئی تو میرے اقتدار کا سورج بالکل ہی غروب ہو جائے گا۔ وہ خود کو ”رب“ کہلاتا تھا اس کا غرور خاک میں مل گیا تھا۔

یہی حال اس کے سرداروں کا تھا۔ اس اقتدار میں وہ بھی فرعون کے شریک تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اقتدار کا مطلب یہ تھا کہ انہیں بھی زوال کا منہ دیکھنا پڑتا۔ وہ جو فرعون کے نام پر اپنی قوم سے دولت بنورے میں لگے ہوئے تھے وہ سب دروازے بند ہو جاتے۔ یہی سردار فرعون کو غلط مشورے دے کر اس کے کفر میں اضافہ کرتے چلے جا رہے تھے اور اپنے اقتدار کو طول دینے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ یہ شکست تو ایسی تھی کہ ان کے ہوش بالکل ہی اڑ گئے۔

تمام سرداروں ان قوم پر حق ہوئے اور فرعون کو گھیر کر بیٹھ گئے۔ موجودہ صورت حال پر غور کرنے لگے اور جب بہت باتیں ہو چکیں تو انہوں نے ایک زبان ہو کر فرعون سے استفسار کیا۔

”کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو کوئی نئی چھوڑ دے گا کہ وہ ملک میں فساد پھیلے؟ تجھے اور تیرے دیوتاؤں کو ٹھکراتے رہیں؟ کیا تو اپنی کمزوری اپنی قوم پر ظاہر کر دے گا کہ تو نے موسیٰ اور اس کی قوم کو زندہ چھوڑ دیا؟ آج جو لوگ تجھے سجدہ کرتے ہیں، تو چاہتا ہے وہ تجھے سجدہ کرنا چھوڑ دیں اور موسیٰ کی باتوں میں آ کر تجھ سے بغاوت کریں اور اس کی قوم ہم پر غالب آ جائے؟ اگر تو نے ابھی کوئی تدبیر نہ کی تو یہ قند بڑھتا جائے گا۔ جلد کوئی تدبیر کر نہ رہیں اجازت دے۔“

کی کثیر تعداد ہے، دوسری جانب دو بھائی اکیلے ہیں۔ ان کی پشت پر کوئی دباؤی طاقت نہیں۔ وہ پھر بھی خوفزدہ نہیں۔ کوئی بات ضرور ہے وہ جو کہتے ہیں وہ خدا کے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔ شاید یہی سچ ہے۔ پھر شیطان اپنا کام دکھانا تھا۔ باطل خیالات انہیں گھیر لیتے تھے۔ فرعون کی طاقت کا خیال آتا تھا۔ یہ خیال مصریوں کے دلوں میں بھی تھا کہ موسیٰ کی بات مان کر اپنے دیوتاؤں کو چھوڑنا پڑے گا۔ مصیبت بھی غالب آ رہی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے تھے اور مصریوں کے نزدیک بنی اسرائیل غیر مذہب تھے۔ اگر موسیٰ کی عملداری ہو گئی تو بنی اسرائیل ان پر حاوی ہو جائیں گے۔ مفت کے غلام ہاتھ سے چلے جائیں گے۔

جادوگروں کی صفوں میں بھی یہی باتیں ہو رہی تھیں لہذا وہ آگے بڑھنے میں پس و پیش کر رہے تھے۔ انعام کا لالچ انہیں اکساتا تھا اور عذاب کا خوف روکتا تھا۔

مصریوں نے حتیٰ حجت کر کہا شروع کیا کہ آگے کیوں نہیں بڑھتے۔ آگے بڑھو اور موسیٰ کا غرور خاک میں ملا دو۔ جادوگروں نے یہ آوازیں سنیں تو انہیں ہوش آیا۔ ان میں سے کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچے۔

”موسیٰ! اپنی تلخ کچھوڑ۔ تیرے کلام کا ہم پر کوئی اثر ہونے والا نہیں۔ اب تو تم یہ بتاؤ کہ ابتدا ہماری جانب سے ہو یا پہلے تم کرو گے؟“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں نے جنہیں تلقین کر کے اپنا حق ادا کر دیا۔ اب تمہارا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ رہا پہلے کرنے کا معاملہ تو میں تمہارے مقابلے پر نہیں آیا ہوں تم میرے مقابلے پر آئے ہو۔ جادو کا دعویٰ مجھے نہیں ہے لہذا پہلے بھی تم ہی کرو۔“

جادوگروں نے کہا اچھا تو پھر ہم دکھاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ساتھ رسیاں اور لائٹیاں لائے تھے۔ یہی ان کا جادوئی ساز و سامان تھا۔ انہوں نے رسیوں کے ٹکڑے اور لائٹیاں زمین پر پھینک دیں اور نعرے لگنے لگے۔

”فرعون کی عزت کی قسم! ہم ہی غلبہ پانے والے ہیں۔“

اچانک ان کے جادو کی دج سے ایسا دکھائی دیا کہ ان کی رسیاں اور لائٹیاں سانپ بن کر دوڑ رہی ہیں۔ ہزاروں سانپ میدان میں دوڑ رہے تھے۔ یہ ایسا خوفناک منظر تھا کہ سب کی سانسیں رک گئی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خوف پیدا ہوا۔ اپنی شکست کا خوف نہیں بلکہ یہ ڈر پیدا ہوا کہ عوام الناس ان کے جادو کو دیکھ کر دھوکے میں نہ آ جائیں۔ اسی وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی۔

”اندیشہ نہ کرو تو ہی غالب ہوگا۔ تیرے دامن ہاتھ میں جو بلا بھی ہے فوراً پھینک دے۔ جادوگروں کی تمام بنادیں نکل جائے گی۔ انہوں نے جو کچھ کیا ہے شخص جادوگروں کا فریب ہے اور جادوگر کی راہ سے آگے کامیاب نہیں ہو سکتا۔“

اجازت الہی کی دیر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا زمین پر پھینک دیا۔ زمین پر گرتے ہی یہ لامنی عظیم شکل و صورت والا اثر دہا بن گئی۔ اس کے پاؤں بھی تھے اور بڑی موٹی گردن اور بھی ایک انتہائی چوڑی گھبراہٹ سے والی شکل تھی۔ اسے دیکھتے ہی لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ یہ اثر دہا جادوگروں کی بھیجی ہوئی رسیوں کی طرف متوجہ ہوا اور ایک ایک کر کے سب کو نشتہ لگا۔

یہ ایسا کرشمہ تھا جو جادوگروں کے دل و دماغ میں بھی نہ آیا ہوگا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے دلوں نے گواہی دی کہ یہ کوئی جادو اور شبدہ نہیں بلکہ یہ ایسا حق ہے جس پر حق کے سوا کوئی قادر نہیں ہو سکتا۔ حقیقت ان پر کھل گئی۔

اللہ نے ان کے دلوں سے غفلت کے پردے ہٹا دیے وہ پروردگار کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔ انہوں نے فرعون کی موجودگی کی پروا بھی نہیں کی اور حاضرین کو گواہ بنا کر اقرار کیا۔

”ہم ہماروں اور موسیٰ کے رب پر ایمان لے آئے جو کچھ موسیٰ نے دکھا یا ہم اپنے علم کے مطابق کہتے ہیں کہ یہ ہرگز جادو نہیں بلکہ جادو سے... بالآخر خدا کا مجزہ ہے۔ اس کا سحر سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بے شک خدا کے رسول ہیں۔“

فرعون ان کے منہ سے الفاظ نہیں چھین سکتا تھا لیکن سمجھ رہا تھا کہ اس کا دام فریب تار تار ہو گیا ہے۔ موسیٰ (علیہ السلام) کو شکست دینے کی جو آخری تدبیر تھی وہ بھی ناکام ہو گئی۔ اب اس نے مصریوں کو بہکانے کے لیے فریب کا دوسرا راستہ اختیار کیا۔

ناکامی

منظر سرامام

کامیابی ہو یا ناکامی... ہمیشہ عمل اور بے عملی کی چادر میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ بھی کچھ ایسا کرنا چاہتے تھے جس سے دنیا بھی حیران رہ جائے، کچھ کرنا بھی نہ پڑے... اس کے لیے تو انسان کو بڑی میٹھی اور گہری نیند کی ضرورت ہوتی ہے اور نیند کے بعد ایک تفصیلی خواب بھی چاہیے ہوتا ہے۔

ناکامی سے منہ چھپانے اور ڈر جانے والوں کے لیے ایک حساس تحریر



کر خلا میں جھول رہا گیا۔

وہ بہت مستحکم فیز پوزیشن میں پھنسا ہوا تھا۔

اس کا ایک ہیر ٹوٹے ہوئے تختے کے اندر دھنسا ہوا جھول رہا تھا اور دوسرا ہیر اوپر والی سیز جیوں میں اٹکا ہوا تھا

حامد کے لیے آج کا دن ہی نمونہ تھا۔

پہلا حادثہ تو یہ ہوا کہ قلیب سے نکل کر جب وہ کٹری

کی سیز جیوں کے ذریعے نیچے اترنے لگا تو اچانک ایک سیز جی کا تختہ ٹوٹ گیا اور اس کا ایک ہیر اس تختے میں دھنسن

سرداروں نے فرعون کو اتنا برا بھینٹہ کر دیا کہ اس کے غضب نے خود اسے گھیر لیا اور وہ کفر و منکرات کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا۔ غصے کے عالم میں اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”آپ تم دیکھتے جاؤ کہ میں موئی اور اس کی قوم کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ میں ابھی حکم دیتا ہوں کہ بنی اسرائیل کی اولاد وزیرہ کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جائے اور صرف لڑکیوں کو زندہ رکھا جائے تاکہ ہم جوان ہونے پر انہیں اپنی باندیاں بنائیں۔“

اس وقت دربار میں ہونے والی یہ گفتگو جب دربار سے باہر نکلی تو اس اعلان نے بنی اسرائیلیوں کو سراسیمہ کر دیا کہ فرعون ہمارے بیٹوں کو قتل کرے گا۔

فرعون مصر کا یہ دوسرا اعلان تھا جو بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کے بارے میں کیا گیا۔ حضرت موئی علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے بھی یہ اعلان کیا گیا تھا۔ اس وقت اس اقدام کا مقصد یہ تھا کہ حضرت موئی علیہ السلام کو دنیا میں آنے سے روکا جائے اور اب مقصد یہ تھا کہ حضرت موئی علیہ السلام کی شان و شوکت کو خاک میں ملا دیا جائے اور ان کی قوم کو ان کے خلاف کھڑا کر دیا جائے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے اس خالمانہ فعل میں کچھ دنوں کے لیے کی آگئی تھی اب پھر اس پر عمل کرنے کا اعلان کیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر موئی علیہ السلام کسی وقت فرعون کے لیے لشکر تیار کریں تو انہیں جو ان میسر نہ آسکیں۔

بنی اسرائیل کی بستیاں میں جان کا خوف پھرے دار بنا ہوا تھا۔ ہوا کو وہ چراغ ہی نہیں مل رہا تھا جسے وہ بجھائے، گھروں میں اندھیرا تھا۔ صرف ایک بڑے گھر میں چراغ روشن تھا جہاں اسرائیلی قبیلوں کے سردار آس کی مخالفتوں کو بھلا کر فی صورت حال پر غور کر رہے تھے۔ غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کئی مصیبتوں کے ذمے دار حضرت موئی علیہ السلام ہیں بلکہ اس سے پہلے بھی انہی کی پیدائش کو روکنے کے لیے ہمارے بچوں کو قتل کیا جا رہا تھا۔

جب کسی قوم پر غلامی کی حالت میں صدیاں گزر جاتی ہیں تو وہ صرف مفلس و بد حال ہی نہیں ہو جاتی بلکہ ہمت و شجاعت کا جوہر بھی ان میں سے نکل جاتا ہے۔ وہ اپنی موجودہ حالت سے اتنے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس سے نکلنے کی کوشش ہی نہیں کرتے بلکہ جب کوئی مسئلہ یا تنبیہ انہیں اس حالت سے نکالنے کے لیے کوشاں ہوتا بھی ہے تو راہ کی سختیوں سے گھبرا کر خود نکات دہندہ کو الزام دینے لگتے ہیں۔ یہی حال حضرت موئی علیہ السلام کی قوم کا تھا بار بار یہ کہتے نظر آتے... کہ ہم غلام ہی شعیب تھے، تم نے فرعون سے لڑائی کیوں مول لی۔ اب وہ اس اعلان کا سبب بھی حضرت موئی علیہ السلام ہی کو سمجھ رہے تھے لہذا پھرے ہوئے حضرت موئی علیہ السلام کے پاس پہنچ گئے۔

”کیا ہم نے نہیں کہا تھا کہ فرعون کے پیچھے ہوئے جاؤ وگرنہ سے مقابلہ نہ کرو۔ کیا ہم نے صلاح نہیں دی تھی کہ فرعون سے صلہ کر لو۔ اب فرعون نے ہمارے بچوں کے قتل کا حکم دے دیا ہے۔ اس سے تو ہم غلام اچھے تھے۔ اب ہماری نسل کشی کی جائے گی۔“

”اس سے اندازہ کر لو کہ فرعون اللہ اس کے رسول اور بنی اسرائیل کا کھلا دشمن ہے۔ تم اس کے خلاف اٹھ کھڑے کیوں نہیں ہوتے۔“

”فرعون تو ہمارا دشمن ہے ہی لیکن ہم پر یہ مصیبتیں صرف تمہاری وجہ سے آئی ہیں۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ تمہارے آ جانے سے ہمارے مصائب میں کمی آجائے گی لیکن یہ پہلے سے بھی بڑھ گئی ہیں۔ تم خود بھی ہلاک ہو گے اور ہمیں بھی ہلاک کر دے گے۔ ہم تمہاری خاطر فرعون سے جنگ کرنے والے نہیں۔“

حضرت موئی علیہ السلام نے انہیں سمجھایا۔ ”اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو۔ بلاشبہ زمین اللہ کی ملکیت ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے وراثت بنا دیتا ہے اور انجام (کی کامیابی) منتفیوں کے لیے ہی ہے۔ وہ وقت قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو برا کر دے گا اور تم کو اس زمین کا خلیفہ بنا دے گا اور پھر دیکھو گا کہ تم کس طرف عمل کرتے ہو۔“

(جاری ہے)

ملاحظات

قصص القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمن، قصص الانبیاء، ابن کثیر، توریتہ... ارض القرآن، سلیمان لدوی، ترجمان القرآن، ابو الکلام آزاد، انبیائے قرآن، جمیل احمد.

اور بہت نیچے فرش تھا۔ اگر وہ تختہ مکمل ٹوٹا ہوا ہوتا تو وہ سیدھا نیچے آجاتا۔

اوپر سے کسی فلیٹ کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ خطی اکرم نیچے آ رہا تھا۔ اکرم ایک بوڑھا آدمی تھا اور حامد کی طرح وہ بھی اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کی باتیں دماغ کھانے والی ہوا کرتیں۔

وہ میز چایاں اترتا ہوا حامد کے پاس آ کر رک گیا۔
”حامد صاحب! آپ اس طرح کیوں لنگ رہے ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”جناب! میں پھنس گیا ہوں۔“ حامد نے بتایا۔ ”خود دیکھ لیں۔ سیزمی ٹوٹ گئی ہے۔“

”تو کیا ہوا۔ ایک ہفتے سے اپنا بھر باہر نکال لیں۔“ اکرم نے کہا۔

”بہت مشکل ہے۔ میں کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں۔“
”دیکھیے یہ تو کوئی بات نہیں کہ آپ نے پورا راستہ گھیر رکھا ہے۔ اب مجھے نیچے جانا ہے تو کیسے جاؤں۔“

”تمہارا کیا خیال ہے کہ میں جان بوجھ کر اس میں کھس گیا ہوں۔“ حامد غصے سے بولا۔ ”میں مجھے شوق ہو گیا ہے کہ اپنے آپ کو اس مصیبت میں ڈال لوں۔“

اس دوران نیچے والی منزل کا ایک آدمی اوپر جانے کے لیے سیزمیوں پر آواہر حامد سے ٹکری سیزمی پر آ کر گر کر گیا۔ ”او بھائی۔“ وہ اکھڑ لپچے میں بولا۔ ”یہ کیا رولا نچایا ہے۔ ہوا ایک طرف۔ مجھے اوپر جانا ہے۔“

”ارے بھائی! میرا پاؤں اس تختے میں پھنس گیا ہے۔“ حامد نے کہا۔ ”خدا کے لیے میری مدد کرو۔ نکالو مجھے۔“

اب اس آدمی پر اصل پوزیشن واضح ہوئی تھی۔ ”ہاں یار۔ تو تو واقعی پھنس گیا ہے۔ اب کیا کرے گا۔۔۔ کیسے نکلے گا؟“

”بھائی! میں اپنی کوشش سے نکل نہیں سکتا۔ تم سب مل کر کوئی راستہ نکالو۔“

کچھ اور لوگ بھی آکر اوپر نیچے رک گئے۔ وہ سب مل کر اس صورت حال پر غور کر رہے تھے۔ اب یہ بات ہر آدمی تھی کہ دس بار بلڈنگ کے مالک کو کہا جا چکا ہے کہ وہ کٹری کی سیزمیاں ختم کر کے سینٹ کی پکی سیزمیاں بنادے لیکن وہ سنتا ہی نہیں ہے۔

ایک صاحب نے کہا۔ ”میں اس بندے کی اسی طرح پھنسی ہوئی تصور براخبر والوں کو سمجھوں گا۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“ کسی نے پوچھا۔

”تم دیکھ لینا کیا ہوتا ہے۔ عدالت اس کا نوٹس لے گی۔ بلڈنگ کے مالک کے خلاف کیس ہو جائے گا۔“

”اور جب تک کیا میں اسی طرح چہنبر ہوں۔“ حامد حلق بھاڑ کر پتلا بٹا۔

”نہیں، نہیں۔ تم بھی نکل آؤ گے۔“
”بلکہ تمہارے لیے تو ایک زبردست چانس ہے۔“

ایک نے کہا۔ ”کمانی! کا ایسا سہرا چانس ہر ایک کو نہیں ملتا۔“
”اب اس میں میری کون سی کمانی ہو جائے گی؟“

”بہت سارے کی بات ہے حامد بھائی۔“ ایک نوجوان نے کہا۔ ”تم اس بلڈنگ کے مالک پر کیس کر سکتے ہو۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ تم کو ایک ضروری ایگریگیشنٹ پر سائن کرنے کے لیے جانا تھا لیکن سیزمی میں چھپنے کی وجہ سے تم نہیں جا سکتے۔“

”اور اس پر دوسرا کیس یہ بتا ہے کہ اس سیزمی کی وجہ سے تمہاری ٹانگ ڈنچی ہوئی ہے۔“

”تم سب کے سامنے تماشائین کر رہے ہو۔“ کسی اور نے لقمہ دیا۔

”کم از کم پچاس لاکھ کا کیس ہو سکتا ہے اس پر۔“
”بھائی! سب سے کم پچاس لاکھ تو بہت زیادہ ہیں۔“ کسی نے کہا۔

”نہیں کمال صاحب! اس جیسے دولت مند بندے کے لیے یہ کچھ نہیں ہیں۔“

”خدا کے لیے تم لوگ مجھے نکالنے کی کوشش کرو۔“ حامد نے کہا۔ ”میں کب تک چہنبر ہوں۔“

”حامد بھائی! ذرا یہ تو سوچو کہ تمہاری وجہ سے پوری بلڈنگ میں رہنے والوں کا کتنا بھلا ہو جائے گا۔ یہ سیزمیاں ختم ہو جائیں گی۔ پکی سیزمیاں بن جائیں گی اور تم پوری بلڈنگ کے ہیرو کہلاؤ گے۔“

اس دوران میں حامد کے فلیٹ کے سامنے والے فلیٹ کی شہلا بھی آکر اس بیچڑ میں شامل ہو گئی تھی۔ حامد دل اسے دیکھ کر کئی بار دھڑکا تھا اور اس کا بھی شاید یہی حال ہو۔ وہ بھی حامد کے اس کیس میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

اس نے حامد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”حامد صاحب! شاید آپ کے علم میں نہ ہو کہ میں ایک چینل کے لیے کام کرتی ہوں۔“

”نہیں۔ یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔“ حامد مسکرا دیا۔
”آپ ہمارے چینل کو انٹر ویو دے دیں۔ یہ ہماری آج کی بریکنگ نیوز ہوگی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس انٹرویو کی بنیاد کیا ہوگی؟“
”وہ یہ بتائیں گے کہ آپ میں کتنا حوصلہ ہے۔ کتنی برداشت ہے۔ آپ کس عزم کے ساتھ اس مصیبت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔“

آس پاس کھڑے لوگوں نے تائیاں بجا دیں۔
حامد کی دھڑکنیں تیز ہونے لگی تھیں۔ شہلا خود اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ اگر یہ حادثہ برپا نہیں ہوتا تو وہ ہمیشہ کی طرح اسے نظر انداز کرتی ہوئی اس کے برابر سے گزر جاتی۔

اب وہ دل ہی دل میں اس حادثے کا شکر گزار ہونے لگا تھا اور جہاں تک خود اس کے پھنسے رہنے کا معاملہ تھا۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ وہ ذرا سا جھٹکا دے کر اپنے پیروں کے پیچھے کر کے اس سیزمی سے نکل سکتا تھا۔

اس دوران میں بلڈنگ کا ایک آدمی اپنے ہاتھ میں ایک فائل لیے ہوئے آ گیا۔ اس نے دیکھوں جیسا کالا کوٹ پہن رکھا تھا۔ حامد کے لیے وہ اچھی تھا۔ اس نے آتے ہی اپنا تعارف کروایا۔ ”ناچیز کو تسلیم فاروقی کہتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”میں دیوانی مقدمات کا ماہر ہوں۔ اس حادثے کا سننے ہی میں نے مالک کے خلاف کیس تیار کر لیا ہے۔ اب سب کے اور خاص طور پر آپ کے سامنے کر دیتا ہوں۔“

”دیکھ! صاحب! کیا مالک پچاس لاکھ دے دے گا؟“ شہلا نے پوچھا۔

”میڈم! آپ پچاس لاکھ کی بات کر رہی ہیں، میں نے تو اتنی لاکھ کا پروگرام بنایا ہے۔“

دیکھ کے اس بیان پر زور دواتائیاں بجا رہی تھیں۔ شہلا نے اس بار کوٹ بھرے انداز میں حامد کی طرف دیکھا۔ ”پلیز! سامن کرو میں۔“

”ہاں ہاں، میں تیار ہوں۔“ حامد جبکہ کر بولا۔
بلڈنگ کا چوکیدار ایک بڑے سے شارپ میں ہوٹل کی جائے اور بسکٹ لے آیا تھا۔ یہ چائے سلطان احمد نے منگوائی تھی۔

”بھائی! میں نے سوچا کہ تم اتنی دیر سے جھنڈے ہوئے ہو، کچھ کھا یا پینا نہیں ہوگا۔ اس لیے چائے اور بسکٹ منگوائی ہے۔“

سلطان احمد کے اس جذبے کو بے حد سراہا گیا تھا۔
نیچے کی منزل کے استاد مظہم کے یہاں سے چائے کی ایک درجن پتالیاں آگئی تھیں۔ سلطان احمد نے سب سے پہلے شہلا کو چائے پیش کی تھی۔ ”یہ لیں میڈم! یہ چائے لیں۔“

”ارے میں کیوں، آپ حامد صاحب کو دیں۔“

بانسری عشق اور منشیات

حال ہی میں اخبارات میں ایک خبر شائع ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ پولیس نے کراچی کی ایک نوجوانی بستی سے ایک انوکھے منشیات فروش کو گرفتار کیا ہے۔ انوکھا ان منسوں میں کہ اس شخص کا طریقہ واردات سب سے نرالا تھا۔ اس کے پاس بانسری تھی۔ جب یہ دیکھتا کہ دور دور تک کوئی پولیس والا نہیں ہے، کوئی دیکھ نہیں رہا تو بانسری کی تان چھیڑ دیتا۔ جیسے ہی فضا میں اس کے سر لیے سر پھیلنے یار لوگوں کو غم ہو جاتا کہ معاملہ صاف ہے۔ وہ بھاگ کر آتے اور اس سے اپنی مطلوبہ منشیات خرید لے جاتے۔ ہم نے زندگی میں بارہا چین کی بانسری دیکھی ہے۔ دالا کا حارہ پڑھا اور سنا ہے اس کا سچ مفہوم بھی سمجھ میں نہ آ سکا۔ وہ اس لیے کہ بانسری تو بے چین جی میں بجائی جاتی ہے۔ آدمی بے چین ہو یا دل بے چین ہو۔ اصل میں دونوں ایک ہیں۔ اب جبکہ ہم نے یہ خبر پڑھی تو اس عمارے کا سو فیصد مفہوم سمجھ میں آ گیا۔ بزرگوں نے سچ کہا ہے کہ عقل آتے آتے آتی ہے۔ ظاہر ہے اگر آتے آتے آتی ہے تو جاتے جاتے چلی بھی جاتی ہوگی۔

ہو سکتا ہے جن پولیس والوں نے نواز منشیات کو پکڑا وہ موسیقی سے بھی نہ رکھتے ہوں۔ انہیں نوازی پسند نہ ہو یا وہ کن دس نہ ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں وہ راگ پسند نہ آیا ہو جو وہ اس وقت بجا رہا تھا۔ کچھ بھی ہو ہمارے خیال میں وہ بے سرا تو نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ بے سرا ہوتا تو اتنے دنوں سے چین کی بانسری کیسے بجا سکتا تھا؟

ہم کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں اور بزرگوں سے سنتے آئے ہیں، کہا جاتا ہے ایک زمانے میں استاد ایسا راگ گاتے تھے کہ آگ لگ جاتی تھی۔ اس وقت یقیناً چاس ایسا نہ ہوئی ہوگی۔ ورنہ اتنی ٹھیکڑ میں بڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ بعض راگ ایسے تھے جو گائے جاتے تھے تو بارش ہونے لگتی تھی۔ اگر واقعی یہ بات سچ ہے تو کراچی کے اوپر گھومتے ہوئے بادلوں کو وہ راگ سنانا چاہیے۔

خفیہ عقل کی کتاب ”سرخ سفید سیاہ“ سے آذین رضوان، کراچی کا انتخاب

سیاسی پارٹیاں

آپ ذرا تھوڑا سامانی میں جھانکے کیا کیا نام سامنے آتے ہیں۔ ری پبلکن پارٹی، جناح عوامی لیگ، عوامی لیگ، آزاد پاکستان پارٹی، پیپلز عوامی پارٹی، عوامی مسلم لیگ، جنس پارٹی، نظام اسلام پارٹی اور نہ جانے کیا کیا پارٹیاں ہیں۔

اب انہیں ڈھونڈ چرائے رخ زیلا لے کر یہ پارٹیاں اس طرح ٹوٹیں کہ کوئی ان کا نام لیوا تک نہ رہا حالانکہ ان میں سے بعض برسر اقتدار بھی رہیں۔ مگر دیکھیے، نئے ناموں کے نشان کیسے کیسے۔ وہ جو غالب نے کہا ہے۔

مری تعمیر میں مضر ہے اک صورت خرابی کی چنانچہ پارٹیاں جتنی بھی رہیں اور نوٹی بھی رہیں۔ پھر ان میں سے نئی نئی پارٹیاں جنم لیتی رہیں۔ مارشل لا کے دور میں کیا کیا پارٹیاں وجود میں آئیں، کیسے کیسے حمایتی پیدا ہوئے، لیکن وقت کا دھارا سب کو بہا کر لے جاتا ہے۔ اب وہی لوگ جمہوریت کے گمن گام رہے ہیں، جمہوریت کی خوبیاں نگوار رہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ مارشل لا والے بھی جمہوریت کے فوائد بیان کر رہے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ہماری قوم کا حافظہ ہمیشہ سے کمزور چلا آ رہا ہے۔ لاکھ روغنِ بادام لو، چاہے جتنا خمیرہ گاؤں بانِ عمرین کھلاؤ، کتنا ہی شربت امار پلاؤ، اس کی یادداشت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا دو روپے۔ چلیے حساب صاف ہو گیا۔

معاف کیجیے بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ پارٹیاں ٹوٹی ہی نہیں بنی بھی ہیں۔ ایک ایک پارٹی سے کئی کئی جن بنیں۔ اب مسلم لیگ ہی کو کچھ کیجیے۔ سنی نہیں بن سکیں۔

انتہاس برسر، سفید، سیاہ از شفق عقیل

”کچھ کہہ نہیں سکتے۔ بہت سے لوگ پیلٹی کے لیے بھی اس قسم کی حرکت کرتے ہیں۔ پچھلے دنوں خیر آئی بھی کہ ناخیر یا کا ایک آدمی بغیر پیراشوٹ جہاز سے کود کر مر گیا تھا۔“

”معاف کیجیے گا۔ مجھے ایسا بے گئی موت کا کوئی شوق نہیں ہے۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم نے پیسوں کے لالچ میں ایسا کیا ہو۔ اسی لالچ کے لیے تو آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

”بے وقوف انسان۔“ ایک بزرگ خفا ہو گئے۔

”اب اس بے چارے حامد کو کیا معلوم ہے کہ یہ سودا اسی لالچ میں ہوگا۔“

”ارے سب جانتا ہوں میں۔ یہ سب اس وکیل اور اس شخص کی ملی بھگت ہے۔“ اکرم نے کہا۔

حامد کا دل چاہا کہ وہ کسی طرح اس بڑھی سے باہر نکل کر اس کم فہم کا گلا دبا دے لیکن اس کا بدلہ اس شخص نے لے لیا تھا جس نے حامد کی حمایت کی تھی۔ اس نے ایک زوردار گھونسا اکرم کو جڑو یا تھا۔ بدلے میں اکرم نے اسے نگرمدی تھی۔

ذرا سی دیر میں وہاں بولا ہونے لگا تھا۔ کچھ لوگ اکرم کی حمایت میں آ گئے تھے اور کچھ اس دوسرے شخص کی حمایت میں۔ اچھی خاصی مار پیٹتے ہوئے لگی تھی۔

اتنی دیر میں شہلا حامد کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی جبکہ دوسرے لوگوں کی توجہ لڑنے والوں کی طرف تھی۔

”شہلا!“ حامد دھیرے سے بولا۔ ”میری ٹانگ اب حرکت کرنے لگی ہے۔ میں اب بڑی آسانی سے اس پھندے سے نکل سکتا ہوں۔“

”نہیں حامد نہیں..... پلیز ایسا مت کرنا۔“ شہلا بولکھلا کر بولی۔

”وہ کیوں۔“ حامد حیران رہ گیا تھا۔

”خود سوچو۔ اگر تم نے خود کو باہر نکال لیا تو ہمارے خوابوں کا کیا ہوگا۔ تم اسی لالچ روپے کہاں سے حاصل کر دے۔ قدرت نے تمہیں زندگی سنوارنے کا ایک موقع دیا ہے۔ اس چانس کو... برداشت کرو۔ پھر میں تمہارے ساتھ ہوں نا۔“

”شہلا! یہ دیکھو۔ کیا میں پندرہ دن اسی طرح گزار دوں۔“ حامد نے پوچھا۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جہاں تم نے اپنی پوری زندگی اسی طرح گزار دی ہے، وہاں پندرہ دن اور کئی۔“ شہلا نے کہا۔ ”اور میں تمہیں خوش کرنے اور بہانے کے لیے ساری کوششیں کروں گی۔“

”نفس تو چاہی گی لیکن دس لاکھ آپ کو کہاں سے دوں؟“

”وہ جو اسی لالچ میں گئے بیٹا..... ان میں سے دس مجھے دے دینا۔ زندگی بھر دعا میں دوں گا۔ میری بیٹیاں بھی یاد کیا کریں گی۔“

”ادو کہاں ہیں میرے پاس اسی لالچ۔“

”میں جانتا ہوں بیٹا۔ مجھے اس دیکل پر پورا بھروسہ ہے۔“ بزرگ نے کہا۔ ”بہت قابل آدمی ہے۔ یہ تم کو اسی لالچ دلا کر رہے گا۔“

”چاچا میاں۔“ شہلا نے بزرگ کو مخاطب کیا۔

”آپ کو شرم آنی چاہیے کہ ایک آدمی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے اور آپ اس کے پیسوں سے اپنا حصہ مانگنے چلے آئے ہیں۔“ پھر اس نے سب کی طرف دیکھا۔ ”آپ سب کان کھول کر سن لیں۔ ان کے پاس جتنے پیسے ہوں گے، ان کا

حساب کتاب میں رکھوں گی۔ یہ نہیں ہوگا کوئی دس لاکھ لے کر چلا جا رہا ہے۔ کسی کو پاگل کر رہے ہیں۔ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ ایک ایک پائی کا حساب میرے پاس ہوگا۔“

”کیوں! کیا تم حامد صاحب کی بیوی ہو؟“ ایک عورت نے جل کر پوچھا۔

”ہوں تو نہیں۔ لیکن وہ بھی سچی ہوں۔“ شہلا تڑخ کر بولی۔

حامد مسکرا دیا۔ اس دوران پہلی بار اس نے خوشی کی کوئی خبر نہ تھی۔ اس نے شہلا کی طرف دیکھا۔ وہ گھٹ بھر سے انداز میں حامد کو کچھ رہی گئی۔

اچانک ایک عورت نے اعلان کیا۔ ”حامد بھائی! آج رات کا کھانا میری طرف سے ہوگا۔ آپ بتادیں، آپ کی پسندیدہ ڈش کیا ہے۔ دیکھیں صاحب تکلف مت کیجیے گا۔“

”یہ لو۔“ ایک دوسری عورت چمک کر بولی۔ ”رات کے کھانے کا تو میں نے سوچ رکھا تھا۔“

”چلو۔ تم صبح کا ناشتا کر دینا حامد بھائی کو۔“

حامد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے روکا جائے یا نہنا چاہیے۔ تکلیف تو ہو رہی تھی لیکن امکانات روشن ہوتے جا رہے تھے۔ ایک طرف تو اسی لالچ کا آسرا ہو گیا تھا۔

دوسری طرف شہلا بھی لڑکی کی توجہ حاصل ہونے لگی تھی۔ یہ سب اسی بڑھی کی وجہ سے ممکن ہو سکا تھا۔

”حامد صاحب! کیا آپ کے ساتھ یہ پہلا حادثہ ہے یا پہلے بھی ہو چکا ہے؟“ شہلا کی اکر م نے پوچھا۔

حامد ہنسا کر رہ گیا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے کہ مجھے اس قسم کی مصیبت میں پڑنے کا شوق ہے؟“

”ان کو کچھ مل جائے گی۔ پہلے آپ تو لیں۔“

شہلا کے بعد حامد کو بھی جائے دی گئی۔ بکت بھی دیے گئے۔ دیکل صاحب چائے ختم کرتے ہی کیس فائل کرنے کے لیے روانہ ہونے لگے لیکن اس سے پہلے انہوں نے حامد سے کہا۔ ”حامد صاحب! ایک ہزار روپے تو دیں۔“

”ایک ہزار..... وہ کیوں؟“

”مجھے بلڈنگ کے مفاد کے لیے میں آپ سے اپنی وکالت کی فیس تو نہیں لے رہا لیکن تمہارے دالوں کو کچھ دینا پڑے گا۔“

”تمہارے دالوں کو..... میں سمجھا نہیں۔“

”ارے بھائی۔ اس کی ایف آئی آر کئے گی۔“ وکیل نے کہا۔ ”تا کہ مالک کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا جائے۔ پھر آپ کی طرف سے کیس فائل ہوگا اور آپ کے حق میں فیصلہ ہوتے ہی اسی لالچ روپے مل جائیں گے۔“

”بھائی جان! اور یہ فیصلہ کتنے دنوں میں ہوگا؟“

حامد نے کراہتے ہوئے پوچھا۔ اب اس کا ہیرا چھٹا خاصا درد کرنے لگا تھا۔

”کم از کم پندرہ دن تو لگ ہی جائیں گے۔“ وکیل نے بتایا۔ ”وہ بھی اس لیے کہ یہ امر جیسی نہیں ہے۔“

”دیکل صاحب! کیا آپ پاگل ہو گئے ہیں۔“ حامد چلا یا۔ ”میں پندرہ دنوں تک اسی طرح لٹکا رہوں۔“

”تو کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔“ وکیل طنزیہ انداز میں بول کر دوسروں سے مخاطب ہوا۔

”کیوں بھائی! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں بھائی جان! آپ بالکل شیک کہہ رہے ہیں۔ رقم بھی تو معمولی نہیں ہے۔ اسی لالچ میں ہوتے۔“

”حامد میاں! ایک بزرگ نے مخاطب کیا۔

”جی فرمائیں۔“ حامد جھلا کر بولا۔

”تم کو تو یاد ہوگا چٹا کہ میں تمہارے والد صاحب کا دوست ہوا کرتا تھا۔“ بزرگ نے کہا۔ ”اور میں بھی اسی بلڈنگ میں رہتا ہوں۔“

”جی فرمائیں۔“

”بیٹا! تمہارے والد مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ تو تم بھی میرا خیال رکھنا بیٹا۔“

”آپ بتا تو دیں..... کیسے خیال رکھوں۔“

”بیٹا! صرف دس لاکھ۔ میری دو جوان بیٹیاں ہیں۔ دونوں اس دس لاکھ میں تمت جائیں گی۔“

تنہائی

نادیہ نور

رقابت اور انتقام میں انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ اسے بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا سوائے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کے... جیون سناٹھی جب بار بار ساتھ بدلنے کا عادی ہو تو نہ منزل اس کی منتظر ہوتی ہے اور نہ ہی رستے اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ اس نے بھی ”جب میرا نہیں تو کسی کا نہیں“ والے فارمولے پر عمل کر ڈالا اور اپنی زندگی سے مطمئن ہو گئی۔

خون بہا دینے والے برقعے موسم کی لہر گرما دینے والی واردات کا احوال



ہوئے بال چہرے پر پڑے ہیں۔ آنکھیں مندی ہوئی اور منہ کھلا ہوا ہے۔ وہ گھبرا کر جاگ اٹھی اور جلدی سے لیپ روشن کر دیا۔ لمحہ بھر تک اس نے ان آوازوں کو سنا جو گیراج کا دروازہ ہوا کے زور سے بار بار کھٹنے اور بند ہونے سے

لیون کے رخصت ہونے کے بعد کی رات کرکشی نے خواب دیکھا کہ وہ مجھد ہو گئی ہے۔ خواب میں کرکشی نے خود کو دوری سے دیکھا تھا کہ وہ چٹ پڑی ہوئی ہے۔ اس کا جسم ایک سفید رنگ کے سلیب کے اندر دکھا ہوا ہے۔ بھرے

ہوگا۔ یہاں کے لوگ ہمارے بارے میں طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔ ہاں، پچاس لاکھ سے کم اپنا کوئی بزنس شروع کروینا۔ میرا خیال ہے کہ یونیک کا کام سب سے اچھا رہے گا۔ میں خود فیئن ڈیزائنر ہوں، اسی لیے میں وہ بزنس سنبھال سکتی ہوں۔“

”چلو۔ جیسے تمہاری مرضی۔“ حامد کی آنکھوں میں بہت سے خواب اتر آئے تھے۔

”اور ایک بات اور... شادی کے بعد ہم سب سے پہلے اسلام آباد اور مری وغیرہ کی سیر کو جا سکیں گے۔“

”چلو یہ بھی منظور ہے۔ میں تو اب تمہارے کہنے پر چل رہا ہوں۔“

اس دوران میں ایک آدمی ان دونوں کے پاس آ گیا۔ ”معاف کیجیے حامد صاحب! میں آپ کو ڈسٹرب کر رہا ہوں۔ میرا نام مختار ہے۔ میں پچھلے ہفتے اس بلڈنگ میں کرائے دار کی حیثیت سے آیا ہوں۔ میں خود سیکل ہوں اور ہائی کورٹ میں پریزنس کرتا ہوں۔“

”جی فرمائیے مختار صاحب۔“

”جناب! مجھے جیسے ہی آپ کے ساتھ ہونے والے اس حادثے کی خبر ملی، میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ سید حاجی کے پاس پہنچ گیا۔“

”جی کئے پاس! وہ کیوں؟“

”آپ کے کس کو اسٹرونگ بنانے کے لیے۔“ جی سے بات ہو چکی ہے۔ آپ کو ایک کروڑ پچاس لاکھ ملنے والے ہیں۔ وہ یہی فیصلہ سنائے گا۔“

”کیا؟“ حامد کے ہوش اڑ گئے تھے۔ ”ایک کروڑ پچاس لاکھ۔“

”جی ہاں۔ میں بھی کچا کام نہیں کرتا۔“

اسی وقت وہ میری تھوڑی سی ملی۔ گزری کا زینہ چہرہ راکر ٹوٹ گیا اور حامد تکا بایاں کھتا ہوا چپٹا ہوا، نیچے گرنا چلا گیا۔ سر کے تل گرنے کی وجہ سے اس کے دماغ میں شدید

چوٹ آئی گی۔ ہاسپتال تک جاتے جاتے اس کا انتقال ہو گیا تھا۔

اس کی موت کے بعد صرف اتنا ہوا کہ بلڈنگ کے مالک نے ٹکڑی کا زینہ ختم کروا کے سینٹ کا پکا زینہ بنوا دیا

اور اس کیس کو حادثہ قرار دے کر فراموش کر دیا گیا۔

اب اس بلڈنگ کے وہی شب و روز ہیں۔ وہی زندگی

ہے۔ سب اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔

سیر حیاں پختہ ہونے کے بعد اب اس بات کا بھی امکان نہیں

رہا کہ ایسا کوئی اور حادثہ کی اور حامد کے ساتھ پیش آ جائے۔

لوگوں کے درمیان ہونے والا جھگڑا اب ختم ہو چکا تھا۔ اس بلڈنگ کی یونین کے صدر نے ان لوگوں کو سمجھایا تھا۔ ”دیکھو... اگر ہم لوگ آپس میں اسی طرح جھگڑا کرتے رہے تو کسی کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔“

”تو اب کون سا رہا ہے۔“

”آ رہا ہے۔“ صدر مسکرا دیا۔ ”میں نے پورا حساب

لگا لیا ہے۔ دیکھو، اگر ہم کیس جیت جاتے ہیں تو چالیس لاکھ

سیدھے سیدھے حامد کے ہوجائیں گے۔“

”حامد کو اتنی سی بات کے لیے چالیس لاکھ کچھ زیادہ

نہیں ہیں۔“ کسی نے اعتراض کیا۔

”نہیں کیونکہ ان پیسوں پر اسی کا حق ہے۔“ صدر

نے کہا۔ ”ہمیں انصاف سے کام لینا چاہیے۔ کیونکہ قیامت

کے دن خدا کے سامنے بھی ہوتا ہے۔ ہم نے اگر حساب

کتاب میں غلطی کی تو ہمارا عذاب کیا جائے گا۔“

سب نے صدر کی اس بات کی تحریف کی کیونکہ سب

ہی خدا کے خوف سے لرز اٹھے تھے۔

”چلیں۔ مان لیا حامد کو چالیس لاکھ مل گئے۔ اس

کے بعد کا کیا حساب ہوگا۔“

”بقیہ چالیس میں سے پانچ وکیل صاحب کو ملے

جائیں گے۔“ صدر نے بتایا۔ ”کیونکہ ساری محنت وکیل

صاحب کی ہوگی۔“

”ہاں، یہ بات تو ہے۔“ سب نے تائید کی تھی۔

”اس کے بعد رہ جاتے ہی پینتیس لاکھ... ہماری

بلڈنگ کے دونوں بلاک میں بیس افراد رہے ہیں اور بیس فیملیوں تو

ہر فیملی کو ڈیڑھ لاکھ روپے مل جائیں گے۔ اور یہ بھی کچھ کم نہیں

ہے، کیونکہ یہ رقم ہمیں بغیر کسی محنت کے یوں ہی مل رہی ہے۔“

”یہ بات تو ہے۔“ انصاف اسی کو کہتے ہیں۔“

ان لوگوں کی باتوں سے بے خبر حامد اور شہلا اپنی

پلائنگ میں مصروف تھے۔ شہلا کہہ رہی تھی۔ ”سنو حامد!

اب چونکہ مجھ میں ادوم میں کوئی دوری نہیں رہی۔“

”دوری تو ہے۔“ حامد نے اس کی بات کاٹ دی۔

”اوہ، میرا مطلب ہے کہ نہیں رہے گی۔“ شہلا نے

کہا۔ ”اس لیے میں تم سے صاف صاف کہہ رہی ہوں کہ تم

اپنا سارا حساب کتاب میرے ہاتھ میں دے دو گے۔“

”ظاہر ہے۔“ حامد نے پیار بھری نگاہوں سے اس

کی طرف دیکھا۔

”تو ہم سب سے پہلے اس بلڈنگ کو چھوڑ کر کہیں اور

خشت ہوجائیں گے کیونکہ اب ہمارا یہاں رہنا مناسب نہیں

بلند ہو رہی تھیں۔

یہ آوازیں رات کے سائے میں آسانی سے گم رہی تھیں۔ وہ بستر سے اتر کر ٹیبل منڈل کے بال میں گئی۔ راستے میں ہنگامی کے ہر بین کو باہر کی جلا دی تھی۔ کرنٹی نے بچے بچے کر بچن کے گل کو کھولا۔ ایک تیز آواز کے ساتھ پانی نے گرنا شروع کر دیا۔ اس نے چلو میں پانی بھر کر اپنے چہرے پر چھڑکا پھر گلاس بھر کے پانی پر اور سبک کے اوپر جو موٹر کی کے شیشے پر آکھیں، جہاں گاہری طرف جھانکا۔ رات صاف تھی۔ درختوں کی قطاروں میں سے باہر کا اسٹور والا شیفہ جو جن کے عقب میں تھا، نظر آ رہا تھا۔ گرے والی برف اس کی چھت تک پہنچ رہی تھی۔ گہراج کا دروازہ ہوا کے ایک جھونکے سے پر شور آواز میں کھلا اور بند ہو گیا۔ اسے بند کرنے کے لیے کرنٹی کا باہر نکلتا ضروری تھا جہاں سے کوئی چہنچہ بھی تو اس کی آواز ہوا کے جھنڈوں میں گم ہو جاتی یزک کے اس پار کرنٹی کے قریب ترین پردی کا گھر کی فلائنگ کے قاصطے پر تھا۔ ہوا سے کھڑکی کا شیشہ کھڑکایا۔

”خوب! تم جیسے اس قدر جھنڈے موسم میں چھوڑ کر چلے گئے۔“ کرنٹی نے خود کھائی کی۔

کرنٹی کو لیون کے معاشقے کا علم تھا۔ اتوار کی ایک سہ پہر کو اس نے اوپر کی منزل پر دھڑے لون کو اٹھایا تو اسے لیون کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ ٹیبل منڈل پر بچن میں رکے ایک شیشہ پر بول رہا تھا۔ لیون نے کسی کو میٹھی کہہ کر غلط کیا۔ لیون کا لہجہ اس قدر نرمی تھا کہ کرنٹی کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ وہ خاموشی سے فون کان سے لگائے ہاتھ سننی رہی۔ بعد میں اس نے اس معاشقے کو لے کر لیون سے کوئی بات نہیں کی۔ اسے انتظار تھا کہ کب یہ معاملہ ختم ہوتا ہے مگر یہ معاملہ خامسا لہا ہو گیا تھا۔

اسی وقت فون بجنے لگا۔ کرنٹی نے گلاس سبک پر رکھا اور مڑی۔

”ہیلو“ فون اٹھا تو ہوئے اس نے کہا۔ اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ صرف ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی تیز تیز سانس لے رہا ہو۔ ”کون ہے؟“ کرنٹی نے پھر پوچھا مگر اس بار بھی جواب کے بجائے اسے ہانپ ہی سنائی دی۔ اس نے فون بند کر دیا۔ اس نے تیزی سے چلنے ہوئے سڑکیاں طے کیں۔ بتیاں چلنے دیں اور اوپر لگے دیوار گیر فون کو پہنچ دیا۔ پھر اپنے ٹائٹ گاؤن کو کمر کے ساتھ کس کر باندھا اور کبل اوڈھ کر بستر میں گھس گئی۔ گھر سے باہر ہوا کے ساتھ دروازے کی کٹھنٹ برابر ابھر رہی تھی۔ ٹیبل منڈل پر بار

بارون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

کرنٹی نے خود کو سیکڑ کر گھڑی بنایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ دنیا میں جانے کتنے لوگ تھے جو اپنی موت کے خواب دیکھتے تھے مگر پھر بھی سو جاتے تھے اور صبح کو انہیں کچھ بھی یاد نہیں رہتا تھا۔

☆☆☆

پانچ سال قبل وہ اس قصبے میں آئے تھے۔ قصبے کا نام گرد بلز تھا۔ کرنٹی پر کس فارمی میں ڈھنپری میکانیٹ کی حیثیت سے ملازمت کرتی تھی۔ پر کس ایک مشہور اور چلتا ہوا اسٹور تھا۔ وہاں اس کا وقت پر لگا کر گزارتا تھا مگر اب لیون کے جانے کے بعد یہ ایک مسئلہ تھا کہ وہ وہاں کس طرح دوسروں کا سامنا کرے گی۔ اس نے ”پر کس“ کے مالک جوئے کو فون کیا اور اس سے کہا کہ اس کا ایک مزید تیار ہو گیا ہے اور وہ یہ جگہ جاری ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ کب وہاں آئے گی۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی کہ اس کے لیے جگہ خالی رکھی جائے۔ جوئے نے کہا یہ خبر اس کے لیے پریشان کن ہے۔ اب شاید یہی کوئی مناسب ختم الہل مل سکے۔ جوئے نے کرنٹی کی تعریف کی اور کہا کہ وہ ایک بہترین کارکن تھی اور اسے ہر کوئی پسند کرتا تھا۔ کرنٹی کو آخری بات چھوٹی محسوس ہوئی۔ اس نے فون بند کر دیا۔ فریج سے چاکلیٹ ٹیک کھلا۔ یہ بات جھوٹ نہیں تھی کہ کوئی تیار ہو گیا تھا۔ دراصل وہ خود تیار ہوئی تھی۔ گرد بلز ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ لیون ٹورنٹو میں ملازمت کرتا تھا جو یہاں سے چالیس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ کرنٹی کو امید نہیں تھی کہ لیون کے جانے کی خبر جلدی پھیلے گی۔ اس نے میز پر بیٹھ کر ٹیک کھانا شروع کر دیا۔

کرنٹی کو اندازہ تھا کہ میٹھی کسٹروس میں کام نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے بال جولاہے سیاہ تھے، ایک عجیب ترغیب آمیز انداز میں بکھرے رہتے تھے۔ وہ تیز رنگوں کی لب اسٹیک لگاتی تھی جسے کرنٹی کی بارہا اپنے شوہر کے کارڈ پر لگی دیکھ چکی تھی۔ میٹھی ایک تیز لہر جیسی عورت تھی۔ عورتیں جنس سے چڑتی تھیں اور مرد جنس پر جان چڑھتے تھے۔

کب ختم ہو چکا تھا اور کرنٹی جس انداز سے میٹھی فون کی سمت دیکھنے جا رہی تھی۔ لیون کے چلے جانے کے بارے میں ابھی تک کسی کو علم نہیں تھا۔ خود کرنٹی کے والدین بھی اس سے بے خبر تھے۔ کرنٹی کے ماں باپ لیون سے اپنے بیٹے کی طرح پیار کرتے تھے کیونکہ وہ ان دونوں کا بڑا خیال رکھا کرتا تھا۔ لیون وجہ بھی تھا ہوشیار بھی۔ اس کا جسم کسی کھلاڑی جیسا تھا۔ وہ ”دنیا فار اٹلینٹ“ نامی فرم میں

معاشیاتی مشیر کے عہدے پر تھا اور اپنے پیشے میں بے حد کامیاب بھی تھا۔

کرنٹی کا اندازہ تھا کہ میٹھی، لیون کی کمپنی میں بطور کلائنٹ گئی ہوگی۔ وہیں اس کی ملاقات لیون سے ہوئی ہوگی اور پھر لیون پر اس کا جادو چل گیا ہوگا۔ اس کا سن اور انداز کسی جادو سے کم نہیں تھا۔

صبح کی روشنی میز پر پڑ رہی تھی۔ باہر جنوری کا دن کھلا ہوا تھا مگر بے حد چمک رہا تھا۔ مناسب وقت تھا کہ گہراج کے دروازے کو ٹھیک کر دیا جاتا۔ اس وقت دروازہ آواز بھی نہیں کر رہا تھا مگر کرنٹی خود کو اس قدر بھاری محسوس کر رہی تھی کہ وہ کوئی بھی کام نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر نوں کا ٹیک لٹال دیا۔ وہ کسی کی بات نہیں سنتا چاہتی تھی۔ وہ کرسی میں دھنس کر بیٹھ گئی اور باہر کی سمت دیکھنے لگی۔ برف باری پھر شروع ہو گئی تھی۔

☆☆☆

موسم سرما کی پیش قدمی کے ساتھ برف کے ڈھیر بلند ہو رہے تھے۔ حتیٰ کہ یہ اتنی بلند ہوئی کہ اگر وہ اس میں سے اپنی کار نکالنا چاہتی توئی کھنسنے کھدائی کرنا پڑتی مگر اسے پردا نہیں تھی۔ اسے کہیں جانا بھی نہیں تھا۔ وہ سو گز وقت گزار رہی تھی حالانکہ اس کا خوفناک خواب ساتھ تھا۔ وہ جلدی سونے لیٹ جاتی تھی۔ بتیاں چلنے دیں اور دوسرے دن دوپہر میں بڑی مشکل سے اٹھتی اور صرف ضروری کام مثلاً منہ دھونا، کپڑے پہننا وغیرہ تک ہی خود کو محدود رکھتی تھی۔ ویلنٹائن ڈے پر رات کو کوئی ٹو بجے اس نے اپنے قہقی دروازے پر کرسی کی دسک سنی۔ کرنٹی اس وقت لیونک روم میں ایک کتاب لیے صوفے پر دراز تھی۔ وہ اٹھ کر بچن میں گئی، اس نے سوچا یہ کون ہو سکتا ہے؟ کوئی قاتل..... اسے ہر روز خوفناک خواب دکھائی دے رہا تھا۔ بار بار ایک جیسا خواب دیکھنے کی وجہ سے وہ منظر کی جزئیات سے ابھی طرح آگاہ ہو گئی تھی۔ برف تلے اس کا برہنہ جسم..... گھٹنے ٹھوڑے سے سکڑے ہوئے..... اس کی سپید رنگت..... ہر پریشانی سے اوپر ایک زخم کا نشان اور خون کی ایک خشک لکیر پیشانی تک آتی ہوئی..... کسی کھلے ہوئے منہ جیسی۔

دسک پھر سنائی دی۔ کرنٹی دروازے کی طرف گئی۔ ”کون ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں مارکس ہوں۔“ باہر سے آواز آئی۔ ”سڑک کے پار ہتا ہوں۔ تمہارے لیے لکڑیاں لایا ہوں۔“ کرنٹی نے دروازہ غیر متفصل کیا۔ دوسری طرف مارکس جون کھڑا

تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ اس کے زرد دانت نظر آنے لگے۔ ”ہائے کرنٹی! میں لکڑیاں لایا ہوں۔ بالکل خشک ہیں۔“ وہ دروازے سے اندر آ گیا۔

”انہیں ادھر ہی ڈال دو۔“ کرنٹی بولی۔

”نہیں..... میں انہیں آتش دان کے پاس رکھ دیتا ہوں۔“ مارکس نے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔ وہ بچن سے گزر کر لیونک روم میں گیا۔ کرنٹی سینے پر ہاتھ باندھے دھمتی رہی۔ مارکس نے لکڑیاں آتش دان کے پاس قرینے سے رکھ دیں۔ مارکس سڑک کے پار اپنے بوڑھے اٹکل کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ دو بیٹیاں اور متعدد بچے چھوڑ کر ادھر آیا تھا۔ مارکس نے لکڑیاں رکھ کر خود کو سیدھا کیا۔ ہاتھ جھاڑے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ کرنٹی نے سوچا کہیں یہ بچے ہوئے تو نہیں ہے۔ ”مجھے تمہارا خیال آتا رہا ہے۔“ مارکس نے کہا۔ ”تم ادھر بالکل اکیلی رہ رہی ہو اور موسم اتنا سرد ہے۔ کبھی کسی وقت بھی جا سکتی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا تم سردی میں ٹھہرو۔“

”شکریہ۔“ کرنٹی نے کہا اور پشیمان ہونے لگی کہ مارکس کو اندر کیوں آنے دیا پھر وہ کچھ سوچ کر یوٹی۔ ”لیون تمہارا شکریہ ادا کرے گا۔ مجھے کھانا تیار کرنا ہے۔ اسے کچھ دیر ہو گئی ہے بیچنے میں..... وہ کسی بھی وقت آجائے گا۔“

مارکس نے کرنٹی کو عجیب نظروں سے دیکھا۔ ”وہ آج رات آ رہا ہے؟ میں اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“

بھرے میں نے اسے دیکھا نہیں ہے۔

”وہ ملک سے باہر گیا تھا برس پر۔ آج رات آ رہا ہے۔“ کرنٹی نے جواب دیا۔

”کمال آدی ہے لیون۔“ نہیں اکیلا چھوڑ گیا۔“

کرنٹی ہال دے میں چلی آئی۔ ”لکڑیوں کے لیے شکریہ..... میں اب ڈرنے والی ہوں۔“

”کسی اچھی سی عورت کو اس طرح اکیلا چھوڑنا اچھی بات نہیں۔“ مارکس نے کرنٹی کی طرف توجہ کے ساتھ دیکھا۔ کرنٹی دروازے کی طرف جانے لگی۔ اس نے تصور میں خود کو بھاگتے اور مارکس کو پوچھا کرتے دیکھا۔ مارکس نے اپنی من مانی کے بعد اسے مارڈالا اور اس کی لاش پھیل کر کنارے لے جا کر دفن کر رہا ہے جہاں برف اسے چھپا سکتی تھی۔ اس کا خواب آنکھوں میں تیر رہا تھا۔

کرنٹی نے بڑھ کر تیزی دروازہ کھول دیا۔ ہوا کا ایک برقیلا جھونکا اندر گھسا مگر وہ اسے کھولے کھڑی رہی۔ مارکس بھی وہیں آ گیا۔ اس نے اپنے جوتے پہنے اور کرنٹی کی

پریشانی ہوئی تھی۔ باہر بارش کا شور جاری تھا۔ ہوا میں کچھ گرمی پیدا ہوئی تھی۔ اس سے برف کے ٹکڑے پگھلنے لگے تھے اور چھت سے نیچے آ رہے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ جمیل پر بھی برف پگھلنے والی ہے اور آس پاس کی تمام زمین صاف ہونے والی ہے۔

سونے کے لیے جاتے ہوئے کرستی نے ساری بیتیاں جلا دیں مگر رات بھی اسے اپنا پڑا خواب نظر آیا۔ لگتا تھا اسے موت کے خیال نے مکمل طور پر چکر لایا ہے۔ حالانکہ دن کا تجربہ بھی خاصا اثر انگیز تھا لیکن وہ بھی خواب پر اثر نہیں ڈال سکا۔ صبح ہوئی تو کرستی نے محسوس کیا کہ وہ ڈری ہوئی ضرور ہے مگر اس پر قابو پاسکتی ہے۔ باہر فضا بہت شفاف سی تھی۔ ہر طرف برف ہی برف تھی مگر مکمل صاف تھا اور سورج نکل آیا تھا۔ جس وقت کرستی نے برف پر اپنا پیچہ مارا اسے احساس ہوا کہ برف سخت نہیں رہی، اس میں نرمی پیدا ہوئی تھی۔ تین گھنٹے کی محنت کے بعد اس نے خاصی برف ہٹائی پھر گیراج میں گئی۔ کارڈ اسٹارٹ کی اور اسے باہر نکالا۔ کارڈ انجن سرد تھا مگر کام کر رہا تھا۔ قصبے کے مین بازار پہنچ کر کرستی نے کافی تعداد میں پھل اور سبزیاں خریدیں۔ دودھ اور دیگر اشیاء بھی لیں پھر سارا سامان کار میں ڈالا۔

”ارے کرستی! یہ تم ہو۔“ کرستی کو اپنے عقب میں کسی کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے سرینا کھڑی تھی۔ سرینا کے شوہر اور لیون میں شش سانی تھی۔

”اوہ سرینا تم۔“

”کیا حال ہے تمہارا کرستی۔“ سرینا نے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ کرستی نے احتیاط سے کہا۔

”لیون کیسا ہے؟“ سرینا نے پوچھا۔ سرینا چھوٹے قد کی خاصی موٹی عورت تھی مگر اس کی ازدواجی زندگی میں کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔

کرستی نے قدرے تذبذب کے بعد کہا۔ ”لیون مجھے چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا ہے۔ ہمارے درمیان تلخچہ کی بوچھاڑ ہے۔“

”ارے..... آئی ایم سوری۔“ سرینا ایک دم سے سنجیدہ ہو گئی۔ کرستی کے لیے آسانی ہو گئی پھر آرام سے سرینا کے دوسرے سوالات کو جھٹکتا دیا۔ چلتے چلتے کرستی نے سرینا سے کہا کہ لیون کسی عورت کے ساتھ نہیں فرار ہو گیا ہے۔ اب یہ بات کوئی راز نہیں۔ تم اسے دوسروں کو بتا سکتی ہو۔ میں یہیں رہوں گی۔ فی الحال کام نہیں کر رہی مگر جلد دوبارہ اسٹور پر چلی جاؤں گی۔

مگر پتہ چل کر کرستی نے گھر کی صفائی شروع کر دی۔ وہ

آدھی رات تک لگی رہی اور.... بالآخر اس نے گھر کو اچھی حالت میں کر لیا۔ اس کے بعد کرستی نے غسل کیا اور کھانا کھایا۔ پھر اپنے صاف ستھرے بستر پر لیٹ گئی۔

آنے والے ہفتے میں کرستی نے لیون کی تمام چیزیں، لباس اور جوئے وغیرہ جمع کیے اور ضرورت مندوں کو تحیرات کروا دیں پھر تمام الماریاں اور کھڑکیاں صاف کیں۔ لیون کی تمام تصویروں کو جمع کیا اور ہنڈل بنا کر کبکس میں بند کر کے تھخانے کے ایک کونے میں ڈال دیا۔ تھخانے سے ہی کرستی نے باغبانی اور لکڑی کے کام والے اوزار نکالے اور گھر کی صفائی اور مرمت کے کاموں کی طرف متوجہ ہوئی۔ ایک صبح کرستی فون کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سوچتے ہوئے ایک لمبی سانس لی اور فون ملایا۔ وہ اپنے ماں باپ سے بات کرنا چاہتی تھی جو کسی اور شہر میں رہتے تھے۔ اسے حیرت ہوئی کیونکہ اس کے اور لیون کے بارے میں ماں نے جان کر کوئی حیرت ظاہر نہیں کی۔ تب کرستی نے پوچھا۔

”مگر ماں! تم تو لیون کو بہت پسند کرتی تھیں۔“

”صرف اس لیے کہ وہ کہیں پسند تھا۔“ اس کی ماں نے کہا۔ پھر اس کے باپ نے بات کی اور کہا۔

”کیا تم ہمارے پاس آنا چاہتی ہو؟“

”نہیں ڈیڈ۔“ کرستی بولی۔

”میں چالیس سال کی ہوں کوئی بچہ بھی نہیں ہے، میں ٹھیک ہوں ادھر ہی۔“ فون بند کرنے کے بعد کرستی نے گیراج کا دروازہ درست کیا پھر اپنے گھر کا اچھی طرح جائزہ لیا۔

کرستی نے سوچا کہ یہ ایک اچھا مکان ہے۔ بس اس کو رنگ و روغن اور چھت کو کچھ مرمت کی ضرورت تھی۔ وہاں مکان کے آس پاس بہت سے درخت لگے ہوئے تھے اور اب سبزہ بکھر رہا تھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ وہ یہ گھر نہیں چھوڑے گی۔ وہ یہاں سے بھی نہیں جائے گی۔ میں ایک کتا بھی لوں گی! ان درختوں میں وہ دوڑتا ہوا بہت اچھا لگے گا۔ کرستی سوچ بھرے انداز میں چلی اور گیراج کا دروازہ بند کر دیا۔ جب وہ مڑی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے اپنی طرف مارتس کو بڑھتے دیکھا۔

”ہائے کرستی۔“ اس نے اپنے زرد دانت نکالتے ہوئے اسے پکارا۔ ”تم نے اپنا مکان صاف کر لیا ہے مجھے بالائیں میں مدد کرو۔“ مارتس نے زمین لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے جسم سے کسی ستے سے پر لیم کی خوشبو اٹھ رہی تھی اور ہاتھ میں کوئی ہنڈل دیا رکھا تھا۔ ”آج اتوار کی رات ہے۔“ مارتس بولا۔ ”میں نے سوچا تم تبا ہو گی۔ تمہیں کتنی دن

گا۔ کچھ پینے پلانے کی چیزیں لایا ہوں۔“ مارتس نے ٹیکٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”مجھے کی کمی نہیں چاہیے مارتس۔“ کرستی کا لہجہ خشک ہو گیا۔ ”اور سنو، میں نہیں چاہتی کہ تم میرے گھر آؤ۔“ سمجھے۔“

مارتس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کیا بات ہے تم ٹھیک تو ہو؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ کرستی نے اسی درشتی سے کہا۔ ”سردیاں سخت تھیں مگر گزر چکی ہیں اور تم مارتس..... اب میرے گھر مت آنا۔ درنہ میں پولیس کو مطلع کر دوں گی۔ بس اب چلے جاؤ۔“ مارتس نے اسے گھور کر دیکھا، مڑا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

”لعنت ہو۔“ کرستی نے آہستہ سے کہا۔

☆☆☆

وہ خواب کی گرفت میں تھی اور خود اپنی لاش کو دیکھ رہی تھی۔ برف کے نیچے دبی ہوئی آنکھیں جن کا رنگ نیلا تھا، اب سرمئی ہو گئی تھیں۔ چہرے کے زاویے اور گوشت سیاہ ہو گئے اور پھول چکے تھے۔ کرستی اپنی برف میں دبی ہوئی لاش کے ساتھ گئی اور قاتل کا کہیں پتا نہیں تھا۔ کرستی نے سوچا آخر مجھے کہاں ڈالا گیا ہے؟ میں کہاں مدفن ہوں؟ خواب میں کرستی کو بس اس قدر ہی پتا چلتا تھا کہ اسے جمیل کے آس پاس کہیں دفن کیا گیا ہے۔ وہ خواب کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے آنکھیں سے چل رہی تھی کہ اس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا۔ اسے لگا جیسے پر مشروط ہندلا ہو کر ایک سیاہ دیوار پر گیا ہو۔ کرستی نے خود کو سنبھالا۔ اس نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ وہ سلیپ غائب ہونے لگی۔ اب اسے ایک چھت نظر آ رہی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ بلند ہو رہی ہے، فضا میں اٹھ رہی ہے۔ کرستی نے نیچے چھت کو دیکھا پھر یہ چھت بھی چھوٹی ہوئی۔ وہ بہت اوپر اٹھ گئی تھی۔ اب نیچے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

دوسری صبح گرم تھی۔ برف نے اب تیزی سے پگھلنا شروع کر دیا تھا۔ پانی چلنے کی نرم آوازوں سے فضا سنسنی آ رہی تھی۔ کرستی نے ایک پیچہ سنبھالا اور ٹول بس بنگل میں دیا اور صحن کے عقبی حصے کی سمت چل پڑی۔ یہاں کا شیلڈ پتلی دیواروں کا تھا۔ اس کی چھت بھی پتلی تھی۔ یہاں انہوں نے اپنے گھر کا کٹھن کٹا ڈال رکھا تھا۔ کرستی نے برف صاف کی اور سچ کر اس کا دروازہ کھول دیا۔ اندر کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ یہاں نمی اور خنک تھی۔ عجیب سی بو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ دیواروں کی درزوں سے سورج کی

روشنی اندر آ رہی تھی اور نقش و نگار بنا رہی تھی۔ اسے سمجھے میں در نہیں لگی کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں خواب میں ٹھیک سے نظر نہیں آتی تھی۔ یہی اس کا مدفن ہے۔ اس کی لاش یہیں دفن ہے۔ کرستی نے لمبی سانس لی اور سوچا کہ انسانی ذہن کیسا کرشمہ ساز ہوتا ہے۔ پھر رک کر فرش کے ایک کونے کی طرف دیکھا اور اپنا ٹول بس کھولنے لگی۔ وہ کونے کے نیچے اٹھا ڈری تھی۔ یکے بعد دیگرے اس نے جب کئی تختے اٹھا دیے تو پیچہ سنبھالا اور زمین کھودنے لگی۔ ذرا ہی دیر بعد اسے وہ سلیپ دکھائی دے گئی۔ اس پر برف کی چھانچ موٹی تھی جی ہوئی تھی۔ کرستی نے سلیپ ہٹا کر نیچے نگاہ ڈالی۔ نیچے زلیہ..... اب اتنی حسین نہیں نظر آ رہی تھی جیسی وہ ہوئی تھی..... اور اس کے پاس لیون بھی پڑا ہوا تھا۔ اب وہ بھی اتنا خوب صورت نہیں رہا تھا۔ کرستی ان دونوں کو دیکھتی رہی..... بالکل غیر جذباتی انداز میں۔ ”تم لوگ ابھی تک گلے سڑے نہیں؟“ کرستی نے خود کلائی کی۔ اس کے دماغ میں کچھ عرصہ پہلے کی باتیں گھومیں۔ جب وہ آفس سے لوٹی تھی تو اس نے دروازے پر دو عدد سوٹ کس دیکھے۔ لیون گھر میں میکی کی لاش کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔

لیون نے اعتراض کیا کہ اس کا میکی سے معاشرہ تھا مگر میکی عیاش عورت تھی۔ جب اس کا دل بکھر گیا تو اس نے نیا عاشق ڈھونڈ لیا اور لیون کو چھوڑ دیا۔ اسی بات پر لڑائی ہوئی اور غصے میں آ کر لیون نے میکی کا گلا دبا دیا جس کے باعث وہ مر گئی۔ لیون گرفتاری کے ڈر سے میکی کی لاش کو بچھا کر مارتس کا جوار بھاڑا۔ اس نے اکاؤنٹ سے تمام رقم نکال لی تھی اور کرستی سے کہا کہ وہ بعد میں اسے بھی بلائے گا اور پھر جب وہ لاش کو یہاں دفن کر رہا تھا تو پیچے کی ایک ضرب سے اس نے لیون کو بھی میکی کے پاس پہنچا دیا۔ باقی کام کرستی نے خود کیا تھا مگر اس سے ایک غلطی ہوئی تھی۔ اس نے سلیپ کے پانی کو رہنے دیا جو برف بن گیا تھا اور اسی وجہ سے یہ لاشیں ابھی تک گئی نہیں تھیں۔ کرستی نے ازار پیچیک دیے۔ ہاتھ بھجائے اور بولی۔

”اگلی سردیوں تک تمہاری ٹھکان میں نہ ہو چکی ہوں گی اور پھر تمہیں پھیل کنارے پہنچانے میں مجھے کوئی وقت نہیں ہوگی۔“ اس کے بعد کرستی نے سامان اٹھایا۔ شیلڈ کے دروازے تک آئی اور مڑ کر غلامیں دیکھا اور بڑبڑائی۔

”گڈ بائی..... اینڈ گڈ نائٹ۔“



حریف

نثر ہادی

”تیرا عشق نچائے گلی گلی“ کی عملی تفسیر بنی وہ بھی پھر سے بچنے کے لیے پھرتوں پر مجبور تھی کیونکہ... چاہتوں بھرا ساتھ پانے کے لیے اسے زندگی کی ضرورت تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان غیروں سے تو جنگ کر سکتا ہے مگر اپنی ذات اور اپنے رشتوں سے لڑنا انسان نہیں ہوتا اور اسے بھی یہی کٹھن مرحلہ درپیش تھا کہ اس کے مدمقابل غیر نہیں اپنے تھے، جن کی دسترس سے دور وہ درد بھٹکتی روح بن گئی تھی اور اس سفر نے اسے یہ باور کرایا تھا کہ انسان کا ذرہ برابر عمل بھی جزا یا سزا بن کر مکافات کی صورت اس کے سامنے آجاتا ہے... اس نے بھی بے خیالی میں ایک انسان کی محض ہمدردی کی بنیاد پر مدد کی تھی لیکن اس کا صلہ اسے کب اور کیسے ملنے والا تھا اس کا اندراک اگر اسے قبل از وقت ہو جاتا تو جی جان سے وہ اسی محاذ پر ڈٹی رہتی۔ بہر حال ایک روز اس مکافاتی عمل نے اس کی آنکھوں پر پڑا پردہ ہٹا دیا اور دھندلکے میں چھپے منظر کو واضح کر دیا مگر... اس پر یقین کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

حالت کی پارٹس چھپے لوگے غمزدگی کی اذیت اور... بے استیارتوں کی دلخراش داستان



”یہ کام جلد از جلد ہو جانا چاہیے۔“ اشرف خاں نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

سانگرہ کی تقریب سے صدف اسی وقت لوٹی تھی جب اشرف خاں اس کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ شب خوابی کا لباس بھی نہیں پہن کر تھی پھر اشرف خاں کے جانے کے بعد تو اس کا ذہن اتنا منتظر ہوا کہ اسے کپڑے تبدیل کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ وہ صرف سینڈل اتار کر بستر پر لیٹ گئی۔ اس کے دماغ میں اشرف خاں کی نہ صرف اس وقت کی باتیں پکارا رہی تھیں بلکہ وہ گفتگو بھی جو اس نے گزشتہ رات چھپ کر سن لی تھی جب اشرف خاں اپنے بڑے پڑوسر صدیق دُرُاج سے کوئی خاص بات کر رہا تھا۔

ان سب باتوں کی وجہ سے صدف کی نیند اس کی آنکھوں سے بہت دیر تک اڑی رہی۔ رات اپنے تیسرے پہر میں داخل ہو رہی تھی جب اس کی آنکھ کھلی اور اس رات اس نے ایک حیرت انگیز خواب دیکھا۔

وہ ایک چمک دار انسانی کھوپڑی تھی جس کے چار دانت بھی تھے۔ کسی ایسی چمک دار دھات کے دانت جو کھوپڑی سے زیادہ چمک رہے تھے۔

”صدف!“ ایک بھاری بھر کم آواز اس طرح آئی جیسے وہی کھوپڑی بول رہی ہو۔ ”غور سے سنو اور یقین کرو۔ تم خوب جانتی ہوگی کہ میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ تم شدید خطرے میں ہو صدف!..... تمہیں قتل کرنے کا حکم صادر کیا جا چکا ہے۔ فوراً میرے پاس آ جاؤ۔ کسی اور جگہ جا کر تم اپنی جان نہیں بچا سکو گی۔“

پھر وہ کھوپڑی تحلیل ہوتی چلی گئی، اندھیرے میں مدغم ہو گئی۔

خواب ختم ہوتے ہی صدف کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ سینے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ جو آواز اس نے خواب میں سنی تھی، وہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ وہ آواز لاشیوں کے کافر قبیلے کے مذہبی پیشوا کی تھی۔ وہ مذہبی پیشوا کا لاش قبیلے کی زبان میں ”بیان“ کہلاتے تھے۔

بیان کو صدف ”خیلاری“ کے نام سے جانتی تھی۔

دو سال پہلے صدف تقریباً کافرستان جا چکی تھی جہاں بیان خیلاری ایک معاملے میں اس کا احسان مند ہوا تھا۔ اسی لیے جب صدف کافرستان سے رخصت ہونے لگی تھی تو پراسرار قوتوں کے مالک خیلاری نے اس سے کہا تھا۔

”پریشانی کا سبب؟“
”وہی باتیں۔“ صدف نے جواب دیا اور پھر غالباً ہمت کر کے بولی۔ ”آپ اچھا نہیں کر رہے ہیں بابا!“
”اسی کی وجہ سے تم پیش وشرت کی زندگی گزار رہی ہو۔“
”قوم کے ساتھ وہ سب کچھ کرنے سے بہتر ہوتا کہ میں غربت کی زندگی گزارتی۔“ صدف کی آواز بھرا گئی۔
اشرف خاں چند لمحوں خاموشی سے اسے گھورتا رہا، پھر بولا۔ ”ابھی تم کسی دوست کی سانگرہ سے آئی ہو۔ امید ہے کہ تم نے وہاں کی فریبی دوست سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا ہوگا۔“
”ظاہر ہے بابا!“ صدف کی نظریں پھر جھک گئیں۔
”کسی کو یہ باتیں بتانے کا مطلب تو یہی ہوتا جیسے میں اپنے ہی جرم کا اعتراف کر رہی ہوں۔“

”اپنی ماں کو بھی نہیں بتایا؟“
”جی نہیں لیکن.....“ وہ چپ ہو گئی۔
”لیکن..... لیکن کیا؟“

اس مرتبہ صدف نے کچھ جرأت کی۔ ”اگر آپ نے یہ سب کچھ بند نہ کیا تو.....“ وہ پھر چپ ہو گئی۔
”تو؟“

”تو نہ جانے کیا ہوا“ صدف نے کہا۔ ”کل سے ایک طوفان آیا ہوا ہے میرے دماغ میں..... ممانے میری تربیت کچھ ایسی ہی کی ہے کہ میں سب کچھ دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتی۔“
”بتاؤ کسی کو؟“ اشرف خاں غرایا۔

صدف خاموش رہی۔ اس نے پھر نظریں جھکا لی تھیں۔
اشرف خاں اسے ایک منٹ تک گھورتا رہا، پھر تیزی سے چلا ہوا کمرے سے نکل آیا۔ وہاں سے وہ اپنی خواب گاہ میں لوٹا۔ دل شاد خانم بے خبر سو رہی تھی۔ اشرف خاں نے اپنا موبائل فون اٹھایا اور کمرے سے نکل کر بیٹھنے کے میسر پر پہنچا۔ وہاں سے اس نے موبائل پر کسی سے رابطہ کیا۔
”میں باس!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔
”میری بیٹی صدف کو جانے ہو؟“

”کیوں نہیں باس! ہم میں سے کون نہیں جانتا ہوگا آپ کی بیٹی کو۔“
”ختم کر دو اس کو۔“

”جی!“ بہت چوکی ہوئی آواز تھی۔

اشرف خاں نے کہا۔ ”کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا کہ موت حادثاتی معلوم ہو۔“
”دل..... لیکن..... باس.....“

ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔
”ڈانٹا نہیں اسے۔“ اجازت لے کر گئی تھی مجھ سے!“
اشرف خاں جواب میں کچھ کہے بغیر دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ دل شاد خانم نے منہ بنایا اور لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس پر نیند شدت سے سوار ہو گئی۔
اشرف خاں اپنے کمرے سے نکل کر صدف کے کمرے کے دروازے پر پہنچا اور دروازے پر دھک دی۔
”کون؟“ اندر سے صدف کی آواز آئی۔ چونکا ہوا انداز تھا کیونکہ گیارہ سے زیادہ کا وقت ہو چکا تھا۔
”میں ہوں۔“ اشرف خاں نے بلند آواز میں کہا۔
فوراً ہی قدموں کی آواز سنائی دی جو دروازے کی طرف آ رہی تھی پھر دروازہ کھول دیا گیا۔ صدف غالباً اسی وقت آئی تھی۔ اس نے کپڑے تبدیل نہیں کیے تھے۔
”بابا!“ وہ سنجیدگی سے بولی۔
”ہوں۔“ اشرف خاں تیزی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔

”کیا بات ہے بابا؟“ صدف نے سوالیہ انداز میں باپ کو دیکھا۔

اشرف خاں نے گاؤں کی جیب سے وہی تصویر نکالی جس نے اسے چونکا یا تھا۔ وہ اس نے صدف کے سامنے کر دی۔

”یہ تمہاری ہی تصویر ہے نا؟“ اشرف خاں کی آواز میں غصہ تھا۔
”جی۔“ صدف کی آواز بہت دھیمی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ پیکا پڑ گیا تھا۔

”اور.....“ اشرف خاں بولا۔ ”تصویر سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ تم کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کر رہی ہو!“
صدف نے نظریں جھکا لیں۔

”کیا نتائج تم؟“ اشرف خاں نے تیزی آواز میں پوچھا۔
صدف خاموش رہی۔ نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

”جواب دو!“ اشرف خاں نے کہہ کر اپنی زور سے دانت پر دانت بجائے کہ اس کے جڑے کی ہڈیاں ابھریں۔
صدف نے نظریں اٹھائیں اور آہستہ سے بولی۔

”یہ اتفاق تھا بابا کہ میں کل رات اس طرف نکل گئی تھی۔ میں نے باتوں کی آواز سنی۔ میں وہ ہوتی ہوئی آگے نکل جاتی لیکن ایک ایسا لفظ میرے کان میں پڑا کہ میں شگ کرک کئی پھر میں نے جو باتیں سنیں، انہی کی وجہ سے میں کل سے اب تک پریشان ہوں۔“

اشرف خاں نے سی سی نوٹج دیکھیں اور چونک گیا۔ وہ اپنے کمرے کے ڈرائنگ روم میں چند افراد سے جو خاص قسم کی میٹنگ کیا کرتا تھا، انہیں ہر صورت میں راز رکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے کمرے کے ان بیرونی حصوں پر کیمرے لگوائے تھے جہاں سے کوئی چھپ کر میٹنگ کی باتیں نہ کر سکتا تھا۔ ایسی ہی ایک جگہ کہ وہ تصویر تھی جس میں ایک لڑکی نظر آ رہی تھی جس کی عمر بیس اکیس سال کے قریب تھی۔

اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ اشرف خاں وہ تصویر دیکھ کر نہ صرف چونکا بلکہ لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھا۔ اس نے پیلو میں لیٹی ہوئی اپنی بیوی دل شاد خانم پر نظر ڈالی جو سوچکی تھی۔ اشرف خاں نے اسے جھنجھوڑا لیا۔
”دل شاد!“ اس کی آواز بھی خاموشی تھی۔
”دل شاد! وہاں ہر بڑا کرناٹھ بیٹھا۔“ کیا ہوا..... خیریت؟“

”صدف.....“ اشرف خاں نے بیوی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ ”واپس آگئی ہے؟“

دل شاد خانم نے گھڑی پر نظر ڈالی۔
”اس وقت کیسے خیال آگیا آپ کو؟“

”میری بات کا جواب دو!“ اشرف خاں کا لہجہ خاصا تیز تھا۔

”اب تک تو شاید ابھی نہیں ہو۔“ دل شاد خانم نے جواب دیا۔ ”بتاؤ چکی ہوں آپ کو..... اس کی کسی دوست کی سانگرہ تھی آج، کہہ رہی تھی کہ وہاں سے کھانا کھا کر ہی آئے گی، ہم لوگ کھانے پر اس کا انتظار نہ کریں۔ میں اسے زیادہ دیر تک رات کے وقت باہر رہنے کی اجازت نہ دیتی لیکن اس خیالی سے دے دی کہ وہ کل سے بہت کم مام اور چپ چپ سی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ سانگرہ میں جا کر اس کا دل پھیل جائے گا۔“

”دوبارہ یہ کہانی سنانے کی کیا ضرورت تھی!“ اشرف خاں پھر جھنجھکا گیا۔ ”میں نے پوچھا تھا کہ وہاں آگئی یا نہیں۔“

”میں بھی جواب تو دے چکی ہوں۔“ دل شاد خانم نے منہ بنایا۔ ”گیارہ بج چکے ہیں۔ آہی گئی ہوگی۔ میں تو آج جلدی سو گئی تھی۔“

اشرف خاں بستر سے اٹھا اور شب خوابی کے لباس پر گاؤں پہننے لگا۔

”کیا صدف کو دیکھنے جا رہے ہیں؟“ دل شاد خانم نے پوچھا۔
”ہاں۔“ اشرف خاں گاؤں کی ڈوری باندھتے



جاسوس ڈائجسٹ سیلی کیشنز

ایک ادارہ، چار ماہانہ مطبوعات

دنیا بھر میں

خبریات

اور مضمونات

کی نشر و اشاعت

جاسوسی ڈائجسٹ سب سے زیادہ پڑھنے والی ماہنامہ گزشتہ
مالی سال میں دنیا بھر میں 10 لاکھ 50 ہزار سے زائد
نسخوں کی فروخت ہوئی ہے۔



جہاں جاسوس پڑھنا چاہتے ہیں وہاں یہ رسائل ہر ماہ ہاتھ لگتے ہیں

C-63 فیئر ٹریڈ ایکسپنیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

فون نمبر: 35804200, 35802552 (92-21) 35802551 (92-21) ای میل: group@hotmail.com



اشرف خاں نے کہا اور ناشتے میں مصروف رہا۔
”آپ کے سامنے تو یہ نہیں بتائے گی۔“ دل شاد خانم
نے کہا۔
”تو بعد میں پوچھ لیتا۔“ اشرف خاں نے کہا۔ ”ناشتا
کر کے میں جا رہا ہوں دفتر..... آج شاید واپسی میں بھی
کچھ دیر ہو۔ کام زیادہ ہے۔“
جب اشرف خاں چلا گیا تو دل شاد نے اپنا سوال
صاف سے دہرایا۔
”کچھ خاص نہیں ماما“ صدف نے جواب دیا، پھر
فوراً ہی یولی۔ ”اس وقت بھی میں اپنی دوست کے گھر
جاری ہوں۔ کل سانگرہ کی تقریب کے دوران ہی اس کی
طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔ اسے دیکھنے جاؤں گی۔ فون پر
خیریت دریافت کرنا تو رکسی سی بات ہو گی نا۔“
لیکن صدف نہ تو گزشتہ رات کسی دوست کی سانگرہ پر
گئی تھی، نہ اس وقت اس نے سچ بولا تھا۔ وہ گزشتہ رات بھی
شیراز کے ساتھ لائٹ ڈرائیو پر نکل گئی تھی اور اس وقت بھی
شیراز ہی سے ملے جانا چاہتی تھی۔
شیراز سے اس کی محبت پر دان چڑھتے ہوئے چار
سال گزر چکے تھے۔ ان دنوں نے ایک ہی کالج میں پڑھا
تھا۔ صدف ٹرسٹ ایئر میں داخل ہوئی تھی۔ شیراز اس وقت
تھرڈ ایئر میں تھا۔ دو سال بعد کالجیشن کرنے کے بعد اسے
ایک کمپنی میں اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ صدف نے اسی سال
فائنل ایئر کا امتحان دیا تھا اور نتیجے کی انتظار تھی۔ شیراز نے
اس سے وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی اس کا نتیجہ آئے گا، وہ اپنے
والدین کو اس کا رشتہ لینے کے لیے بھیج دے گا۔
ان دنوں شیراز اپنے گھر میں اکیلا رہ رہا تھا۔ اس کے
والدین اور اس کی چھوٹی بہن چینی ریاست ایلوئس گئے
ہوئے تھے جہاں شیراز کی بڑی بہن بیاہ کر گئی تھی۔ ان دنوں
اس کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ سب اسے ہی دیکھنے گئے
تھے۔ شیراز کمپنی کی مصروفیت کے بہانے وہیں رک گیا تھا
مگر ان کے جاتے ہی اس نے پندرہ دن کی چھٹی لے لی تھی
تاکہ صدف کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزرا سکے۔
گزشتہ روز اس کی چھٹی کا پہلا دن تھا۔ صدف نے
اس کے ساتھ چار گھنٹے گزارے تھے لیکن اب دوسرے دن
صبح ہی صبح وہ اس لیے ملنا چاہتی تھی تاکہ اسے اپنی موجودہ
صورت حال کی شکایت سے آگاہ کر سکے۔
جب وہ اپنی کار میں شیراز کے گھر کی طرف روانہ ہوئی
تو راستے میں ہی اسے موبائل فون پر اطلاع دے دی کہ وہ

”اچھی لڑکی!..... میں تمہارے بارے میں سب کچھ
جان سکتا ہوں مگر فی الحال میں نے تمہارے مستقبل میں تھوڑا
سا جھکا ہے۔ جب تم تیس سال کی ہو جاؤ گی تو ایک خطرہ
تمہارے سر پر منڈلائے گا۔ جب بھی ایسا ہوا، میں تمہیں
اس خطرے سے آگاہ ضرور کروں گا۔ کیونکہ میں تمہاری
زندگی میں محبت بھی دیکھ رہا ہوں اس لیے جب بھی تمہیں کسی
خطرے سے آگاہ کرنا چاہوں گا تو تمہارے خواب میں
دائمنی کی کھوپڑی بھیجوں گا جو یہاں رہنے والوں کے لیے
محبت کی علامت ہے۔ تم نے یہاں اس کے بارے میں سنا
تو ہو گا!“
کافرستان میں صدف دائمنی کی لازوال محبت کا
قصہ سن چکی تھی۔
وہ سب باتیں اس وقت بھی صدف کو یاد آ گئیں۔
اسے یہ بھی یقین تھا کہ اس کا خواب بیان غلطی ہی کی
پر اسرار تو توں کا کر شہ تھا۔ اس نے جو وعدہ کیا تھا، وہ کبھی
دلکھا یا۔ صدف کو یہ بھی یقین تھا کہ اس سے کوئی بات بھی غلط
نہیں کہی گئی ہو گی۔
اس یقین کے باعث اس کے دماغ میں یہ سوال ابھرا کہ
کیا اس کا باپ اشرف خاں اس کی زندگی کا دشمن بن سکتا ہے؟
یہ تو بہر حال ملے تھا کہ صدف اس کے ایک نہایت
سکین راز سے واقف ہو گئی تھی لیکن کیا کوئی باپ ایسی کسی
وجہ سے اپنی بیٹی کو قتل بھی کر دے سکتا ہے؟
ان خیالات کی وجہ سے صدف باقی رات جاگتی رہی۔
”کیا رات کو سو نہیں سکتیں؟“ صبح ناشتے کی میز پر دل
شاد خانم نے اس سے پوچھا۔ ”تمہاری آنکھیں سرخ ہو
رہی ہیں۔“
”جی ماما“ صدف نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔
”نید نہیں آئی رات کو۔“
”کیا باپ نے بہت زیادہ ڈانٹا تھا۔“
صدف جواب میں کچھ نہیں کہہ سکی کیونکہ اسی وقت
اشرف خاں ڈائمنگ روم میں داخل ہوا تھا۔
لیکن جلد ہی دل شاد خانم نے اشرف خاں سے کہا۔
”میں نے آپ کو بتا دیا تھا کہ یہ مجھ سے اجازت لے کر گئی ہے،
پھر بھی آپ نے اسے اتنا ڈانٹا کہ یہ رات بھر سو نہیں سکی۔
دیکھ رہے ہیں آپ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔“
اشرف خاں نے ایک اونچٹی نظر صدف پر ڈالی جو
نظر سے جھکائے خاموشی سے ایک ٹوسٹ پر کھنکھار رہی تھی۔
”میں نے اسے کتنا ڈانٹا ہے، یہ اسی سے پوچھو!“

میں منٹ میں اس کے گھر پہنچ رہی ہے۔
 ”آئی جی؟“ شیراز نے حیرت سے کہا تھا۔ ”کل تو یہ
 طے ہوا تھا کہ.....“
 ”کل کی بات چھوڑو۔ میں اس وقت کسی اور وجہ سے
 آ رہی ہوں اور گھر پہنچ کر ہی بتاؤں گی۔ راستے میں نہیں
 بتا سکتی۔ تم جانتے ہو کہ میں تیز ڈرائیونگ کرتی ہوں اور اس
 وقت تو کچھ زیادہ ہی تیز کر رہی ہوں۔ ایک گھنٹہ سے
 اسٹیئرنگ سنہال کر سو بائبل پر زیادہ بات نہیں کر سکتی۔“
 پھر اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔
 شیراز کے والد بھی ایک بڑی پوسٹ پر کام کرتے
 تھے، اس لیے گھر میں کئی ملازم تھے لیکن والدین وغیرہ کے
 جانے کے بعد اس نے خانا ماں اور چوکیدار کے علاوہ سب
 کو اس وقت تک کے لیے چھٹی دے دی تھی جب تک اس
 کے والدین واپس نہ آ جاتے.....
 صدف کی باتوں کی وجہ سے شیراز بے چینی سے اس کا
 منتظر تھا۔
 ”میں ناشا کر چکا ہوں۔“ اس نے صدف سے کہا۔
 ”خانا ماں سے چائے بنانے کے لیے کہہ دیا ہے۔
 تمہارے ساتھ چائے پی لوں گا۔“
 صدف نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر کہا۔ ”میں
 اس وقت تھیں یہ بتانے آئی ہوں کہ اب کچھ دن تک ہماری
 ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ میں کالاںش وادی جا رہی ہوں۔“
 ”ابھی کیا پسند آگئی کالاںش وادی؟ دو سال پہلے ہی تم
 کالج کی چھٹیوں میں وہاں کی تھیں۔ وہاں کے عجیب عجیب
 قصے بھی سنائے تھے مجھے!“
 ”آج میں ایک خاص وجہ سے جا رہی ہوں۔ یہاں
 میری زندگی خطرے میں ہے۔“
 ”کیا؟“ شیراز چونک گیا۔
 ”مجھے قتل کیا جاسکتا ہے۔“ صدف نے اسے اور
 زیادہ چوکا دیا۔
 ”کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ تیز لہجے میں بولا۔
 ”رات خواب میں مجھے بنیان غیلاری نے بتایا ہے۔“
 ”کیا بکو اس ہے؟“ شیراز نے منہ نہ دیا۔ ”تم مجھے
 بتا چکی ہو غیلاری کے بارے میں اور میں نے بھی یقین نہیں
 کیا کہ وہ پراسرار قوتوں کا مالک ہے۔ یہ انیسویں صدی ہے
 صدف! اب ان باتوں پر کوئی یقین نہیں کرتا۔“
 ”پہلے میں بھی یقین نہیں کرتی تھی اور وہی لوگ اب
 بھی یقین نہیں کرتے جن کا ایسی باتوں سے سابقہ نہیں پڑا۔“

مجھ سے بنیان غیلاری نے چلتے وقت جو کچھ کہا تھا، بالکل دیا
 ہی ہوا ہے۔“
 ”یعنی تم نے خواب میں وہ کھوپڑی دیکھی ہے جس
 کے بارے میں غیلاری نے بتایا تھا؟“
 ”ہاں۔“ صدف نے جواب دیا۔ ”اور آواز میں
 نے پہچان لی تھی۔ وہ بنیان غیلاری ہی کی آواز تھی۔“ پھر اس
 نے وہ سب کچھ بتا دیا جو اس نے خواب میں سنا تھا۔
 ”سب وہم ہے تمہارا۔“ شیراز نے پھر منہ نہ دیا۔
 ”بنیان غیلاری تمہارے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے۔ خواب
 میں تم نے وہی سب کچھ دیکھا جو تم شاید سوچتی رہتی ہو۔
 یہاں کون تمہاری جان کا دشمن ہو سکتا ہے؟“
 ”کوئی ضرور ہے۔ مجھے اپنے خواب پر یقین ہے۔“
 صدف نے جواب دیا۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے
 اپنے باپ پر شبہ ہے۔ اس صورت میں شیراز اس کا اور مذاق
 اڑاتا۔ ”کوئی بھی اس بات پر یقین نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی شخص
 اپنی نئی کوشش کرانے کے بارے میں بھی سوچ سکتا ہے۔“
 صدف نے اشرف خاں اور اس کے بزنس پارٹنر
 صدیق وراج کی وہ گفتگو بھی نہیں دہرائی جس سے اس پر
 ایک راز کا انکشاف ہوا تھا۔ یہ بتاتے ہوئے اسے شرم محسوس
 ہوئی کہ اس کا باپ ایسا آدمی ہے۔
 ”اچھا!“ شیراز نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”کیا
 گھر پر مہم اور بابا کو بتاؤں گی کہ وہاں جا رہی ہو؟“
 ”ہاں۔ بتاؤں گی۔“ صدف نے جھوٹ بولا
 کیونکہ اسے اپنے باپ پر ہی شبہ تھا.....
 ”اچھا تو.....“ شیراز نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”میں
 بھی ان دنوں چھٹی پر ہوں۔ میں بھی چلتا ہوں تمہارے
 ساتھ۔ تمہاری باتوں کی وجہ سے کالاںش وادی دیکھنے کی
 خواہش مجھے بھی ہے۔“
 ”مجھے اچھا لگے گا اگر تم میرے ساتھ چلو گے۔ ایسی
 صورت میں یہ بھی مناسب رہے گا کہ میں اپنی کار تمہارے
 گیراج میں بند کر دوں۔ یہاں سے تمہاری گاڑی پر روانہ
 ہوا جائے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ جو لوگ مجھے ختم
 کرنا چاہتے ہیں، وہ میری کار کو پہچانتے ہیں لیکن تمہاری کار
 نظر انداز کر دیں گے۔“
 اس گفتگو کے درمیان چائے بھی آ چکی تھی اور باتوں
 کے دوران ہی بی بی گئی تھی۔ اب صدف جلد از جلد یہ شہر
 چھوڑ دینا چاہتی تھی جہاں اس کے یقین کے مطابق اس کی
 زندگی خطرے میں تھی۔

”بس جلدی بگس چلو!“ صدف نے کہا۔
 ”وہاں کتنے دن رہنا پر سکنا ہے؟“
 ”کچھ کہہ نہیں سکتی۔“
 ”کپڑے وغیرہ لے کر آئی ہو؟“
 ”نہیں۔“ صدف نے جواب دیا۔ ”گھلت کی وجہ
 سے کچھ ساتھ نہیں لیا۔ راستے میں کسی جگہ سے دیکھنا پڑے
 گا۔ کسی مارکیٹ سے ضرورت کی کچھ چیزیں خرید لوں گی۔“
 ”ایک اپنی کیس میں کہیں جانے کے لیے تیار رکھنا
 ہوں۔ وہ لے لیتا ہوں۔ خانا ماں کو بھی چھٹی دے دوں گا۔
 گھر کو بھی لاک کر دیتے ہیں۔“
 دس منٹ بعد شیراز کی کار وہاں سے روانہ ہو رہی
 تھی۔ ڈرائیونگ وہ خود کر رہا تھا۔ صدف پچھلی نشست پر
 لیٹ گئی تھی تاکہ باہر سے کسی کی بھی نظر اس پر نہ پڑ سکے.....
 جب کار پشاور کی حدود سے نکل گئی تو صدف اٹھ بیٹھی
 اور اس نے کہا۔ ”اب ڈرائیونگ میں کروں گی۔“
 ”تم تیز رفتاری سے چلاؤ گی۔ مجھے تمہاری
 ڈرائیونگ سے ڈر لگتا ہے۔ ویسے کچھ آگے جانے کے بعد
 راستہ بھی خطرناک ہو جائے گا۔“
 ”میں اس راستے سے واقف ہو چکی ہوں۔“
 شیراز نے کار روک دی اور صدف نے ڈرائیونگ
 سیٹ سنبھال لی۔
 ”وہاں پہنچ کر تمہیں اپنے آپ پر غصہ آئے گا۔“
 شیراز نے سسکتا ہوا ہونے کہا۔
 ”کیوں؟“
 ”وہ غیلاری تمہیں بتائے گا کہ اس نے تمہیں کسی
 خطرے سے آگاہ نہیں کیا۔“
 ”اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ صدف نے یقین
 سے کہا۔
 شیراز نے موضوع بدلا۔ ”یہاں سے فاصلہ شاید
 ساڑھے چار سو کلومیٹر ہے!“
 ”ہاں۔“ صدف نے کہا۔ ”ہم سہ پہر تک پہنچ
 جائیں گے۔“
 ”یہ کالاںش وادی کا فرستان ہی کا ایک حصہ ہے نا؟“
 ”ہاں۔“
 ”چراں سے کتنا فاصلہ ہے؟“
 ”وہ قریب ہی ہے۔ کالاںش وادی سے پہلے میں
 چراں ہی گئی تھی۔ وہاں سے کالاںش وادی کا رخ کیا تھا۔
 ابھی چراں کے نام پر مجھے بنیان غیلاری کی ایک بات اور

حریف یاد آئی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ بعض اوقات مذہبی رسومات کا
 کچھ سامان خریدنے کے چراں جانا پڑتا ہے اسے لہذا اگر کسی
 میں اس سے ملے آؤں اور وہ کالاںش وادی میں نہ ملے تو مجھ
 لینا کہ وہ چراں جانا گیا ہوا ہوگا۔“
 ”ابھی تم چراں جانا چاہتی ہو یا کالاںش وادی؟“
 ”ابھی تو کالاںش وادی ہی جانا ہے۔“
 ”ہوں۔ اچھا اب میں پچھلی سیٹ پر جا کر لیٹا
 ہوں۔ تمہاری ڈرائیونگ سے گھبراہٹ ہونے لگی ہے مجھے۔
 میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ضرورت سے زیادہ تیز چلا رہی ہو جبکہ
 یہ راستہ اس رفتار کے لیے مناسب نہیں ہے۔“
 وہ صدف کے جواب کا انتظار کیے بغیر پچھلی سیٹ پر
 جانے لگا۔
 ”یہ ایک عام سی بات ہے۔“ صدف نے سنجیدگی
 سے کہا۔ ”جو لوگ خود ڈرائیونگ کرتے ہیں، انہیں کسی دوسرے
 کی ڈرائیونگ پر بھروسہ نہیں ہوتا۔“
 اس کے جواب میں شیراز کچھ کہنے کے بجائے پچھلی
 سیٹ پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔ ”میں
 اب کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ جب تم تھک جاؤ گی تو
 ڈرائیونگ سیٹ میں سنبھال لوں گا۔ بتا دینا مجھے۔“
 صدف ”ہوں“ کر کے رو گئی۔ وہ خود بھی یہی چاہتی
 تھی کہ کچھ دیر ان دونوں میں کسی قسم کی گفتگو نہ ہو۔ وہ اپنے
 مسئلے پر کچھ سوچنا چاہتی تھی۔ کیا ایک ہی اس کے دماغ میں
 یہ خیال آیا کہ اسے قتل کرنے یا کروانے کا خواہاں کہیں اس
 کے باپ کا بزنس پارٹنر صدیق وراج تو نہیں! کوئی باپ اپنی
 بیٹی کو قتل کرانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔
 اسی بات کی روشنی میں صدف سوچنے لگی تھی کہ ممکن
 ہے اس کے باپ نے صدیق وراج کو بتایا ہو کہ ان
 دونوں کی میننگ کی باتیں اس کی بیٹی نے سن لی تھیں جو ایک
 خطرناک بات ہے۔ اور اسی لیے صدیق وراج نے فیصلہ کیا
 ہو کہ صدف کا قصہ تمام کر دیا جائے۔
 ☆☆☆
 دو بجتے والے تھے جب صدیق وراج اشرف خاں
 کے دفتر میں داخل ہوا۔ اسی وقت اشرف خاں کی میز پر
 رکھے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اشرف خاں نے
 صدیق وراج کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے موبائل
 پر آنے والی کال ریسیوو کی۔
 کال ”بولی“ کی تھی جسے اشرف خاں نے صدف کو ختم
 کرنے کی ہدایت کی تھی۔

”کام ہو گیا؟“ اشرف خاں نے پوچھا۔

”نہیں باس!..... ہمارے آدمیوں نے سارا پشاور چھان مارا ہے۔ وہ نہیں نظر آئیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ پشاور سے کہیں اور چلے گئی ہوں۔“

”یہ تو اسی صورت میں ممکن ہے جب اسے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ پشاور میں رکی تو قتل ہو جائے گی اور اس کا امکان نہیں ہے کہ اسے یہ معلوم ہو جائے۔“

”میں نے کہا نا باس کہ ہم نے سارا پشاور چھان لیا ہے۔ ان کے دوست شیراز کو بھی چیک کیا تھا۔ اس کے گھر پر تالا پڑا ہوا ہے۔ چونکہ اس سے معلوم ہوا کہ صدف بی بی تو ساڑھے نو بجے کے قریب وہاں پہنچی تھیں۔ شیراز اس وقت گھر پر ہی تھا۔ دونوں میں کچھ دیر باتیں ہوئیں، پھر صدف بی بی شیراز کے ساتھ اس کی کار میں کہیں چلے گئیں۔ اپنی کار انہوں نے شیراز ہی کے گھر میں چھوڑ دی ہے۔“

”ہوں۔“ اشرف خاں کے چہرے پر فکر مندی کے آثار نمایاں ہوئے۔ کچھ دیر سوچ کر اس نے کہا۔ ”تو پھر ایک امکان یہ ہے کہ وہ چترال یا کالاں والی تھی۔ تو فوراً چار آدمیوں کو بڑے طاہرہ چترال بھیجو۔ دو آدمی اسے چترال ہی میں تلاش کریں اور وہ کالاں والی کی طرف چلے جائیں۔ یہ ضروری ہے کہ وہ چاروں آدمی صدف کو بھی جانتے ہوں اور شیراز کو بھی۔ قوی امکان ہے کہ اگر اس نے وہاں کار کرایا ہے تو ابھی راستے ہی میں ہوئی۔ وہ وہاں کار سے ہی جائے گی۔ اور آخری بات یہ کہ اسے پشاور میں بھی تلاش کرتے رہو۔ ضروری نہیں کہ تمہارے کہنے کے مطابق وہ پشاور چھوڑ گئی ہو۔“

”خیک ہے باس!“ جواب ملا۔ ”فوری طور پر جو بھی فلاحی لی، اس سے چار آدمی روانہ کر دیے جائیں گے۔“

”ایک آخری بات اور سنو!“ اس مرتبہ اشرف خاں اس طرح بولا تھا جیسے غرایا ہو۔ ”مجھے زیادہ سے زیادہ کل رات تک تمہاری کامیابی کی رپورٹ مل جانی چاہیے۔“

”لیکن..... وہ.....“ قدرے تذبذب کے ساتھ کہا گیا۔ ”معلوم تو ہو جائے..... کہ وہ..... کہاں ہیں!“

”بالا لائی ہوئی تمہاری اگر معلوم نہ ہوا!“ اشرف خاں نے غصے میں دہانے کے انداز میں کہا اور رابطہ منقطع کر کے موبائل میز پر رخ دیا۔

صدیق دڑانچ اس دوران میں غور سے اشرف خاں کی طرف دیکھتا رہتا تھا پھر وہ بولا۔ ”تم نے فون پر بتایا تھا اس بارے میں۔ میں اسی کے متعلق بات کرنے آیا ہوں۔“

یہ خیال تمہیں کیوں آیا کہ اگر وہ پشاور میں نہیں تو چترال یا کالاں والی کی طرف چلی ہوگی۔“

”وہ ایک مرتبہ جا چکی ہے وہاں۔ قصے سناتی رہی ہے کافرستان کے۔ یہ بھی بتایا تھا اس نے کہ وہاں اس کے کئی اچھے دوست بن گئے ہیں جن میں عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی۔ وہ ہمیشہ وہاں کے لوگوں کی تعریف بھی کرتی رہی ہے۔“

”خیر! میں تمہیں یہ مشورہ دینے آیا تھا کہ اپنا یہ فیصلہ بدل دو۔ صدف کو کسی طرح سمجھا بجا دو کہ وہ اس بارے میں اپنی زبان ہمیشہ بند رکھے۔ دل شاد بھابی کو بھی اعتماد میں لو۔ وہ تم سے زیادہ بہتر انداز میں صدف سے بات کر سکتی ہیں۔ وقتی طور پر یہ کہنے میں بھی کسی حرج نہیں کہ تم جلد ہی یہ سارا کام ختم کر دو گے۔“

”میں جانتا ہوں اس کا مزاج۔ وہ یقین نہیں کرے گی۔ خطرہ ہم دونوں ہی کے سر پر منڈلاتا رہے گا۔“

”تمہیں یہ خیال نہیں کہ وہ تمہاری بیٹی ہے؟“

”اگر یہ خیال رکھوں تو پھر دوسرا راستہ ہم دونوں ہی کو جیل پہنچا سکتا ہے۔“

”میں بہر حال اصرار کروں گا کہ اپنا فیصلہ تبدیل کرو۔ اپنے آدمیوں سے کہو کہ صدف جہاں بھی لے، اسے یہ حفاظت گھر پہنچا دیا جائے اور پھر اسے سمجھانے کے لیے۔“

”آج موسم عجیب ہو رہا ہے!“ اشرف خاں نے منہ بناتے ہوئے صدیق دڑانچ کی بات کاٹ دی۔

”ہاں۔“

”صدیق! تم جانتے ہو کہ میں جب کوئی فیصلہ کرتا ہوں تو سوچ سمجھ کر ہی کرتا ہوں اور پھر اپنا وہ فیصلہ بھی نہیں بدلتا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے صدف کے سلسلے میں مجھ سے زیادہ ہمدردی ہو!“

”ہاں۔“ اس مرتبہ صدیق دڑانچ نے ایک طویل سانس بھی لی۔ ”میرا پیشہ اپنی جگہ لیکن معصوم لڑکیوں کے لیے میرے دل میں ہمدردی ہی ہوتی ہے۔“

”اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ تم لوکی کے باپ نہیں بن سکے۔ چنانچہ ایک تمہارا اور تمہاری خواہش ہوگی کہ تمہاری بیٹی بھی ہو۔“

اس بار صدیق دڑانچ نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ ایسا معلوم ہوا تھا جیسے جھجکا گیا ہو۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

”اجما میں اب چلتا ہوں۔ کچھ ضروری کام ہے۔“

اس نے اشرف خاں کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا

حریف

اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

دختر سے نکل کر وہ اپنی کار میں بیٹھا اور اسے ڈرائیو کرتا ہوا ایک ڈیڑھ میل تک نکل گیا۔ اس مختصر دورے میں صرف ایک ہی خیال اس کے ذہن میں پھرتا رہا تھا۔ آخر اس نے کار سڑک کے کنارے رکی اور موبائل فون پر کوئی نمبر ملانے لگا۔

”ہیلو!“ دوسری طرف سے نسوانی آواز آئی۔

”کون؟ کس سے بات کرنی ہے آپ کو؟“

”تم ہی سے کرنی ہے دل شاد!“ صدیق دڑانچ نے

کہا۔ ”میں نے تمہاری آواز پہچان لی ہے تم نے نہیں پہچانی۔“

”اوہ! صدیق؟“

”ہاں۔“

دوسری طرف ایک طویل سانس لی گئی، پھر کہا گیا۔

”کیا بات ہے؟“

”صدف کہاں ہے؟“

”صبح سے ہی غائب ہے۔ کہہ کر تو گئی تھی کہ اپنی کسی

دوست کو دیکھنے جا رہی ہے لیکن ابھی تک نہیں لوٹی۔ اتنی دیر

ہوئی تو نہیں چاہیے تھی۔“

”ہوں۔“ صدیق دڑانچ نے سر ہلایا۔ ”بس اسی کی

خیریت پوچھنی تھی۔“

”پہلے تو بھی نہیں پوچھی!“

”اشرف سے معلوم ہوتی رہتی تھی۔ آج اس سے

بات ہوئی تو احساس ہوا کہ وہ صدف سے کچھ ناراض ہے۔“

”وہ اس کے خلاف ہیں کہ صدف رات کے وقت

زیادہ دیر تک گھر سے باہر رہے۔ کل اس کی کسی دوست کی

سائیکل گئی۔ مجھ سے اجازت لے کر گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا

کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اس قسم کی تقریبات میں کچھ دیر تو

ہو جاتی ہے۔ اسی خیال سے اجازت دے دی گئی۔ اشرف

اسی بات پر ناراض ہیں۔“

”آج اسے دیر ہوئی ہے۔ اس کا خیال نہیں ہے تمہیں؟“

”خیال تو ہے۔ کچھ پریشان ہوئی ہوں۔ اشرف کو اس

لیے اطلاع نہیں دی کہ وہ پہلے ہی اس سے راض ہیں۔“

”خیر! آجائے گی۔“ صدیق دڑانچ نے یہ ظاہر

سرسری انداز میں کہا۔ ”بس اسی کی خیریت پوچھنے کے لیے

فون کیا تھا۔ اور کوئی بات نہیں۔“

صدیق دڑانچ نے اسے اشرف خاں کے ارادے

سے آگاہ نہیں کیا۔ بات ختم کرنے کے بعد اس کے چہرے

پر سوچ بچار کے آثار بدستور قائم رہے۔

دو گھنٹے بعد اس نے دل شاد خانم کی کال ریسیو کی۔

”وہ ابھی تک نہیں لوٹی ہے صدیق!“ دل شاد خانم

نے کہا۔ ”اب میں پریشان ہوئی ہوں۔ اس کی جن دو چار

دوستوں کو جانتی ہوں، انہیں بھی فون کر چکی ہوں۔ انہی

سے معلوم ہوا کہ گزشتہ رات ان کی کسی دوست کی سائیکل

نہیں تھی۔ اس سے اور انہیں ہو گئی ہے۔ اشرف اس سے

ناراض ہیں لیکن میں نے انہیں بھی فون پر اطلاع دی تھی۔

اصل پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ صدف کا فون بھی بندل رہا

ہے۔“ وہ بولتی ہی چلی گئی تھی۔

”اشرف خاں نے کیا کہا؟“ صدیق دڑانچ نے پوچھا۔

”مجھ پر ہی طنز کرنے لگے تھے کہ اور آ زادی دو بیٹی کو

..... میں نے ان کے خطر کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا کہ

پولیس میں رپورٹ کریں۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ کسی کی گمشدگی

کی رپورٹ جو تین گھنٹے سے پہلے پولیس نہیں لگتی۔ میں نہیں

جانتی کہ ایسا کوئی تانوں سے لیکن اشرف خاں اپنے رسوخ سے

بھی کام لے سکتے ہیں۔ ہر جگہ تو تعلقات ہیں ان کے۔“

”لڑکی کا معاملہ ہے۔“ صدیق دڑانچ نے کہا۔ ”باپ

کی بدنامی کا بھی خیال کرنا پڑتا ہے۔ خیر! از کو جانتی ہو؟“

”ہاں۔ وہ اور شیراز ایک دوسرے کو پسند کرتے

ہیں۔ صدف کا زلزلہ آنے کے بعد ان دونوں کی شادی

کردی جاتی۔“

”دوپہر کو تمہیں فون کرنے کے بعد میں نے چھان

بین کی تھی۔ شیراز کے گھر بھی گیا تھا۔“ صدیق دڑانچ نے

جھوٹ بولا۔ ”وہاں کے ایک ملازم سے معلوم ہوا کہ صدف

دہاں پہنچی تھی، پھر اس کے ساتھ ہی کہیں چل گئی۔“

”یہ تو سوچنا چاہیے کہ وہ اس کے ساتھ کہیں

بھاگ جائے گی۔ ایسا تو اسی صورت میں ہوتا ہے جب گھر

والے ان کی شادی کے لیے تیار نہ ہوں۔“

”خیک کہہ رہی ہو تم! میں معلوم کرنے کی کوشش کر رہا

ہوں کہ وہ دونوں کہاں چلے گئے ہیں اور کیوں گئے ہیں۔“

”معلوم ہوتے ہی مجھے اطلاع دینا۔ اگر اس نے اپنا

فون بند نہ رکھا ہوتا تو میں اتنی پریشان نہیں ہوتی۔“

”سمجھ رہا ہوں میں۔“ صدیق دڑانچ نے کہا۔ ”جیسے

ہی کچھ معلوم ہوگا، میں تمہیں اطلاع دوں گا۔“

”میں بے چینی سے انتظار کر دوں گی۔“

صدیق دڑانچ نے صرف ”ہوں!“ کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

گھر مندی اس کے چہرے سے اب بھی ظاہر ہو رہی تھی۔

☆☆☆

مارچ 2018ء

251

سینس ڈائجسٹ

مارچ 2018ء

250

سینس ڈائجسٹ

خاصہ راستہ ملے ہو چکا تھا جب صدف نے شیراز سے کہا۔ "میں تو سیدھی کالاش وادی میں جاؤں گی لیکن تم چترال چلے جاؤ۔"

"کیوں؟"

"میں نے بتایا تھا کہ بیان غیلاری کسی وقت چترال بھی چلا جاتا ہے اس لیے اگر وہاں ہو تو اسے اطلاع دے دینا کہ میں کالاش وادی پہنچ چکی ہوں۔ وہ فوراً اپنا سارا کام چھوڑ کر مجھ سے ملنے پہنچ جائے گا۔"

"لیکن میں اسے کہاں ڈھونڈتا پھر دوں گا؟ اسے جانتا بھی نہیں ہوں۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ تم جس ہوٹل میں ٹھہرو، اسی کے کسی بھی منتظم سے پوچھ لیتا۔ چترال میں بھی بیان غیلاری بہت مشہور ہے۔ وہ کسی دوسرے ہوٹل میں ٹھہرا ہوگا تو بھی اس ہوٹل کے منتظم کو معلوم ہوگا۔ وہ تمہیں بتا دے گا۔ تم جا کر اس سے مل لیتا۔ بتا دینا کہ میں نے ہی تمہیں بھیجا ہے، بلکہ فون پر اس سے میری بات بھی کر دینا۔"

"راستے میں تم نے دوسری سم ڈھالوائی ہے اپنے موبائل میں۔ اس کا نمبر نہیں بتایا تم نے؟"

"ابھی خود مجھے وہ نمبر یاد نہیں ہے۔ میں تمہیں مس کال دیتی ہوں۔ نمبر آجائے گا تمہارے پاس۔ سید کر لیتا۔" صدف نے کاری رفتار بہت کم کرتے ہوئے اپنے موبائل سے شیراز کا نمبر ملایا۔ شیراز کے موبائل کی گھنٹی بجی جو اس نے پہلے ہی جیب سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس نے اسکرین پر آہٹا نمبر صدف کے نام سے سید کر لیا۔ اس دوران میں دل شاد خانم اسے کئی بار ہنگ کر چکی تھی لیکن صدف نے اسے کال ریسیو نہیں کرنے دی تھی۔

"خیال نہیں رہا مجھے۔" وہ بولی۔ "بہتر ہوتا کہ فی الحال تمہارا نمبر بھی بدل جائے۔ خیر!..... ابھی راستے سے تم بھی دوسری سم لے لو۔"

"آخر تم اپنے گھر والوں کو اتنا خبر کیوں رکھنا چاہتی ہو؟"

"دو بار کر چکے ہو تم یہ سوال اور میں بتا چکی ہوں کہ فی الحال کسی وجہ سے یہی مناسب ہے۔" صدف نے جواب دیا۔ "زندگی میں یہ پہلا موقع ہے جب تم میرے لیے کسی ناول کا پراسرار کردار بن گئی ہو۔"

صدف کچھ نہیں بولی۔

"تم کہاں سے ملے گی؟" شیراز نے پوچھا۔

"ایک چھوٹا سا شہر ابھی اور ہے ہمارے راستے

میں۔ وہیں سے مل جائے گی۔ اس کے بعد ہمارے راستے بھی تبدیل ہو جائیں گے۔"

"کیا مطلب.....؟"

"میں کار میں ہی کالاش وادی جاؤں گی۔ تم کسی جیب میں چلے جانا۔"

"جیب کہاں ملے گی مجھے؟"

"راستے میں دیکھی نہیں لوگوں کی جیبیں؟"

"لیکن وہ....."

"پوری بات سنو!" صدف نے اس کی بات کاٹی۔ "یہ لوگ سامان لینے کے لیے مختلف بستوں کے درمیان سفر کرتے رہتے ہیں۔ راستے میں انہیں کوئی سواری مل جائے تو اسے بھی مقول معاوضے کے لیے اپنے ساتھ بٹھا لیتے ہیں۔ ہمیں کسی جگہ رک کر ڈراویر کسی ایسی جیب کا انتظار کرنا ہوگا جو چترال جا رہی ہو، یا چترال سے گزر کر آگے جا رہی ہو۔" "نہ جانے کس قسم کے لوگ مل جائیں۔ مجھے انخوا کر لیا تو!" شیراز ہنسا۔

"کوئی خوب صورت لڑکی نہیں ہو تم!" صدف نے منہ بتایا۔

"لڑکی نہ کہی، خوب صورت مرد تو ہوں، اور سنا ہے کہ یہاں کے لوگ....."

"میں چاہتا ہوں کہ تمہارا موڈ ٹھیک ہو۔ آج ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ شاید ہنسا مسکرا رہی ہوں گئی ہو۔"

"میں نہیں بتا چکی ہوں کہ میری زندگی خطرے میں ہے۔" "مجھے تمہارے خواب پر یقین نہیں ہے۔ بس چل پڑا ہوں تمہارے ساتھ۔"

لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اسے یقین کرنا پڑا جب ایک چوٹے سے جزل اسٹور کے سامنے گاڑی روک کر دونوں اترے۔

صدف بولی۔ "سم اگر یہاں نہ لی تو کسی اور جگہ سے مل جائے گی مگر یہاں سے مجھے اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں مل جائیں گی۔"

وہ دونوں دکان میں داخل ہوئے۔ دکاندار ایک ہی تھا اور اس وقت ایک گاہک کو کچھ دکھا رہا تھا۔ صدف اس کے فارغ ہونے کے انتظار میں اسٹور میں رہی ہوئی چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ سامنے ہی ایک بڑا سا آئینہ لگا تھا۔ اس میں دکان کے باہر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ اس منظر نے صدف کو چوکا دیا۔ اس نے دکان کے سامنے رکھے والی ایک گاڑی کی کھڑکی سے رائل کی ٹال جھانکتے دیکھ لی تھی۔

حریف

راستہ ابھی کافی دور تک ایسا ہے کہ کوئی موڑ نہیں آئے گا۔" "میں اس راستے پر اس سے زیادہ تیر نہیں چلا سکتا صدف!" "پھر تو نکل جائیں گے۔" صدف نے ہنسی سے کہا۔ "نکل جائیں، اچھا ہے۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے ایسے لوگوں سے ٹکرانے کا۔"

"ٹکراؤ تو پھر بھی ہوگا کسی وقت۔ اپنی اس ناکامی کے بعد وہ جج یا عمرہ کرنے نہیں چلے جائیں گے۔"

"دعی آگرا میں گے تو دوسری بات ہوگی۔"

"اب تو یقین آ گیا ہوگا تمہیں میرے خواب کا!"

"بات تو اب کچھ میں آ رہی ہے۔" شیراز نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن اس نے اپنی پراسرار قوتوں سے تمہاری حفاظت کا بندوبست کیوں نہیں کیا؟"

"اس حد تک کام نہیں کرتی ہوگی اس کی مافوق انطرت طاقت۔" صدف نے جواب دیا۔ "اسی لیے اس نے مجھے اپنے پاس بلایا ہے۔"

"تو کیا تم اب وہیں رہو گی؟"

"وہ کوئی ایسا بندوبست کر دے گا کہ یہ خطرہ میرے لیے خطرہ نہ رہے۔"

"یہ کیسے ہوگا؟"

"یہ تو اس سے مل کر ہی معلوم ہو سکے گا۔" صدف نے کہا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر ریو اور بیگ میں رکھ لیا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب اس کا رنگ نہیں پہنچا جائے گا جس سے اس پر قاترنگ کی گئی تھی۔

"اب۔" صدف کچھ توقف سے بولی۔ "چند میل کے بعد وہ مقام آئے گا جہاں سے ہمارے راستے تبدیل ہوں گے۔"

"کیوں؟"

"تمہیں چترال جانا ہوگا۔ بتا چکی ہوں تمہیں۔"

"وہ اس وقت کی بات ہے جب تم پر گولیاں نہیں چلائی گئی تھیں۔ اب حالات دوسرے ہیں۔ یہ بات میرے سامنے آ چکی ہے کہ تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ تمہیں اکیلا چھوڑ دوں۔ میں تمہارے ساتھ ہی جاؤں گا۔"

"میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں شیراز! ریو اور میرے لیے کھلوٹا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔"

"پیچھے سے چلائی جانے والی گولی کا تم کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اس وقت بھی تم نے آئینے میں دیکھ لیا تھا، اس لیے بچت ہو گئی۔"

"چیلے جاؤ!" صدف نے تیزی سے کہتے ہوئے شیراز کا ہاتھ بھی کھینچا اور دونوں پیچے ہو گئے۔ اس وقت دو گولیاں پٹلیں جن سے وہ دونوں تو محفوظ رہے لیکن ایک گولی نے اسٹور کا کچھ سامان برباد کر دیا تھا اور دوسری گولی دکاندار کے شانے میں لگی تھی۔

"نگلو یہاں سے!" صدف کھڑی ہوتے ہوئے شیراز سے بولی۔

اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ کار بہت تیزی سے آگے نکل گئی تھی۔

"یہ....." شیراز اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ وہ دونوں کار میں بیٹھے۔ ڈرائیونگ سیٹ اس مرتبہ صدف نے نہیں سنبھالی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کی سیٹ پر بیٹھی تھی اور اس نے اپنے بھی بیگ سے ریو اور نکال لیا تھا۔

"تیزی سے چلو۔" صدف بولی۔ "کار اسی طرف گئی ہے۔ پکڑنا ہے اسے۔ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ گولی ان پر بھی چلائی جا سکتی ہے۔"

"گولیاں کسی کار سے چلائی گئی تھیں؟" شیراز نے پوچھا۔

"ہاں، آئینے میں گس دیکھ لیا تھا میں نے اس کا۔ رائل بھی کھڑکی سے باہر لگی ہوئی دکھائی دے گئی تھی۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ نشانہ مجھے ہی بتایا جا سکتا ہے۔"

شیراز نے عقب نما آئینے میں دیکھا کہ جزل اسٹور کے سامنے لوگ جمع ہونے لگے تھے۔

"تیز چلاؤ شیراز!" صدف بولی۔ "ہمیں پکڑنا ہے اس کار کو۔ نیلے رنگ کی کار ہے۔ شاید اوپل ہے پرانے ماڈل کی۔"

"اب اسے پکڑنے کی ضرورت کیا ہے۔" شیراز نے رفتار کچھ بڑھائی۔ "کیوں ان خطرناک لوگوں سے ٹکرانا چاہتی ہو؟"

"انہیں معلوم تو ہو جائے گا کہ میں کوئی تر نوالہ نہیں ہوں۔ اور مجھے یہ خبری میں مار لیں تو دوسری بات ہے۔ اس وقت تو اسٹور کا آئینہ میرے لیے سیما کی کر گیا۔"

شیراز کو نہ تو اس کی ان باتوں پر حیرت ہوئی اور نہ وہ اس پر حیران ہوا کہ صدف کے ڈیٹھی بیگ میں ریو اور موجود تھا۔ اس سے بات چینی ہوئی نہیں تھی کہ صدف کا مزاج ہی ایسا تھا۔ اس نے فائننگ کی تربیت بھی لی تھی۔

"اور تیز چلاؤ شیراز!" صدف دانت پر دانت جما کر لی بولی۔ "وہ کار ہماری دسترس سے نکلنا نہیں چاہے۔"

”ایسی صورت میں تمہاری موجودگی سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ایسا تجربہ ہوا ہے کہ میں اب بہت محتاط رہوں گی۔“ صدف نے کہا۔ ”کیونکہ اب تم بھی ان کی نظر میں آگئے ہو اس لیے خطرہ تمہارے لیے بھی ہو سکتا ہے۔“

”ریوالور میرے پاس بھی ہے۔ تمہاری طرح بہت اچھا نشانے باز نہیں لیکن ریوالور چلانا جانتا ہوں لیکن.....“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔“ صدف نے اس کی بات کاٹی۔ ”ضروری ہے کہ تم چترال جاؤ۔“

صدف بہ مشکل ہی شیراز کو چترال جانے پر آمادہ کر سکی۔

”میں وہاں تمہارے لیے فکر مند رہوں گا۔“ شیراز نے ٹھنڈی سانس لی۔

”کیا مجھے تمہاری فکر نہیں رہے گی؟ پھر یہ کہ جس میں مستقل وہاں نہیں رہ سکتا ہوگا۔“ صدف نے کہا۔ ”اگر وہاں بیٹان غیلاری نہ لے تو کالاںش وادی آجائے۔“

شیراز کچھ نہیں بولا لیکن اس کے چہرے سے فکر مندی کا تاثر ختم نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

صدف کے کہنے کے مطابق اسے ایک ایسی جیب مل گئی جس میں اسی علاقے کے لوگ چترال جا رہے تھے۔ معاوضہ ملے کر کے انہوں نے شیراز کو جیب میں بٹھا کر چترال بھی پہنچا دیا اور اسے چترال کے ایک اچھے ہوٹل پر اتارا۔ چونکہ شیراز کے ساتھ ایک سوٹ تیس بھی تھا، اس لیے وہ لوگ سمجھ گئے تھے کہ یہ سارن وہاں قیام کرے گا۔

شیراز خاصا تھک گیا تھا لیکن یہ اس کے لیے آرام کرنے کا موقع نہیں تھا۔ کمرے میں رک کر اس نے صرف چائے پی اور ہوٹل کے استقبالیہ پر پہنچ گیا۔ اس نے ریسپنڈنٹ سے کہا۔ ”کیا آپ بیٹان غیلاری کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟..... شاید وہ آج کل چترال.....“

”جی۔“ چترالی مسکرایا۔ ”وہ ہمارے ہی ہوٹل میں مقیم ہیں۔“

شیراز کو جب ہوا کہ چترالی بڑی صاف اردو بولا تھا۔ ”مجھے ان سے ملنا ہے۔“ شیراز اس حسین اتفاق پر خوش ہوا تھا کہ بیٹان غیلاری سے ملنے کے لیے اب اسے ادھر ادھر نہیں جانا پڑتا۔

”وہ جانتے ہیں آپ کو؟“ چترالی نے پوچھا۔

”میں تو نہیں جانتا لیکن ان کو جاننے والی ایک ہستی ہی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان سے ملوں۔“

ایسی وقت شیراز نے محسوس کیا کہ وہاں کچھ ہلچل ہوئی تھی۔ ہلچل کا سبب وہ شخصیت تھی جو اسی وقت ہوٹل میں داخل ہوئی تھی۔

شیراز نے چترالی سے پوچھا۔ ”کیا یہی بیٹان غیلاری ہیں؟“

”جی نہیں۔ یہ تو شیرازہ خان ہیں۔ کالاںش کے بہت بڑے رئیس۔ مجھے بتایا جا چکا ہے کہ وہ یہاں انہی سے ملنے آرہے ہیں جن سے آپ ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔“

”اوہ!“

”لیکن بیٹان غیلاری کی بڑی بات ہے جناب!“

چترالی کہتا رہا۔ ”شیرازہ خان کو ہی آنا پڑا غیلاری بابا سے ملنے۔ غیلاری بابا نہیں گئے ان کے گھر۔“

اچانک پیدا ہونے والی ہلچل جلد ہی ختم ہو گئی کیونکہ شیرازہ خان اوپر ہی منزل پر جا چکا تھا۔

”میرا نام وغیرہ تو آپ رجسٹر میں لکھ ہی چکے ہیں۔“ شیراز نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”اب مجھے اپنا نام بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ غیلاری بابا کو یہ پیغام پہنچا دیں کہ میں ان سے فوری طور پر ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے ان کے پاس صدف نے بھیجا ہے۔“

”فوری طور پر تو ممکن نہیں جناب!“ چترالی نے کہا۔ ”غیلاری بابا پہلے ہی ہدایت کر چکے ہیں کہ شیرازہ خان کے آنے کے بعد انہیں بالکل وسر ب نہ لیا جائے۔“

یہ جواب شیراز کے لیے مایوس کن تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”تمہاری ملاقات ہے ان کی؟“

”غیلاری بابا کے کہنے کے مطابق کھٹنا بھر تو ضرور مل جائے گا۔“

”اچھا۔“ شیراز نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”جب ان کی ملاقات ختم ہو جائے تو انہیں میرے بارے میں اطلاع دے کر مجھے بھی مطلع کرو دیجئے گا۔ میں اپنے کمرے میں جا کر کچھ دیر آرام کر لیتا ہوں۔“

”بہتر ہے۔“

شیراز اپنے کمرے میں آ گیا۔ اب اسے کچھ دیر آرام کرنے کا بہانہ مل گیا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے موبائل پر صدف سے رابطہ کیا اور اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔

”ٹھیک ہے۔“ صدف کا جواب آیا۔ ”میرا خیال درست ہی ثابت ہوا کہ شاید وہ وہاں ہوں۔ تم ان سے ملاقات کر کے ہی آنا۔ ویسے تو غالباً انہیں معلوم ہو چکا ہوگا

حریف

کہ میں کالاںش وادی پہنچ گئی ہوں، پھر بھی انہیں بتا دینا اور پوچھنا کہ میرے لیے کیا ہدایت ہے۔“

”ایک گھنٹے بعد ملاقات ہو سکے گی۔“

”جب بھی ہو..... میں یہاں ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوں۔ ابھی ابھی پہنچی ہوں۔ آرام کرنے کے لیے لیٹی ہی تھی کہ تمہاری کال آ گئی۔“

”آرام کرو اور چوکنار ہو۔ میں بھی اب کچھ دیر آرام کروں گا۔“

گھنٹہ گزرنے کے بعد شیراز نے موبائل بند کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر وہ خود کی کا تصور تھا یا کوئی خواب کہ شیراز نے ایک کھوپڑی دیکھی۔ ویسی ہی کھوپڑی جیسی صدف نے اسے بتائی تھی۔ کھوپڑی کے چار دانت خاصے چمک دار تھے۔ کھوپڑی کے نظر آتے ہی ایک آواز بھی شیراز کے کانوں سے نکلتی۔

”میں غیلاری ہوں شیراز! تم خطرے میں ہو۔ فوراً یہ ہوٹل چھوڑنا ہے نہیں۔ مجھ سے ملاقات کے لیے انتظار نہ کرو۔ کالاںش وادی پہنچو۔ صدف وہاں پہنچ چکی ہے۔ اس سے کہنا کہ وہ میری عبادت گاہ میں جا کر وہیں میرا انتظار کرے۔ میں آج ہی چند گھنٹے بعد وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

آواز ختم ہوتے ہی کھوپڑی اندر میرے میں تحلیل ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی شیراز کی آنکھیں بھی کھل گئیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل کی دھڑکنیں خاصی تیز تھیں۔ کیونکہ وہ غیلاری سے بھی نہیں ملتا تھا اس لیے جو آواز اس نے سنی تھی، وہ اس کے لیے اجنبی تھی لیکن اس خواب یا تصور کے باعث اسے یقین آ گیا کہ وہ غیلاری ہی کی آواز تھی جس نے اسے کسی انجانے خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے ہوٹل چھوڑنے کی ہدایت کی تھی۔

شیراز بستر سے فوراً ہی اٹھ گیا۔ اس نے یہاں آنے کے بعد اپنا سوٹ کس کھولنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی تھی وہ پیمپوں والا سوٹ کس گھیشا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے صدف کی باتوں پر سچ محسوس میں یقین نہیں کیا تھا کہ غیلاری پر اسرار قوتوں کا مالک ہے لیکن اب اسے یقین آ چکا تھا کہ اس انکسیدی صدی میں بھی پر اسرار قوتوں کے مالک موجود ہیں۔

اس نے کمرے کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ باہر کھڑے ہوئے دو آدمی اس سے ٹکرائے اور اسے دھکیلتے ہوئے کمرے میں لے آئے۔ وہ گرتے گرتے بچا تھا۔ سوٹ کیس اس کے ہاتھ سے چھوٹ ہی گیا تھا۔

ان دونوں میں سے ایک نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

”صدف کہاں ہے؟“ دوسرے آدمی نے شیراز کو گھورتے ہوئے اس طرح پوچھا کہ اگر جواب نہ ملتا تو شیراز کو کچا ہی چا جائے گا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کی ٹال شیراز کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

غیلاری نے درست پیغام دیا تھا کہ شیراز خطرے میں تھا۔

”کون صدف؟“ اس نے انجان بننے کی کوشش کی۔

”جس کے ساتھ تم پشاور سے آرہے تھے!“ ریوالور والے نے کہا۔

”میں نے اس لڑکی کا نام نہیں پوچھا تھا۔“ شیراز نے بہ دستور انجان بننے کی کوشش کی۔ ”وہ راستے میں مل گئی تھی۔ میری گاڑی خراب ہو گئی۔ اس نے مجھے لفٹ دی تو میں یہاں پہنچا۔ وہ کسی اور طرف چلی گئی۔ مجھے چترال آنے کے لیے کرائے کی جیب.....“

”بکومت!“ وہ بولا جس نے دروازہ بند کیا تھا، پھر اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”یہاں زیادہ دیر تک رکتا ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ کسی وقت ہوٹل ہی کا کوئی آدمی شاید نکل آئے اور!“

”لیکن اس سے معلوم کرنا تو ضروری ہے۔“

”معلوم کر لیں گے۔“ وہ آدمی تیزی سے شیراز کے قریب آیا۔ شیراز نے محسوس کیا کہ وہ اسے دبوچنا چاہتا تھا۔ اس نے چاہا کہ جھکا کر دے کر خود کو بچائے اور جیب سے اپنا ریوالور بھی نکالنے کی کوشش کرے لیکن فوراً ہی وہ سانپ کی طرح پھنکارا۔

”خبردار! بالکل ساکت رہو۔ میں گولی چلاتے ہوئے ذرا بھی دیر نہیں دوں گا۔ گولی چلنے کی آواز سے لوگ اس طرف متوجہ تو ہوں گے لیکن ہمیں چڑنا کسی کے بس کی بات نہیں۔“

اس دھمکی کے بعد شیراز ساکت رہ گیا۔ اس نے یقین کر لیا تھا کہ ریوالور والے کی بات محض دھمکی نہیں تھی۔ جو آدمی جھپٹ کر اس کی طرف آیا تھا، وہ اس کی پشت پر چلا گیا۔ پھر شیراز کو ایسا لگا جیسے اس کے سر پر قیامت ٹوٹ گئی ہو۔ وہ کسی بھاری چیز کا اس کے سر سے ٹکراؤ تھا۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ ہوٹل کے کمرے میں نہیں تھا۔ اس نے خود کو پہاڑی علاقے کے ایک ویران حصے میں پایا۔ اسے ایک درخت سے ہاتھ دیا گیا تھا۔ وہ یہ جاننے

سے قاصر تھا کہ اسے ہوٹل سے نکال کر یہاں کس طرح لایا گیا ہوگا۔ اس دلت اس کے سامنے ٹھن آدی تھے۔ ان میں سے دودھی تھے جو ہوٹل میں اس کے کمرے میں آئے تھے۔ تیسرا اس کے لیے اچھی تھا۔

”اب“ وہی ریو اور دال شیراز سے بولا۔ ”میرے سوال کا جواب دور نہ تمہاری کھال اوچھڑی جائے گی۔“

”میں جواب دے چکا ہوں۔“ شیراز نے کہا۔ ”تم کو میری بات پر یقین کرنا چاہیے۔“

”بکواس کی گئی تم نے..... وہ تمہاری ہی کار میں آئی تھی لیکن چترال تم جیب میں ہی آئے تھے۔“

اتنا کچھ جانتے ہیں یہ لوگ، شیراز کے دماغ میں خیال آیا۔ اب ان سے کوئی اور جھوٹ بولنا بے کار تھا لیکن وہ سچ بھی نہیں بولنا چاہتا تھا۔ صرف کی زندگی اسے اپنی زندگی سے زیادہ پیاری تھی۔

”تم جیب میں چترال آئے ہو“ وہی آدی پھر بولا۔ ”تو ہم معلوم کر چکے ہیں لیکن صدف کہاں گئی؟ کیا وہ تمہاری کار میں کالاش دادی گئی ہے؟“

”تم اب جو چاہو، کرو۔“ شیراز نے کہا۔ ”میری زبان اب بند رہے گی۔“

”تم تو طوطے کی طرح بولو گے۔“ دانت پیتے ہوئے کہا گیا، پھر اس نے ایک ساکھی سے کہا۔ ”شروع ہو جاؤ۔“

زبان تو کھلوانے ہی اس کی۔“

شیراز نے دیکھا کہ جس آدی کو مخاطب کیا گیا تھا، وہ ایک چابک سنبھالے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔

”اگر تم نہیں بولو گے تو میں تمہاری کھال اس وقت تک اوچھڑوں گا جب تک تم جواب نہیں دو گے یا مر نہیں جاؤ گے۔ تم صرف سچ جواب دے کر ہی ہم سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہو۔“

شیراز نے کچھ کہنے کے بجائے اپنے ہونٹ اس طرح مضبوطی سے بند کر لیے جیسے مرنے کے لیے تیار ہو۔

قرب آکر اس شخص نے چابک کھانے کے لیے ہاتھ اٹھایا یہی تھا کہ کہیں سے ایک گولی چلی جو اس کا بازو ڈھکی گئی۔ اس کے منہ سے کراہ نکلی، چابک اس کے ہاتھ سے گر چکا تھا۔

سبکی نے چونک کر دیکھا کہ دو آدی قریب ہی موجود تھے جن کے چہروں پر تھا نہیں تھیں۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ریو اور تھا۔ گولی یقیناً اسی سے چلائی گئی ہوگی۔

شیراز کو قید کر کے لانے والوں نے جلدی سے اپنے

ہاتھ اوپر اٹھا دیے تاکہ ان پر گولی نہ چلائی جائے۔ ان میں سے کسی کے بھی ہاتھ میں ریو اور نہیں تھا۔ انہیں اس کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ شیراز کو انہوں نے درخت سے باندھ دیا تھا۔

نو وارد افراد میں سے ایک نے کسی قدر بلندی کی طرف اشارہ کیا۔ شیراز نے بھی اوجھڑ دیکھا۔ اس پلٹنے پر ایک مشین گن نظر آئی۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص بھی چہرے پر نقاب لگائے ہوئے تھا۔

”کوئی بھی غلط حرکت ہوئی تو.....“ ریو اور دال بولا۔

”تم سب کے جسم میں سوراخ ہی سوراخ ہوں گے۔ پھٹتی ہو جاؤ گے۔“

شیراز نے محسوس کیا کہ اس شخص نے اپنی آواز بدلنے کی کوشش کی تھی۔ یہ احساس ان تینوں کو بھی ہو گیا ہوگا جنہوں نے شیراز کو باقاعدگی بنایا تھا۔

”تم..... کون ہو؟“ نور اور نقاب پوش نے پوچھا گیا۔

”ہم تمہارے قیدی کو لینے آئے ہیں۔“ نقاب پوش نے جواب دیا۔

اس کا ساتھی شیراز کے قریب آیا اور وہ رسیاں کھولنے لگا جس سے اسے باندھا گیا تھا۔

”تم اپنی آواز بدلنے کی کوشش کر رہے ہو!“ نقاب پوش سے پھر کہا گیا۔ ”کیا ہم تمہیں جانتے ہیں؟ آواز اس لیے بدلی ہے کہ ہم تمہیں پہچان سکیں؟“

”کوئی سوال نہیں، کوئی جواب نہیں۔“ ریو اور دال نے سر دھچکے میں کہا۔

شیراز کو درخت سے آزاد کرانے کے بعد اس آدی نے پوچھا۔ ”تمہاری جیبوں سے تو کچھ نہیں نکالا گیا؟“

سوال دوستانہ انداز میں کیا گیا تھا لیکن شیراز کے دماغ میں خیال آیا تھا کہ وہ آسمان سے گر کر کججور میں اکتنے دالا تو نہیں؟

اس نے اپنی جیبوں کی تلاشی لی پھر کہا۔ ”میرا ریو اور کہاں ہے؟“

”میرے پاس ہے۔“ بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا گیا۔

”کالو!“ اسے حکم ملا۔ ”اور یاد رکھو کہ ذرا سی بھی شرارت کرنے کی کوشش کی تو تم تینوں ہی کے جسم چھلکی کر دیے جائیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا تھا اور وہ اس کے پاس پہنچ گیا تھا جس نے اعتراف کیا تھا کہ شیراز کا ریو اور اس کے پاس ہے۔

حریف

ریو اور نقاب پوش کو دے دیا گیا۔

”تم سے ہماری کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔“ ریو اور دال نقاب پوش بولا۔ ”ہم یہاں تمہاری لاشیں پس بکھیر رہے۔ بس باندھ دیں گے تاکہ بعد میں خود کو آزاد کرالو۔“

یہ اس لیے ضروری ہے کہ تم لوگ فوری طور پر ہمارے پیچھے آنے سے باز رہو۔“

وہ تینوں خاموش رہے۔

شیراز اس دوران میں اس طرح کھڑا ہوا جیسے اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہو۔ وہ ان سب کے منہ تک رہا تھا۔

جس نقاب پوش نے اسے رسی سے چھٹکارا دلا یا تھا، اسی نے رسی کے تین ٹکڑے کیے۔ شیراز کو مضبوطی سے باندھنے کے لیے خاصی لمبی رسی استعمال کی گئی تھی۔ اس کے تین ٹکڑے ان تینوں کو اس طرح باندھنے کے لیے کافی تھے کہ وہ ٹھوڑی سی جدوجہد کر کے خود کو آزاد کر سکیں۔

جب ان تینوں کو ایک ایک کر کے باندھا جا رہا تھا تو ان میں سے ایک بولا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ فوری طور پر تم لوگوں کے پیچھے نہیں آؤں گا۔“

”بکواس مت کرو!“ ریو اور دال نقاب پوش نے کہا۔ ”تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کہتا لیکن اس پر عمل نہیں کرتا۔“

ان تینوں کو باندھ دیا گیا۔

جس نقاب پوش نے شیراز کو رسی سے آزاد کرایا تھا، اسی نے شیراز سے پوچھا۔ ”تمہارا سوٹ کیس کہاں ہے؟“

”میں معلوم ہے کہ تمہارے ساتھ ایک سوٹ بھی کیس تھا۔“ وہ ہوٹل میں ہونا چاہیے۔“ شیراز نے جواب دیا۔

”اگر یہ لوگ وہ بھی اٹھا نہ لائے ہوں۔“

”کیوں؟“ ریو اور دال نے اپنا ریو اور جیب میں رکھتے ہوئے ان تینوں کی طرف دیکھا۔

جواب ملا۔ ”ہم سوٹ کیس کا کیا کرتے؟ وہ وہیں ہوگا۔“

نقاب پوش نے جیب سے موبائل نکالا۔ کسی سے رابطہ کیا۔ دھیمی آواز میں مختصر سی بات کی اور موبائل بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔

”چلو۔“ شیراز سے کہا گیا۔ ”تم جہاں کہو گے، جہیں وہاں پہنچا دیا جائے گا۔“

شیراز نے دیکھا کہ کچھ بلندی پر نظر آنے والا نقاب پوش مشین گن کے ساتھ غائب ہو چکا تھا۔ شیراز ان دونوں

نقاب پوشوں کے ساتھ چل پڑا۔

”یہ لوگ تم سے کیا پوچھنا چاہتے تھے؟“ شیراز سے سوال کیا گیا۔

”اگر میں اس کا جواب نہ دوں تو؟“ شیراز نے ہمت کر کے کہا۔

”تو جواب کے لیے تم پر زور نہیں دیا جائے گا۔“

میرے انداز سے کے مطابق وہ تم سے صدف کے بارے میں پوچھ رہے ہوں گے۔ تم دونوں ساتھ ہی چلے تھے لیکن چترال صرف تم پہنچے مگر انہیں اصل فکر تو صدف کی ہوگی۔“

سبکی کچھ جانتے ہیں یہ لوگ، شیراز کو خیال آیا۔

”کہاں ہے صدف؟“ شیراز سے پوچھا گیا۔

”اس کا جواب تو میں اس صورت میں بھی نہیں دیتا۔“

جب وہ لوگ میری کال اوچھڑا دیئے۔“

نقاب پوش ہنسا۔ ”ابھی محبت کرتے ہو صدف سے؟“

خیر! میں اپنا سوال نہیں دہراؤں گا۔ وہ یقیناً کالاش دادی گئی ہوگی۔ یہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم چترال کیوں آئے تھے لیکن اس بارے میں بھی تم سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔“

شیراز خاموش رہا۔

”ہم تمہیں داکٹر ہوٹل پہنچا سکتے ہیں لیکن یہ مناسب نہیں ہوگا۔ تمہیں نہیں اور جانا چاہیے۔ غالباً تم کالاش دادی جانا پسند کرو گے!“

”میں اس سوال کا جواب بھی نہیں دوں گا۔ تم لوگ میرے ہمدرد ہو؟“

”اگر نہ ہوتے تو تمہیں ان لوگوں سے کیوں چھڑاتے؟“

”تو مجھے چترال کے بس اڑے پر چھوڑ دو۔ مجھے جہاں جانا ہوگا، چلا جاؤں گا۔“

”بس میں سفر تمہارے لیے پھر خطرہ بن سکتا ہے۔“

”میرے لیے کوئی اور چارہ کار نہیں ہے۔“

وہ نقاب پوش اپنی جیب سے موبائل نکالتے ہوئے تیزی سے چند قدم آگے بڑھ گیا۔ وہ چاہتا ہوگا کہ موبائل پر اس کی باتیں شیراز کے علم میں نہ آسکیں۔

ایک ڈیڑھ منٹ بعد ہی وہ پھر شیراز کے قریب تھا۔

”تمہیں جہاں جانا ہے، وہاں کے راستوں سے واقف ہو؟“

”یہ پوچھنے کا سبب؟“

”ہم نہیں ایک جیب دے دیں گے۔“

مارج 2018ء

سپینس ڈائجسٹ

266

سپینس ڈائجسٹ

مارج 2018ء

سپینس ڈائجسٹ

266

سپینس ڈائجسٹ

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ذاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 900 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے

بقیمت مالک کے لیے 9,000 روپے

آپ ایک وقت میں کسی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ذاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

یہ دونوں ملک سے قانون صرف ویسٹرن یونین یا مٹنی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بجاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس فون نمبر 0301-2454188

سرپرست منیر سید فون نمبر 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C II پمپنٹن ڈسٹری بیوٹنگ کمپنی انٹرنیٹ کوڈنگ روڈ کراچی
فون: 35804200-35804300

تینوں ہی نے صدف کی مددگار عورت کو سلیوٹ کیا جس پر
صدف کو حیرت ہوئی ہی جا چکی تھی۔ اسی عورت نے ان سے
کچھ کہا جس پر انہوں نے وہاں جمع ہونے والے لوگوں کو
منتشر کر دیا۔ سب اپنی اپنی نشستوں پر چلے گئے۔ ہوٹل کی
انتظامیہ کے لوگ دیگر کوئیں لے گئے جس کے ہاتھ میں
موجودہ گولی کا نشانہ بنی تھی۔ ویٹر کا ہاتھ بھی زخمی ہوا تھا۔
مددگار عورت نے مسکرا کر صدف سے کہا۔ ”میرا نام
ناتشا ہے۔ کیا آپ مجھ سے چند منٹ بات کرنا پسند کریں گی؟“
”ضرور۔“

”تو آئیے، اس طرف بیٹھنے ہیں۔“ اس نے ایک
خالی میز کی طرف اشارہ کیا۔ صدف اس کے ساتھ اس کی
میز پر جا بیٹھی۔

”میرا انتقال یہاں کی پولیس سے ہے۔“ ناتشا نے کہا۔
”پولیس والوں نے آپ کو سلام کیا تھا؟“
”جی ہاں۔ میں ان کی آفیسر ہوں۔“

”اوہ!..... لیکن میں نے تو سنا تھا کہ مقامی پولیس
کے افسران کا تعلق حکومت سے ہوتا ہے۔ پولیس کے مقامی
لوگ کانسٹیبل کی سطح سے زیادہ کے نہیں ہیں۔“

”یہ کچھ پرانی بات ہوئی۔ اب ہمارے یہاں تعلیم
بڑھ گئی ہے۔“

”یقیناً مجھے اس کا علم نہیں۔“ صدف نے کہا۔ ”لیکن
..... آپ مجھ سے کیا خاص بات کرنا چاہتی ہیں؟“

”جی ہاں۔“ ناتشا نے کہا۔ ”آپ کو اندازہ ہوا تھا
کہ میں نے جان بوجھ کر آپ کو دھکا دیا تھا؟“

”ہاں کچھ شبہ تو ہوا تھا۔ مجھے اس پر بھی حیرت ہے کہ
آپ میرے ساتھ ساتھ کیوں چل رہی تھیں؟“

”میری ڈیوٹی لگائی گئی تھی کہ آپ کا خیال رکھوں
کیونکہ پشاور ہی سے آپ کے کچھ دشمن آپ کے پیچھے لگے
ہوئے ہیں اور آپ کو شاید ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ آپ
پشاور ہی سے آئی ہیں نا؟“

”جی ہاں اور اس پر مجھے مزید حیرت ہوئی۔ یہاں کی
پولیس کو کسے معلوم ہوا کہ میں کسی خطرے میں پڑ سکتی ہوں؟“

”تفصیل مجھے نہیں بتائی گئی لیکن روایک باتوں سے
مجھے ایک شبہ ضرور ہوا ہے۔“

”کس بات کا شبہ؟“

”پولیس افسران کی آپس کی دھیمی گفتگو میں سے چند
لفظ میرے کان میں پڑ گئے تھے۔ ان میں ہمارے ایک
رئیس شہزادہ خان کے علاوہ ہمارے قبیلے کے سردار سیف

دماغ دوسو سو کی آماجگاہ بن گیا۔ کچھ ایسے سوالات جنم لینے
لگے جو اس کے لیے پریشان کن تھے۔

اسی عالم میں اس نے آدھا گھٹنا اور گزرا۔ اس
آدھے گھٹنے میں شیراز سے رابطہ کرنے کی دوبارہ کوشش کی
لیکن شیراز کا موبائل بندی ملا۔ وہ پریشانی کے عالم میں
کمرے سے نکل کر ہال میں آگئی۔

ہال میں بیٹہ کر صدف نے کافی پی اور پھر اچانک یہ
فیصلہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی کہ اسے چڑا ل جانا چاہیے۔ وہ
تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ سین اس وقت جب
وہ باہر نکلنے کے لیے پہلا قدم اٹھا چکی تھی، گولی جلنے کی آواز
سنائی دی اور ساتھ ہی کسی نے صدف کو اتنی زور دیا کہ
وہ خود کو گرنے سے نہیں بچا سکی۔

جس نے دھکا دیا تھا، وہ بھی ایک عورت تھی اور وہ بھی
صدف کے قریب ہی گری تھی.....

گولی کی آواز نے وہاں ہچکل پیدا کر دی۔ وہ گولی
ہوٹل کے باہر سے چلائی گئی تھی جو ہوٹل کے ایک ویٹر کے ہاتھ
میں موجودہ سے گرائی تھی۔ ویٹر بری طرح ہولکا گیا تھا۔

صدف اپنا لباس درست کرتی ہوئی اٹھی تو اس کے
ذہن میں یہ خیال موجود تھا کہ وہ گولی اسی پر چلائی گئی ہوگی۔
اسے دھکا دینے والی عورت بھی کھڑی ہو چکی تھی۔

”معاف کیجیے گا۔“ وہ بولی۔ ”میں اتنی جلدی میں تھی
کہ آپ سے ٹکرائی۔“

صدف نے خود کو دروازے کے سامنے سے ہٹاتے
ہوئے اس عورت کو غور سے دیکھا جو مقامی ہی معلوم ہوتی تھی
لیکن اردو اس نے بڑی حد تک صاف لہجے میں بولی تھی۔

صدف کو اس کے جواب پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس
کے خیال کے مطابق عورت نے فائر کرنے والے کو دیکھ لیا
تھا اور یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ اس گولی کا نشانہ کون ہے۔ اسی لیے
اس نے اسے دھکا دے کر گولی کا نشانہ بننے سے بچا تھا۔

”تکریوں؟ یہ عورت کون ہے؟“

پے در پے کی سوال صدف کے دماغ میں ابھرے۔
دو عورتوں کو گرتے دیکھ کر خامے لوگ ان کے گرد جمع
ہونے لگے تھے جن میں ہوٹل کی انتظامیہ بھی تھی۔ انہوں
نے سوالات کی بھرمار کر دی تھی۔

جواب میں صدف کی مددگار عورت نے انہیں مقامی
زبان میں دو ایک ہی جواب دیے تھے کہ پولیس آگئی،
مقامی پولیس جنہیں صدف نے ان کے مخصوص لباس سے
پچانا۔ وہ تین تھے جن میں سے ایک عورت بھی تھی۔ ان

”مگر ان مہربانیوں کا مطلب.....؟“
”مناسب وقت آنے پر تم جان لو گے۔ میرے سوال کا
جواب دو۔ تم یہاں کے سب راستوں سے واقف ہو؟“
”واقف نہیں بھی ہوں گا تو لوگوں سے پوچھتا ہوا چلا
جاؤں گا۔“

”تم یقیناً کالا لاش وادی جاؤ گے۔“ نقاب پوش بولا۔
”ہم جہیں لو بائیں چیک پوسٹ تک پہنچا دیں گے۔ وہاں ہمیں
جیب دے دی جائے گی۔ وہاں سے جبریت بارہ میل
اور بمبورت دس میل دور ہے۔ کالا لاش وادی بھی وہیں نہیں ہوگی۔
دو گھنٹے کا سفر ہے تم جہاں بھی جاؤ گے، ہمیں معلوم ہو جائے گا،
تمہارا سوٹ کس وٹیں پہنچا دیا جائے گا۔ ٹھیک ہے؟“

شیراز نے سر ہلانے پر اکتفا۔
اب وہ اس جگہ پہنچے تھے جہاں ایک جیب کھڑی
تھی۔ مشین کن والا بھی جیب میں موجود تھا۔
”بیٹھو!“ شیراز سے کہا گیا۔

شیراز جیب میں بیٹھ گیا۔ مشین کن والا ڈرائیونگ
سیٹ پر بیٹھا تھا۔

”لو بائیں چیک پوسٹ۔“ اس سے کہا گیا۔
اس نے سر ہلا دیا اور جن اشارت کر دیا۔

☆☆☆

کافرستان میں تین علاقے ہیں۔ بجزیرت، بمبورت اور
کالا لاش اعتقدوں کے اختلاف کے باوجود یہاں ہر ماسن لوگ
ہیں۔ جن میں پائی جانے والی روایات کافی دلچسپ ہیں،
لیکن صدف جب کالا لاش وادی پہنچی تھی تو یہ سب باتیں اس
کے ذہن میں نہیں تھیں۔ وہ غیلاری.... کی عبادت گاہ
پر پہنچی تھی جہاں سے معلوم ہوا تھا کہ غیلاری چڑا ل گیا ہوا
تھا۔ پھر صدف ایک ہوٹل میں قیام پذیر ہو گئی تھی اور سوچ
رہی تھی کہ شیراز کو چڑا ل بھیج کر اس سے بہت جلدی قدم اٹھایا
تھا۔ اسے شیراز کی کال بھی رہی ہوگی مگر غیلاری سے اس
کی ملاقات ایک گھنٹے بعد ہو سکے گی، لیکن جب ڈیڑھ گھنٹے
بعد شیراز کی دوسری کال نہیں آئی تو اسے تشویش ہوئی۔
غیلاری سے ملاقات میں شیراز کو اتنی دیر تو نہیں لگنی چاہیے
تھے۔ اسے غیلاری کو بس صدف کا پیغام پہنچانا تھا جس کے
بعد صدف کی داستان میں غیلاری جلد از جلد کالا لاش وادی
واپس لوٹا۔

ایک گھنٹہ پچیس منٹ کے بعد صدف نے شیراز کو
فون کیا تو اس کا موبائل بند ملا۔ یہ اس کے لیے اور زیادہ
تشویش کی بات تھی۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھ گئی۔ اس کا

جان کا نام بھی آیا تھا۔ شاید انہی میں سے کسی کے کہنے پر پولیس نے آپ کی حفاظت کا بندوبست کیا ہے۔ کیا آپ سیف جان سے واقف ہیں؟

”جی نہیں۔“

”شہزادہ خان سے؟“

”ان کو بھی نہیں جانتی۔ اگر آپ کے خیال میں انہیں میرے بارے میں کچھ معلوم ہے تو ان سے ملنا ہوگا۔“

”سیف جان سے آپ کی ملاقات کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے البتہ شہزادہ خان سے ملاقات کر سکتی ہوں اگر وہ چترال سے جلد واپس آ گئے۔“

”وہ چترال گئے ہوئے ہیں؟“

”جی ہاں۔ آج ہی گئے ہیں۔ میرے علم کے مطابق انہیں کوئی خاص کام تھا جس کے لیے انہیں ہمارے ایک روحانی پیشوا کی مدد درکار تھی۔ اتفاق ہے کہ ہمارے وہ روحانی پیشوا بھی آج صبح چترال گئے تھے۔ شہزادہ خان انہی سے ملنے گئے ہوں گے۔“

”روحانی پیشوا؟“ صدف نے جلدی سے پوچھا۔

”کیا آپ کا اشارہ غیلاری بابا کی طرف ہے؟“

”اوہ! کیا آپ انہیں جانتی ہیں؟“

”میں انہی سے ملنے یہاں آئی ہوں۔“

”خوب!“ وہ ہنسی سے کچھ سوچنے لگی۔

”اور کوئی بات؟“ صدف نے کرسی پر پہلو بدلا۔

”دراصل مجھے نہیں جانا ہے۔“

”خطرے کی وجہ سے آپ کو ہوئی تک محدود رہنا چاہیے۔ یہ تو محض اتفاق ہے کہ میں نے ایک شخص کو دیکھ لیا تھا جو آپ کو روپو اور سے نشانہ بنانا چاہتا تھا۔“

”کوئی مقامی؟“

”جی نہیں۔ کسی مقامی کو آپ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟ وہ لوگ تو پشاور ہی سے آپ کے پیچھے آئے ہیں۔“

”کیا یہاں فائرنگ کرنے والے کو پکڑنے کی کوشش نہیں کی جاتی؟“

”روپو اور والا فوراً ہمارا نکلا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ باہر موجود ہمارے کچھ لوگ اس کے پیچھے دوڑے تو ہوں گے۔ میں نیچے سے ابھی خبر ہوں۔“

اسی وقت صدف کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے جلدی سے موبائل نکالا۔ اسکرین پر اسے شیراز کا نام دکھائی دیا۔

”کہاں ہو؟“ وہ کال ریسو کرتے ہی بولی۔ ”تم

نے اپنا موبائل بھی بند کر رکھا تھا۔ میں بہت پریشان ہو کر چترال آئے ہی والی تھی کہ یہاں ایک واقعہ پیش آ گیا۔“

”میں ایک مصیبت میں پڑ گیا تھا۔ ہوئی میں مجھے۔۔۔۔۔“

شیراز نے اپنی آپ بیتی سنائی شروع کی۔

صدف خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی۔ اس نے دو ایک سوال کرنے کے لیے لیکن ناشا کی موجودگی میں مناسب نہیں تھا۔

جب شیراز خاموش ہو گیا تو صدف نے پوچھا۔

”لیکن یہ بات تو خاصی دیر پہلے کی ہے۔ اس کے بعد تم نے اپنا موبائل کیوں بند کر رکھا تھا؟“

”ان لوگوں نے میرا روپو اور اور موبائل مجھے دے دیا تھا موبائل بند تھا۔ مجھے ذہنی اذیت کی وجہ سے اسے کھولنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ ابھی میں نے دیکھا کہ موبائل بند پڑا ہے تو میں نے اسے کھولا۔ پھر خیال آیا کہ تمہیں فون پر ہی سب کچھ بتا دوں گا۔“

”اچھا خیر! تفصیلی بات تو یہاں آ جاؤ گے، جی ہوگی۔ کب تک بک رہے ہو؟“

”شاید یوں گھنٹا اور لگے گا۔“

”میں ایک ہوئی میں ہوں لیکن اب۔۔۔۔۔ جیسا کہ غیلاری بابا نے ہدایت کی ہے، میں یہاں سے ان کے معبد چلی جاؤں گی۔“

ناشا جو خاموشی سے صدف کی طرف دیکھ رہی تھی، غیلاری کا نام سن کر چونکی۔

صدف کہہ رہی تھی۔ ”تم بھی وہیں چلے آنا۔ کسی سے بھی پوچھو گے، وہ تمہیں معبد تک پہنچا دے گا۔“

گفتگو ختم کر کے صدف نے موبائل بند کیا۔

ناشا فوراً بولی۔ ”آپ نے ابھی بتایا تھا کہ آپ غیلاری بابا ہی سے ملنے آئی تھیں۔ کیا آپ کے ساتھ کوئی اور بھی ہے جو چترال سے آ رہا ہے؟“

”جی ہاں۔ میں اور دو ساتھ ہی آ رہے تھے۔ مجھے خیال آ یا کہ غیلاری بابا انہیں چترال نہ گئے ہوئے ہوں اس لیے اسے وہاں ہی دھکا دیا تھا اور یہ خیال درست بھی ثابت ہوا۔ میرے دوست کی ملاقات غیلاری بابا سے ہو چکی ہے اور انہوں نے ہدایت کی ہے کہ میں ان کے معبد چلی جاؤں اور وہیں قیام کروں۔“

”غیلاری بابا۔۔۔۔۔“ ناشا کا انداز بڑبڑانے کا سا تھا۔ ”وہیں شہزادہ خان بھی ان سے ملا ہوگا۔ غیلاری بابا جان کچے ہوں گے کہ یہاں آپ کسی خطرے سے دوچار

حریف

”یہ بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے تم مجھے ان لوگوں کے بارے میں بتاؤ جنہوں نے تمہاری مدد کی تھی۔ نقاب پوش تو وہ اس لیے ہوں گے کہ تم سے اور تمہارے دشمنوں سے، بلکہ میرے دشمنوں سے اپنے چہرے چھپائیں لیکن تم نے بتایا تھا کہ آواز بدلنے کی کوشش بھی کی تھی۔ یہ بات تو ممکن نہیں معلوم ہوئی کہ تم ان سے واقف ہو اس لیے انہوں نے آواز بدلی۔ صرف یہ ممکن ہے کہ وہ میرے دشمنوں سے خود کو چھپانا چاہتے ہوں۔“

”یہی بات ہو سکتی ہے۔“

”لیکن یہ ایک معما ہے۔“

”جو بھی نہ بھی حل تو ہوگا۔“

”بنیان غیلاری سے تمہاری اور کوئی بات نہیں ہوئی؟“

”میری اس سے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔“

”کیا؟“ صدف حیرت سے بولی۔ ”تو بھروسہ کی ہدایت؟“

”وہ۔۔۔۔۔“ شیراز نے طویل سانس لی۔ ”وہ مجھے کھوپڑی کے ذریعے دی گئی تھی۔ فون پر میں وہ تفصیل نہیں بتا سکتا تھا۔ اختصار سے کام لیا تھا میں نے!“

”تو وہ کھوپڑی تم نے بھی خواب میں دیکھی تھی؟“

”خواب میں یا فونوں میں، اس کا اندازہ نہیں مجھے۔“

”اب تو تمہیں میری باتوں پر مکمل یقین آ گیا ہوگا کہ بنیان غیلاری۔۔۔۔۔“

”یقین تو اسی وقت آ گیا تھا جب تم پر حملہ ہوا تھا۔“

”دوسرا حملہ بھی ہو چکا ہے۔“

”کب؟“ شیراز چونکا۔

صدف نے بھی وہ سب کچھ بیان کر دیا جو اس پر گزری تھی۔

”شیراز بولا۔“ اس کا مطلب ہے کہ مسلسل پیچھا کیا جا رہا ہے تمہارا!“

”اس حملے کے بعد تو بات بالکل واضح ہو گئی۔“

”ابھی ابھی ایک اور خیال آیا ہے مجھے۔ غیلاری نے جو ہدایات مجھے کھوپڑی کے ذریعے دی تھیں، وہ براہ راست تمہیں کیوں نہیں دیں؟“

”اس لیے کہ میں یہاں آنے کے بعد نہ تو سوئی ہوں اور نہ مجھ پر غنود کی طاری ہوئی ہے۔ وہ کھوپڑی غالباً بیداری میں نظر نہیں آ سکتی۔“

”ہوں۔“ شیراز نے سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ ”اب کیا ارادہ ہے؟“

”بنیان غیلاری کا انتظار۔“

ہو سکتی ہیں اس لیے انہوں نے شہزادہ خان سے ہی اس بارے میں کچھ کہا ہو۔ شہزادہ خان نے فون پر سیف جان سے بات کی ہوگی۔ سیف جان نے یہاں کے پولیس آفیسر سے کچھ کہا ہوگا جس کی وجہ سے مجھے آپ کی حفاظت پر مامور کیا گیا۔“

”شاید۔“ صدف نے کہا لیکن اسے ناشا کی بات پر یقین آ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”مجھے اب یہاں سے اپنا سامان لے کر معبد منتقل ہو جانا چاہیے۔“

”آپ کو ہوں آمانی نہیں چاہیے تھا۔ معبد ہی میں قیام کرتیں۔“

”پہلے میں وہیں گئی تھی لیکن وہاں کے لوگ مجھے بابا کی اجازت کے بغیر وہاں نہیں روک سکتے تھے لیکن اب انہیں فون پر بابا سے اجازت مل گئی ہوگی۔“ صدف کھڑکی ہو گئی۔

”مجھے معلوم ہے کہ آپ کے پاس کار ہے۔ میں اپنی کار میں آپ کے پیچھے پیچھے چلوں گی۔ یہ میری ڈیوٹی ہے۔“

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ سرکاری ڈیوٹی پر ہیں۔“

☆☆☆

صدف ہوٹل سے معبد منتقل ہو گئی۔ اس مرتبہ بنیان غیلاری کے تائین نے اس کا استقبال بڑی عزت سے کیا۔ اس کے لیے ایک کمرہ وہ پہلے ہی شیک کر دیا تھے۔ انہیں یقیناً غیلاری بابا سے ہدایات مل چکی ہوں گی۔

شیراز سے موبائل پر ہونے والی گفتگو کے باعث صدف کا دماغ اس سوال میں الجھا ہوا تھا کہ وہ لوگ کون ہو سکتے ہیں جنہوں نے شیراز کی مدد کی۔ شیراز نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے مددگار مقامی لوگ نہیں تھے۔ غالباً وہ بھی پشاور سے آئے ہوں گے مگر کون؟“

اس سوال کا جواب اس کا دماغ نہیں دے سکا۔ وہ بے چینی سے شیراز کا انتظار کرتی رہی جو زبیرا وہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ شیراز اپنے سامان سمیت وہاں پہنچ گیا۔ اس کی آمد کے بارے میں صدف نے بنیان غیلاری کے تائین کو بتا دیا تھا اس لیے اسے فوراً صدف کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔

”تم نے فون پر بڑے غیر معمولی حالات بیان کیے تھے لیکن مختصر طور پر، میں کئی سوال اس لیے نہیں کر سکتی کہ میرے ساتھ کوئی تھا۔“

”کون؟“

”وہ کب تک آ رہا ہے؟ پوچھا تھا یہاں کسی سے؟“
 ”ہاں۔ اس کے ایک نائب نے بتایا تھا کہ وہ کل صبح آئے گا۔“

”تو فی الحال ہمیں یہیں قید رہنا ہے؟“
 ”قید ہی سمجھو۔ باہر نکلنے میں تو خطرہ ہے۔“
 ”خیلاری تمہیں اس خطرے سے کس طرح بچائے گا؟“
 ”یہ تو اسی وقت معلوم ہوگا جب اس سے ملاقات ہو جائے۔“

شیراز نے اپنا پیٹ سہلایا۔ ”مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔“
 ”رات ہو چکی ہے۔ بھوک تو لگے گی۔“

”یہاں کھانا تو ملے گا نا؟“
 ”کیوں نہیں ملے گا۔ میں ابھی کسی کو بلا کر بات کرتی ہوں۔“
 ”نہ جانے کیا کھانا ہوتا ہوگا یہاں!“
 ”اب یہاں سب کچھ مل جاتا ہے، جو بھی کھانا چاہو۔ اب یہ سو پچاس سال پہلے کا کفرستان نہیں ہے۔ اچھے خاصے ہوٹل کھل چکے ہیں یہاں۔“
 اسی دوران معبد کے ایک آدمی نے آ کر ان سے کھانے کے بارے میں پوچھا۔ صدف نے اسے ہدایت دیں اور دوسرے بل کر رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

صبح وہ دونوں اٹھے ہی تھے جب انہیں معلوم ہوا کہ خیلاری آ گیا تھا۔
 ”آپ لوگ ناشا کر لیں پھر وہ آپ سے ملاقات کرنے خود آئیں گے۔“ انہیں ناشا پہنچانے والے نے بتایا۔
 وہ دونوں بڑی بے چینی سے خیلاری کے منتظر تھے۔ انہوں نے جیسے جیسے ناشا کیا اور انتظار کرنے لگے۔

”یہ تمہارا بیٹا آدمی کیسا ہے؟“ شیراز نے پوچھا۔
 ”نہایت شفیق، نہایت شریف۔“ صدف نے جواب دیا۔ ”اس نے اپنی پراسرار قوتوں سے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا، اپنے کسی مخالف یا دشمن کو بھی نہیں۔“
 ”تمہیں اس کا یقین کیوں ہے؟“

”بیٹا خیلاری کی باتوں سے سمجھا ہے میں نے اور میں اسے سمجھتا انسان بھی نہیں سمجھتی۔“

وہ دونوں یہ باتیں کر رہے تھے کہ ایک معترض ان کے کمرے میں آیا۔ صدف اس کے احترام میں کھڑی ہوئی تو شیراز کو بھی کھڑا ہونا پڑا اور اس نے سمجھ لیا کہ وہ خیلاری ہی ہوگا۔

اس کے بال سفید تھے لیکن عمر اتنی زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ کسی موقع پر صدف نے اسے بتایا تھا کہ بیٹا خیلاری کی عمر نوے سال ہے لیکن وہ ساٹھ پینسٹھ سال کے تن ور ست شخص کی طرح چاق و چوبند تھا۔

اس کی شفقت کا مظاہرہ شیراز نے اسی وقت دیکھ لیا جب اس نے پہلے صدف اور پھر شیراز کے سر پر زردگانہ انداز میں ہاتھ رکھا۔

”میں تمہارا منتظر رہتا لیکن کل ایک بہت ضروری مسئلے کے باعث جڑال جانا پڑ گیا۔“
 ”شیراز نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں شہزادہ خان آپ سے ملنے پہنچا تھا۔“

”ہاں۔ وہ اس وقت وہیں تھا اور ایک ایسے معاملے میں بھٹس گیا تھا کہ اسے میری مدد کی ضرورت تھی۔ وہ خود نہیں آ سکا تھا اس لیے مجھے جڑال جانا پڑا اور یہ اچھا ہی ہوا۔ میں جان چکا تھا کہ تم شیراز کے ساتھ یہاں پہنچ چکے ہو۔ مجھے یہ علم بھی ہو گیا تھا کہ تمہارے دشمن تمہاری تاک میں یہاں تک پہنچ گئے ہیں اور جڑال میں شیراز کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ اس وقت تک انہیں علم نہیں تھا کہ تم کالاں وادی پہنچ چکے ہو۔ وہ شیراز سے تمہارے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ اسی لیے میں نے شیراز کو خبردار کیا تھا اور اسے تمہارے لیے پیغام دیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ یہ جڑال سے یہاں کے لیے روانہ ہوتا، دشمنوں نے اس کو اغوا کر لیا۔“

”اور کچھ لوگوں نے اسے میرے دشمنوں سے بچایا۔“
 ”یہ بھی میرے علم میں آ چکا ہے۔ پشاور ہی سے تمہارے کچھ ہمدرد بھی یہاں پہنچے ہیں جو تمہیں ہر قیمت پر دشمنوں سے بچانا چاہتے ہیں۔“

”وہ کون ہیں..... کون ہیں بابا؟“ صدف نے بے چینی سے پوچھا۔

”میں دونوں ہی کے بارے میں جان چکا ہوں لیکن ابھی تمہیں بتا کر ذہنی اشتعال میں نہیں ڈالنا چاہتا لیکن میں جانتا ہوں کہ ایک دن تم خود ہی سب کچھ جان لو گی۔ اس وقت کا انتظار کرو۔“

”ابھی آپ نے کہا تھا کہ شہزادہ خان کا آپ کے پاس پہنچنا اچھا ہی ہوا۔“

”ہاں۔“ خیلاری نے جواب دیا۔ ”مجھے علم ہو گیا تھا کہ تمہارے دشمن یہاں بھی پہنچ چکے ہیں۔ ہوئی میں قیام کی وجہ سے تم کسی وقت بھی خطرے میں پڑ سکتی تھیں اس لیے میں نے شہزادہ خان سے کہا کہ وہ سیف جان سے رابطہ

حریف

کے تمہاری حفاظت کا بندوبست کر دے۔ اس نے یہ کام فوراً کیا تھا۔ پولیس کے لوگ تمہاری حفاظت کے لیے مامور کر دیے گئے تھے۔ تم پر جو کوئی چلائی گئی تھی، اس سے تمہیں بچانے والی پولیس ہی سے تعلق رکھتی ہے۔“

”تمنا شام بتایا تھا اس نے مجھے۔“
 ”میں جانتا ہوں۔“
 ”آپ کیا نہیں جانتے بابا!“ اب شیراز بھی اس کا معتقد ہو چکا تھا۔

”ہاں۔“ خیلاری مسکرایا۔ ”میں سب جانتا ہوں لیکن ہر بات کا انکار کرنے کا کوئی موقع ہوتا ہے۔“
 ”اب میرا انبیا دی مسئلہ تو یہ ہے بابا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ صدف بولی۔ ”آپ نے مجھے یہاں بلایا تھا اور میں یہاں آ گئی ہوں۔“

”نوری طور پر میرے دماغ میں ایک بات آئی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ جیت کی وہ کھوپڑی ہی تمہاری حفاظت کرے گی۔“
 ”محبت کی کھوپڑی؟“ شیراز پوچھ بیٹھا۔
 ”ہاں۔“ خیلاری مسکرایا۔ ”یہ بہت پرانی بات ہے۔ یہاں کے ایک بہت خوب صورت اور بہادر شخص کو ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ اس کا نام داگنائی تھا۔ لڑکی بھی اس سے محبت کرتی تھی۔ بعض لوگ ان دونوں کی محبت کو ایک روائی قصہ سمجھتے ہیں لیکن میں جو کچھ بتا رہا ہوں، وہ کوئی قصہ نہیں، حقیقت ہے۔ اس زمانے میں یہاں بہار کے موسم میں بکریوں کو چرانے کے لیے دور دراز جگہ گاہ میں جانا پڑتا تھا۔ داگنائی جب موسم بہار میں بکریاں چرانے جاتا تھا تو اس کی محبوبہ ایک پہاڑی نیلے پراختی آگ چلائی کرتی تھی کہ وہ چرگاہ سے دیکھی جاسکے۔ چرگاہ میں داگنائی آگ روشن کرتا تھا۔ اس طرح ان دونوں میں پیام و سلام ہو جاتا تھا۔ یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ جب خزاں کے موسم میں داگنائی واپس آنے والا تھا تو اس نے دیکھا کہ لڑکی کی طرف سے آگ نہیں چلائی گئی تھی۔ داگنائی اسی وقت بے تاب ہو کر اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا یہاں پہنچا۔“

”اور اسے معلوم ہوا کہ لڑکی کی شادی کسی اور سے ہو گئی۔“ شیراز بول پڑا۔
 ”جی نہیں۔“ خیلاری نے جواب دیا۔ ”وہ لڑکی اچانک کسی وجہ سے مر گئی تھی، داگنائی کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے اپنے سینے میں پھری مار کر خود کو ہلاک کر لیا۔“
 ”میں ایک مرتبہ یہ سب کچھ سن چکی ہوں۔“ صدف بولی۔ ”یہاں کی لڑکیاں اب بھی رقص کر کے اور گا کر داگنائی

کی محبت کو خراج عقیدت پیش کرتی ہیں۔“
 خیلاری نے اپنا بیان جاری رکھا۔ ”اس زمانے میں میرے جد امجد اس معبد کے بڑے پجاری تھے۔ چند سال بعد انہیں خواب میں بشارت ہوئی۔“
 ”بشارت؟“ شیراز بول پڑا۔ ”کس کی طرف سے؟“
 ”یہ سوال مت کر دیر سے بچے!“ خیلاری مسکرایا۔
 ”شہروں کی بڑی بڑی درس گاہوں میں پڑھے ہوئے لوگ ان باتوں پر یقین نہیں کر سکتے۔“

”بابا کو اپنی بات کرنے دو شیراز!“ صدف بولی پڑی۔
 ”ہاں۔“ خیلاری نے اپنی بات جاری رکھی۔
 ”انہیں بشارت یہ ہوئی کہ ہمارے بڑے دیوتا نے محبت کے لیے داگنائی کی قربانی اس حد تک پسند کی ہے کہ اس کی کھوپڑی کو غیر معمولی طاقتیں بخش دی ہیں لہذا اس کھوپڑی کو اب مندر میں ہونا چاہیے چنانچہ میرے جد امجد قبرستان گئے اور صندوق سے داگنائی کی کھوپڑی نکال لائے۔ اسے صاف سترا کیا تو دیکھا کہ اس میں غیر معمولی چمک تھی۔ دو چمک اس قوت کی تھی جو ہمارے بڑے دیوتا نے اسے دی تھی اور اسے محبت کی کھوپڑی قرار دیا تھا۔ میرے جد امجد نے وہ کھوپڑی محبت کی دیوی دینا کے مجھے کے قدموں میں رکھ دی۔“
 ”فرسا۔“ شیراز پھر بول پڑا۔ ”سوا دو ہزار سال پہلے یونان کا سکندر اس علاقے سے گزرا تھا۔ اس کے خاصے فوجی سپہیں رہ گئے تھے۔ غالباً اس کے اثرات یہاں اب تک ہیں۔ یونانی نامیخا لونی میں ان کی ایک دیوی دیش ہے جس کو حسن و محبت سے نسبت دی جاتی ہے۔ یہ نام ”دینا“ کیا دیش ہی کی وجہ سے رکھا گیا ہے؟“

خیلاری نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ ”ہمارا عقیدہ یہ رہا ہے کہ اگر کوئی محبت کرنے والا کسی پریشانی میں پڑ جائے تو داگنائی کی کھوپڑی اس کی مدد کر سکتی ہے، بشرطیکہ وہ کھوپڑی میں دنیا کی سب سے قیمتی دھات کا ایک دانٹ لگوا دے۔“
 ”سب سے قیمتی دھات تو غالباً پلٹینم ہے۔“ شیراز پھر بول پڑا۔
 خیلاری نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اس طویل عرصے میں چار بار ایسا ہو چکا ہے کہ یہاں کے چار دولت مندوں نے اس کھوپڑی کے دانٹ لگوائے ہیں، مختلف اقدار میں۔ وہی دانٹ اب بھی داگنائی کی کھوپڑی میں ہیں۔ جن لوگوں نے دانٹ لگوائے تھے، داگنائی کی قوت

موزی

ہیں غور و فکر کی لت لگانے کے بعد انہوں نے آنا جانا موقوف کر دیا جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ واقعی تائب ہو گئے ہیں اور کسی سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے، بالخصوص سگریٹ پینے والوں سے۔ (انہی کا قول ہے کہ بڑھیا سگریٹ پیتی ہے ہر شخص کو محاف کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ خواہ وہ رشتے دار ہی کیوں نہ ہو) میں گیا بھی تو کھینچے کھینچے رہے اور چند دن بعد ایک مشترکہ دوست کے ذریعے کہلوایا کہ ”اگر میں نے برائے مجبوری سگریٹ پینے کی قسم کھالی تھی تو آپ سے اتنا بھی نہ ہوا کہ زبردستی چلا دیتے۔ میں ہوں مجبور مگر آپ تو مجبور نہیں۔“ سات مہینے تک سگریٹ اور سوسائٹی سے اجتناب کیا لیکن خدا بڑا مسبب الاسباب ہے، آخر ایک دن جب وہ وعظ کر خوش خوش گھر لوٹ رہے تھے تو انہیں بس میں ایک سگریٹ لائٹر پڑا مل گیا چنانچہ پہلے ہی بس اسٹاپ پر اتر پڑے اور لپک کر سگریٹ کا ڈبا خرید لیا (میں اس واقعے پر قطعاً تعجب نہیں ہوا اس لیے کہ گزشتہ کرس پر انہیں بس سے نالوں کے موزے چار آنے رعایت سے مل گئے تھے جن کو ”پچ“ کرنے کے لیے انہیں ایک دوست سے قرض لے کر پورا سوٹ سلوان پڑا) سگریٹ اپنے جلتے ہوئے ہونوں میں دبا کر لائٹر جلانا چاہا تو معلوم ہوا کہ اندر کے تمام بڑے غائب ہیں۔ اب مابقی خریدنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔ ہم نے اکثر بیوی دیکھا کہ مرزا دیسیری لینے کو گئے اور آگ لے کر لوٹے! اور دوسرے دن اچانک غریب خانے پر گاڑھے گاڑھے دھوئیں کے بادل چھا گئے جن میں سے مرزا کا مسکراتا ہوا چہرہ رفتہ رفتہ ظور ہوا۔ گلے گٹھوے تمام ہوئے تو نشتوں سے دھواں خارج کرتے ہوئے بشارت دی کہ سگریٹ میرے لیے موجب نشاط نہیں، ذریعہ نجات ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب
”چراغ تلتے“ سے اقتباس
عاصم خان، حیدر آباد کا منٹا خاندان

ہو۔ تمہیں انوا کیا جاسکتا ہے۔ ایک بار کیا بھی جا چکا ہے لیکن تم بھی داخل نظر آ رہے ہو۔“

شیراز نے طویل سانس لی۔ ”تمہارا ساہ جو پڑ گیا ہے مجھ پر..... اور اب ایک اطمینان یہ ہو گیا ہے کہ ہماری حفاظت کے لیے بھی کچھ نامعلوم لوگ ہیں۔“

”اس بات نے مجھے اور اطمینان میں ڈال دیا ہے۔“

صدف بخیدہ ہوئی۔ ”اور جب سب کچھ سامنے آ جائے گا تو نہ جانے کیا ہو۔“

”واپس شہر پہنچنے کے بعد ہی یہ معاملہ ہوگا۔“ شیراز نے کہا، پھر مسکراتا ہوا بولا۔ ”بھڑکے ہم سب سلامت شہر تک جائیں۔“

☆☆☆

سہ پہر کو وہ دونوں کافرستان سے روانہ ہوئے۔

”پہلے تو تمہیں میرے ہی گھر چلنا ہوگا۔“ راستے میں شیراز نے کہا۔ ”تمہاری کاررواہیں ہے۔“

”وہاں سے مجھے اپنی کارلے کر آئی جی کے پاس جانا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”تم اس وقت سامان ٹھیک کرنے میں مصروف تھے جب غیلاری بابا نے مجھے یہ ہدایت کی تھی۔“ صدف نے جواب دیا۔ ”یہاں کے سردار سیف جان نے میرے بارے میں آئی جی کی بات کی ہے، اسے بتایا ہے کہ میری زندگی خطرے میں ہے۔ دوسرے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی جا چکی ہے۔“

”ہم رات گئے پنجپنچس کے پشاور۔“ شیراز نے کہا۔

”اس وقت آئی جی پولیس ہیڈ کوارٹر میں تو نہیں ہوگا، اپنے گھر پر پڑا سو رہا ہوگا۔“

”میں اس کے گھر ہی جاؤں گی۔ غیلاری بابا نے بتایا ہے کہ اس وقت آئی جی اپنے گھر پر میرا منتظر ہوگا۔ اسے بتایا جا چکا ہے کہ میں وہاں اس وقت پہنچوں گی۔ ان سب باتوں سے مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ آئی جی سے سیف جان کے تعلقات ذاتی نوعیت کے ہیں۔“

”جب ٹھیک ہے، ورنہ اتنی رات کو کسی کے گھر جانا مناسب نہیں ہوتا۔ میں بھی چلا جاؤں گا تمہارے ساتھ۔“

”نہیں۔“ صدف نے کہا۔ ”میں اکیلی ہی جاؤں گی آئی جی کے پاس۔“

”تم خطرے میں ہو، کہی تو تمہارے ساتھ ہونا چاہیے۔“

”کار کا مجھے ہی پشاور کی حدود میں داخل ہونی، پولیس خفیہ طور پر مجھے نظر میں رکھے گی۔ یعنی اس طرح میری

انجمن میں ضرور ہوں کہ میری زندگی کا دشمن کون ہے اور کیوں ہے۔“

غیلاری نے طویل سانس لی۔ ”جب تم پر یہ راز کھلے گا تو.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”تو؟“ صدف کا انداز سوالیہ تھا۔

”میں تم واپسی کے بارے میں سوچ۔“ غیلاری نے جواب دینے سے پہلو ہچکایا۔

”آپ نے بتایا نہیں کہ میں کب واپس جاؤں؟“

”ستاروں کے حساب سے تمہیں آج سہ پہر تک یہاں سے روانہ ہونا چاہیے۔“

”یعنی رات کا سفر؟“ شیراز بولا۔

”ہاں۔“ غیلاری نے کہا۔

اسی وقت ایک آدی ناشتے کا سامان لے کر آ گیا۔

”ہم ناشتا کر چکے ہیں۔“ صدف نے بتایا۔

”میں نے نہیں کیا۔“ غیلاری نے جواب دیا۔

”رات کو درہمیک جا گا تھا۔ ابھی آٹھ گھنٹہ تو فوراً تم سے ملنے آ گیا۔ تم لوگ یہ اخروٹ اور شہتوت کھاؤ۔“ ناشتے میں یہ دونوں چیزیں بھی تھیں۔ اتنے مزے دار شہتوت اور اخروٹ تمہیں ہمارے علاقے کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتے۔“

بابا بھی کھڑے ہوئے شیراز ادا صدف بولی۔ ”میں جب پہلی بار یہاں آئی تھی تو میں نے اخروٹ اور شہتوت بہت کھائے تھے۔“

ناشتے کے بعد غیلاری دو ایک باتیں کر کے رخصت ہو گیا۔

”میری خواہش تھی کہ میں یہاں کچھ دن اور گزاروں۔“ شیراز بولا۔ ”یہ علاقہ اور یہاں کے رہنے والے مجھے بہت پیار سے لگے ہیں۔ ایک الگ ہی کچھ ہے ان کا لباس و دیکھو تو انوکھا۔ ہرے نیلے رنگ کے کپڑے اور ان پر سپیایاں، ٹوپی بھی خوب ہوتی ہے۔ علاقہ بھی سرسبز ہے بے حد۔ صنوبر کے درخت ہی درخت۔“

”چلو..... حالات ٹھیک ہونے کے بعد یہاں آتے رہنا۔“ صدف ہنس کر بولی۔

شیراز اسے غور سے دیکھنے لگا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“ وہ پھر بھی۔

”تمہاری زندگی خطرے میں ہے اور تم اس طرح ہنس بول رہی ہو جیسے یہ عام حالات ہوں۔“

”تو کیا آدی کو مرنے سے پہلے مر جانا چاہیے؟“

صدف مسکرائی۔ ”اور پھر میری وجہ سے تم بھی خطرے میں

رہنا۔“

”مجھے اپنی بات کرنے دو شیراز! صدف بولی اور پھر غیلاری سے مخاطب ہوئی۔ ”مجھے کب واپس جانا چاہیے؟“

”پیاری لڑکی! غیلاری مسکرایا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ زیادہ پریشان نہیں ہو اس بات سے کہ کچھ لوگ تمہاری جان کے دشمن ہو گئے ہیں۔“

”ہاں بابا! مجھے کسی بات سے خوف نہیں آتا۔ بس

نے ان کی پریشانی دور کر دی۔“

”یہاں ایسے کارکن ہیں جو کھوپڑی میں دھات کے دانٹ فٹ کر سکیں؟“

”نہیں۔“ اس مرتبہ غیلاری نے اسے جواب دیا۔ ”اس کے لیے کھوپڑی تمہاری دغا کے کی ترقی یافتہ ملک میں لے جانی پڑتی ہے۔ ہمارے کئی بزرگ دغاگانی کی کھوپڑی لے کر وہاں جا چکے ہیں۔ مجھے یہ اعزاز اب تک حاصل نہیں ہوا۔“

”اسی لیے آپ نے مجھے یہاں بلایا تھا۔“ صدف مسکرائی۔ ”آپ چاہتے تھے کہ میں دغاگانی کی کھوپڑی میں پانچواں دانٹ لگوں اس بات پریشانی سے نجات حاصل کر لوں؟“

”ہاں۔“ غیلاری نے کہا۔ ”فوری طور پر میرے دماغ میں یہی خیال آتا تھا لیکن پھر یہاں حالات کچھ بدل گئے۔ میرے لیے ممکن نہیں رہا کہ میں ہفتے بھر کے لیے بھی معبد سے غیر حاضر رہ سکوں اور دغاگانی کی کھوپڑی صرف میں ہی یہاں سے لے جاسکتا ہوں۔“

”تو پھر آپ نے میرے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”تمہیں واپس جانا ہوگا۔“ غیلاری نے کہا۔ ”سیف جان کے ذریعے تمہاری حکومت کو آگاہ کر دیا جائے گا کہ تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ اس طرح سرکاری طور پر تمہارے دشمنوں کا بھی سراغ لگائیں گے۔ اس کے علاوہ میں بھی بہر حال تمہاری طرف سے غافل نہیں رہوں گا۔“

”یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے۔“ شیراز نے سر ہلایا۔

”ابتداء میں ہی یہ قدم اٹھایا جانا چاہیے تھا۔“

”میری خواہش تھی کہ مجھے دغاگانی کی کھوپڑی میں پانچواں دانٹ لگوانے کا اعزاز حاصل ہو جائے۔“

”آپ نے وہ کھوپڑی میرے خیالوں میں کیسے پہنچا دی تھی؟“

”وہ دغاگانی کی کھوپڑی نہیں، اس کا ٹکس ہوتا ہے۔ میں نے ایک محل کے ذریعے یہ طاقت حاصل کی ہے کہ دغاگانی کی کھوپڑی کے ٹکس کے ذریعے کسی سے بھی بات کر سکوں۔“

”مجھے اپنی بات کرنے دو شیراز! صدف بولی اور پھر غیلاری سے مخاطب ہوئی۔ ”مجھے کب واپس جانا چاہیے؟“

”پیاری لڑکی! غیلاری مسکرایا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ زیادہ پریشان نہیں ہو اس بات سے کہ کچھ لوگ تمہاری جان کے دشمن ہو گئے ہیں۔“

”ہاں بابا! مجھے کسی بات سے خوف نہیں آتا۔ بس

نے ان کی پریشانی دور کر دی۔“

”یہاں ایسے کارکن ہیں جو کھوپڑی میں دھات کے دانٹ فٹ کر سکیں؟“

”نہیں۔“ اس مرتبہ غیلاری نے اسے جواب دیا۔ ”اس کے لیے کھوپڑی تمہاری دغا کے کی ترقی یافتہ ملک میں لے جانی پڑتی ہے۔ ہمارے کئی بزرگ دغاگانی کی کھوپڑی لے کر وہاں جا چکے ہیں۔ مجھے یہ اعزاز اب تک حاصل نہیں ہوا۔“

”اسی لیے آپ نے مجھے یہاں بلایا تھا۔“ صدف مسکرائی۔ ”آپ چاہتے تھے کہ میں دغاگانی کی کھوپڑی میں پانچواں دانٹ لگوں اس بات پریشانی سے نجات حاصل کر لوں؟“

”ہاں۔“ غیلاری نے کہا۔ ”فوری طور پر میرے دماغ میں یہی خیال آتا تھا لیکن پھر یہاں حالات کچھ بدل گئے۔ میرے لیے ممکن نہیں رہا کہ میں ہفتے بھر کے لیے بھی معبد سے غیر حاضر رہ سکوں اور دغاگانی کی کھوپڑی صرف میں ہی یہاں سے لے جاسکتا ہوں۔“

حقانیت کا بندوبست کیا گیا ہے۔ آئی جی کو تمہاری کار کا نمبر بتادیا گیا ہے۔

”تب ٹھیک ہے ورنہ میں تمہاری تہائی کی وجہ سے پریشان رہتا۔“ شیراز نے کہا پھر یوں۔ ”جب تم حاکم جادو بتادینا۔ ڈرائیونگ سیٹ میں سنبھال لوں گا۔“

صدف نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

تین گھنٹے بعد ڈرائیونگ سیٹ شیراز نے سنبھال لی۔

صدف اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔

”پچھلی سیٹ پر جا کے لیٹ جاؤ۔“ شیراز نے کہا۔

”اتنی محنت بھی نہیں ہوتی ہے۔“

”جب دماغ کسی الجھن کا شکار ہو تو تھکن کا احساس نہیں ہوتا۔“ شیراز نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم کافی الجھی ہوئی ہو۔“

”یہ بات مجھے زیادہ الجھ رہی ہے کہ کوئی ایک مجھے ختم کرنا چاہتا ہے اور کوئی دوسرا مجھے بچانے کے لیے مستعد ہے۔“

شیراز نے سر ہلادیا۔

رات ہو چکی تھی۔ اندھیرے میں اوپر سے نیچے

یا نیچے سے اوپر جاتا ہوا راستہ پہاڑ کے گرد گردش میں نظر آتا

ہے۔ گاڑیوں کی روشنیوں اور بھی دکھائی دیتی ہیں اور نیچے

بھی لیکن دن کی نسبت رات کے وقت ٹریفک کم ہو جاتا

ہے۔ اس خیال کا اظہار شیراز نے بھی کیا۔

”ہاں۔“ صدف نے کہا۔ ”لوگ احتیاطاً رات کے وقت کم سفر کرتے ہیں۔ خصوصاً برف باری کے موسم میں تو بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”موسم سے دور ہیں۔“

”یہ اچھا ہی ہے، کسی پریشانی میں نہیں پڑے۔“

رات کے وقت یہاں لگتا بہت اچھا ہے۔ دن میں تو دکھائی

نہیں دیتا لیکن رات کے وقت ہیڈ لائٹس کی وجہ سے پتا چلتا

رہتا ہے کہ ہمارے اوپر کے راستے پر کتنی گاڑیاں رواں

دواں ہیں اور نیچے کتنی ہیں۔ اس وقت دو گاڑیاں اوپر

دکھائی دے رہی ہیں۔ تین گاڑیاں نیچے ہیں۔ نیچے والی دو

گاڑیاں نیچے جا رہی ہیں۔ ایک اوپر آ رہی ہے۔ جو گاڑیاں

اوپر ہیں، اگر ان کی رفتار ہم سے زیادہ تیز ہو تو وہ جلد ہی

ہمیں اپنے پیچھے نظر آئیں گی۔“

”اور جو اوپر آ رہی ہے، وہ ہمارے سامنے آ جائے

گی۔ اس وقت بہت محتاط رہنا ڈرائیونگ میں۔“ بعض جگہ

راستہ بہت تنگ ہوتا ہے۔“

”دیکھ چکا ہوں میں۔“

اسی وقت انہیں فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ

دونوں چونک گئے۔ پھر انہوں نے ایسی آواز سنائی جیسے

کوئی بہت بڑا پتھر لڑھکاتا ہوئے آ رہا ہو۔

چاندنی رات ہونے کی وجہ سے شیراز اور صدف نے

پتھر دیکھ لیا۔ وہ خاصا بڑا پتھر تھا جو ان کی گاڑیاں کو بھل بھی

سکتا تھا۔

”بریک لگاؤ۔“ صدف تیزی سے بولی۔

شیراز اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی بریک لگا

چکا تھا لیکن نیچے جاتی ہوئی گاڑی میں فل بریک لگا گاڑی

کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ اسی لیے شیراز نے اس

طرح بریک لگا یا تھا کہ گاڑی کی رفتار کم ہوتی چلی گئی۔

گولیاں چلنے کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔

پہاڑ پر ایسی آوازوں کی گونج ایسی ہوتی ہے کہ فائرنگ

کی سمت کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہوتا لیکن گولیاں چلنے سے جو

شعلے چمک رہے تھے، وہ اوپر دکھائی دے رہے تھے۔

جو دو گاڑیاں اوپر تھیں، وہ اب دکھائی نہیں دے رہی

تھیں۔ غالباً ان کی ہیڈ لائٹس بجھا دی گئی تھیں۔ لیکن ممکن تھا

کہ انہی گاڑیوں میں سے لوگوں نے ایک دوسرے پر

گولیاں چلائی شروع کی ہوں۔

جو پتھر اوپر سے لڑھکاتا ہوا نیچے آ رہا تھا، وہ ان کی

گاڑی سے خاصا آگے راستے پر گر گیا۔ اب شیراز، گاڑی

روک چکا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو چکی تھیں۔

”کیا یہ پتھر ہماری گاڑی کو کھینچنے کے لیے لڑھکایا گیا

ہوگا؟“ وہ بولا۔

”اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“ صدف

نے کہا۔ ”شاید یہ مجھے ختم کرنے کی تیسری کوشش تھی۔“

شیراز نے اس وقت دیکھا کہ صدف نے اپنا

ریوالور نکال لیا تھا اور بہت چوکنا نظر آ رہی تھی۔

”یہ جو فائرنگ ہے۔“ وہ پھر بولی۔ ”یہ شاید وہ لوگ

ہوں گے جن میں سے ایک مجھے ختم کرنا اور دوسرا مجھے بچانا

چاہتا ہے۔ اس پتھر کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں ہمیں

گاڑی روکنا پڑے۔ آگے جو شیراز! ہمیں یہاں رکتا

نہیں چاہیے۔“

اس وقت فائرنگ کی آوازیں آئی بند ہو چکی تھیں۔

شیراز گاڑی کو پھر حرکت میں لے آیا۔ پتھر.....

راستے کے کنارے پر تھا۔ اگرچہ میں ہوتا تو گاڑی آگے

نکلنا مشکل ہو جاتا۔

”یہ صورت حال تو بڑی سنسنی خیز ثابت ہوئی ہے۔“

حریف

اس مرتبہ شیراز کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”ممکن ہے کہ اوپر اب دو ایک لائٹیں بھی پڑی ہوئی

ہوں۔“ صدف بولی۔ ”اتنی شدید فائرنگ ہوئی تھی۔“

”اور ہلاک ہونے والے دونوں ہی طرف کے لوگ

ہو سکتے ہیں۔“

اسی وقت شیراز کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔

صدف جلدی سے بولی۔ ”تم اسٹیرنگ دونوں

ہاتھوں سے سنبھالے رکھو۔ میں دیکھتی ہوں۔“ صدف نے

اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکال لیا۔

”اچھا نمبر۔“ صدف اسکرین پر نظر ڈالتے ہوئے

بڑبڑائی۔

”دیکھو تو، کون ہے۔“

صدف نے کال ریسپنڈ کی لیکن خاموش رہی۔ وہ پہلے

دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز سننا چاہتی تھی۔

”ہیلو! ایک بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔“

”شیراز..... ہیلو!“

”کون ہیں آپ؟“ صدف نے پوچھا۔

دوسری طرف چند لمبے سکوت رہا پھر آواز آئی۔

”آپ صدف بول رہی ہیں؟“

”آپ کون ہیں؟ مجھے کیسے جانتے ہیں؟“ صدف

نے پوچھا۔ اس نے موبائل کا ایکسچینج کر دیا تھا تا کہ شیراز

بھی وہ باتیں سن سکے۔

موبائل پر آواز آئی۔ ”میں وہی ہوں صدف بی بی

جس نے آپ کے دوست کو آپ کے دشمنوں سے چھڑایا

تھا۔ ان کا موبائل ہم نے آپ کے دشمنوں سے واپس لیا تھا

تو دیکھ لیا تھا کہ اس کا نمبر کیا ہے۔ میں آپ کے پیچھے آ رہا

ہوں۔ جو پتھر آپ کے راستے میں آ کر گر رہا ہے، وہ انہی

لوگوں نے گرایا تھا جو آپ کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔

میں نے اور میرے ساتھیوں نے انہی لوگوں پر فائرنگ کی

تھی۔ پھر ان لوگوں نے بھی گولیاں چلائی شروع کر دیں

لیکن ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے البتہ ان میں سے

دو مارے جا چکے ہیں۔ باقی دو اپنی گاڑی چھوڑ کر کسی طرف

بھاگ چکے ہیں۔ میں نے فون یہ کہنے کے لیے کیا ہے کہ

آپ دونوں تیزی سے نکل جانے کی کوشش کیجیے۔ لیکن

ہے کہ آپ کے دشمن دوسرا ناگائے بیٹھے ہوں۔“

”ہم آگے نکل چکے ہیں اور نکل رہے ہیں لیکن آپ

کون ہیں؟ آپ کو اس سے کیا وچہسی ہے کہ میں خطرے میں

ہوں یا نہیں؟“

صدف کو اپنی اس بات کا جواب نہیں ملا۔ دوسری

طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔

صدف نے موبائل بند کرتے ہوئے سوالیہ نظروں

سے شیراز کی طرف دیکھا۔ ”یہ آواز۔“ شیراز سوچتے ہوئے

بولا۔ ”میرا خیال ہے اسی آدمی کی گھنٹی گونج نے مجھے

بچایا تھا، زیادہ تر یہی بول رہا تھا اس وقت۔ اس نے اپنی

آواز بھی بدلی تھی۔ فون پر اور زیادہ بدلی ہوئی تھی لیکن مجھے

بڑی حد تک یقین ہے کہ یہ وہی تھا۔“

”اس کا نمبر تو آ گیا ہے تمہارے موبائل پر۔ کسی

وقت اس سے دوبارہ بات کی جاسکتی ہے۔“ صدف نے

سوچتے ہوئے کہا۔ ”کسی طرح معلوم ہو کہ یہ کون ہے۔“

”تم اس صورت حال سے کھل آئے کے بعد بھی

پر سکون نظر آ رہی ہو۔“ صدف جھنجھکیاں گئی۔

”کتنی بار کر دو گے اس قسم کی باتیں؟..... تمہیں کبھی

اندازہ نہیں ہو سکا کہ خوف مجھ سے ہمیشہ دور رہتا ہے۔“

”تو اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے یارا۔“

”بار بار یہ باتیں مت کیا کر دو۔“

”اچھا سہ کار۔“

صدف نے موبائل اس کی جیب میں واپس رکھنے

سے پہلے کال کرنے والے کا نمبر اپنے موبائل میں ”فینڈ“

کر لیا۔

پشاور پینتے تک ان دونوں کا موضوع، صدف کی زندگی

کو خطرات اور اس کے ”نامعلوم“ دشمن اور دوست ہی رہے۔

پشاور کی حدود میں داخل ہونے کے بعد انہیں یہ

احساس بھی ہو گیا کہ ان کے پاس سے آتی جاتی ہوئی

گاڑیوں میں پولیس کے سادہ لباس والے ہو سکتے تھے۔

شیراز کے گھر پہنچنے کے بعد صدف دہاں سے اپنی کار

لے کر فوراً ہی روانہ ہو جاتا جانتی تھی لیکن شیراز نے اصرار

کر کے اسے جانے کے لیے روک لیا۔ رات کا کھانا وہ

راستے ہی میں کھا چکے تھے۔

چائے پیتے ہوئے شیراز نے پوچھا۔ ”تم آئی جی کے

گھر پہنچو کیسے؟ کیا پتا بھی بتا دیا گیا ہے؟“

”ہاں، اور بہت آسان پہلے۔ آسانی سے پہنچ

جاؤں گی۔“

☆☆☆

صدف کا خیال درست بھی ثابت ہوا۔ چائے پینے

کے بعد وہ شیراز کے گھر سے اپنی کار میں روانہ ہوئی تو

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

پھلپھری

قابل علاج مرض ہے

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

اجمل زیدی کے لئے ریویا کسٹن کا مستقل ریویر



اسلام آباد

کان پیر 62، سڑک نمبر 20، ٹکرا G-8
سرگودھا (ضلع) پاکستان
فون: (051) 32331725
موبائل: 0300-8566188
ٹیکس: 2281538

**ASIAN EXCELLENCE
PERFORMANCE AWARD**



**AWARD
PILLAR OF LEUCODERMA**

لاہور

پشاور

کلف سینٹر

14- فروری تا 27 فروری

آئس: نمبر 18
فیروز پور، راجستھان

14- جون 27ء جون

4301-27 to 4301-14

پیشکش

یکم فروری ۱۹۱۵ فروری

فیصل آباد نزد بھٹری چوک پتہ ۱۰
فون: ۰۵۲۱۱۲۲۱۵۲۱۵

کیم جون ۱۱۵ جلد

0300-8568188: سہیل

ملتان

کراچی

پیش نظر

28 مارچ 64ء - اپریل

تہ سہ روزہ خدہ ک عزیز ہر گلستان
(1991) 4518091 62

28 جولائی 67- اگست

28 نومبر 75ء

ارچون سیر

6427664-13

سری سٹاپ 42 مل K.F.C کراچی

13- جرحہ کی 27 جرحہ کی

0300-8566188

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

کہا۔ ”آپ کسی پر مشغول نہیں کر رہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی سے آپ کی فکری یا سیاسی معاملے میں مخالفت نہیں ہے۔“

”درست خیال ہے آپ کا۔ میرے صرف دوست ہیں، دشمن کوئی نہیں ہے۔ میں حیران ہوں کہ میری جان کا دشمن کون ہو گیا ہے اور کیوں ہو گیا ہے۔“

”خیر! فی الحال آپ کی حفاظت کا بندوبست تو میں نے فوراً ہی کر دیا تھا۔ اس معاملے کی تفتیش کے لیے انسپکٹر آصف کو بھی سب کچھ بتا دیا ہے۔ وہ کل کسی وقت آپ سے ملاقات کرے گا۔ فون کر کے آئے گا۔ فی الحال میں نے ایک اور افسر کو روک رکھا ہے۔ وہ ایک موہا بل میں آپ کی گاڑی کے پیچھے آپ کے گھر تک جائے گا۔ آپ اپنے گھر ہی جا چکیں گی نا؟“

”کیا آپ کے خیال میں مجھے گھر نہیں جانا چاہیے؟“
 ”یہ مطلب نہیں تھا میرا۔“ آئی جی نے کہا۔
 رورڈی میں پوچھ بٹھا۔ میں آپ کے والد کو فون کر کے ان
 سے کہوں گا کہ وہ آپ کو آپ کی واپسی سے آگاہ کر دیں
 تاکہ اس رپورٹ پر کام نہ کیا جائے جو انہوں نے کی ہے۔“
 ”تھنک“

”مجھے مختصر طور پر جو کچھ معلوم کرنا تھا، وہ میں نے معلوم کر لیا۔ اب آپ جاسکتی ہیں!“

”ابھی آپ نے بتایا تھا کہ آپ نے کسی پولیس آفیسر کو روک رکھا ہے جو.....؟“

”وہ بارہ پولیس موبائل ہی میں بیٹھا ہے۔ آپ اپنی گاڑی میں روانہ ہوں گی تو موبائل آپ کے پیچھے چل پڑے گی۔ میں نے اس کا بندوبست کروایا ہے کہ ہر وقت ایک موبائل آپ کے ساتھ رہے۔“

”بہت شکریہ۔“ صدف ٹکڑی ہونے لگی۔

جب وہ آئی جی کے صر سے روانہ ہوئی تو اس کے
 دیکھ لیا کہ ایک پولیس مو بائل اس کے پیچھے آ رہی تھی۔
 اب صر ف کو سوجایا تھا کہ اشرف خاں اور ول شاد
 خانم سے کیا بات کرے گی۔ خاص طور سے ول شاد خانم تو
 اس پر بہت بڑبڑائیں کہ وہ کچھ بتائے بغیر غائب ہوئی تھی۔
 وہ گھر پہنچی تو اسے فوری طور پر تعجب ہوا کہ وہ دونوں
 ڈرائنگ روم میں اس کے منتظر تھے۔

”آپ دونوں اتنی جلدی تو نہیں اٹھتے۔“
 ”آئی جی کافون آیا تھا ابھی۔“ اشرف خاں نے
 اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”اس کے بعد ہی میں نے تمہاری
 ماں کو جگا دیا ہے حالانکہ یہ گھٹنا بھر پہلے ہی سوئی تھیں۔“

آوھے گھٹنے کے اندر اندر بڑی آسانی سے آئی جی کی گھر پہنچ گئی۔

فلپاری کے کہنے کے مطابق آئی جی اس کا منتظر تھا۔

”میرا خیال تھا بے کہ آپ آدھے گھٹنے پہلے آجائیں گی۔“

”راستے میں کچھ گڑبڑ ہوئی تھی جس کی وجہ سے آپ کا اندازہ غلط ہو گیا۔“

”کیا ہوا؟“

”پچھلی بائیں تو آپ کو سیف جان سے معلوم ہو چکی ہو گی۔“

”ہاں۔“ آئی جی نے کہا۔ ”مجھے تفصیل سے سب کچھ بتایا جا چکا ہے۔“

”یہاں آتے ہوئے مجھ پر ایک بار پھر حملے کی کوشش کی گئی تھی۔“

”کیسے؟“ آئی جی نے تیزی سے پوچھا۔

”صدف نے وضاحت سے سب کچھ بتایا۔“

آئی جی بولا۔ ”آپ کو بالکل اندازہ نہیں کہ آپ کا مددگار کون ہے؟“

”بالکل نہیں ہے۔“

”اور جو آپ کا دشمن ہو گیا ہے، اس کے بارے میں بھی آپ کسی پر شبہ ظاہر نہیں کرنا چاہئیں!“

”جی۔“

”ایسی صورت میں تحقیق آگے بڑھانا خاصا دشوار ہوگا۔ یہ بات تو غالباً آپ کے علم میں نہیں ہوگی کہ آج آپ کے والد اور والدہ نے پولیس میں آپ کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی ہے؟“

”جی بالکل۔“ مجھے علم کیسے ہو سکتا تھا!“

”آپ نے اپنے والدین کو بھی نہیں بتایا تھا کہ آپ کا لاش واوی جارہی ہیں۔ اس کی کوئی وجہ؟“

”اچانک فیصلہ کیا تھا میں نے وہاں جانے کا۔“

صدف نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ اسے کیا بتانا ہے اور کیا نہیں بتانا۔

”اس کے باوجود۔“ آئی جی نے کہا۔ ”آپ انہیں فون پر بتا سکتی ہیں۔“

”میں انہیں فون پر اطلاع دینے والی تھی کہ مجھے ایک خیال آ گیا۔ یعنی میرا دشمن کوئی ایسا باسورغ شخص بھی ہو سکتا ہے جو کچھ میری لوکیشن معلوم کر لے۔“

آئی جی نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے

پریشان کر دیا تم نے۔ آخر کہاں غائب ہو گئی تھیں؟“ آخری فقرہ کہتے ہوئے اشرف خاں کے لہجے میں سختی آگئی تھی۔

”میں کالاں وادی چلی گئی تھی۔ چاہے پروگرام بنایا تھا۔“

”فون بھی نہیں کر سکتی تھیں؟“ دل شاد خانم بھٹ پڑیں۔

”جہیں اتنی آزادی اس لیے تو نہیں دی گئی تھی۔“

”آئی ایم سوری ماما! صدف نے وہی آواز میں کہا۔

”نیند خراب ہو گئی میری۔ صبح بات کروں گا اب تم سے!“

”اشرف خاں نے کہا اور ڈرائنگ روم سے جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

”نیند۔“ دل شاد خانم نے ترشی سے کہا۔ ”نیند اب کیا خاک آئے گی۔“

”مجھے آپ سے کچھ بات کرنا ہے ماما!“ صدف کھڑی ہو گئی۔ ”پلیز! میرے کمرے میں چلیے۔ ناراض ہیں آپ مجھ سے۔ میں آپ کی ناراضگی دور کر دوں گی۔“

دل شاد خانم نے فوراً اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ سوچتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔

صدف انہیں اپنے کمرے میں لے آئی اور انہیں بڑی محبت سے اپنے بستر پر بٹھا کر خود ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

”خوشامد سے میری ناراضگی ختم نہیں ہو جائے گی۔“

دل شاد خانم نے کہیں۔

”یہ خوشامد نہیں ہے ماما! میری جگہ آپ کے قدموں ہی میں ہے۔ میں آپ سے پہلے صرف یہ سوال کروں گی کہ..... کیا آپ چاہتی ہیں کہ آپ کی بیٹی اس دنیا میں نہ رہے؟“

”کیا مطلب؟“

”میری زندگی خطرے میں ہے ماما۔“

دل شاد خانم چونک پڑیں۔ ”یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟“

”میں مذاق نہیں کر رہی ہوں ماما!..... میں اپنی حفاظت ہی کے لیے کالاں وادی چلی گئی۔“

”وہاں کیوں..... اور تمہارا دشمن کون ہے؟“

”یہ تو میں نہیں جانتی اور یہی جاننے کے لیے کالاں وادی چلی گئی لیکن غیلا ری بابا نے میرے دشمن کی نشاندہی نہیں کی۔ بس میری حفاظت کا بندوبست کر دیا۔“

”کالاں وادی کے اس بوڑھے کے بارے میں تم پہلے بھی بتا چکی ہو اور دیکھو کسی انسان کی ایسی طاقتوں پر یقین نہیں ہے۔“ دل شاد خانم نے کہا۔ ”مجھے یہ بتاؤ کہ تمہاری دشمنی کس سے ہوئی ہے؟“

”مجھے تو یاد نہیں کہ میں نے کسی کو اپنا دشمن بنایا ہو۔“

”کہیں تم..... کسی کے راز سے تو واقف نہیں ہوئی ہو؟“

صدف نے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ وہی آواز میں کہا۔ ”جی۔“

”کس کے؟“ دل شاد خانم نے جلدی سے پوچھا۔

صدف ان کے سوال پر دھیان دے بغیر بولی۔ ”لیکن میں نہیں مان سکتی کہ وہ شخص میری جان کا دشمن ہو سکتا ہے۔“

”آخر وہ ہے کون؟“

صدف نے پھر ہچکچاہٹ کے بعد جواب دیا۔ ”جس شخصیت کے ایک راز سے میں واقف ہو گئی ہوں، اسے آپ بھی جانتی ہیں۔“

”میں بھی جانتی ہوں؟“ دل شاد خانم نے چونک کر کہا، پھر کچھ اس طرح غصی سانس لی جیسے صدف کا اشارہ سمجھ گئی ہوں، تاہم سپاٹ سے لہجے میں پوچھا۔ ”کون ہے وہ؟“

”بابا۔“ صدف نے اب بھی وہی آواز میں کہا۔

”لیکن میں اس معاملے میں شدید الجھن کا شکار ہوں۔ کوئی باپ اس طرح اپنی اولاد کا جانی دشمن کیسے ہو سکتا ہے!“ پھر وہ حیرت سے بولی۔ ”ماما! میرا خیال تھا کہ آپ بابا کا نام سن کر چونک جائیں گی لیکن.....“ وہ رکی۔ ”کیا آپ بھی ان کے اس راز سے واقف ہیں؟“

”ہاں۔“ دل شاد خانم نے غصی سانس لی۔

”اور..... اور..... اور.....“ صدف فیصلہ نہیں کر سکی کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔

”میرے مقدّم میں یہی لکھا ہے۔“ دل شاد خانم نے کھوئے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ”مگر میں ہر کچھ ہوں۔“

”اوہ!“ صدف ماں کا منہ کھتی رہ گئی۔

دل شاد خانم کچھ توقف سے بولیں۔ ”کالاں وادی تم اسی شخص سے ملنے گئی تھیں جس کے بارے میں تمہارا خیال ہے کہ وہ پر اسرار قوتوں کا مالک ہے؟“

”جی۔“

”تمہارا خیال تھا کہ وہ جہیں بچا لے گا..... یا بچا سکتا ہے؟“

”جی ماما! مجھے خطرے سے بھی انہوں نے ہی آگاہ کیا تھا۔ بعد میں ان کی بات سچ بھی ثابت ہوئی۔ میری جان لینے کے لیے تین کوششیں کی جا چکی ہیں۔“

صدف نے وہ سب کچھ بھی بیان کر دیا جو کچھ اس کے ساتھ پیش آ چکا تھا۔ یہ بھی بتایا کہ بنیان غیلا ری نے اسے خطرے سے کس طرح آگاہ کیا تھا پھر بولی۔ ”اب میری دوسری الجھن یہ بھی ہے کہ مجھے بچانے کی کوشش کرنے والے کون لوگ ہیں۔“

”اب تو یہ سب کچھ شاید پولیس ہی معلوم کر سکے گی۔“

”مجھے اس پر یقین نہیں ہے ماما کہ بابا میری زندگی ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے اب مجھے یہ پریشانی بھی ہے کہ پولیس نے بابا کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا تو انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ آپ انہیں سمجھائی کیوں نہیں ماما کہ وہ یہ سارے کام چھوڑ دیں۔“

”کرنا چاہتی ہوں بات! کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اب میں جا کر سوؤں گی۔ تم بھی سو جاؤ۔ رات بھر کی جاگی ہوئی ہو۔“

صدف کچھ نہیں بولی۔ دل شاد خانم اس کے کمرے سے چلی گئیں۔ ساری رات جاگنے کے باوجود صدف کو کچھ دیر سے ہی نیند آئی۔ دوسری صبح وہ جاگی بھی دیر سے۔

”تمہارے باپ نے تمہارے جاگنے کا انتظار نہیں کیا۔“ دل شاد خانم نے اس سے کہا۔ ”ناشا کر کے دفتر چلے گئے۔“

”مگر رات انہوں نے کہا تھا کہ مجھ سے صبح بات کریں گے!“

”اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ جو کچھ تم مجھے بتا چکی ہو، وہ سب میں نے انہیں بتا دیا ہے۔“

”پھر کیا بولے؟“

”کچھ نہیں۔ ایک جملہ بھی نہیں کہا۔ دفتر چلے گئے۔“

اسی دوران صدف کے موبائل کی گھنٹی بجی..... اس نے کال ریسیو کی۔ کال کرنے والا انسپکٹر آصف تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ آئی جی کی ہدایت کے مطابق صدف سے ملنا چاہتا ہے۔

”میں گھر پر ہی ہوں۔“ صدف نے اس سے کہا۔

”آجائے!“ پھر اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

”کسے بلایا ہے؟“ دل شاد خانم نے پوچھا۔

صدف نے انہیں انسپکٹر آصف کے بارے میں بتا دیا۔

”کیا بیان دو گی اسے؟“ دل شاد خانم نے پوچھا۔

”جو وہ پوچھنا چاہے گا، وہ بتا دوں گی لیکن یہ بہر حال نہیں بتاؤں گی کہ میں بابا کے کسی راز سے واقف ہوئی ہوں۔ پولیس خود کچھ معلوم کر سکے تو کر لے۔ میں بابا کی گرفتاری میں فریق نہیں بننا چاہتی حالانکہ بابا کو میں نے یہی تاثر دیا تھا کہ میں اس سلسلے میں اپنی زبان بند نہیں رکھ سکتی۔“

دل شاد خانم کا چہرہ سپاٹ رہا۔

”میں منٹ بعد ہی انسپکٹر آصف آ گیا۔ صدف سے اس کی گفتگو ڈرائنگ روم میں ہوئی۔ اس کے سوال جواب

حوریف

میں صدف نے وہی سب کچھ بیان کر دیا جو وہ آئی جی سے کہہ چکی تھی۔

”آپ کسی پر بھی شبہ کا اظہار نہیں کر رہی ہیں۔“ انسپکٹر آصف نے کہا۔ ”یہ ممکن نہیں کہ کوئی بلاوجہ کسی کی جان لینا چاہے۔“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔“

”آپ اپنے دماغ پر زور دیجیے۔ میں کھوپڑی والی بات کی طرف تو نہیں جاؤں گا لیکن آپ اس پر غور کیجیے کہ جب آپ کو کوئی بھی وجہ سے خطرے کا احساس ہوا اور آپ نے کالاں وادی جا کر مدد لینے کا فیصلہ کیا، اس سے پہلے چوبیس گھنٹے کا وقت آپ نے کیسے گزارا تھا۔ اس دوران میں کیا کچھ دیکھا اور کیا کچھ سنا تھا۔ بھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ دیکھتا یا سنتا ہے، اس کے خیال میں وہ کوئی خاص بات نہیں ہوتی اس لیے وہ اس کے لاشعور میں چلی جاتی ہے لیکن کسی اور کے لیے یہ خطرناک بات ہو جاتی ہے کہ وہ کچھ کسی کے علم میں آ گیا جو نہیں آنا چاہیے تھا اور جس کی وجہ سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اسی لیے وہ اس کا دشمن بن جاتا ہے جو اس کے بارے میں کوئی خاص بات جان گیا ہو۔“

ان باتوں سے صدف نے اندازہ لگا لیا کہ انسپکٹر آصف محض عام سا پولیس آفیسر نہیں بلکہ خاصا پڑھا لکھا اور سمجھدار شخص بھی ہے۔

”سمجھ رہی ہیں تانہ..... آپ میری بات؟“ انسپکٹر آصف قدرے توقف سے بولا۔

”جی۔“ صدف نے کہا۔ ”میں سوچوں گی، یاد کرنے کی کوشش کروں گی کہ میرے وہ چوبیس گھنٹے کس طرح گزرے تھے، میں نے کیا کیا دیکھا تھا یا کیا کیا سنا تھا۔“

”مگر ایسا کوئی معاملہ آپ کو یاد آ سکیا تو پولیس کے لیے آسانی پیدا ہو جائے گی۔“ انسپکٹر آصف نے کہا۔ ”کسی اور انداز سے سوچ بچار اور تفتیش میں دیر لگ سکتی ہے۔ خیر!“ اس نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر صدف کی طرف بڑھایا۔ ”آپ کو اگر کچھ یاد آ جائے تو مجھ سے رابطہ کیجیے گا۔ کارڈ پر میرے دفتر اور میرے موبائل کا نمبر موجود ہے۔“ اس کے ساتھ دو کھڑا ہو گیا۔

”بہتر ہے۔“

اسے رخصت کرنے کے بعد صدف اپنے کمرے میں آ گئی۔ اب اس نے شیراز سے رابطہ کیا۔ شیراز نے فوراً کال ریسیو کی۔

”میں رات سے ہی منتظر رہا ہوں تمہاری کال کا۔“

شیراز نے کہا۔ ”میں نے فون اس لیے نہیں کیا کہ تم سو رہی ہوگی۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھیں۔“

”جائے ہوئے تو تم بھی تھے۔“

”ہاں لیکن میں پتھر دے کے لیے سو گیا تھا اور میری آنکھ دو گھنٹے بعد کھل گئی تھی۔ خیر، چھوڑو یہ باتیں۔ اپنی سناؤ کیا گزری؟“

”کچھ خاص نہیں۔“ لیکن اس جواب کے باوجود صدف نے بے کم و کاست سب کچھ بیان کر دیا۔

”یہ اچھا ہوا۔“ شیراز نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے کہ ایک پولیس میں سو بائیں تمہاری حفاظت کے لیے ہر وقت موجود رہے گی۔“

”اس قسم کی حفاظت کو میں اطمینان بخش نہیں سمجھتی۔“ صدف نے کہا۔ ”تم بھی ایسی خبریں سننے اور پڑھتے رہے ہو کہ پولیس کی موجودگی میں لوگ قتل ہوتے رہے ہیں۔“

”وہ تو ہے، تاہم اس تذکرے سے دشمن کے لیے مشکلات بہر حال بڑھ جاتی ہیں اور ساتھ ہی خود بھی محتاط رہنا ضروری ہوتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ جب تک تمہارے دشمن کا پتہ نہ مل جائے تم خود کو گھر تک محدود رکھو!“

”اس طرح تو میرا دم گھٹ جائے گا شیراز!“

شیراز نے جلدی سے کہا۔ ”ابھی میں کہہ چکا ہوں کہ خود کو اپنے گھر تک محدود رکھو۔ کچھ تو احتیاط برتو!“

”اچھا!“ صدف نے طویل سانس لی۔ ”ٹھیک ہے۔ میں خود کو قیدی سمجھ لیتی ہوں۔“

”کچھ بھی سمجھ لیکن یہ ضروری ہے کہ گھر تک محدود رہو۔“

”اچھا بابا!“ صدف نے منہ بتایا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ اسے خود پر کچھ تعجب ضرور تھا کہ اسے خطرے کی پروا ہی نہیں تھی۔ اس نے اس بارے میں خود بھی سوچا تھا کہ یہ غیر فطری ہی بات تھی۔

شب دروز گھر میں رہنے کے خیال ہی سے اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ بستر پر پڑی اس معاملے پر غور کرتی رہی۔ اسے اب بڑی حد تک یقین ہو چکا تھا کہ کوئی باپ اپنی اولاد کی زندگی ختم کرنے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔ اسے شبہ اپنے باپ کے پانچ صدیق و زوار پر تھا لیکن پولیس کو وہ اپنے اس شبہ سے بھی آگاہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح پولیس اس کے باپ کے بارے میں بھی سب کچھ جان لے گی۔ اس صورت میں اشرف خاں کی گرفتاری بھی یقینی ہو جاتی۔

سارا دن ابھی اس میں موز گزرا۔ شام کو اس نے کچھ

دیر شیراز سے سو بائیں پر بات کی۔

رات کے کھانے کی میز پر اس کا سامنا اشرف خاں سے ہوا۔ اشرف خاں سر جھکائے کھانا کھاتا رہا۔ اس نے ایک بار بھی ایسے نہ دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ دل شاد خانم بھی خاموش رہیں۔ اس میز پر رات کا کھانا اتنی خاموشی سے پہلے کبھی نہیں کھایا گیا تھا۔

کھانے کے بعد اشرف خاں نے اپنے معمول کے مطابق ٹی وی لاؤنچ کا رخ کیا۔ اس موقع پر دل شاد خانم اور صدف بھی اس کے ساتھ ہوتی تھیں۔ اس موقع پر صدف نے فیصلہ کیا کہ اسے اشرف خاں سے بات کر لینی چاہیے۔ دل شاد خانم کی موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ صدف انہیں سب کچھ بتا ہی چکی تھی۔

”بابا!“ صدف بولی۔

اشرف خاں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے یقین ہے کہ آپ میری جان کے دشمن نہیں ہو سکتے لیکن مجھے ایک فیصل پر شبہ ہے۔ کیا میں آپ سے اس بارے میں بات کر سکتی ہوں؟“

”کس پر شبہ ہے تمہیں؟“ اشرف خاں نے پوچھا۔

”پہلے میں اپنے ایک سوال کا جواب چاہوں گی۔“

”پوچھو!“

”کیا آپ نے اپنے کاروباری شریک کار کو بتا دیا ہے کہ میں آپ کو لوگوں کے اصل کاروبار سے واقف ہو چکی ہوں؟“

”تمہارا اشارہ صدیق و زوار کی طرف ہے؟“

”جی۔“

”یہ سوال کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی تم نے؟“

”اگر آپ نے ان کو اس بارے میں بتا دیا ہے تو وہ میرے دشمن ہو سکتے ہیں۔“

”کیا تم اس بارے میں پولیس کو بتانا چاہتی ہو؟ یعنی صدیق و زوار پر شبہ کا اظہار کرنا چاہتی ہو۔“

”میں انہیں کا شکار ہوں۔ میں نے پولیس کو یہ بات بتا دی اور وہ حقیقت ثابت ہو گئی تو اس کے بعد آپ بھی پولیس کی نظر میں مشتبہ ہو جائیں گے۔ آپ کی گرفتاری کا بھی امکان پیدا ہو جائے گا۔“

اشرف خاں طنز پر انداز میں بولا۔ ”تمہیں یہ شبہ نہیں ہوا کہ میں تمہیں ختم کرنا چاہتا ہوں؟“

دل شاد خانم اس دوران میں بالکل خاموش رہی تھیں۔ وہ اب بھی خاموش رہیں لیکن اشرف خاں کے سوال پر غور سے صدف کی طرف دیکھنے لگیں۔

حریف

صدف بولی۔ ”میں صاف گوئی سے کہوں گی بابا کہ میں اس بارے میں بھی تذبذب کا شکار ہوں۔“

اشرف خاں کے چہرے پر غصے کے آثار ظاہر ہوئے اور پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر تیزی سے چلتا ہوا لاؤنچ سے نکل گیا۔

صدف نے نظریں جھکا لیں۔

”یہ کیا کہیں گیں تم!“ دل شاد خانم بولیں۔ ”تم نے ان سے یہ کہہ دیا کہ تمہیں ان پر شبہ بہر حال رہا ہے۔“

صدف اب بھی خاموش رہی۔

اس رات جب وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو اسے خود پر رونے آنے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ بے بسی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے شیراز کو فون کیا۔ وہ اپنا ذہن بنانا چاہتی تھی۔ اگر یہ مقصد نہ ہوتا تو بھی وہ شیراز کو فون کرتی۔ اسے بتانی کہ اشرف خاں سے کیا بات چیت ہو چکی ہے۔

کچھ دیر باتیں کر کے اس نے فون بند کیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ خاصی دیر بعد اسے نیند آ ہی تھی۔

نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا کہ اس نے خواب میں داکٹری کی کھوپڑی دیکھی اور اسے بیان غیاری کی آواز سنائی دینے لگی۔

”مجھے دیر سے معلوم ہوا کہ خطرہ تمہارے سر پر پہنچ چکا ہے۔ جاگ جاؤ!“

وہ فوراً جاگ گئی۔ بے اختیار اس کا ہاتھ ٹپکے کے نیچے گیا۔

ان دنوں وہ دروازے پر پہنچنے کے بجائے رکھ کر سونے لگی تھی۔

ریوانور اس کے ہاتھ میں آگیا لیکن اسی وقت کسی نے عقب سے اس کا منہ باندھا۔ منہ باندھے والے ہاتھ میں رد مال یا ایسی ہی کوئی چیز تھی جس سے ایک عجیب سی بو سانس کے ذریعے اس کے جسم میں گئی اور اس کے دماغ پر اندھیرا چھاتا چلا گیا۔

☆☆☆

شیراز کا معمول تھا کہ ناشتا کرنے کے بعد انٹرنیٹ پر کئی اخبارات کی خبروں پر اچھی سی نظریں ضرور ڈالتا تھا۔ اگر کوئی خاص خبر دکھائی دیتی تو توجہ سے پڑھ لیتا تھا۔ اس روز اس کی نظر ایک چھوٹی سی خبر پر پڑی اور اسے یوں لگا جیسے اس کے پیروں سے زمین نکل گئی ہو۔

خبر کے مطابق معروف بزنس مین اشرف خاں کی بیٹی صدف کو گزشتہ رات اس کی خواب گاہ سے اغوا کر لیا گیا تھا۔ پولیس اس معاملے کی تفتیش کر رہی تھی۔

خبر میں اس معاملے کی وضاحت نہیں تھی۔ غالباً اخبار

کی کاپی پر پس جاتے جاتے یہ خبر لی تھی، اسی لیے اسے مناسب جگہ بھی نہیں لگا یا جاسکتا تھا۔ صرف اشرف خاں کے نام کی وجہ سے شیراز کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔

جلدی سے سیٹ پر بند کر کے وہ تقریباً دوڑتا ہوا باہر نکلا اور کار میں بیٹھ کر تیز رفتاری سے صدف کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ کار کی رفتار کے ساتھ اس کا دماغ بھی ہوا میں اڑ رہا تھا۔

صدف..... صدف.....! صرف اس نام کی گونج پھیلی ہوئی تھی اس کے دماغ میں اور یہ سوال اسے سانپ کی طرح ڈس رہا تھا کہ کیا صدف کو مار دیا گیا ہوگا؟

نہیں، اس نے خود کو تسلی دی۔ وہ زندہ ہوگی۔ اسے ہلاک تو اس کی خواب گاہ میں بھی کیا جاسکتا تھا۔ اغوا کرنے کا مقصد کچھ اور ہی ہوگا۔

اسی سوچ بچار اور ذہنی اشتعال میں وہ صدف کے گھر پہنچ گیا۔ ڈرائنگ روم میں اشرف خاں اور دل شاد خانم، دونوں ہی موجود تھے۔ دل شاد خانم کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ دیر تک روتی رہی تھیں۔ اس وقت بھی ان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اشرف خاں کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہو۔

”یہ کیا ہوا ہے آئی؟ گھر میں یہ کیسے ہو گیا؟“ شیراز دل شاد خانم سے مخاطب ہوا۔ وہ اشرف خاں سے کم ہی بات کرتا تھا اور اس وقت تو اس کو یہ خیال بھی تھا کہ صدف کے اغوا میں اشرف خاں کے علاوہ کسی اور کا ہاتھ نہیں ہو سکتا تھا۔ صدف کی یہ بات اپنی اہمیت کھو چکی تھی کہ کوئی باپ اپنی بیٹی کا دشمن نہیں ہو سکتا۔

دل شاد خانم نے غصے سے فون کی آواز میں اسے بتایا۔

”وہ کئی تھے بیٹا! اب کے چہروں پر تھا میں تھیں۔ انہوں نے مجھے اور تمہارے انکل کو مضبوط ڈور یوں سے باندھ دیا تھا۔ وہ ہمیں کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہ اس کے بعد ہی صدف کے کمرے میں گئے ہوں گے۔ نہ جانے کیا گزری ہوگی اس کی پر.....!“ آخر میں ان کی آواز بھرا گئی۔

”پھر؟“ شیراز نے بے تابی سے پوچھا۔ ”آپ دونوں آزاد کیسے ہوئے؟“

اس مرتبہ دل شاد خانم سے بولا نہیں گیا۔ اشرف خاں نے جواب دیا۔ ”انہیں باندھتے ہوئے وہ لوگ کچھ جلدی کر گئے تھے۔ ڈوری کچھ طور پر نہیں باندھی گئی تھی۔ دس بارہ منٹ کی کوشش سے یہ خود کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئی تھیں، اس کے بعد انہوں نے مجھے ان ڈور یوں سے نجات

دلائی تھی۔ پھر فوراً ہی صدف کے کمرے کی طرف گئے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صدف موجود نہیں تھی۔ ”پھر..... پھر؟“ شیراز جلد از جلد سب کچھ جان لیتا چاہتا تھا۔

”پولیس کو فون کیا تھا میں نے!“ اشرف خاں نے ہی جواب دیا۔ ”یہ رات ڈیڑھ بجے کا وقت ہے۔ پولیس نے آکر ہر جگہ انگلیوں کے نشانات تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ انہوں نے ہمیں نہیں بتایا کہ انہیں کوئی نشان ملا تھا یا نہیں۔ چھبے کے قریب گئے تھے وہ لوگ یہاں سے۔“

”باہر ایک پولیس موبائل بھی تو کھڑی ہوگی۔“ شیراز نے کہا۔ ”صدف نے مجھے بتایا تھا کہ.....“

”سب پولیس والوں کو بے ہوش کر دیا گیا تھا۔“ اشرف خاں نے جواب دیا۔ ”ان کی گاڑی میں کسی قسم کی گیس کے دھیل جھینکے گئے تھے اور وہ گیس اتنی تیزی سے خارج ہوئی تھی کہ ان میں سے کسی کو بھی گاڑی سے باہر نکلنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ گھر کے ملازمین بھی ہمیں بے ہوش ہی ملے تھے۔“

شیراز اپنی پیشانی مسلتے لگا۔ اسے اشرف خاں پر غصہ آ رہا تھا جو اس وقت خود کو بہت پریشان ظاہر کر رہا تھا۔ شیراز کی دانست میں سب کچھ کھلا کر اسی کا تھا۔ شیراز نے اس وقت یہاں تک سوچا کہ وہ پولیس کو بتادے کہ صدف کو اپنے باپ کے بائیں میں ایک بجٹھی ”را“ سے تعلق کا علم ہو گیا تھا۔

صرف اشرف خاں ہی کا نہیں بلکہ صدیق و ذراغ بھی ”را“ کے لیے کام کر رہا تھا۔ ان دونوں کی مشترکہ دواساز کپنی محض دکھاوا تھی۔ شیراز نے یہ بھی سوچ لیا کہ وہ کتنی جلدی دوا میں بھی تیار کر سکتی تھی۔ ”را“ کے بجٹھی گسی سے کوئی بھی کام لے سکتے تھے۔ انہیں ”فٹنگ“ بھی دی ملک کرتا ہوگا۔

دل شاد خانم کی نظریں اس وقت اشرف خاں کی طرف تھیں۔

شیراز نے سوچتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ ”صدف کو ہلاک کرنے کے بجائے اسے اغوا کیا گیا۔ یعنی اس کے دشمن یا دشمنوں کے منصوبے میں کوئی تبدیلی آگئی ہے۔ ابھی تو صدف زندہ ہی ہوگی۔ اگر وہ لوگ اسے مارنا چاہتے تو یہیں مار دیتے، اغوا نہیں کرتے۔“ وہ یکا یک اشرف خاں کی طرف متوجہ ہوا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے اگلے؟“

”ہاں۔ یہ بات مجھ میں تو آتی ہے۔“ اشرف خاں نے کہا۔ ”مگر اسے کہ اب ان کا منصوبہ کچھ اور ہو۔“

”وہ کیا ہو سکتا ہے؟“ شیراز نے اشرف خاں کی

طرف غور سے دیکھا۔

”کیا تمہیں یہ سوال مجھ سے کرنا چاہیے؟“ اشرف خاں نے تیز لہجے میں کہا۔

شیراز نے دل میں کہا۔ ”کرنا تو آپ ہی سے چاہیے۔“ لیکن وہ یہ الفاظ زبان پر نہیں لاسکا۔ اس کا دل تو چادر ہاتھ کا اشرف خاں کو دھکی دے دے۔ اس سے کہہ دے کہ وہ جا کر سب کچھ بتا دے گا۔

لیکن اس نے یہ دھکی نہیں دی۔ فہم و فراست کا تقاضا یہی تھا کہ وہ کل سے کام لے۔ اشرف خاں کے گھر میں ہی بیٹھ کر اسے یہ دھکی دینے کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ فوری طور پر خود کو خطرات میں ڈال لے۔ اسے اس معاملے میں بہت سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔

”میرا دماغ کچھ ناکارہ ہو گیا ہے۔“ شیراز نے اشرف خاں کو جواب دینے کے بجائے دل شاد خانم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ مجھے کیا کہنا اور کیا کرنا چاہیے!“

”ہاں۔“ دل شاد خانم نے غنڈی سانس لی۔

”معاذ ہی کچھ ایسا ہو گیا ہے۔“

دل شاد..... اس نے سر ہلادیا۔ شیراز نے وہ جملہ کہا انہی سے تھا۔ مگر اس کی نظریں اشرف خاں کی طرف ہی تھیں۔ اپنے گھر آ کر وہ کمرے میں بے چینی سے بیٹھنے لگا۔ صدف کے اغوا کی وجہ سے وہ بے چینی میں مبتلا ہو گیا تھا۔

بار بار اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پولیس کے پاس جائے اور اشرف خاں کے بارے میں سب کچھ بتا دے۔ لیکن وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ ایسا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے وہ اس کے نتائج و عواقب پر ابھی طرح غور کر لے۔ جو قدم اٹھانے کا خیال اسے بار بار آ رہا تھا، وہ کسی نہ کسی اعتبار سے اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ صرف اس کے بیان کی بنیاد پر پولیس اشرف خاں کو گرفتار نہیں کر سکتی تھی۔

کوئی ٹھوس ثبوت ہونا ضروری تھا اور جتنا وقت پولیس کو ثبوت حاصل کرنے میں لگتا، اسی دورانیے میں شیراز کی زندگی کسی بھی خطرے سے دو چار ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

دوپہر ہو چکی تھی۔

صدف اس کمرے میں ٹہل رہی تھی جہاں اسے ہوش آیا تھا۔ آرام کی ہر چیز اس کمرے میں موجود تھی۔ بستر بھی آرام دہ تھا لیکن صدف ہوش میں آنے کے بعد سے اب تک ٹھیک سے آرام نہیں کر سکی تھی۔ جب حالات کے

طرف غور سے دیکھا۔

”کیا تمہیں یہ سوال مجھ سے کرنا چاہیے؟“ اشرف

خاں نے تیز لہجے میں کہا۔

شیراز نے دل میں کہا۔ ”کرنا تو آپ ہی سے

چاہیے۔“ لیکن وہ یہ الفاظ زبان پر نہیں لاسکا۔ اس کا دل تو

چادر ہاتھ کا اشرف خاں کو دھکی دے دے۔ اس سے کہہ

دے کہ وہ جا کر سب کچھ بتا دے گا۔

لیکن اس نے یہ دھکی نہیں دی۔ فہم و فراست کا تقاضا

یہی تھا کہ وہ کل سے کام لے۔ اشرف خاں کے گھر میں ہی

بیٹھ کر اسے یہ دھکی دینے کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ فوری طور پر

خود کو خطرات میں ڈال لے۔ اسے اس معاملے میں بہت

سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔

”میرا دماغ کچھ ناکارہ ہو گیا ہے۔“ شیراز نے

اشرف خاں کو جواب دینے کے بجائے دل شاد خانم کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ

مجھے کیا کہنا اور کیا کرنا چاہیے!“

”ہاں۔“ دل شاد خانم نے غنڈی سانس لی۔

”معاذ ہی کچھ ایسا ہو گیا ہے۔“

دل شاد..... اس نے سر ہلادیا۔ شیراز نے وہ جملہ کہا انہی

سے تھا۔ مگر اس کی نظریں اشرف خاں کی طرف ہی تھیں۔

اپنے گھر آ کر وہ کمرے میں بے چینی سے بیٹھنے لگا۔

صدف کے اغوا کی وجہ سے وہ بے چینی میں مبتلا ہو گیا تھا۔

بار بار اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پولیس کے پاس جائے اور

اشرف خاں کے بارے میں سب کچھ بتا دے۔

لیکن وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ ایسا کوئی قدم اٹھانے سے

پہلے وہ اس کے نتائج و عواقب پر ابھی طرح غور کر لے۔ جو

قدم اٹھانے کا خیال اسے بار بار آ رہا تھا، وہ کسی نہ کسی اعتبار

سے اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ صرف اس کے

بیان کی بنیاد پر پولیس اشرف خاں کو گرفتار نہیں کر سکتی تھی۔

کوئی ٹھوس ثبوت ہونا ضروری تھا اور جتنا وقت پولیس کو ثبوت

حاصل کرنے میں لگتا، اسی دورانیے میں شیراز کی زندگی کسی

بھی خطرے سے دو چار ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

دوپہر ہو چکی تھی۔

صدف اس کمرے میں ٹہل رہی تھی جہاں اسے ہوش

آیا تھا۔ آرام کی ہر چیز اس کمرے میں موجود تھی۔ بستر بھی

آرام دہ تھا لیکن صدف ہوش میں آنے کے بعد سے اب

تک ٹھیک سے آرام نہیں کر سکی تھی۔ جب حالات کے

حریف

باعث دماغ منتشر ہو تو انسان کے لیے آرام کرنا مشکل ہی ہوتا ہے۔

اغوا ہونے سے پہلے صورت حال یہ بتا رہی تھی کہ کوئی اس کی زندگی ختم کرنا چاہتا ہے اور اب اغوا سے یہ سمجھ میں آ رہی تھی کہ بعد میں کچھ اور سوچ کر اسے ختم کرنے کا ارادہ ترک کر دیا گیا ہے ورنہ اسے اغوا کرنے کے بجائے اس کی خواب گاہ میں قتل ہی کیا جاسکتا تھا۔ بے ہوش کرنے کے بعد اس کے سینے میں جاتو بھی اتاراجا سکتا تھا۔

ارادے میں تبدیلی کیوں؟ یہ سوال صدف کے دماغ پر مسلسل ہتھوڑے برسا رہا تھا.....

اس کمرے کے ساز و سامان سے اشارہ ملا تھا کہ وہ جدید طرز کے کسی گھر میں ہوئی لیکن ایک طرف کی دیوار میں روشن دان کی موجودگی سے قدامت ظاہر ہو رہی تھی.....

ہوش میں آنے پر ہاتھ کا سامان اسے سر ہانے کی تیاری پر دکھا نظر آیا تھا۔ اس سامان کے ساتھ گرم چائے اور گرم کافی کے قہر اس بھی تھے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے اغوا کرنے والے اسے کوئی جسمانی تکلیف بھی نہیں دینا چاہتے تھے۔

صدف کو جب ہوش آیا تھا، اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ کمرے میں لگے ہوئے دیوار گیر لاک سے یہی بات ظاہر ہو رہی تھی کہ وہ صدف کو وقت کا اندازہ نہیں ہوتا۔

پیشانی میں اس نے ناشتا تو نہیں کیا البتہ کافی پی لی اور کمرے میں بیٹھ رہی.....

سات بج چکے تھے جب روشن دان سے ایک اخبار کمرے میں آگرا۔ اس نے وہ جلدی سے اٹھایا۔ وہ کبھی خبروں پر نظر ڈالتی لیکن اس کی توجہ ایک جھوٹی خبر کی طرف اس لیے مبذول ہو گئی کہ اس کے گرد سرخ دائرہ بنایا گیا تھا۔

وہ خبر اس کے اغوا ہی کے بارے میں تھی۔ اسی سے اسے معلوم ہوا کہ اسے اغوا کرنے والوں نے پولیس والوں، گھر کے ملازمین کو بے ہوش کرنے کے علاوہ اس کے والدین کو بھی باندھ کر ڈال دیا تھا۔

اس خبر نے صدف کو اور زیادہ الجھا دیا۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ اسے اغوا کرنے والا اشرف خاں نہیں تھا.....

”تو پھر کون؟“

اس سوال پر غور کرتے ہوئے اچانک اس کے دماغ میں خیال آیا کہ یہ سب ڈراما بھی ہو سکتا ہے۔ پولیس کو یہ باور کرانا مقصود ہوگا کہ صدف کو اغوا کرنے میں اشرف خاں کا

حریف

کوئی ہاتھ نہیں۔ اخبار اسے بھی اس لیے پہنچایا گیا تھا کہ خبر

پڑھ کر وہ سمجھے کہ اسے اشرف خاں نے اغوا نہیں کر دیا تھا۔

لیکن یہ بات صدف کی سمجھ میں نہیں آ سکی کہ اشرف

خاں کم از کم اسے کیوں باور کرانا چاہتا ہے کہ اس کے اغوا

میں اس کا ہاتھ نہیں؟

ان خیالات میں بہتے ہوئے صدف پھر چوکی۔ یہ کیا

ہو گیا؟ اسے اس کا یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا باپ اس کا

جانی دشمن بن گیا ہے لیکن اس دقت وہ اسی انداز میں سوچ

قارئین متوجہ ہوں



کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

- ☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔
- ☆ شہر اور علاقے کا نام۔
- ☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رائٹے اور مزید معلومات کے لیے

شمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سینس جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

63-C ایڈیٹنگ، ڈیزائننگ، پرنٹنگ، ڈسٹری بیوٹن

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

ری تھی.....

اس نے اپنا سر جھکا۔ وہ صدیق و ذرا نچ کے بارے میں سوچنے لگی، لیکن یہ اس کے لیے معافی بنا رہا کہ اسے ختم کرنے کے بجائے اسے اغوا کیوں کیا گیا ہے؟ ارادے کی اس تبدیلی کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟

صدف کا دماغ مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اسے ان لوگوں کا بھی خیال آیا جو ایک سبک اس کی حفاظت کرتے رہے تھے اور شیراز کو اس کے دشمنوں سے بچا چکے تھے۔ مگر انہوں نے اسے اس وقت کیوں نہیں بچایا؟ کیا انہیں یہ اندیشہ نہیں تھا کہ اسے اس کے گھر میں بھی ٹارگٹ کیا جاسکتا ہے؟

پھر صدف کے دماغ میں یہ خیال بھی آیا کہ اسے شاید انہی لوگوں نے اغوا کیا ہو اور مقدمہ بنی ہو کہ وہ خطرات میں نہ پڑے۔ اس کمرے میں وہ ہر خطرے سے محفوظ ہو گئی تھی۔ اخبار بھی اسے اسی لیے پہنچایا گیا تھا کہ وہ سمجھ لے کہ اس کے اغوا میں اس کے باپ کا ہاتھ نہیں ہے۔ اس کے والدین کو تو بائندہ کر ڈال دیا گیا تھا!

صدف ٹپکی رہی اور اس کا دماغ الجھتا ہی رہا۔ اسے شیراز کا بھی خیال آیا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ شیراز پولیس سے رابطہ کر کے وہ سب کچھ بیان کر سکتا ہے جو وہ اسے بتا چکی تھی۔

انہی خیالات میں الجھتے ہوئے اس نے کئی گھنٹے گزار دیے۔ ٹپکتے ٹپکتے وہ تھک جاتی تو کچھ دیر کے لیے بستر پر لیٹ جاتی اور پھر ٹپکتے لگتی۔

اس کا ضمیر نہ جانے کہاں سے اٹھا تھا کہ وہ پہلے بھی کسی مرحلے پر خوف زدہ نہیں ہوئی تھی اور اب بھی اسے کوئی خوف نہیں تھا۔

وہ پھر بھی دھلتے لگی۔ ایک بج چکا تھا جب وہ چوکی۔ اس نے دیکھا کہ ایک منہ بوٹا باسکٹ آہستہ آہستہ روشن دان سے نیچے آ رہی تھی۔ اس باسکٹ میں خاصی بڑی ٹرے تھی۔ باسکٹ فرش پر آ کر ٹک گئی۔ صدف نے اس کے قریب جا کر دیکھا۔ ٹرے میں اس کے لیے کھانا بھیجا گیا تھا۔

اتنی مہمان نوازی؟ صدف کے دماغ میں سوال ابھرا۔ وہ ہموک تو محسوس کر رہی تھی لیکن کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

☆☆☆

اس وقت اشرف خاں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے صدیق و ذرا نچ سے کہہ رہا تھا۔ "میں نے

تمہیں فون پر بتا دیا تھا کہ اس واقعے کے باعث میں بہت الجھا ہوا ہوں، پھر بھی تم نے اصرار کیا کہ میں دفتر آؤں کیونکہ تم مجھ سے ملاقات کر کے کچھ کہنا چاہتے ہو لیکن تم کچھ کہنے کے بجائے بس گھورے جا رہے ہو مجھے!"

"ہاں۔" صدیق و ذرا نچ نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "میں تمہارے چہرے سے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ تم نے صدف کو زندہ رہنے دیا ہوگا یا نہیں اور لے جا کر ختم کر دیا ہوگا۔"

"کیا بکو اس کر رہے ہو تم صدیق!..... میں فون پر تمہیں سب کچھ بتا چکا ہوں اور اخبار میں آچکا ہے کہ وہ لوگ مجھے اور دل شاد کو بائندہ کر چھوڑ گئے تھے۔"

"یہ سب کچھ مجھے تمہارا ڈراما معلوم ہو رہا ہے۔ تم اسے اپنے گھر میں ختم نہیں کرنا چاہتے تھے یا ایک بات اور ہو سکتی ہے....."

"مزید کوئی بات نہیں ہو سکتی۔" اشرف خاں نے اس کی بات کاٹی۔ "حقیقت صرف یہ ہے کہ میرے فیصلے کے بارے میں تمہاری تائید نہ کی کی وجہ سے میں نے صدف کو ختم کرانے کا فیصلہ ترک کر دیا تھا، یا یوں سمجھ لو کہ بعد میں باپ کا دل نرم ہو گیا تھا۔ میں اسے کسی نہ کسی طرح سمجھانے کی کوشش کرتا تھا۔"

"جھوٹ بول رہے ہو تم اشرف خاں!..... تم نے میری بات پوری نہیں ہونے دی۔ ایک بات اور ابھی ہو سکتی ہے۔ یہ ڈراما کہ تم مجھے یہ یاد کرانا چاہتے ہو کہ صدف کے اغوا میں تمہارا ہاتھ نہیں۔"

"تم بے شک انداز میں سوچ رہے ہو!"

"اگر یہ یہ بکا انداز ہے تو بتاؤ کہ صدف کو اغوا کرنے یا کرانے والا اور کون ہو سکتا ہے..... کس میں اتنی ہمت آ سکتی ہے کہ وہ تمہاری یعنی اشرف خاں کی بیٹی کو اغوا کر سکے؟"

"یہ تو پولیس ہی معلوم کر سکے گی۔"

"نہیں اشرف خاں!..... صدف خطرہ تھی تو صرف تمہارے لیے یا میرے لیے۔ اس کے دشمن ہم دونوں ہی ہو سکتے ہیں۔ کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ اسے میں نے اغوا کر دیا ہے؟"

"ہرگز نہیں۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا۔"

"تو کوئی تیسرا دشمن کون ہو سکتا ہے صدف کا؟"

"میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ یہ تو پولیس ہی معلوم کر سکے گی۔"

"ان فضول باتوں سے کوئی فائدہ نہیں اشرف خاں

حریف

..... تم مجھے صاف بتاؤ کہ ابھی اسے زندہ رکھا ہے یا ختم کر دیا ہے۔"

"شاید میں تمہاری غلط فہمی دور نہیں کر سکتا۔"

"سنو اشرف خاں! " صدیق و ذرا نچ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔ اگر وہ زندہ ہے تو مجھے ابھی بتاؤ کہ وہ کہاں ہے ورنہ دوسری صورت یہ ہے کہ میں تم سے اپنا کاروبار کی اشتراک ختم کر لوں۔ میں کسی ایسے شخص کا شریک کاروبار نہیں رہنا چاہتا جو جیسا سفاک ہو۔ اتنا سفاک کہ اپنی بیٹی کو بھی....."

اشرف خاں نے پھر اس کی بات کاٹی۔ "تم اپنی سوچ کا انداز بدل لو صدیق!"

"میں فیصلہ کر کے آیا ہوں اشرف خاں! " صدیق و ذرا نچ نے کہا۔ "تمہیں دونوں میں سے کوئی ایک بات اپنا ہوگی۔ تم مجھے صدف کے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتے تو ہماری شراکت فوراً ختم ہو جانی چاہیے۔ میں اپنے لیگل ایڈوائزر کو ہدایات بھی دے آیا ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ تم جھوٹ بولنے سے باز نہیں آؤ گے۔ وہ کاغذات تیار ہو چکے ہوں گے جن کی رو سے ہمارا پچھلا شراکت نامہ منسوخ ہو جائے گا۔ میں کبھی میں نصف کا حصہ دار ہوں۔ میرا سرمایہ تم مجھے لوٹاؤ۔"

"ہوں۔" اشرف خاں کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ "کیا

اس طرح ہمارا تعلق ختم ہو جائے گا؟"

"ظاہر ہے۔"

"راے لیے ہم دونوں ہی کام کرتے ہیں۔"

"وہ کوئی شراکت داری نہیں ہے، وہ ایک الگ معاملہ ہے۔ میں آج ہی شاستری سے بات کر لوں گا۔"

شاستری وہ ایجنٹ تھا جس کی ہدایات کے مطابق وہ دونوں کام کرتے تھے۔

"کیا بات کرو گے شاستری سے؟" اشرف خاں نے پوچھا۔

"یہی کہ اسے مجھ سے جو کام لینا ہے، وہ مجھ سے لے اور جو کام تم سے لینا ہے، وہ تم سے لے۔ کوئی بھی کام ہم دونوں کو یہ یک وقت نہ دیا جائے گا!"

"اچھا!" اشرف خاں نے طویل سانس لی۔ "میری اس پریشانی کی حالت میں بھی تم مجھے چھوڑنے کا فیصلہ کر رہی ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"ہماری ٹیبلنگ کی اسی وقت ہوتا ہے۔"

"میساجا ہو۔" اشرف خاں نے کہا۔ "کیا تمہارے لیگل ایڈوائزر نے کاغذات تیار کر لیے ہوں گے؟"

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔" صدیق و ذرا نچ نے کہا اور اپنا موبائل نکال کر اس پر اپنے لیگل ایڈوائزر سے رابطہ کرنے لگا۔

اشرف خاں اٹھ کر ٹپکتے لگا۔ اس کے چہرے سے گہری سوچ بچاؤ کا اظہار ہو رہا تھا۔

☆☆☆

وہی پراگندگی کا یہ عالم تھا کہ صدف کو وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ اسے وقت کا علم بھی نہ ہوا یا اگر کمرے میں دیوار گیر کلاک نہ ہوتا۔ اس وقت کلاک میں رات کے نو بجنے والے تھے۔ وہ بستر پر بیٹھی خیالات میں ڈوب ابھرتی رہی تھی..... کہ دروازے کے قریب ہونے والی آہٹ نے اسے چو کا دیا۔

وہ ایک مرتبہ دروازے کے قریب جا کر اسے کھولنے کی کوشش کر چکی تھی اور خود اس کے خیال کے مطابق بھی دروازہ باہر سے بند ہونا چاہیے تھا اور وہ بند ہی تھا۔ صدف نے اس کمرے کی قیدی بننے کے بعد پہلی مرتبہ دروازے پر قدموں کی آہٹ سن لی تھی۔ وہ بستر سے کھڑی ہو گئی۔

دروازہ کھول کر اندر آنے والے اس شخص کو دیکھ کر اسے کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ وہ صدیق و ذرا نچ تھا۔ اس نے دروازہ صرف بھینرنے پر اکتفا کیا اور صدف کی طرف چلا آیا۔

"کچھ فیصلہ کر لیا تم نے!" صدف بے خوفی سے بولی۔ "مجھے اب کوئی مارو گے یا ذبح کر دو گے؟ زہر تو تم میرے منہ میں اس وقت بھی پکا سکتے تھے جب مجھے میری خواب گاہ میں بے ہوش کیا گیا تھا۔"

"بہت بہادر لڑکی ہو تم! میں تمہارے چہرے پر خوف کا سایہ بھی نہیں دیکھ رہا ہوں۔" صدیق و ذرا نچ اس کے قریب آگیا۔ صدف ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹی اور صدیق و ذرا نچ کو گھورتی رہی۔

"بیٹھ جاؤ!" صدیق و ذرا نچ نے تنبیہ کی سے کہا۔

"میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہی پوچھو گے کہ میں نے تمہارے اور اپنے باپ کے بارے میں کس کس کو وہ سب کچھ بتا دیا ہے جو میں جان چکی ہوں۔ مجھے ختم کرنے کے بعد تم ان لوگوں کو بھی ختم کرنا چاہو گے۔"

"بیٹھ جاؤ بے بی! میرا خیال ہے کہ تم نے وہ باتیں شیراز کے علاوہ کسی کو نہیں بتائی ہوں گی۔" صدیق و ذرا نچ نے کہا۔ "اور مجھے اپنے ذریعے سے معلوم ہو گیا تھا کہ شیراز

کو پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اس کے وہاں جانے کا مطلب یہ بھی سمجھ سکتی ہو اور میں نے بھی سمجھ لیا تھا۔“

صدف چونکی۔ ”شیراز کے ساتھ تم کی کیا کیا؟“
”کچھ نہیں۔ وہ اپنے گھر پر ہوگا۔ اشرف خاں پر پولیس نے ابھی ہاتھ نہیں ڈالا ہے۔ ثبوت حاصل کیے بغیر پولیس یہ قدم اٹھا بھی نہیں سکتی۔ صرف ایک شخص کے بیان کی وجہ سے وہ اشرف خاں کو گرفتار کر سکتی ہے نہ مجھے!“
”تو کیا تم دونوں کو ایک ساتھ ختم دے گے؟“ صدف جیسے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اسے آج رات اغوا کرنے کا منصوبہ تو بنایا ہوگا تم نے!“
”تم فضول باتوں میں وقت ضائع کر رہی ہو۔“ صدف وڑائچ کی حد تک جھنجھلا گیا۔ ”نہیں اسے قتل کرنا چاہتا ہوں نہ تمہیں۔“

”تو مجھے مذاق میں اغوا کیا ہے؟“
”ہاں۔ تمہیں اغوا تو میں نے ہی کر لیا ہے۔“ صدف وڑائچ نے کہا۔ ”اگر نہ کردتا تو تم اپنے گھر میں بھی ماری جاسکتی تھیں۔ اشرف خاں تمہیں زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا کیونکہ تم اس کے خلاف واحد گواہ ہو۔ صرف تم ہی نے میری اور اس کی باتیں سنی تھیں لیکن میں اشرف خاں کو شروع ہی میں لعن طعن کر چکا ہوں کہ اس نے یہ فیصلہ غلط کیا ہے۔ میں نے تو تمہاری حفاظت کا بندوبست کیا تھا صدف! اشرف خاں نے اپنے گھر کے لوگوں کو بچڑا لیا اور کالاش دوا کی طرف بھیجا تھا اس لیے میں نے بھی فوری طور پر بندوبست کیا تھا کہ وہ تمہیں نہ مار سکیں۔ شیراز کو تمہارے دشمنوں سے میں نے ہی بچا لیا تھا اور جن لوگوں نے کالاش دوا دی سے پشاور آنے والے راستے میں تمہاری کار پر ایک بڑا پتھر لڑھکا دیا تھا، ان پر فائرنگ بھی میرے آدمیوں نے کی تھی۔“

صدف حیران نظر آ گئی۔
”کیا مطلب!“ اس کے منہ سے نکلا۔ ”کیا مطلب ہوا ان باتوں کا؟“

”شاید میں نے کوئی بھی اچھی ہوئی بات نہیں کی۔“ صدف وڑائچ اب بھی بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ ”میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ تمہیں بچانے اور اپنی زندگی کا رخ بدلنے کے لیے میں جو کچھ کر سکا تھا، وہی کیا ہے میں نے!“
پھر اس نے خاموش ہو کر اپنا موبائل نکالا اور کسی سے رابطہ کرنے لگا۔ صدف حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ صدف وڑائچ کی

باتوں پر یقین کرے یا نہ کرے!
”کہاں ہوئے صدف وڑائچ نے موبائل فون پر کسی سے پوچھا اور کہا۔“ میں بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“ پھر اس نے کچھ سن کر صرف ”اچھا“ کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

”میں کچھ بھی سمجھنے سے اب تک قاصر ہوں۔“ صدف کی آواز اس مرتبہ بھرا ہوئی سی تھی۔
”میں نے اپنی زندگی بدلنے کا فیصلہ کر لیا ہے صدف!“ صدف وڑائچ نے کہا۔ ”میں نے اشرف خاں کے ادارے سے اپنی شراکت ختم کر لی ہے۔ اب اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے اپنا سب کچھ اس شرط پر ایک ادارے کے حوالے کر دیا ہے کہ اسے غریبوں کی بہتری پر خرچ کیا جائے۔ میں نے خود کو پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔“

”مگر کیوں؟“ صدف کی سمجھ میں نہیں آکا تھا کہ یہ سب کچھ سننے کے بعد اسے کیا کہنا چاہیے!
”کیوں؟“ صدف وڑائچ کی مسکراہٹ پڑھ رہی تھی۔ ”نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ میں ایک ایسی زندگی گزار رہا ہوں جو مجھے نہیں گزارنا چاہیے تھی۔ آج میں نے اپنے اور اشرف خاں کے خلاف ثبوت بھی حاصل کر لیا ہے۔ آج میں نے اس سے اپنی تلیدگی کے بارے میں جو باتیں کی تھیں، وہ ریکارڈ بھی کر لی تھیں۔ وہ ریکارڈنگ اور اپنا ایک مفصل بیان بھی میں پولیس کو بھیج چکا ہوں۔ میں نے اپنے بیان میں یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ایک خاص کام کرنے کے بعد خود کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“

”مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں۔“ صدف دھنسی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ”خواب میں سن رہی ہوں، میں تمہاری باتیں اور یہ تم نے بلایا کسے ہے؟“
اس سے پہلے کہ صدف وڑائچ اسے جواب دیتا، کسی نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ساتھ ہی ایک آواز آئی۔ ”مہمان..... باس!“ یہ گویا اطلاع تھی۔

”آئے دو۔“
فوراً دروازہ کھلا اور جو شخصیت اندر آئی، اسے دیکھ کر صدف بھونچکا رہ گئی۔ وہ دل شاد خان تھیں۔
”مما!“ صدف کے منہ سے حیرت کے عالم میں نکلا۔
دل شاد خان تیزی سے اس کے قریب آئیں اور اسے سینے سے لگا کر ہانگوں کی طرح پیار کرنے لگیں۔ پھر سر موڑ کر صدف وڑائچ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں کس زبان

سے تمہارا شکریہ ادا کروں!“
”کسا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت ہے؟“ صدف وڑائچ نے ہنسی کی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”کیا یہ میرا فرض نہیں تھا کہ اپنی بیٹی کو مرنے سے بچاؤں؟“

صدف چونکی۔
”ہاں صدف!“ دل شاد خان نے کہا۔ ”صدف بی بی تمہارے باپ ہیں۔“
صدف ہانگوں کی طرح کبھی صدف وڑائچ کی طرف اور کبھی دل شاد خان کی طرف دیکھنے لگی۔

”ہاں صدف!“ دل شاد..... پولیس۔ ”میری پہلی شادی صدف بی بی سے ہوئی تھی۔ جب تم ایک سال کی تھیں تو ہم دونوں ایک غلط فیصلے کا شکار ہو گئے۔ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ بعد میں وہ غلط فیصلہ توبہ ہوئی لیکن طلاق ہو چکی تھی اور میں نے اشرف خاں سے شادی بھی کر لی تھی۔ اسے علم نہیں تھا کہ میں صدف کی مطلقہ ہوں۔ میں نے اس سے یہ شرط منوائی تھی کہ یہ بات وہ تم پر کبھی ظاہر نہ ہونے دے کہ تم اس کی بیٹی نہیں ہو۔“

اس وقت صدف وڑائچ موبائل فون پر کسی کو پتا بتانے کے بعد کھڑا رہا تھا۔ ”آپ اپنے کسی افسر کو پھیلو یوں کے ساتھ یہاں پہنچ دیں۔ میں گرفتاری دینے کے لیے تیار ہوں۔“ پھر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

دل شاد..... بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”اب میں اشرف خاں سے طلاق لے کر تم سے شادی کر سکتی ہوں اور تم.....“
”اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے دل شاد!“
صدف وڑائچ نے کہا اور پھر صدف کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے ایجنٹ ہونے کی وجہ سے غداری کے جرم میں پھانسی بھی ہو سکتی ہے اور شاید عرقیہ..... اس لیے کہ میں خود ہی اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ دونوں ہی صورتوں میں میں ہمیشہ کے لیے بچھڑا رہے۔ ایسی صورت میں کیا تم ایک مرتبہ میرے سینے سے نہیں لگو کی بیٹی؟“

”بابا!“ صدف کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔
”میری بیٹی!“ صدف وڑائچ نے بڑی جبت سے کہا۔
صدف اس کے سینے سے جا لگی۔ اس وقت دل شاد خان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔
”پولیس شاید اشرف خاں کو گرفتار کر چکی ہو۔“ دل شاد خان نے اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کار میں گھر سے کچھ دور نکل آئی تھی جب میں نے ایک مرد میں دیکھا تھا کہ پولیس کی دو گاڑیاں جھٹکتے کے سامنے آئی تھیں۔“

”پولیس کو میرا بیان جوں چکا ہے۔ ابھی آئی جی نے مجھے فون پر بتایا ہے۔ اشرف خاں کے خلاف کوئی بڑا ثبوت تو نہیں لیکن شیراز کے پاس میری اور اشرف خاں کی گفتگو کی ریکارڈنگ اسے گرفتار کرنے کے لیے کافی ہے۔“

اسی وقت ایک آدمی تیزی سے اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں خود کار رائل کلف تھی۔
”باس!“ وہ تیزی سے بولا۔ ”اشرف خاں کے آدمیوں نے حملہ کیا ہے۔ وہ اندر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“
”روکو! نہیں!“ صدف وڑائچ نے دانت پر دانت جھالے تھے۔

رائل والا جتنی تیزی سے آیا تھا، اتنی ہی تیزی سے واپس لوٹ گیا۔

☆☆☆

”اب کیا ہو گا بابا!“ صدف کی سانس تیزی سے طپنے لگی۔
”گھبراؤ نہیں۔“ صدف وڑائچ نے کہا۔ ”میرے جیسے جی تم دونوں پر آج نہیں آ سکتی۔“
اسی وقت صدف وڑائچ کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ صدف وڑائچ نے فوراً کال ریسیو کی۔ کال کرنے والا اشرف خاں تھا۔

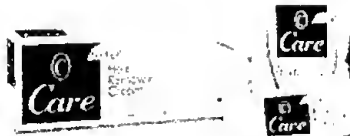
”پولیس مجھے گرفتار نہیں کر سکی صدف!“ اشرف خاں کی آواز میں پہنچ تھا۔ ”فراہم ہونے کی نوبت تمہاری وجہ سے آئی ہے اس لیے اب میرے آدمی تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ تمہیں گھر میں گھس کر مار دیں گے۔“
”جو بات نہیں ہوں میں اشرف خاں کہ تمہارے آدمی مجھے آسانی سے مار لیں۔“ صدف وڑائچ دہڑا دہڑا۔ ”ہاتھ میرا بھی خالی نہیں ہے۔“

پھر اس نے مزید کچھ کہنے سے بغیر سلسلہ منقطع کیا اور جیب سے ریوا لور نکال کر دل شاد خان سے بولا۔ ”تم دروازہ اندر سے بند کرلو!“ اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیا تھا۔
”آپ خود کیوں جا رہے ہیں بابا!“ صدف اس کا راستہ روکتے ہوئے بولی۔ ”آپ کے آدمی.....“

”میں میرے زیادہ آدمی نہیں ہیں میری بیٹی!“ صدف نے کہا۔ ”وہ انہیں اندر آنے سے نہیں روک سکیں گے۔ تم دونوں بھی خطرے میں پڑ جاؤ گی۔“
”ہم ساتھ مرجائیں گے بابا!“ صدف جذباتی ہوئی۔ ”اسنے دن بعد تو مجھے ملا ہے اپنا باپ۔ اب ساتھ ہی جئیں گے اور ساتھ ہی مریں گے، یا مجھے بھی ایک ریوا لور دیجیے۔ میں بھی آپ کے ساتھ.....“



ہیرا کی



سوفٹنگ کسٹ، پینچل ونڈنگ کے ساتھ سکن کوڈ کے وقت، مرٹن سائنس

پہلا رنگ چوں گویہی تو چاہیے



کیترے بہتر کیا!

کوئی کی نہیں آئی تھی۔
"دل شادا" صدیق دڑاچ بولا۔ "میرے گھر کی قیمت میں کروڑ سے کم نہیں ہے۔ وہ میں صدف کے نام کر چکا ہوں۔ تم وہ بچ کر کوئی چھوٹا گھر خرید لیں، دو تین کروڑ کا۔ باقی رقم سے دونوں مناسب زندگی گزار سکتی ہو۔"
دوڑتے ہوئے دڑی بوٹوں کی دھمک سنائی دی۔ پولیس اندر آ چکی تھی۔

"ہا!!" صدف آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ بولی۔ "آپ اس طرح لے اب بچھو بھی جائیں گے۔" "میں تمہارا شکر گزار ہوں بیٹی! تم نے اشرف خاں سے جو باتیں کی تھیں، وہ بھی بتائی تھیں اس نے مجھے۔ تمہاری ان باتوں نے میرا ضمیر چھوڑ ڈالا اور تم سے مجھے جو محبت ہے، اس نے بھی مجھے مجبور کیا کہ میں اس زندگی سے کنارہ کر لوں۔"
زور دار آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور کئی پولیس والے اندر آ گئے۔ ان میں ایک سب انسپٹر اور ایک انسپٹر بھی تھا۔

"صدیق دڑاچ؟" انسپٹر سوالیہ انداز میں بولا۔
"ہاں۔" صدیق دڑاچ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "میری کلائیاں حاضر ہیں آفسیر! اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھادیے۔

جب صدیق دڑاچ کے ہتھکڑیاں لگائی جا رہی تھیں، صدف دل شادا... کے سینے سے لگی سسکیاں لے رہی تھی۔ دل شادا خاتم کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

"آفسیر! "صدیق دڑاچ بولا۔ "یہ صدف اور اس کی ماں ہیں۔ میری درخواست ہے کہ آپ انہیں اپنی حفاظت میں میرے گھر پہنچا دیجیے گا۔" پھر وہ دل شادا خاتم کی طرف دیکھ کر بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تم اشرف خاں کے گھر جانا پسند نہیں کرو گی۔"

دل شادا خاتم نے اشاعت میں سر ہلا کر اس سے اتفاق کیا۔

"شیراز کو بھی فون کر دو۔" ہتھکڑیاں لگے ہوئے صدیق دڑاچ نے کہا پھر مسکرا کر صدف سے بولا۔ "میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے تمہاری شادی میں گھنٹا بھر شرکت کی اجازت دے۔"

صدف ایک بار پھر رو رہی ہوئی صدیق دڑاچ سے جا پئی۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ اشرف خاں کو شہر سے فرار ہوتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا تھا۔

"ابھی تو میرے پاس ایک ہی ریوالتور ہے۔ تم اپنی ماں کے ساتھ نہیں رکھو میری جان!"
"نہیں۔" صدف اس سے لپٹ گئی۔ "میں آپ کو۔۔۔"
"اسے سنبھالو دل شادا" صدیق دڑاچ نے صدف کو شاید پوری قوت سے دل شادا خاتم کی طرف دھکیل دیا۔ صدف گرتے گرتے چلی۔ اسے دل شادا خاتم ہی نے سنبھالا تھا۔

صدیق دڑاچ تقریباً دوڑتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ بڑی شدت سے جاری تھی۔
"مجھے جانے دیں ماما" صدف نے خود کو دل شادا خاتم سے چھڑایا اور دروازے کی طرف چلی۔
"صدف!" دل شادا خاتم نے اسے آواز دی اور اس کے پیچھے آئی۔

صدف اس وقت مایوسی کا سامنا کر چکی تھی۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ صدیق دڑاچ نے دل شادا خاتم سے دروازہ بند کرنے کے لیے کہا تھا لیکن صدف کی جذبہ باتیت دیکھ کر خود ہی باہر سے دروازہ بند کر گیا تھا۔

صدف نے پاگلوں کی طرح دروازے پر گھونے برسا دیے۔

"خود کو قابو میں رکھو صدف..... میری بیٹی! دل شادا خاتم نے اسے گھسیٹ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

اسی وقت ایسا معلوم ہوا جیسے گولیاں چلنے میں شدت آ گئی ہو۔ ان دھماکوں سے سارا علاقہ گونج رہا تھا۔

"ماما" صدف سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "اتنے دن چھپائے رکھی آپ نے مجھ سے یہ بات!"

"میں نہیں چاہتی تھی بیٹی کہ تم اشرف خاں کو سوتیلا باپ سمجھو۔"

اسی وقت گولیاں چلنا بند ہو گئیں۔
صدف چونکی۔ "یہ کیا ہوا؟"

لیکن دل شادا... کیا جواب دیتی اوہ خود کچھ نہیں سمجھ سکتی تھی۔

پھر دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ دروازہ کھول کر صدیق دڑاچ اندر آیا۔

"پولیس آ گئی ہے۔" اس نے بتایا۔ "ان کی طرف سے جب فائرنگ ہوئی تو اشرف خاں کے آدمی ہماگ نکلے۔

میں اپنے آدمیوں سے بھی کہہ چکا ہوں کہ وہ ہتھیار ڈال دیں اور پولیس کو اندر آنے دیں۔"

صدف پھر اس سے جا پئی۔ اس کی جذبہ باتیت میں